

جوہر بھارتی

پہلی کہانیاں آپ یہاں آجک بیتیماں
کراچی
ماہنامہ سرگزشت

جولائی 2016

عمروں کی
معاوضہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

www.paksociety.com

فخر انسانیت: اس نے بے پرو سامانی میں بھی عالمی ہیرو کی سمیٹ لی
لازوال: پاکستان کی وہ نامور شخصیت جس نے مرنے سے پہلے ملک چھوڑ دیا
فلرٹ: اگر عورت کی رنج بانی جو دوسروں کے درمیان کئی پیٹنگ ہو رہی تھی

سرگزشت

ایک صفحے میں مکمل، مختصر مختصر، ایک نادر روزگار کا تعارفِ خاص

ادارہ

07

شاعر
جذبات

شخصیت

اس کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی تھی

ڈاکٹر ساجد امجد

16

قصیدہ گو

مشعل راہ

خدمتِ حینق کی اس نے نادر مثال پیش کی ہے

زویا اعجاز

63

مخراست

سفر کہانی

جانبیالی کا شہکار ایک ایک الگ انداز کی داستان

ندیم اقبال

77

شمشال اور زونو

خراج تحسین

ان متاثر فحش شخصیت کا تذکرہ جنہوں نے مثالِ رستم کی

شکور پٹھان

117

قابلِ فخر

جنگِ عظیم

دوسری جنگِ عظیم کا عبرت بھرا واقعہ

شکیل صدیقی

149

عیار حسینہ

گفت و شنید

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

مدیر اعلیٰ

08

شہر خیال

فلم نگری

اس نے موت سے قبل پاکستان چھوڑ دیا تھا

انور فرہاد

47

لازوال

روداد

ایک ملکہ کی داستانِ عشق کا سبق آموز قصہ

سلمیٰ اعوان

69

ملکہ یاجوری

تحریر خاص

اس ماہ سے جٹری اہم شخصیات کا ذکر خاص

صائمہ اقبال

104

جولائی کی شخصیات

پراسرار

ایک ایسا واقعہ جس کی توجیہ پیش کرنا ناممکن ہے

ابن کبیر

139

وقت کی جست

حیرت انگیز

ان اسرار کا تذکرہ جن کے تعاقب میں بد قسمتی تھی

شماٹلہ حسن

155

بار نصیب

ادارہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے ہنر مند طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہیں ہے۔

معاشرت

بلند حوصلوں اور بے مثل واولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

166
سراب

دوسری سچ بیانی

سیٹی غواہین ممال نے دعائی کہ اب وہ واپس آئے

215
حبسی

چھوٹی سچ بیانی

اس نے دانستے دوست کی شادی رکوا دی

239
صحیح راستہ

چھٹی سچ بیانی

وہ لڑکی عجیب و غریب قسطرت کی تھی

251
مظلومو اطالم

آٹھویں سچ بیانی

انڈیسی لڑکی میں اس کے ساتھ عجیب بات گزرا

268
جزواں

سوغات

دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافانی پارچے

000
پارچے

تاریخ

کرہ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں پر ایک نظر

159
تاریخ عالم

پہلی سچ بیانی

اسی نے مناد کی خاطر

202
فلٹ

تیسری سچ بیانی

ایک ناواقف اور نموش غمبیرت اثر واقع

227
سزا

پانچویں سچ بیانی

گھڑالوں کے لیے اس نے شمشاد بنائیاں دیں

245
زورہ محبت

ساتھویں سچ بیانی

ایک معمولی سی بات نے کسیار اختیار کر لیا

261
فریب نظر

نویں سچ بیانی

کیا واقعی اس پر کالا علم ہوا تھا

275
کالام

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

جلد 26 ❖ شماره 06 ❖ جولائی 2016ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

کیوں تا اس ماہ بھی ایک کہانی سنا دوں؟ عنوان ہے "کوئی بھول ہوئی ہے"۔ کہانی کچھ یوں ہے "مسجد کے سامنے ایک پولیس موبائل کھڑی تھی۔ ایک پولیس والا نہایت تیزی سے مسجد سے نکلا۔ سفید گول ٹوپی کو جیب میں رکھا اور سیدھے سامنے کھڑے پھلوں کے ٹھیلے پر پہنچا۔ کئی اچھے اچھے پھل چنے۔ شاپر میں رکھا اور دوسرے ٹھیلے پر پہنچا۔ وہاں سے بھی کچھ پھل منتخب کر کے تیسرے ٹھیلے پر پہنچا جہاں میں (مصنف) کھڑا تھا۔ ابھی وہ پھل اٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے پوچھا "ان سے آپ افطار کریں گے؟" پولیس والے نے جواب دیا "اور کس لیے اٹھا رہا ہوں؟" میں نے کہا "کیا ان پھلوں سے افطار کریں گے تو روزہ قبول ہوگا؟" اس نے خوشخوار لگا ہوں سے دیکھا پھر کہا "کیوں نہیں ہوگا۔ آخر سیاست داں بھی توجیح و عمرہ کرتے ہیں۔" اس کہانی کو پڑھ کر میں سوچ رہا ہوں واقعی ہم سے کہیں نہ کہیں بھول ہوئی ہے جو آج معاشرہ بے لگام ہو رہا ہے۔ ایسے وقت میں مجھے مولانا حالی کا شعر یاد آ رہا ہے

"اے خاصہ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی
مومن ہے سو مغرور ہے، مفلس سو گدا ہے
فریاد ہے اے کشتی امت کے نگہ بان
بیڑا یہ جاہی کے قریب آن لگا ہے۔"

معراج رسول

شعبہ اشتہادات

نمبر اشتہادات: 0333-2256789
مدیرہ کراچی: 0333-2168391
ڈائریکٹر: 0323-2895528
مدیرہ اعلیٰ: 0300-4214400



قیمت فی پرچہ: 60 روپے ❖ زبر سالانہ: 800 روپے

پبلشر اور پرنٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن

ڈیفنس کٹرل ایریاء میں کورنگی روڈ

کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ جن پر تنگ پریس

ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



شاعر جذبات

دریائے سندھ کی ایک شاخ کے کنارے ضلع میانوالی کا ایک گاؤں تھا۔ اس وقت وہ گاؤں ضلع بنوں میں آتا تھا اور عام سا گاؤں تھا جہاں تعلیم کا کوئی بھی چرچا نہ تھا۔ یوں بھی وہ گاؤں ساٹھ ستر پھوس کے جموں پڑی نما گھروں پر مشتمل تھا۔ اسی گاؤں میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ قدرتی مناظر، شاداب میدانوں اور سرسبز کھیتوں کے درمیان وہ عمر کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ہادو پاراں کی ستم دانی اور دریائے سندھ کی طغیانی کا قابل برداشت بھی ہو جاتی تھی مگر یہ مناظر اس کے لیے نت نئی دلچسپیوں کا باعث ہوتے اور وہ مناظر اس پر سحر طاری کر دیتے۔ وہ کھوسا جاتا۔ ایک بے نام سی امنگ اس کے دل میں پیدا ہو جاتی۔ جب ساون بھادوں میں دریا چرھاؤ پر ہوتا تو اس کے دل میں بھی ایک عجیب سا موج پیدا ہو جاتا تو یا شعر کہنے سے پہلے طبیعت نامعلوم طور پر شعر گوئی کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ چنانچہ سن شعور پر پہنچنے ہی اس نے کئی نظموں میں اس کا اظہار کر دیا۔ دیگر دیہات کی طرح اس کے ہاں بھی دستور تھا کہ چھوٹی عمر میں اسکول نہ بھیجا جائے۔ اسے بھی سات سال کی عمر میں اسکول بھیجا گیا۔ اس زمانے میں اردو نصاب کا بیشتر حصہ محمد حسین آزاد کے قلم سے نکلا ہوا تھا۔ اسی لیے اسے آزاد کے دلکش طرز بیان نے اسیر کر لیا تھا۔ اسی دور میں اس کے ہاتھ مجموعہ قصص آگیا۔ اس میں منکوم تھے اہل زبان اور چھوٹی بچر میں تھے۔ انہیں وہ بار بار پڑھا کرتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خود بخود موزوں مصرعے زبان پر آنے لگے۔ پانچویں میں پہنچا تو چھوٹی چھوٹی نظمیں کہنے لگا۔ ابتدا سے ہی وہ صحیح وزن میں شعر کہنے لگا تھا۔ گو کہ اس کی مادری زبان ملتان (سرائیکی) تھی مگر پڑھے لکھے لوگوں کی اور کاروباری زبان اردو تھی اسی لیے وہ اردو کو فوقیت دیتا تھا۔ پھر اردو زبان پر اس کی گرفت بھی بہت مضبوط ہو گئی تھی اور سر عبدالقادر جیسے نقاد کو سچ معنی کے دیباچے میں لکھنا پڑا۔ ”جب تک میں نے اسے دیکھا نہ تھا اسے یونہی کے کسی شہر کا باشندہ سمجھتا رہا۔“ جب کہ خود اس نے بہت پہلے اقرار کر لیا تھا۔ ”دیکھی ہے میں نے وہی نہ دیکھا ہے لکھنؤ۔ خود رو بروئے اہل زبان شرمسار ہوں۔“ خیر جناب اپانچویں کے بعد چھٹی ساتویں اور آٹھویں میں اردو، فارسی میں خوب دلچسپی لی۔ میر، سودا، غالب، مومن ذوق جیسے قدیم شعرا کے ساتھ اس دور کے شعراء میں حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی کو بھی دلچسپی سے پڑھا۔ 1901ء میں جب ملکہ کٹوریہ کا انتقال ہوا اس وقت وہ ساتویں میں تھا۔ ملک بھر کی طرح اس کے اسکول میں بھی سوگ میں جلسہ منعقد ہوا جس میں اس نے مسدس کی صورت ایک طویل مرثیہ کہہ کر سنایا جس کی دھوم پورے ضلع میں ہو گئی۔ انہی دنوں ڈویژنل انسپکٹر آف اسکول محاسبہ کے لیے آگئے۔ اساتذہ نے اسے ان کے سامنے فخر سے پیش کیا۔ انہوں نے کلام سنانے کی فرمائش کی تو اس نے خدمت، والدین کے عنوان سے ایک طویل نظم سنادی جسے سن کر انسپکٹر نے اس کے لیے نہ صرف تعریفی اسناد جاری کی بلکہ اٹریکٹر سر شہتہ تعلیم کو بھی خط لکھا جس پر ڈپٹی کمشنر بنوں کی معرفت خوشنودی کا پروانہ بھی آیا جس نے اس کے سبب شوق پر تازیا نے کا کام کیا۔ ٹرل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ہائی اسکول میں پہنچا تو بطور شاعر اس کی شہرت پہلے سے پہنچی ہوئی تھی۔ یہ ہائی اسکول بنوں میں تھا جہاں اکثریت پشتو بولنے والوں کی تھی جن کی اردو پر وہ خوب ہنسا کرتا۔ اس لیے کاکڑ قبائلی لڑکے پتلی دال کو ”دبلا دال“ کہتے۔ بنوں میں اس کے حلقہ احباب میں ایسے لوگ شامل ہوتے گئے جو ظفر سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے اس کی قوت فکر کو جلا ملنے لگی۔ 1906ء میں جب وہ دسویں میں تھا۔ ”زمانہ“ کانپور اور ”مخزن“ لاہور میں تو اترے اس کی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ زمانہ کے ایڈیٹر فشی دیا ز ان گم خطوط سے خوب حوصلہ افزائی کرتے۔ اب اس نے سیاسی اور قومی نظمیں بھی کہنا شروع کر دی تھیں جو ملک بھر کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ میٹرک کرنے کے بعد 1907ء میں وہ ایک سال کے لیے سینٹرل ٹریڈنگ کالج لاہور میں مدرس کی تربیت کے لیے داخل ہوا۔ لاہور آیا تو اخبار ”صدائے ہند“ کے ایڈیٹر دین محمد کی طرف سے منعقد مشاعرے میں شرکت کی جس میں ملک کے نامور شعراء آئے ہوئے تھے۔ 1907-08ء میں اس نے خوب خوب سیاسی نظمیں کہیں جو مختلف اخبارات میں شائع بھی ہوئیں اور انگریز حکومت کی جانب سے پرسش بھی ہوئی۔ لاہور کے سینٹرل کالج سے فارغ ہو کر وہ ڈیرہ اسماعیل خان کے مشن اسکول میں ملازمت کرنے لگا۔ یہیں رہتے ہوئے اس نے 1916ء میں اخلاقی، معاشرتی نظموں کا پہلا مجموعہ ”کلام محروم“ شائع کر لیا جسے پڑھ کر اکبر الہ آبادی نے کہا۔ ”ہے داد کا سحق کلام محروم۔ ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم“ جناب میں اس نے بھی رباہی میں اخبار کی معرفت شکر یاد کیا جس کا ایک شعر تھا۔ ”آیا مجھ کو یقین کہ شاعر ہوں۔ جب داد سخن جناب اکبر سے ملی۔“ کلام محروم کے بعد اس کے اور بھی بہت سے مجموعے آئے ”سج معانی، ہر باعیا، کاروان وطن، نیرنگ معانی، بہار طفلی، کلام محروم حصہ دوم اور شعلہ نوائے خوب پذیرائی حاصل کی۔ اس شاعر جذبات کو ہم بلوک چند محروم کے نام سے پہچانتے ہیں۔

شہرِ خیال



☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا اظہار یہ کراچی سے۔ ”رمضان جیسے بابرکت تہوار میں ہماری سالگرہ پر سرگزشت ہمیں کسی بہت ہی عزیز اور دل پسند مہمان کی طرح ملا۔ اس میں شامل اکثر تحریریں ہمارے لیے کسی سر پرانز اور خوب صورت تحفوں سے کم نہ تھیں۔ شاندار ادارہ اور ”مصنف“ نے دل بھایا تو شہرِ خیال کی اوج ثریا پر اعجاز حسین شہار کو براجمان دیکھ کر گردن میں تھوڑی تکلیف ہوئی لیکن دل خوش ہو گیا۔ تمبرہ بھی خوب تھا۔ محمد خولید کورنگی میں کہیں بستے ہیں اور ہم بھی یہیں پائے جاتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی قوم کے ڈپریشن میں معراج رسول جلتا تھے۔ عاقبت نااندیش رہبرو رہنما ہم نے خود جتنے جو ہم پر مسلط ہو کر وہ کارنامے سرانجام دیتے ہیں کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ چند لوگوں کے عوض ہمارے سرکاری ملازم غیر ملکیوں کو شہریت دے دیتے ہیں اور رہنما چند دونوں کی خاطر ان کو تحفظ، ایسی ملامت کا زعم اس وقت پارہ پارہ ہو جاتا ہے جب دوست نما دشمن ہمیں ہماری اوقات یاد دلا دیتے ہیں کیونکہ رہبر ہمارے کا۔ لیس ہیں۔ سدرہ بانو، بشری افضل، فلک شیر اور دیگر ساتھیوں سے ملاقات خوشگوار رہی۔ مسلم رشید کا سند یہ سب سے دلچسپ تھا۔ حکیم الشعراء کی رباعیوں نے دل جیت لیا۔

فریضہ حج کی ادائیگی کو سفر نامے میں پہلے شہاب نامے میں قدرت اللہ شہاب ڈھال چکے ہیں لیکن احمد حسین صاحب کے سفر حج کا منظر نامہ پڑھ کر یقین ہے کہ کھل پڑھنے والوں کو روحانی سکون ضرور ملا ہوگا۔ ”شمشال سے نور نژاد تک“ میں صرف شمشال کا تذکرہ ہی اتنا پر لطف ہے تو نور نژاد پہنچ کر کیا ہوگا۔ ندیم اقبال کی گلگت کی وادیوں کے بارے میں سحر انگیزی کیا تمہی کہ سلسلی اعوان نے شہزادی جوار خان اور شہزادہ فردوس کی شاندار داستان عشق میں وادی گلگت کی سیر کروادی۔ سیر سے مظلوم ہو رہے تھے کہ شہزادہ فردوس کی روایتی انا پرستی نے افسردہ کر دیا۔ شاہی محلوں کی غلام گردشوں میں ہونے والی سازشوں کا شکار ہو کر شہزادہ کا شہزادی سے بدظن ہو جانا ایک آنکھ نہ بھایا۔ انڈین کرکٹ اشارویراٹ کوہلی کو زویا اعجاز کا خراجِ تحسین کھلاڑی کے شایان شان تھا۔ حالیہ آئی پی ایل میں اس کی ریکارڈ توڑ کر رکھ دی گئی۔ منظر امام کے کارناموں میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ گلینے لوگ کراچی کے گلینوں پر شکور پیمان کا احسان ہے جسے ہم ہر سال یاد رکھیں گے۔ جون میں اپنی سالگرہ پر کراٹو کا تحفہ جہاں اچھا لگا وہاں آخری امتحان اور پراسرار قاتل وہ مہمان ثابت ہو میں جو کسی کی خوشی میں شرکت تو کرتے ہیں مگر واجبی سے انداز میں۔ ”ذره بنا آفتاب“ زوال پذیر ہو کر غروب ہو گیا۔ ”دیا اور طوفان“ سے لے کر ”کبڑا عاشق“ تک کے تمام سفر میں ہم رنگیلا کے شریک رہے ہیں۔ انور فرہاد اگر یہ بھی فرما دیتے کہ ان کے زوال میں اداکار اور گزریب کی بد قسمتی بھی شامل رہی ہے جس کو رنگیلا نے بہر و ثابت کرنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ جون کی شخصیات میں سب کی سب شخصیات ہمیشہ شاندار ہوا کرتی ہیں لیکن اس مرتبہ بیگم رعنا لیاقت علی خان کا تذکرہ ہمارا پسندیدہ ترین تھا۔ صائمہ اقبال سے گزارش ہے کہ شخصیات کے انتخاب میں صرف تاریخ پیدائش کو پیرا میٹر بنائیں تو آپ کی تحریر کو تاریخی دستاویز کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ ”بیت بازی“ میں اشفاق حسین یمن کا شعر بہت ہی خوب صورت تھا۔ آخر میں آپ کا شکر یہ کہ 5 جون کو دنیا میں ہماری آمد پر ہمیں خوب صورت تحفوں سے نوازا۔ ”سراب“ نے اپنا رنگ جمایا ہے۔ پہلے سے بھی بہتر ثابت ہوئی۔ سچ بیانیوں میں رشتے اور بزدل نے خاص مزہ دیا۔ وی آئی پی ہمارے معاشرے کی عکاس ہے۔ گمان چھوٹی سی تھی لیکن پسند آئی۔“

☆ اعجاز حسین شہار کا نامہ خلوص نور پور تھل سے۔ ”دوستوں کی محفل میں شامل ہونا پھر کسی صدارت مل جائے تو کتنے اعزاز کی بات ہے لیکن سچی بات ہے کہ اگر خط شائع ہو جائے تو خوشی ہوتی ہے۔ بہر حال احباب کی حوصلہ افزائی کا شکر یہ کہ یہ اعزاز ملا۔ اس بار کافی طویل خطوط شامل اشاعت ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ کم از کم معاشرے کی سچی کہانیوں، کرداروں اور شیطان صفت انسانوں پر کھل کر بحث

ہونی چاہیے۔ ان کے اوصاف اور چہرے کریہہ چہروں کو بڑھنے والوں کو وضاحت سے روشناس کرانا چاہیے۔ یوں اس عالم کا حق ادا ہو جائے گا اور وضاحت سے ہمیں چہروں کو بڑھنے، پرکھنے اور سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ بھگروالے درجہ حرارت بڑھ جانے کی وجہ سے ستارے ہیں اس لیے حاضری نہ ہونے کے برابر ہے۔ ابتدائی کہانیاں کافی پُر پیچ اور نئے موضوعات پر ہیں کیونکہ سرگزشت ہر مکتبہ نگار کا قاری پڑھتا ہے اس لیے ہر ایک کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ کئی ایسے موضوعات اور سلسلے ہیں جنہیں میں بھی سرسری پڑھتا ہوں لیکن حقیقی زندگی سے قریب کہانیوں جیسے جرم و سزا، حادثے اور شکاریات جیسے سلسلے دیکھ کر جسم میں سستی پیدا ہو جاتی ہے لیکن جب سب کی پسند کا خیال رکھا جائے گا تو بوریت نہیں ہوگی۔ ”شکاری“ ویراٹ کوہلی کی محنت اور لگن کی عظیم داستان ہے۔ ابھی ان کی عمر محض 27 سال ہے۔ کرنے کو کافی سال پڑے ہیں۔ کامیابیوں کے کئی در کھلیں گے۔ ”ذرا بنا آفتاب“ میں رنگیلانے ہر شعبہ ہائے زندگی میں تجربات کیے اور کامیابیاں کئیں۔ آخر زوال بھی زندگی کا حصہ ہے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں کے اصول کو تیز نظر رکھنا چاہیے۔ وہ ایک عظیم انسان تھے بھی لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ ”جون کی شخصیات“ میں جاوید میاں داد اور وسیم اکرم کا نام اور نو نو دیکھ کر ہم سب کچھ بھول گئے۔ کتنی خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں۔ کیسے کھلاڑی اور جذبے تھے بس اب سب کچھ خواب لگتا ہے۔ ”سراب“ کی موجودہ قسط کو حد سے ... بڑھ کر تیز چلایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ ذرا ہولار کھیں تاکہ پڑھنے کا مزہ برقرار رہے کیونکہ مصنف صاحب اب حالات و واقعات پر عمل قابو اور کنٹرول حاصل کر چکے ہیں۔ ماہ بہ ماہ صفحات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ٹھیک سمت سفر کر رہے ہیں۔ سچ بیانیوں میں اولین کہانی پڑھ کر ہی رشتوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ بھلا کس ”رشتے“ پر اعتبار کیا جائے۔ ذہنوں کی نفرت کتنی بربادیاں کرتی ہیں یہ کہانی ایسے حالات کا مجموعہ ہے۔ یہاں پولیس انسپکٹر کا کردار افسانوی لگتا ہے ورنہ یہ بہترین سچ بیانی ہے۔ ”حاصل عشق“ میں سین کو کسی طور بھی نگزار سے بھگلا نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ اپنے عشق کے عین سے لے کر قاف تک تمام رو داد نفس کو بتا چکی تھی۔ وہ خاندان کے ذہن میں شک اور رقابت کا کاٹنا پہلے ہی بوجھتی تھی۔ اب اسے بدگمان ہوتے دیر ہی کتنی لگتی بس عورت ہونے کے باوجود پہلی اور آخری عقل مندی یہ کی کہ آنے والے وقت میں مکمل طور پر نگزار سے قطع تعلق کر کے جہاں مستقبل محفوظ بنایا وہیں ضمیر کو بھی مطمئن کر لیا۔ میں انہیں اس فیصلے اور کامیابی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ ”محسن قاتلہ“ میں جو کارنامہ دونوں ماں بیٹی نے سر انجام دیا وہ ہوس پرستوں کے خلاف اعلان جنگ ہے لیکن اگر وہ ہاتھ پاؤں بچا کر یہ سب کرتیں تو خوشی کی انتہا نہ ہوتی۔ اب دونوں ایک نیک کام کرنے کے بدلے میں سزا پا کر جیل میں زندگی ضائع کریں گی۔ ”گمان“ میں پولیس ٹکڈ کے مسائل کی معمولی جھلک ہے، ہر اہلکار ظالم اور نا انصاف نہیں ہوتا کئی عام لوگوں سے زیادہ سازشوں کا شکار ہو کر افراتفری کی زندگی گزار رہے ہیں بلکہ باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو انہیں مظلوم گردانا جا سکتا ہے۔ یہاں پتہ پڑی رب نوازی انسان دوستی اور احسان چکانے کے جذبے کو نہ سراہنا سراسر زیادتی ہوگی۔ ”بے والی خالہ“ جہاں خود بخود بھور نظر آئی وہاں اس کا کردار خطرناک بھی ہے۔ باپ اور خاندان کی طرف سے بے کی بجائے کسی بچے کی قربانی کی فرمائش کی جا سکتی تھی تب اڑوس پڑوس اور حملہ کیسے محفوظ رہ سکتا تھا وہ کام بڑی صفائی اور پس پردہ رہ کر کرتی تھی۔ جب تک شک سے بات یقین تک آتی، کتنے معصوم اس نام نہاد رسم کی بھیشت چڑھ چکے ہوتے۔ شکر کیجیے کہ وہ غائب ہوئی ہے اور دعا کیجیے کہ وہ مر کھ چکی ہو اور معاشرہ اس کے شر سے محفوظ ہو گیا ہو۔ ”دھندلے سائے“ اور ”تہی داماں“ کے شروع سے آخر تک واقعات اچھے ہوئے ہیں۔ ”وی آئی پی“ موجودہ حالات کا ٹکس ہیں ادھر ہر پارٹی کا اس کلچر پر رونا دھونا سننے پڑھنے میں آتا رہتا ہے لیکن یہ سب مذاق لگتا ہے۔ نچلا طبقہ بے بس خاموش تماشاخی ہے۔ دوسروں پر الزام تراشی کرنے والے خود عمل کرنے پر تیار نہیں۔“

☆ محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو کا خط۔ ”ادار یہ میں محترم معراج رسول ایک کہانی بنا رہے تھے جو ایک تلخ حقیقت ہے۔ ”شہر خیال“ میں تمام خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی اب تک جتنے بھی خط میں نے لکھے ہیں سب کے سب شائع ہوئے۔ انکل جی کیا ”علمی آزمائش“ اور ”بیت بازی“ کے کوپن ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں (ضرور بھیج سکتے ہیں) اور کیا میں ایک مضمون بھیج سکتا ہوں جو کہ کمپن لک کے بارے میں ہے (کمپن لک پر مفصل چھپ چکا ہے) اس بار مختلف صفحات پر لکھے اقوال زریں بہت پسند آئے کیا میں بھی بھیج سکتا ہوں (جی ہاں ضرور بھیجیں لیکن کوئشن معیاری ہوں اور حوالہ بھی منسلک ہو۔ سنی سنائی باتیں رومی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ معیتر کتابوں سے ہی اقتباس لیا کریں)۔ سلٹی اعوان ایک اور محبت نامہ لے آئیں۔ شمالی علاقہ جات سے بہت خوب صورت سفر نامہ نما کہانی تھی لیکن اختتام رلا دینے والا تھا۔ ”شمشال سے نورنو“ کا دوسرا حصہ بھی معلومات کا خزانہ تھا۔ پڑھ کر بہت لطف اندوز ہوئے۔ اگلی پھر اگر آپ سہنس سے بھر پور تھا۔ آخری قسط کا انتظار ہے۔ ”سراب“ کی یہ قسط بہت پسند آئی۔ ایسا لگا کہ مرحوم کاشف زبیر نے ہی لکھی ہو۔ لگتا ہے اب سراب کا اختتام ہونے والا ہے۔ کہانی بہت تیز رفتار ہو گئی ہے۔ ”بیت بازی“ میں نازمین ناز، سلٹی شاہین، مہوش صدیقی، ندیم یامین اور فرحت اللہ کے اشعار بہت اچھے لگے۔“

☆ اصغر عباس نے میاں چنوں سے لکھا ہے۔ ”ابھی انکل علی سفیان آفاقی کی موت کا غم کم نہ ہوا تھا کہ انکل محی الدین نواب اللہ

کو پیارے ہو گئے۔ اللہ وانا الیہ راجعون۔ ”دیوتا“ کو میں نے کئی سال بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ ان کی تحریر کے بارے میں اتنا عرض کروں گا کہ کہانی بیان کرنے، فن اور اس میں نئے موڈ لانا اور قاری کو ساتھ لے کر چلنا نواب صاحب کا خاصا تھا۔ ان اموات کے بعد تو یقین کریں کاشف زہیر کی اچانک اور جوان موت نے ہلا کر رکھ دیا اور ابھی تک ان کے مرنے کا یقین نہیں ہو رہا۔ کاشف بھائی وہ تھے جن کی ”سراب“ نہ صرف پڑھی بلکہ اس کہانی سے میں نے کہانی لکھنا بھی سیکھی۔ سچی بات ہے کہ ابھی تک دیوتا کے سحر سے نہیں نکل سکا اور ”سراب“ تو کئی لحاظ سے میرے لیے اہم ہے۔ اللہ ان تمام پیاروں کو اپنے جوار رحمت میں جبکہ عطا فرمائے، آمین۔ سرگزشت کے تمام مصنفین کو اللہ تبارک و تعالیٰ صحت اور لمبی عمر عطا فرمائے۔“

☆ اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ”اس ماہ ایگزٹا اشارت ہونے والے ہیں تو تھرے سے معذرت چاہتا ہوں۔ ”ہم خیال“ کے دوستوں عمران جوانی، طاہرہ گلزار، رانا شاہد، سدرہ بانوسیت سبھی قارئین کو میرا سلام۔ آمد رمضان کی سب کو مبارک باد اور آپ کو بھی۔ عید الفطر کے روز دونوں شمارے اکٹھے پڑھ سکیں گا۔“

☆ سید مسرت حسین رضوی کا مسرت نامہ کراچی سے۔ ”ماہ جون 2016ء کا شمارہ پڑھا۔ پہلی کہانی پڑھ کر حیرت آئی، سال پہ سال کی کھتا پسند آئی۔ بقول آپ کے آنے والے وقت میں کہانی حقیقت کا روپ دھار لے گی اور عوام مہنگائی کے جہال میں پھنس جائیں گے، آپ کا تجزیہ صحیح ہے۔ مزاحیہ اداکار رگیلا کی کہانی پڑھی پسند آئی کہ رگیلا کا آخری دور فلمی دنیا سے دور گزارا اس اداکار نے اپنے آپ کو منوانے کے لیے بہت جدوجہد کی جس کی وجہ سے آج اس کا نام تازہ ہے۔ ”رشتے“ میں کہنا یہ ہے کہ رشتوں ناتوں میں اکثر ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں اور اپنے بیگانے بن جاتے ہیں، یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ”حاصل عشق“ میں گلزار کے کردار پر خوشی ہوئی اور سین کے کردار پر افسوس ہوا لیکن بعد کے حالات اور شوہر نہیں کے رویے نے حالات کو سدھا کر دیا اور کوئی خرابی نہیں ہوئی ورنہ تو مرد و ذات فطرت میں لچک ضرور رکھتا ہے۔ ”محسن قاتلہ“ بہت حساس موضوع ہے۔ عمران حسن کو قتل کرنے کا اقدام ہاں اویس اور بیٹی شازیہ کا کردار نہایت شاک پرور رہا۔ دونوں ماں بیٹی نے جو جو کردار ادا کیا بہت اچھا کیا۔ سرکاری وکیل کی حیثیت واقعی کشمکش والی ہے اور وہ کوئی بھی یکطرفہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو وہی کرنا تھا جو قانون کہتا ہے۔ دونوں ماں بیٹی کا کردار قابل ستائش ہے، ان کا غصہ بھی جائز ہے۔ عزت نفس کا کوئی مول نہیں قانون اندھا ہے عمران حسن جیسے لوگ دولت اور اپنی جوانی کے نشہ میں تمام اصولوں بھول جاتے ہیں۔ ایسا ہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ”گمان“ پسند آئی۔ امر واقعہ ہے کہ آج کل بھی قانون کی حدود کا تعین ہوتا ہے اور کئی جگہ پور ڈبھی نظر آتے ہیں۔ خوش آمدید فلاں تھا نہ خدا حافظ فلاں تھا نہ، خدا رحم کرے پولیس والوں پر۔ پہلے زمانے میں پولیس والوں کا بڑا رعب ہوتا تھا مگر آج کل عقاب ہے۔ ”پتے والی خالہ“ سمجھ میں نہیں آئی۔ طیر کے علاقے میں ایک گھر ایسا ہے کہ جس میں اثرات ہیں۔ کوئی اس مکان میں نہیں رہتا۔ دھندلے سائے، سلیٹی جیلانی نیوزی لینڈ والی، ایسے واقعات پاکستان میں بھی اکثر ہوتے ہیں۔ ”تبی داماں“ جیسے واقعات آج کل کے دور میں بہت زیادہ سنائی میں آرہے ہیں۔ لڑکی یا عورت ہر طبقے میں پس رہی ہیں کہیں زیادہ کہیں کم۔ آخری سچ بیانی ”بزدل“ سب کہانیوں پر بھاری ہے۔ محمد یوسف نے سوچنے اور عملی قدم اٹھانے میں واقعی دیر کر دی جس کی وجہ سے شمس کی جان لگی اور ثابت ہوا کہ سچی محبت اور الفت اسی کو کہتے ہیں۔ اتنا انتظار ہر لڑکی نہیں کرتی جتنا شمس نے کیا یوسف کی بد نصیبی ہی تھی جو وہ مجرہ کے انتظار میں رہا اور آخری وقت بھی گنوا دیا۔ بہر حال کہانی عبرت آمیز ہے پسند آئی یوسف کی کم ہمتی کی وجہ سے افسوس ہوا۔ یہ اظہار خیال کہہ لیں یا ”ہم خیال“ یہاں اجازت چاہوں گا یہ کہنے کی کہ شہباز ملک کی کہانی۔ ”سراب“ جلد انتہام پزیر ہو جائے جب کہ اب اس پر نکھار آیا ہے اور اس کو آپ نے..... سے ہی مکمل کرایا ہے یہ میرا خیال ہے (شاید اگست کے شمارے میں اصل مصنف کا نام اور انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب کا نام آپ پڑھ لیں گے)۔ بانی حقیقت آپ ہی تائیں گے اور عرض کروں کہ اس ڈائجسٹ میں سپنس اور جاسوس ڈائجسٹ کی طرح دو کہانیاں شروع کریں۔ یعنی سرگزشت ڈائجسٹ میں دو کہانیاں سلسلہ وار شروع کریں۔ باقی تمام چیزیں یعنی کہانیاں اپنی جگہ درست ہیں اگر یہ خیال آپ کو پسند آئے تو ضرور۔ ایسا کریں یا قارئین کی رائے لے لیں کیونکہ قارئین کی اکثریت کہانیاں پڑھنا چاہتی ہے۔ باقی کرنا تو آپ نے وہی ہے جو آپ کو پسند ہوگا۔“

☆ غلام سرور کراچی سے لکھتے ہیں۔ ”قارئین کی دینی معلومات کے لیے منتخب قرآنی آیات کی تشریح تفہیم القرآن کے مطابق برائے اشاعت ارسال خدمت ہے (ڈائجسٹ میں قرآنی آیات وغیرہ شامل اشاعت کرنا ممکن نہیں کیونکہ لوگ ڈائجسٹ میں چھپی آیات وغیرہ کا احترام نہیں کرتے ہیں)۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری نے کراچی سے لکھا ہے۔ ”انگل اس بار آپ کی کہانی نے بہت ڈسٹرب کیا۔ کیا ہم مایوس ہوتے جا رہے ہیں، کیا اچھے دنوں کی امید نہ رکھیں۔ میرے ملک کے حالات اتنے بھی خراب نہیں کہ ”لائٹ“ گالی بن جائے۔ نہیں نہیں انگل اتنی مایوسی

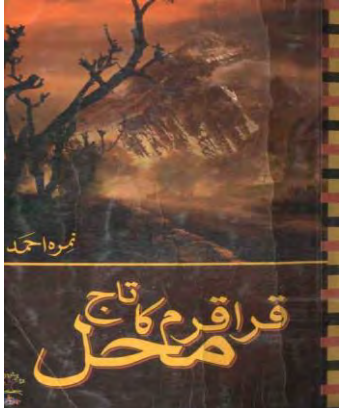
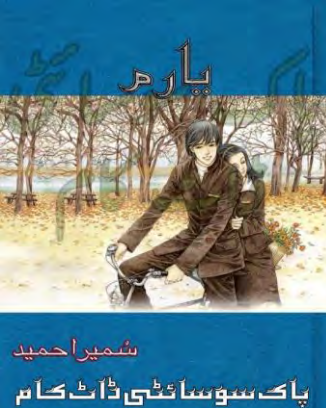
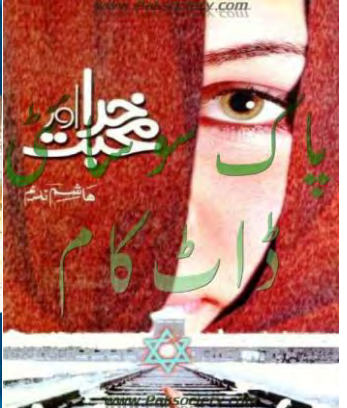
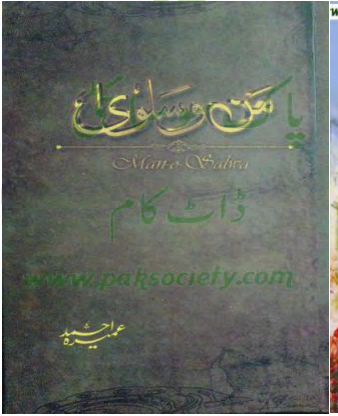
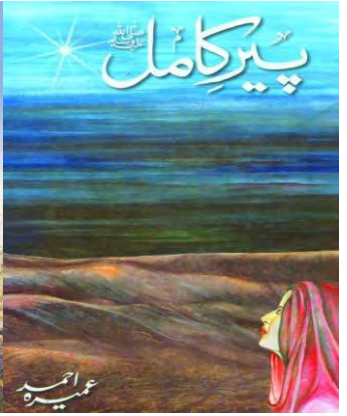
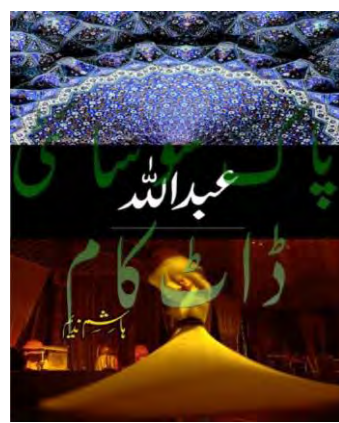
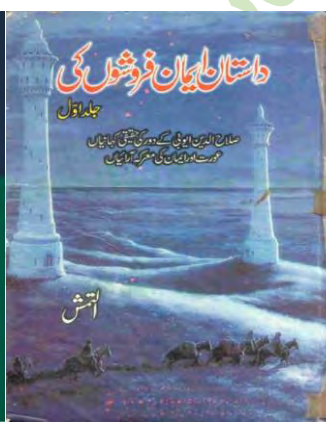
اچھی نہیں "بیستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" اچھے دن بھی آئیں گے لیکن ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان اچھے دنوں کے لیے ہم نے کیا قربانی دی، کیا کام کیا۔ بشری افضل ہم آپ کو بھولنے نہیں ہیں۔ ہاں کبھی آپ کا تذکرہ کرنا بھول جائیں تو اس کے لیے معذرت۔ محی رحمان تبصرے کی پسندیدگی کا شکر یہ، بہت دور سے آپ نے ہمیں یاد کیا۔ اچھا لگا۔ طاہرہ آپا کی کمی محسوس ہوئی، ہاں سب کے تبصرے خوب سے خوب تر تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے اردو ادب کے ایک بڑے شاعر سے متعارف کروایا اور تعریف و تحسین کے حقدار ٹھہرے۔ سلتی اعوان آئی معذرت کہ ہمیں آپ کے بارے میں معلوم نہ تھا۔ تجسس کی انہی تمام کے آپ کی تلاش میں نکلے تو معلوم ہوا کہ آپ تو اردو افسانے کا بڑا نام ہیں۔ ایک محترم رسالے میں آپ کی وہ سفر کہانی پڑھی جس میں آپ کو ایک شاطر نے لوٹ لیا تھا۔ غالباً استنبول میں، وہاں آپ کی ایک عدول چارمنگ تصویر بھی دیکھی اور پہلا خیال یہی آیا کہ ماں ہو تو ایسی جس کے سائے میں شفقت، غلوس، محبت اور تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے ہونے کا احساس بھی ہو۔ خوش رہیں اور ہمیں اپنی تحریروں سے سحر زدہ کرتی رہیں۔ (سرگزشت میں شامل ہر مصنف باکمال ہی ہوتا ہے ابتدائی حصے میں منجھے ہوئے اور معروف قلم کار کو ہی جگہ دی جاتی ہے۔)۔ "کھینے لوگ" یہ تحریر شکور پشمان نے خوب لکھی اور مختصر مگر جامع بھی اتنا ہی کہوں گی کہ اس تحریر میں پرانا کراچی جو کہ بزرگوں سے سنا تھا آنکھوں کے سامنے آکر اٹھا ہوا۔ اچھا لگا ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کا نام کبھی اڑتا اڑتا سنا تھا۔ مکمل تعارف بھی حاصل ہوا۔ "ذره بنا آفتاب" رنگیلا کی کہانی بھی آخر اختتام کو پہنچی۔ سبق ہمیں یہ ملا کہ عروج کی حدود کے کہیں آس پاس ہی زوال کی حدود شروع ہوتی ہے۔ یعنی بلندی اپنے پہلو میں موجود پستی کی وجہ سے ہی بلندی کہلاتی ہے۔ رنگیلا نے اچھی زندگی گزاری۔ شہرت کا ڈانٹ لیا، ان بلندیوں کو چھو لیا جن کو چھونے کی تمنا لیے لاکھوں لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ ابن کبیر طویل غیر حاضری کے بعد آئے اور مغرب میں ہونے والے ظلم کو سنا کر دلوں کو دھلا گئے۔ عورتوں کا لرزہ خیز قتل اور قاتل کی پراسرار کشمکش نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ "ہم نے دیکھا" کہ وقت کی کمی کے باعث سرسری سا ہی دیکھ سکے۔ "رشتے" میں حساس موضوع اپنایا گیا ہے۔ ہمیں تو شروع سے ہی اجمل کے مجرم ہونے کا گمان تھا مگر ہمارے اس گمان کو انسپکٹر سعدی نے اس وقت یقین میں بدل ڈالا جب اس کے بچھائے ہوئے جال میں اجمل بری طرح پھنس بیٹھا۔ رشتوں کا تقدس یا مال کر کے وہ خالی ہاتھ ہی رہا۔ "حاصل عشق" ایسے ایسا پسند عاشق تو اب بس کتابوں میں ہی ملتے ہیں یا پھر منظر امام کی کہانیوں میں۔ حقیقی دنیا میں ان کا گزر کہاں یہ اگر حقیقی دنیا میں دستیاب ہوتے تو شاید بدنت حوا کی زندگی توڑی آسان ہو جاتی۔ اس شمارے نے ثابت کیا کہ لوگ چلے جاتے ہیں ادارے چلتے رہتے ہیں۔ بقول شاعر یہ زندگی کے لیے دنیا میں کم نہ ہوں گے نفوس ہم نہ ہوں گے۔ اس شمارے میں کاشف زبیر کہیں بھی نہیں تھے محفل پھر بھی جو ان تھی، حسین تھی۔

☆ سیف اللہ نے ملک وال سے لکھا ہے۔ "ساجد امجد صاحب کے مضامین تو معلوماتی ہوتے ہی ہیں ان کی کہاں تک تعریف کریں۔ مضمون جو ارخان اس بلندی پر نہیں لگا جس کی توقع سلتی اعوان صاحب سے وابستہ ہے۔ زویا اعجاز کی تحریر "شکاری" کرکٹ کے شائقین کے لیے بھینا ایک تھم ہے لیکن شکور پشمان کا لکھا ہوا "کھینے لوگ" انفرادیت کے لیے ہوئے نظر آیا ہے کیونکہ ڈھیروں معلومات اور اچھوتے انداز بیان کے ساتھ قاری اپنی پرانی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ "تاریخ عالم" اپنے روایتی انداز سے منظر امام صاحب آگے بڑھا رہے ہیں۔ ہر منظر علم میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ عظیم شاہ کی تحریر "ہم نے دیکھا" محمد نذر صاحب کی "آخری امتحان" اور ابن کبیر کی "پراسرار قاتل" تینوں تحریروں کو خانہ پری ہی کہا جاسکتا ہے۔ "شمشال سے نورنؤ" تک میں اس دفعہ ندیم اقبال راستوں کی سختی اور اپنے پاؤں کے پھالوں کا رونا ہی روتے رہے ہیں پھر بھی دلچسپی بنی رہی ہے کہ انداز تحریر خوب ہے۔ فرزانہ بگت کی تحریر "کرا کاٹوا" میں ہر طرف تپا ہی ہی جا ہی پڑھی اور روٹنے کھڑے ہو گئے۔ "ذره بنا آفتاب" مکمل ہوئی۔ انور فرہاد نے ڈھیروں معلومات اکٹھی کر دی ہیں جو کہ بہت اچھی اور خوب صورت کوشش ہے۔ "جون کی شخصیات" حسب سابق بہت اچھا ہے اور دوبارہ پڑھنے کو جی کرتا ہے۔ اختر شہاب کی تحریر "غلطی" سرسری نہیں پوری توجہ سے پڑھی جائے تو قاری یہ ضرور سوچے گا کہ زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا۔"

☆ احمد سعید مخدومی نے سیالکوٹ سے لکھا ہے۔ "سرخ روشناس کرانا نائیل کے لیے سرگزشت سامنے آیا۔ ادارہ نے بہت مزہ دیا۔ اس قسم کا ادارہ کسی اور ڈائجسٹ میں نہیں دیکھا۔ نہایت اہم موضوع اور اتنے کثرت پیرایا میں بہت مزہ آتا ہے۔ تاریخ عالم اپنی بھرپور دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ "ہم نے دیکھا" اور "آخری امتحان" بالکل پسند نہ آئی۔ "ذره بنا آفتاب" اور "شمشال سے نورنؤ" نے دل پر سحر طاری کر دیا۔ اختر شہاب کی "غلطی" بھی کمال کی تحریر تھی۔ "جون کی شخصیات" بھی پسند آئی۔"

☆ سعید احمد چاند نے کراچی سے لکھا ہے۔ "اس دفعہ پرچہ ٹھیک وقت پر ملا۔ معراج رسول صاحب کا ادارہ پڑھا۔ ویسے سرورق بہت اچھا تھا۔ خدیجہ مستور کی زندگی کا حال تفصیل سے پڑھا۔ ایک دو کو چھوڑ کر ساری کہانیاں اچھی تھیں۔ ساجد امجد صاحب "حکیم الشعراء" شکور پشمان کا "کھینے لوگ" منظر امام کا "تاریخ عالم" شیراز حسن کی "انسانی نیکی" ندیم اقبال کی "شمشال سے نورنؤ تک" اچھی تھی۔ محمد نذر کا "آخری امتحان" انور فرہاد صاحب کا "ذره بنا آفتاب" میں رنگیلا کو آخر ہیر و بنا ہی دیا۔ سائرا اقبال کی جون کی سرگزشت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میں جون کی شخصیات کرکٹ کے کھلاڑیوں کے شوقین لوگوں میں اچھی کاوش تھی۔ سنٹوش کمار تو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے پر ان کی پیدائش لاہور میں کہاں سے ہوئی (سہوآلا ہو چھپ گیا) شکر ہے "سراب" میں شہباز ملک کی پہاڑوں سے جان چھوٹی، "بیت بازی" میں سارے ہی شعر اچھے تھے۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف۔ اول نمبر "رشتے" بہترین تھی۔ سین کی "حاصل عشق" لا جواب تھی۔ غزالہ جلیل راؤ کی "محسن قاتلہ" میں عمران حسن کا یہی انجام ہوتا تھا۔ کے ایم خالد کا گمان پڑھا۔ یہ سچ ہے کہ کبھی چھوٹی سی نیکی آدمی کو بڑے انعام کا مستحق بنا دیتی ہے۔ تعجب ہے سلیم طبر کراچی کی "بلے والی خالہ" جیسی عورتیں بھی اس دور میں بھی رہتی ہیں۔ محمد سلیم اختر راولپنڈی کا "دی آئی پی" میت میں دی آئی پی لوگوں کا اتنا انتظار رہتا ہے۔ محمد یوسف کی "بزدل" میں شمر نے اچھا انتقام لیا۔ جن لوگوں نے "ہمیر خیال" میں حصہ لیا۔ بشری افضل، سدہ بانو ناگوری، نجی رحمن، فلک شیر ملک، سعید سرت رضوی، صائمہ نور، ذیشان ریاض، مسلم رشید، عد الجبار رومی کے خطوط پسند آئے اور کچھ ستارے کہاں چھپ گئے۔ شہر خیال کی ہیروئن طاہرہ گلزار، شاہدہ جہانگیر شاہد، ناصر حسین رند، رانا محمد شاہد، محمد سلیم قیصر، منظر علی، قیصر خان، انور عباس شاہ، عمران نقشبندی، احسان عمران سب سے گزارش ہے کہ یہ آپ کا ہی رسالہ ہے۔ اس سے اتنی غفلت؟ (شاہد جہانگیر شاہ کا ڈائلاکسز ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ان کی بیٹائی ستا رہی ہو گئی ہے)۔

☆ عبدالعزیز میمن کا شکایت نامہ کراچی سے۔ "میں آپ کی توجہ آپ کے رسالے ماہنامہ سرگزشت کراچی کے فروری 2016ء کے شمارہ میں شائع ہونے والے مضمون "قدیم تہذیب" کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس مضمون کے صفحہ 136 پر سندھ کے آثار قدیمہ میں "موئن جو دڑو" کا ذکر آیا ہے جس میں محترم مضمون نگار نے اس کو "موہن جو دڑو" لکھا ہے۔ "موہن" ایک ہندو کا نام ہے اور "موہن جو دڑو" لکھنے سے یہ دڑو اس کے نام سے منسوب سمجھا جائے گا۔ "موئن" یا "سمن" سندھی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے "مرے ہوئے" اور "موئن جو دڑو" کا مطلب ہوگا "مرے ہوئے لوگوں کا ٹیلہ" یا "مردوں کا ٹیلہ" اس کی وضاحت آپ کے کسی شمارہ میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ (جی ہاں، ایسا سہوآلا ہے)۔"

☆ انور عباس شاہ کا خط دریا خان بھکر سے۔ "بہت خوب صورت انداز میں بجلی پر کہانی سنائی ہے۔ یہ کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ بجلی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا لیکن جب اس کا بل آتا ہے تو خاص کر غریب عوام پر سکتے طاری ہو جاتا ہے۔ یہ بھی غریب عوام کو لوٹنے کا ایک طریقہ ہے۔ اب بجٹ کی آمد آمد ہے۔ ہماری یہ سطور جب شائع ہوں گی تو بجٹ آچکا ہوگا۔ سنا ہے حکومت اس سال عوام پر ڈبل ٹیکس عائد کرنا چاہتی ہے۔ "ہمیر خیال" میں قارئین کے خطوط جبکہ گار ہے تھے لیکن کافی بہن بھائی نظر نہیں آ رہے جیسے شاہد جہانگیر، طاہرہ گلزار، رانا سجاد اور قیصر عباس وغیرہ۔ "بلے والی خالہ" کافی دل دہلا دینے والی کہانی تھی۔ اس قسم کی باتوں پر یقین رکھنے والے افراد ہندوستان میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہیں لیکن کم ہیں۔ شکور پشمان کی تحریر "کلینے لوگ" ایک پُر اثر تحریر تھی۔ ان کی کہی ہوئی باتیں دل میں اتر گئیں۔ خداوند کریم تمام مسلمانوں کو آپس میں متحد رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ "بدگمان" بے ضمیر پولیس والوں کے لیے ایک سبق آموز تحریر تھی۔ آخر میں چودھری رب نواز کا دونوں پولیس والوں کو شرم دلانے کے لیے طریقے سے تحفہ بھیجنا کافی تھا۔ "سراب" تقریباً اب اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہوئی چکی ہے۔ اس کی جگہ نئی سلسلے وار کہانی کا کم از کم ٹریلر تو جاری کریں۔ "شمشال سے نورنور تک" کا سفر بے حد دلچسپ انداز میں جاری ہے۔ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود بھی رائٹروں میں شمار ہو گئے ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ ہمارے ہی علاقے کے ہیں۔ "مئی کی شخصیات" پڑھ کر معلومات میں اچھا خاصا اضافہ ہوا۔ مضمون میں کافی مشہور شخصیات شامل تھیں۔ "بزدل" ایک دلگہی تحریر تھی جو بھی ہوشمرد نے آخر میں آکر بہت بڑی غلطی کی تھی جو کہ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔"

☆ ایم ایچ ادیب کا خط لاہور سے۔ "اس مرتبہ بھی شمارہ حسب معمول اپنی خوشانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ کہانیوں اور واقعات کے سلسلے میں ہر ماہ جو آپ بیتیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ ایک منفرد سلسلہ ہے اور اس نوع کا کوئی اور ماہنامہ اپنے ملک میں کم ہی نظر آتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ آپ لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ ایک تحریر بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور آئندہ اشاعت میں شائع فرمائیں گے۔"

☆ شیریں زادہ خدیجیل صوابی سے لکھتے ہیں۔ "محترم مدیر صاحب السلام علیکم! تقریباً دو سال قبل ایک مضمون بھیجا تھا۔ تا حال شائع نہ ہو سکا۔ اس لیے گزشتہ دنوں اس پر تنقیدی نظر پھر ڈالی تو کئی خامیاں نظر آئیں۔ اس کو دور کر کے دوبارہ بھیج رہا ہوں۔ اس بار انشاء اللہ معیار پر اترے گا اگر جلد اطلاع دیں تو اس تاریخی موضوع پر دوسرا مضمون بھی روانہ کروں گا۔ (گزشتہ بار ہی مضمون پڑھا تھا لیکن اس میں معلومات کی کمی تھی اسے مسترد کرنا پڑا تھا۔ دوبارہ سے اسے پڑھ لیتا ہوں۔)"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا پیغام پشاور سے۔ "گزشتہ کئی روز سے طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ اب کچھ افادہ ہے۔ اب بھی چلنے ماہنامہ سرگزشت

پھرنے سے قاصر ہوں۔ ذہیل چیز کے ذریعے گھر میں کچھ دیر چل لیتا ہوں۔ پرویز بگرا می کی والدہ کے انتقال کا سن کر دلی صدمہ۔۔۔
 پہنچا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، (آمین) پلیز تمام احباب مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں (شاہد جہاگیر شاہد کی
 بیٹائی ڈائیسز کی وجہ سے متاثر ہو گئی ہے پھر بھی وہ بیٹوں سے سرگزشت پڑھوا کر سنتے ہیں۔ بیٹائی کے لیے خصوصی دعا کریں)۔“

☆ شوکت رحمن خشک کا پیغام پشاور سے۔ ”قلم نگری پابندی سے پڑھ رہا ہوں۔ انور فرہاد سے خصوصی درخواست ہے کہ وہ مایا
 دیوی کے بارے میں مفصل مضمون ضرور لکھیں۔ پاکستانی قلم انڈسٹری کو تباہ کر دیا گیا۔ اس تباہ حال انڈسٹری کو نوحہ پڑھنے والے علی سفیان
 آفاقی بھی ندر ہے۔ پاکستانی فلمی دنیا پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں تاکہ آنے والی نسل جان سکے کہ کبھی ہمارے ہاں سبھی کے مقابلے میں نہایت کم
 پیسوں میں ان سے اعلیٰ درجے کی فلمیں بنتی تھیں۔“

☆ اکبر احمد ذیشان کا خط حافظ آباد سے۔ ”اس بار حکیم الشعراء نے بہت لطف دیا معلومات میں اضافہ ہوا۔ کئی لوگ نے دل
 موہ لیا۔ میرا بچپن لڑکپن اور جوانی کراچی میں گزری ہے اس لیے بھی یہ تحریر اچھی لگی۔ تاریخ عالم معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔
 ”شمال سے ٹورنٹو“ نے سحر طاری کر دیا ہے۔ اتنی اچھی تحریر پر ندیم اقبال کو مبارک باد۔ اُمید ہے کہ تحریر چلتی رہے گی۔ ”رشتے“ نے
 جھنجھوڑ دیا۔ بہت عمدہ سچ بیانی تھی۔ کے ایم خالد کی گمان بھی خاصے کی چیز تھی بزدل بھی پسند آئی۔“

☆ میر زبیر اعجاز تارڑ تحصیل ملی ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ ”میں آپ کے میگزین جاسوسی اور سرگزشت کا خاموش قاری
 ہوں۔ پہلی بار ایک سبق آموز کہانی لکھی ہے جسے قارئین بہت زیادہ پسند کریں گے۔ براہ کرم میری تحریر پر خصوصی توجہ دیجیے گا۔ یہ تحریر سچ پر مبنی
 ہے اور میں نے بڑی مشکل سے اسے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے لیے میں نے کئی لوگوں سے اصلاح لی ہے۔ کہانی کو کئی
 مرتبہ لکھا ہے اور اپنے پروفیسر صاحبان کو چیک کرائی ہے کہ کہیں اس میں کوئی غلطی تو نہیں۔ (اس شمارے سے فارغ ہو کر پڑھ لوں گا)۔“

☆ فقیر غلام حسین خیانتے بکھر سے لکھا ہے۔ ”جون کے شمارے میں سلمیٰ اعوان کی تحریر باعنوان ”جوار خان“ نے ماہنامہ سرگزشت کو
 زینت بخشی۔ انمول جذبوں سے بھری محبت کی یہ داستان بار بار پڑھنے کو بیجا ہوتا ہے۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کے لیے دعا ہے ”اللہ کرے زور قلم اور
 زیادہ“ عشق کی دے دے لفظوں میں باوقار اظہار تحریر، الفاظ کا چناؤ، سسکیاں اور سرگوشیاں سب کچھ احترام آدمیت ملحوظ رکھتے ہوئے لکھاری کی
 مضبوط گرفت کی عکاسی کرتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہماری اعوان برادری میں ایسے بلند فکر اعلیٰ ادبی رجحان والے انسان موجود ہیں۔“

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا پیام لاہور سے۔ ”خدیجہ مستور کے ذہن میں بننے پلانوں پر تحریروں کی کامیاب عمارتیں کھڑی
 ہوئیں اور وہ کامیاب مصنف قرار پائی۔ اس دفعہ سرگزشت کوئی خاص نہیں پڑھ سکا وہ اس لیے کہ 5 جون کو میری شادی تھی اور پھر مصروفیت
 میں کچھ پتا نہیں چل سکا البتہ ”عہد خیال“ کی محفل سے بھی آؤٹ ہونے کو دل نہیں چاہا تو مصروفیت کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھنے بیٹھے گیا۔ اعجاز
 حسین شمار کو مبارک ہو بہت عمدہ تبصرہ کیا۔ محمد خواجہ نے بھی اچھا لکھا تھا طاہر نقاش کی سرگزشت سے وابستگی اچھی تھی اور پھر کبھی جو صدمہ
 پہنچتا ہے تو اللہ کی رضا کے لیے برداشت بھی کرنا پڑتا ہے۔ سدرہ بانو کی آمد زبردست ہوتی ہے جس میں تقریباً ہر طرح کی باتوں کو سمیٹ کر
 تبصرہ کیا ہوتا جو بہت اچھا لگتا ہے۔ محی رحمان کی سچائی پر مستعمل باتیں بے حد اچھی لگیں۔ سعید احمد چاند کی انتہائی مختصر مگر جامع تحریر اچھی تھی۔
 سید مسرت حسین کو خوش آمدید۔ صائمہ نور سیاستدان بھی تو عوام کو کاٹ کا آلو ہی سمجھتے ہیں نا۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت پیارا ہے۔ مسلم رشید کے
 قلم نے تو لفظ لفظ جوڑ کے بھرپور تبصرہ لکھ ڈالا زبردست لگا۔“

☆ انجم فاروق ساحلی کا نامہ شوق لاہور سے۔ ”گزشتہ ماہ مختصر خط شائع کرنے کا شکر یہ۔ گزارش ہے کہ ”موہن کا آدم خور“ اور ”کوپرا
 کار بیچہ“ شکاریات کی تحریروں ہیں اور اس موضوع پر آپ میری کہانیاں شائع کر چکے ہیں۔ ”علم و ادب کا گہوارہ“ (حیدرآباد) تحقیقی علمی مضمون
 ہے۔ گزشتہ موسم سرما میں بہت سی علمی ادبی شخصیات ہم سے جدا ہو گئیں ان کی کمی کا پورا ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔“

☆ قیصر خان کی بھکر سے آمد۔ ”ہمیشہ کی طرح ادارہ میں سلگتا ہوا موضوع زیر باعث تھا۔ بجلی کی وجہ سے بے روزگاری میں
 بہت اضافہ ہوا ہے۔ ”عہد خیال“ میں حاجی صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ بہت اچھا تبصرہ تھا۔ بھکر سے شاہ جی ہمیشہ کی طرح
 حاضر تھے۔ سب کے تبصرے اچھے تھے۔ کچھ نئے لوگ تھے اور کچھ نام لکھنا بھول گئے تھے۔ بندہ بہت لائق ہے لیکن نام و پتا معلوم نہیں۔
 غیر حاضر میں ڈاکٹر روبینہ نصیر، ڈاکٹر قرۃ العین، شاہد جہاگیر، عامر ساحل، رضا اعوان، طاہرہ گلزار وغیرہ کا خط نہ پڑھ کر بہت کمی محسوس کرتا
 ہوں۔ اس مرتبہ پرچہ بہت خاص لگا۔ پہلی کہانی میں سب کا شک طلعت پر تھا پر چودھری قائل نکلا۔ ہنسا بستا گھر اجاڑ دیا۔ ”حاصل عشق“
 میرے مطابق سچے پیار کی سچ عکاسی کرتی ہے۔ محبت میں محبوب کا بھلا سوچنا ہے تاکہ اپنا بہت اچھا فیصلہ کیا گلزار ایک عظیم محبت کا پیکر شخص

ہے۔ ”بزدل“ جناب کوئی اتنی ترقی کے ساتھ اتنا سوچتا ہے کہ کروں یا نہ کروں، جناب کپتان صاحب آپ کو جانا چاہیے تھا۔ فیصلے کی دیر دو زندگیاں لے ڈوبی۔ ہر ماہ کی شخصیت پر صائرا اقبال کا مضمون بہت اچھا جا رہا ہے اور سب سے بڑھ کر ندیم اقبال کا سفر نامہ بہت لاجواب ہے میرے نزدیکی صوبہ اور ضلع کے رہائشی بہت کمال لکھتے ہیں کبھی آپ آئیں تو یاد کرنا ہم ملاقات کے خواہش مند رہیں گے۔ باقی پرچہ ابھی نہیں پڑھ سکا۔ ایک رائے تھی یا عرض تھی۔ میرا دل چاہتا ہے ہمارے جو محسن پاکستان تھے ان سب پر مضمون آنا چاہیے۔ جیسے کہ قائد اعظم، لیاقت علی خان بہت سے لوگ جن کے بارے میں کچھ کچھ معلوم ہے نہ ان کی اولادوں کے بارے میں پتا ہے وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، کیا کرتے ہیں اور کون کون سے سچے اور کھرے محسن تھے۔ ان میں علماء کرام، لکھنوی حضرات، صحافی، تاجر، سیاستدان وغیرہ شامل ہیں۔ مثلاً ایڈمی صاحب، رمضان چھپیا صاحب وغیرہ جیسے لوگ جن کے بارے میں مکمل جان کاری کی ضرورت ہے اور ساتھ میں ادارہ اور دوستوں سے اہل ہے کتابوں کے بارے میں تبصرہ ہو مجھے کون سی کتاب پڑھنی چاہیے، کون سی نہیں اور ساتھ آپ دوستوں سے اہل ہے اپنے ہر خط میں ایک کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ روسو کا اعتراف پڑھنی ہے کہاں سے ملے گی کون سے پبلشر ہیں (ان میں سے بہت سوں پر تحریر آپکی ہے پرانے شمارے دیکھ لیں)۔“

☆ محمد فیاض احمد قادری مظفر آباد آزاد کشمیر سے لکھتے ہیں۔ ”میں ماہنامہ سرگزشت کا قدیم قاری ہوں۔ بہت علمی اور بہترین شمارہ ہے۔ ہمارے ادبی ذوق کی تسکین کا اس سے بہتر اور کوئی حل نہیں کہ سرگزشت کو پڑھنا نہ بھولیں۔ مجھے تقریباً 8 سال ہو گئے ہیں۔ میں سرگزشت جا سوسی، پاکیزہ اور سسٹمز پڑھتا ہوں۔ اس سے قبل کبھی بذریعہ مکتوب حاضری نہیں دی اس بار قلب کی گہرائیوں کے ساتھ دعائیں اور نیک خواہشات لے کر حاضر ہوا ہوں اپنی محفل میں جگہ عنایت فرمائیں اگر شمارہ میں شاعری کے عنوانات سے کوئی ایسا سلسلہ جاری ہو جائے کہ نئے شاعروں کی شاعری کی رہنمائی اور نوک پلک سنواری جائے تو بہت خوب رہے گا۔ آج کل شاعر تو بہت ہیں مگر قابل شعراء نہیں ملتے مجھے اُمید ہے آپ میری اس گزارش پر نظر ثانی فرمائیں گے۔“ (”شاعری“ سرگزشت نہیں ہے)۔“

☆ محمد سلیم قیصر کا خط ملتان سے۔ ”ارض پاک کے پیارے بانیوں، ٹیم سرگزشت، سلیز پر سن، رائٹرز اور قارئین کرام کو ایڈوانس عید الفطر مبارک ہو۔ ماہ صیام کے بقیہ چند مبارک ساعتوں میں اہل پاکستان، اپنے پیاروں اور راقم کے لیے خصوصی دعاؤں کا اہتمام فرمائیں۔ پیارے واجب القدر معراج اہل ایک معمولی سا شکوہ بہت معذرت کے ساتھ۔ میری تحریروں سے اکثر و بیشتر لفظوں کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ میری کوشش تو ہوتی ہے کہ غیر معیاری لفظوں سے اجتناب کروں تاہم میں بلند و بالا دیواروں کے آنگن میں موجود فولادی بچروں میں مقید پھر بھلا میری سوچ کی وسعت اور لفظوں کا احتیاج اس پائے کا نہیں ہو سکتا جو آزاہ۔ زندگی بسر کرنے والا انسان رکھتا ہے۔ شمارہ سنی اہتمام سے آغاز تک جا پہنچا ہے۔ تحریر میں تاخیر کا تحمل نہیں ہو سکتا چاند نظر آئے گا تو تبصرہ بھی ڈالیں گے۔ سلسلہ بیت بازی سیت سب بہت خوب رہے۔ سدا بانو ناگوری آپ کا بہت مشکور ہوں اسی طرح سب سے دعاؤں کی اہل ہے۔ جناب محمد اشفاق، سلیم رشید، انجم فاروقی ساحلی، خالد محمود، محمد ظہیر، رانا محمد شاہد، ناصر حسین رند، ملک جاوید خان سرکانی، عبد الجبار رومی انصاری، صوبی شاہ، محمد احمد رضا انصاری، محترمہ فرزانہ کھٹ، اعجاز حسین شمار، بی بی فردوس احمد، سعید احمد چاند، اولیس شیخ اور محمد عباس کے تبصرہ بھی آپ کی طرح اچھے تھے۔ انور عباس شاہ صاحب لیٹ ہو گئے کیوں؟“

☆ طاہرہ گلزاری کی آمد پشاور سے۔ ”اس بار تو اہل نے کیا خوب لکھا ہے اور ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہمیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا بن گئے ہیں۔ کیا واقعی ہم اشرف الملوقات ہیں؟ اس بار یک جہتی میں معذرت میں اتنی بڑی اور مشہور شخصیت خدیجہ مستور کو لے کر آئے اور ہمیں ان کے بارے میں مختصر لیکن جامع پڑھنے کو ملا۔ اب چلتے ہیں ”عہد خیال“ جہاں کے دربار کے باہر نوکری یعنی بلیک لسٹ میں بھی میری جگہ نہیں تھی خیر خط لیٹ پہنچا ہوگا۔ دروازے پر بھائی اعجاز حسین شمار ملے، سلام دعا ہوئی میں نے مبارک باد دی کہ ہمیشہ کی طرح بہت ہی شاندار تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ ساتھ میں ہم جیسے مسلمانوں کو حج مسجد کے بارے میں بھی بتایا جو ابھی تک وہاں نہ جاسکے اللہ آپ کو اجر دے۔ محمد خواجہ نے مختصر لیکن کافی حد تک جامع تبصرہ کیا ہے۔ طاہر نقاش پہلی بار حاضر لیکن بہت شاندار انداز میں انٹری۔ بشری افضل بھی مختصر تبصرہ لے کر حاضر تھی میں تو آپ کو ہمیشہ یاد رکھتی ہوں۔ سدرہ بانو بھی اپنا لاجواب تبصرہ لے کر حاضر تھی۔ سدرہ ڈیٹر میں نے یہ عورت والی بات مردوں کو طوطا سے کہا ہے جس کے پاس تھوڑی بچھ ہوگی وہ اس جملے کی کاٹ کو سمجھ سکتے ہیں۔ کیا آپ کسی اور معاشرے میں رہ رہی ہو، کیا آپ کو اپنے ارد گرد نظر نہیں آتا کہ عورت کو کیسے کیسے ذلیل کیا جاتا ہے۔ کیوتو آنکھ بند کر کے بھٹتا ہے کہ وہ بلی کو نظر نہیں آ رہا۔ فہیم احمد عباسی بھی آخر آگئے ہماری محفل میں پہلی بار اور اتنا اچھا تبصرہ۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ اب آتے جاتے رہنا۔“

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

اکبر علی رند، حب بلوچستان، معصومہ عنایت، کونینہ، افسر علی شیخ، چنیوٹ۔ رابعہ مظہر، فصیح الدین، عارث علی، کراچی۔ انم شیراز، لاہور

قصیدہ گو

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ باپ کی شفقت و ماں کی ممتا سے محروم تھا۔ فاقہ کشی میں بچپن گزرا مگر جب جوانی کی سرحد پر پہنچا تو زندگی سنوارنے کی ایک نئی راہ سُجھائی دی۔ اس نے اشعار کے ساز پر خیالات کے سوز کو روشن کیا اور کاخِ امرا کی جانب بڑھا کہ اسے خبر تھی، تقدیر کے پابند نباتات و جمادات تو ہو سکتے ہیں، انسان نہیں اور یہی نکتہ اس کے لیے سود مند ٹھہرا کیونکہ آدمی کے حق میں کیمیا بے دل کی بیداری اور اس کے لیے ضروری ہے دلِ خوبیدہ پر ضرب کاری۔ یوں بھی دلِ خاکس میں جب یقین پیدا ہوتا ہے تو مستقبل تعمیر ہوتا ہے۔ یہی قوت صورتِ گرِ تقدیر بنتی ہے۔ اس لیے وہ قلندرانہ ادائیں اور سکندرانہ جلال کے ساتھ جنگاہِ زندگی میں تیغ بے نیام بن گیا۔ اس کی یہی ادا شہرت کا اوج بنی اور اسے فاقہ کشی کے چنگل سے چھڑا کر عیشِ کوش بنا گئی۔ وہ بادشاہان کے لیے رطب اللسان بن گیا۔ ایسے ایسے قصیدے کہے کہ چیونٹی کو بھی خود پر ہاتھی کا گمان ہونے لگا۔ اس کے اشعار خطہٴ عرب میں سند قرار پاتے لیکن بھہات، ایک معمولی سے شخص نے اس کی گردن ریت دی اور کئی دن تک اس کی لاش بے گورو کفن پڑی رہی۔

ایک بدقسمت ماہر زبان و بیان کا زندگی نامہ

اس لیے اس نے رعایت دے دی تھی کہ وہ جو کتاب چاہے پڑھ سکتا ہے لیکن بیٹے کرالبتہ اسے یہ تعجب ضرور ہوتا تھا کہ وہ ایسی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتا ہے جنہیں نہایت مشکل سمجھا جاتا ہے۔

وہ لڑکا حسبِ معمول ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا تھا کہ ایک شخص دکان میں داخل ہوا۔ ابو خالد کتابوں کی جھاڑ پونچھ میں مشغول تھا اس لیے وہ شخص براہِ راست اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔

”میں ایک کتاب بیچنے کے لیے آیا ہوں۔ کیا تم اسے خریدو گے۔“ اس شخص نے کہا جو اس لڑکے کو ہی دکاندار سمجھتا تھا۔

”یہ کتاب اس قابل ہے بھی کہ کوئی اسے خرید سکے۔“

”یہ ابو عبیدہ کی لغت ہے۔ تمیں ورق پر مشتمل ہے لیکن بے بڑی جامع۔ اگر تم اس کی قدر و قیمت کو سمجھ سکتے ہو تو لو یہ دیکھ لو۔“ اس نے کتاب اس لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

سورج نے منہ دکھا دیا تھا۔ بازاروں میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ابو خالد کتب فروش نے بھی اپنی دکان کھول ضرور لی تھی لیکن اس کے مخصوص گاہکوں نے ابھی اس طرف کارخ نہیں کیا تھا صرف وہ لڑکا ایک گوشے میں آکر بیٹھ گیا تھا جو تقریباً روز ہی آتا تھا اور یہاں بیٹھ کر کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کی کم عمری اور شوقِ مطالعہ کو دیکھتے ہوئے ابو خالد نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ کتاب خریدے بغیر وہ اس کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس لڑکے کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن شوق کا یہ عالم تھا کہ دکان کھلنے سے پہلے ہی دکان کے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا اور جیسے ہی ابو خالد دکان پر آتا وہ کچھ دیر ابو خالد کی مدد کرتا اور پھر کوئی کتاب لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہیں رہتا کہ کون دکان پر آیا اور کب چلا گیا۔ ابو خالد اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک غریب گھر کا لڑکا ہے۔ اتنا غریب کہ اپنی جیب سے کوئی کتاب نہیں خرید سکتا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|------------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔



سوسائٹ

سوسائٹ

**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

”مجھے تمہارے حالات سن کر افسوس بھی ہو رہا ہے اور مزید جاننے کی خواہش بھی پیدا ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔“

”میں باپ کی جانب سے جھٹی ہوں اور ماں کی جانب سے ہمدانی۔ یہ دونوں خاندان یمنی ہیں لہذا میں یمنی ہوں۔ عربی نژاد ہوں۔ میرا قبیلہ یمنانی ہے جو کوفہ کے محلہ کندہ میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ میری پیدائش اسی محلے میں ہوئی ہے۔ اسی لیے بعض لوگ مجھے الکندی کہتے ہیں جو میرا قبیلہ نہیں محلہ ہے۔“

”تیری عمر اس وقت کتنی ہوگی؟“

”میری پیدائش 302ھ میں ہوئی اور اب 313ھ ہے۔ اے شخص تو خود حساب لگا لے۔“

”اتنی سی عمر میں تم نے کیا تعلیم حاصل کی ہوگی جب کہ تمہارے گھر میں غربت بھی ہے۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ میں نے بعض مدارس میں لکھنا پڑھنا سیکھا اور علوم صرف و نحو علوم و لغت و ادب اور علوم دین و غیرہ کی تعلیم ضرور حاصل کی ہے لیکن یہ برائے نام ہے۔ میرے عزائم اس سے کہیں زیادہ ہیں۔“

”لڑکے تم سب کچھ کر سکتے ہو اگر تمہاری مالی حالت درست ہو۔“

”یہ تو کبھی درست نہیں ہو سکتی۔“

”کیوں نہیں ہو سکتی۔ تم بڑے ہو کر کسی دربار سے وابستہ ہو جانا۔ پھر تمہارے پاس دولت ہی دولت ہوگی۔“

اس آدمی نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد دکاندار اس کے قریب آیا۔

”احمد تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مفلس بھی کر دیا۔ تم نے تو میری دکان کی ساری کتابیں زبانی یاد کر لی ہوں گی۔ خبردار ان کتابوں کی نقلیں تیار کر کے فروخت مت کر دینا۔“

دکاندار اسے خود ترکیب سکھا رہا تھا اس کا ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ وہ غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ کسی بڑے سردار یا دربار تک اس کی رسائی کیسے ہوگی۔

وہ دکان سے اٹھا تو دو پہر ڈھل رہی تھی۔ چلتے چلتے کچھ پیاس بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے بازار میں ایک تریوز دیکھا۔ اس نے دکاندار سے اس کی قیمت پوچھی۔ دکاندار نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا۔

”جاؤ جاؤ یہ تمہارے کھانے کی چیز نہیں ہے۔ یہ مہنگا

اس لڑکے نے کتاب لے لی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ جب زیادہ دیر ہو گئی اور بیچنے والا تنگ آ گیا تو اس شخص نے لڑکے کو ٹوکا۔

”میاں صاحبزادے! یہ ایک دن میں تو یاد ہونے سے رہی۔ خریدنا ہے تو خریدو ورنہ واپس کرو۔“

”اگر میں کتاب یاد کر چکا ہوں تو کیا انعام ملے گا۔“

لڑکے نے کہا۔

اتنی دیر میں دکان کا مالک ابو خالد بھی قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بھی اس لڑکے کا ساتھ دیا۔

”یا شیخ! معاملہ طے کر لو اگر اس نے کتاب یاد کر لی ہو گی تو کیا انعام دو گے۔“

”اگر اس نے کتاب یاد کر لی ہوگی تو کتاب مفت دے دوں گا۔“

معاملہ طے ہو گیا۔ کتاب فروش نے کتاب اس لڑکے کے ہاتھ سے لے لی اور لڑکے نے بغیر دیکھے کتاب سنانا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اس نے پوری کتاب سنا ڈالی۔ کتاب فروش کا منہ مارے حیرت کے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کتاب میں جو کچھ تھا وہ سب یاد کر چکا تھا۔

”لڑکے! تم جادوگر ہو یا تمہارا حافظہ واقعی اتنا تیز ہے۔ میں نے تم جیسا باکمال آج تک نہیں دیکھا۔ تم تو علم کے میدان میں زبردست ترقی کرو گے۔ میں ہمیشہ ناز کیا کروں گا کہ میں نے تمہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ تمہاری عمر کے بچے تو ایسی کتابوں کو پڑھنے سے بھی قاصر ہوتے ہیں اور تم نے اسے زبانی یاد کر لیا۔ تم تو خطرناک ہو۔ میں تمہارے بارے میں کچھ جانتا چاہوں گا۔“

”میرا نام احمد بن حسین ہے۔ تم مجھے ابن عیدان بھی کہہ سکتے ہو کیونکہ میرا باپ عیدان کے نام سے مشہور تھا۔“

احمد بن حسین نے جان بوجھ کر باپ کا نام صرف عیدان بتایا حالانکہ وہ اپنے بیٹے کے اعتبار سے ”عیدان اللہ“ کے نام سے مشہور تھا۔ احمد بن حسین کو غالباً یہ کہتے ہوئے شرم آئی تھی کہ اس کا باپ ایک معمولی غریب تھا۔

”تمہارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”نہ صرف یہ کہ میرا باپ نہیں ہے بلکہ میں تو ماں کی آغوش سے بھی محروم ہو چکا ہوں۔ میری نانی نے مجھے پالا ہے۔ میں اسی کو ماں کہتا ہوں۔“

پہلے تم نہیں کھا سکتے۔“

”کیوں نہیں کھا سکتا۔ میرے پاس پانچ درہم ہیں وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔“

”نہیں یہ کم ہیں۔“

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک مالدار آدمی آیا۔
دکاندار نے اسے وہ تریبوز دو درہم میں دے دیا۔ اب احمد
بن حسین خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔
”تو نے مجھ کو پانچ درہم میں نہیں دیا اسے دو درہم
میں کیسے دے دیا۔“

”خاموش! تمہارا اس کا کیا مقابلہ۔ تم صرف پانچ
درہم رکھتے ہو وہ ایک لاکھ دینار کا مالک ہے۔“

احمد بن حسین کو اپنی غربت کا شدت سے احساس
ہوا۔ اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی اس وقت تک کوئی عزت
نہیں ہوتی جب تک کوئی ایک لاکھ دینار کا مالک نہ ہو۔

وہ دولت مند بننے کے خواب دیکھتا ہوا گھر تک پہنچ
گیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ تانی سے پوچھے دولت مند کس
طرح بنا جاتا ہے پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اگر تانی کو معلوم
ہوتا تو وہ خود دولت مند نہ بن گئی ہوتیں۔ اس کے کانوں میں
وہ الفاظ گونجنے لگے جو کتاب بیچنے والے شخص نے اسے کہے
تھے۔ اس نے کہا تھا کہ بڑے ہو کر کسی دربار سے وابستہ ہو
جانا پھر تمہارے پاس دولت ہی دولت ہوگی۔ تو کیا بڑے
ہونے تک میں مفلس ہی رہوں گا؟ جیسے جیسے وہ سوچ رہا تھا
اس کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کے
پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے لیکن اس وقت کوئی ترکیب سمجھ میں
نہیں آ رہی تھی۔

وہ کئی دن تک انہی خیالوں میں گم پھرتا رہا۔ کئی دن
ہو گئے تھے وہ کتب فروش کی دکان پر بھی نہیں گیا تھا۔ پھر
ایک دن شاید قدرت نے اس کی رہنمائی کی۔ اس کے جی
میں آئی کہ مطالعہ ہی اس کو کسی بڑے مرتبے تک پہنچائے گا۔
وہ صبح ہوتے ہی کتب فروش کی دکان پر پہنچ گیا۔

”کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں تمہارا کب سے
انتظار کر رہا تھا۔ ایک نایاب کتاب آئی ہوئی ہے، میں چاہتا
ہو وہ تم پڑھ لو۔ کوئی خرید لے گیا تو تم اس سے محروم ہو جاؤ
گے۔“ دکاندار نے ایک کتاب اس کی طرف بڑھاتے
ہوئے کہا۔

اس نے وہ کتاب لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر
دیکھنے لگا۔ یہ ایک ایسی کتاب تھی جس میں دور جاہلیت کے

شعرا کے حالات اور نمونہ کلام درج تھا۔

اس کتاب کو پڑھنے بیٹھا تو اسے معلوم ہوا کہ شعرا نے
جاہلیت میں زہیر بن ابی سلمیٰ پہلا شخص تھا جس نے پہلے پہل
اپنے قبیلے کے سردار ہرم بن سنان کی تعریف میں قصیدہ کہہ کر
پیش کیا گویا پہلی مرتبہ شاعری کو حصول دولت کا ذریعہ بنایا
ورنہ اس سے پہلے شعراء اپنے محبوب کی شان میں قصیدے کہا
کرتے تھے یا اپنے حسب نسب کی شان میں زمین آسمان
ایک کیا کرتے تھے۔ شاعری دولت کمانے کا ذریعہ نہیں بنی
تھی۔ اس کے اور تابعدار ذبیانی نامی شاعر نے سلاطین اور
امراء کی مداحی میں قصائد لکھنا شروع کیے اور اس قدر مالدار
ہو گیا کہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھانے لگا۔ تابعدار
کے بعد ”اعشی“ نے شاعری کو پیشہ بنا لیا، وہ جا بجا لوگوں کی
مدح کرتا پھرتا اور انعام حاصل کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ یہ مرض
عام ہو گیا۔ شعراء اپنی شعر گوئی کی بدولت ممتاز عہدوں پر
فائز رہے۔

وہ اپنے دور کی قریب تر تاریخ میں بھی یہی سب کچھ دیکھ
رہا تھا یا یہ کیسے... کہ اس نے پہلی مرتبہ اس پہلو پر غور کیا تھا۔
دور جاہلیت میں جن شعراء نے قصیدہ گوئی اختیار کی
تھی انہوں نے دولت تو کمائی تھی لیکن عربوں میں ان کی
عزت جانی رہی تھی۔ احمد بن حسین کو اس سے کوئی غرض نہیں
تھی۔ وہ تو اس وقت صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ دولت کس طرح
کمائی جاتی ہے۔

یہ کتاب پڑھ کر اسے ایک نسخہ ہاتھ آ گیا۔ اسے شاعر بن
جانا چاہیے۔ حکمرانوں کے قصائد لکھ کر دولت کمائی جاسکتی ہے۔
اس نے اس کتاب میں شامل نمونہ کلام کا بغور مطالعہ
شروع کر دیا۔ اس نے ایک ایک قصیدے کو غور سے پڑھا۔ وہ
اس نتیجے پر پہنچا کہ قصیدہ نگاری کے لیے کثرت الفاظ کی
ضرورت پڑتی ہے۔ استعارہ و تمثیل کی لطافت اور طرز ادا کی
دلکشی ضروری ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اسے ان قصائد میں کچھ
خامیاں بھی نظر آئیں۔ پہلی تو یہی کہ یہ قصیدے حقائق نگاری
کے نمونے تھے ان میں تخیل کی بلند پروازی نہیں تھی۔ اس کا
خیال تھا کہ تخیل کی بلند پروازی سے کلام پُر شکوہ ہو جاتا ہے۔
قدیم شعراء نے عرب کے نزدیک حقائق نگاری شاعری کا ایک
اہم جزو تھا۔ تخیل کی بلند پروازی اور مبالغہ آرائی ان کے کلام
میں یا تو تھامی نہیں اور اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔

بات بات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک بات سیدھے
سادے طریقے سے کہی جائے تو ایک معمولی سی بات ہوگی

ابھی اسے حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اس میں کیا خامی رہ گئی ہے۔ یہ تو بعد میں آنے والوں نے بتایا کہ ان شعروں کے ایک ایک لفظ سے نو مشتقی ظاہر ہو رہی ہے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ اس نے تین شعر اور کہے جن میں کہا گیا تھا کہ سوز غم محبت میں کھل کھل کر بالکل لاغر ہو گیا ہے اور یہ حالت ہو گئی ہے کہ اگر وہ اپنے مخاطب سے باتیں نہ کرتا ہوتا تو مخاطب اس کو دیکھ بھی نہ سکتا۔

اس نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے تین شعر کہے۔ ان سے بھی نو مشتقی ظاہر ہو رہی تھی لیکن اتنی ترقی ضرور ہوئی تھی کہ دو شعر تو تکلفات سے لبریز تھے لیکن تیسرا شعر حسن ادا اور خوبی کے اعتبار سے بہترین شعر تھا۔ اس کی تنقیدی نگاہ خود بھی سمجھ رہی تھی کہ اس شعر میں فنی خوبی موجود ہے۔

اب اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ ان طباع شعرا میں سے ہے جو فطری طور پر موزونیت طبع رکھتا ہے۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے نظم کلام پر قدرت اور حسن ادا میں حدت حاصل ہوتی گئی۔

دنیا نے عرب میں یا تو قصیدے کہے جاتے تھے یا ہجو نگاری کا رواج تھا۔ کوئی شاعر کسی سے خوش ہوتا تو اس کا قصیدہ لکھتا۔ اس کی کوئی کمزوری ہاتھ آ جاتی تو اس کی ہجو کہتا۔ ابھی تک احمد بن حسین کا کوئی ممدوح نہیں تھا اور نہ ہی وہ ”مستبی“ کے لقب سے مشہور ہوا تھا لیکن زمانے کے رواج کے مطابق اس نے بچپن ہی میں ایک خیالی ”ہجو“ بھی کہی۔

اس نے چند اشعار میں ایسے دو آدمیوں کا مذاق اڑایا جو ایک چوہے کو موت کے گھاٹ اتار کر بڑی شان سے اپنی تمیں مار خانی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ احمد بن حسین (مستبی) غریب چوہے کی موت پر اظہارِ تاسف کرتا ہے اور اس کے دونوں قاتلوں کا مذاق اڑاتے ہوئے ان کی ہجو کرتا ہے۔

پہلے شعر میں اس نے تاسف کیا کہ آخر چوہا موت کے پنجے میں پھنس گیا۔ دوسرے شعر میں اس کے قاتلوں کو دو عرب سوراؤں کنانی اور عامری سے تشبیہ دے کر ان کا مذاق اڑایا جنہوں نے حقیر جانور کو قتل کیا۔ تیسرے شعر میں اس نے پوچھا تم نے اس چوہے کو قتل تو کر دیا، یہ بتاؤ کہ دونوں میں سے کس نے اس کے مال و متاع پر قبضہ کیا۔ چوتھے اور آخری شعر میں یہ ہجو اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس نے پوچھا، اچھا یہ تو بتاؤ تم دونوں میں سے اس کے پیچھے کون تھا اس لیے کہ اس کی ذم پر دانت کے نشانات ہیں۔

مگر اسی کو جدید انداز اور نئے اسلوب میں ادا کیا جائے تو شاعری بن جائے گی مثلاً اگر کوئی کہے کہ رات میں بہت غمگین تھا یہ محض خبر ہے لیکن کہا جائے کہ رات مجھ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تو یہ شاعری ہے۔ احمد بن حسین ان قصیدوں میں یہی خامی دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسا شاعر ضرور آئے گا جو ان خامیوں کو دور کرے گا۔ اس وقت وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ شخص وہ خود ہی ہو گا جو عربی شاعری کو اس مقام پر پہنچا دے گا کہ پھر اس میں ترقی کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہے گی۔

وہ اس کتاب میں نابغہ ذبیانی کے حالات پڑھ چکا تھا کہ وہ اسی شاعری کی بدولت سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے کے لائق ہو گیا تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی شاعری کا پیشہ اختیار کرے گا۔ وہ شاعر کیسے بنے؟ اس سوال کے جواب میں وہ مختلف کتابیں پڑھتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ شاعری ایک فطری چیز ہے اکتسابی نہیں یعنی جس طرح بڑھتی کا کام یا اس طرح دوسرے کام کیسے جاتے ہیں۔ شاعری کیسے نہیں جاسکتی۔ انسان کے صحیفہ قلب پر رنج و غم، خوشی و مسرت اور سوز و گداز وغیرہ کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، انہیں اگر کلام موزوں کی شکل میں ڈھال دیا جائے تو اسی کا نام شاعری ہے۔ شاعر کو شاعر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو محسوس کرتا ہے جو دوسرے نہیں کرتے۔ اس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ بہت سے ایسے معمولی واقعات ہوتے ہیں جو اسے دکھی کر دیتے ہیں جب کہ اس کی نانی پر ان باتوں کا اثر تک نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ہے میں دوسروں کے مقابلے میں بڑی شدت سے چیزوں کو محسوس کرتا ہوں۔

اب صرف یہ دیکھنا رہ گیا تھا کہ وہ موزوں طبع ہے یا نہیں۔ وہ ایک ایسے خیال کے تعاقب میں نکل گیا جسے وہ شعر کی شکل میں ڈھال سکے بالآخر ایک خیال اسے سوجھ گیا کہ وہ ایک شخص سے محبت کرتا ہے لیکن محبت ہوتے ہی زمانہ دونوں میں جدائی پیدا کر دیتا ہے۔ طویل انتظار کے بعد اس کو اپنے محبوب سے ملنے کا اتفاق ہوا مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے محبوب کی صحبتوں سے لطف اندوز ہو سکا زمانے نے اس کو پھر جدا کر دیا۔ خیال اچھا تھا اس نے ذہن پر زور ڈالا اور اس خیال کو نظم کر دیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس خیال کو اس نے دو شعروں میں بیان کر دیا تھا۔ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ یہ دیکھنے کی قدرت

اسی قسم کی طفلانہ شوخیاں اس کے دوسرے شعروں میں بھی نظر آئیں۔

وہ بچپن کے دور سے گزر کر جب سن بلوغ میں داخل ہوا تو وہ ایک قادر الکلام شاعر بن چکا تھا۔ اب اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ وہ جب اپنے اشعار کا موازنہ دوسرے شعرا سے کرتا تو ان سے بہت مختلف پاتا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اگر اسے کوئی قدر دان نصیب ہو جائے تو عیش و نشاط اس کا مقدر بن جائے۔ اس نے ادھر ادھر کوئی ایسا نام ڈھونڈا جس کی مدح میں وہ لب کشائی کر سکے لیکن کسی نام نے اسے اپنی طرف نہیں کھینچا آخر وہ چیخ اٹھا۔

”بے شک! میں نے بہت صبر کیا یہاں تک کہ اب صبر کی گنجائش نہیں رہی۔ اب میں جنگ میں گھستا ہوں اور اس سختی کے ساتھ کہ پھر جنگ کی ضرورت نہ رہے۔“

میں لڑائی کی شدت کی وجہ سے گھوڑوں کے چہروں کو لاغر اور متغیر کر ڈالوں گا۔ اس طرح لڑائی خوب جم جائے گی اور اپنے پیروں پر قائم ہو جائے گی۔

اور نیزہ بازی ان گھوڑوں کو آتش غضب میں ڈال دے گی اور ان کو ڈانٹنا ان میں ایسی تیزی پیدا کر دے گی گویا ان کو کسی قسم کا جنون ہے۔ ان گھوڑوں کو نیزوں نے اس طرح زخمی کر دیا ہوگا کہ ان کے منہ کھلے ہوں گے گویا ان کی لگام پر ایلو اچھڑک دیا گیا ہے۔

میں یہ سب کچھ ایک ایسے شخص کی مدد سے کروں گا جو قاطع تلوار کی طرح اپنا ارادہ پورا کرنے والا ہوگا۔ عنقریب میں اپنا حق نیزوں اور ایسے تجربہ کار مشائخ کی اعانت سے حاصل کروں گا جو ہمیشہ جنگی تیاریوں کی وجہ سے ڈھانٹا ہاندھے رہتے ہیں۔

اور میں اپنا حق ایسی نیزہ بازی سے حاصل کروں گا کہ اس کی حرارت کے مقابلے میں آگ بھی سرد ہے۔

جب میں چاہوں گا تو میرے گرد تیز رو گھوڑوں پر ایسے شہسوار جمع ہو جائیں گے جن کے منہ میں موت شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

اپنے اس ارادے کے اظہار کے ساتھ ہی وہ کسی بڑے میدان جنگ کی تلاش میں شمالی شام کی طرف ہجرت کر گیا۔

یہاں سے اس کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جو جوانی کا دور تھا، بچپن کا نہیں۔ اس دور میں داخل ہونے سے پہلے وہ شعر و شاعری میں کمال حاصل کر چکا تھا۔

چوتھی صدی ہجری جس میں احمد بن حسین سانس لے رہا تھا بڑا پر فتن اور طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ یہ وہ پُر آشوب دور تھا جس میں دن رات فتنے اٹھتے رہتے تھے۔ جمہور نے نبوت کے دعوے داروں کی غارتگریوں کی وجہ سے ملک تباہ ویراں ہوا تھا۔ اس پُر آشوب دور میں کوفہ ان شورشوں کا خاص طور پر آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اس انتشار اور طوائف الملوکی کے دور میں مختلف فرقے اپنے اپنے خیالات اور معتقدات کا زور و شور سے پرچار کر رہے تھے۔

وہ بڑا بہادر اور تیز رفتار تھا۔ وہ جنگ اور بیابانوں کے ان مقامات سے خوب واقف تھا جہاں چشمے اور تالاب تھے اور اہل عرب سفر کے دوران ٹھہرا کرتے تھے۔ وہ ایک منزل سے دوسری منزل تک چاروں کی مسافت ایک ہی روز میں طے کر لیتا تھا۔ وہ کہتا تھا زمین کے طبقات اس کے لیے لپیٹ دیے گئے ہیں۔ وہ عموماً پیدل سفر کیا کرتا تھا۔

اس نے ایک قصیدے میں اپنی پاپیادہ صحرا نوردی کا ان الفاظ میں ذکر کیا تھا۔

”بہت سے ایسے میدان ہیں جن کو میں نے پاپیادہ قطع کیا ہے جنہیں مضبوط اور مشاق اونٹنیاں بھی طے نہیں کر سکتیں۔“

وہ شمالی شام کے سفر پر بھی پاپیادہ روانہ ہوا۔ اس سفر میں بعض ایسے بدوی قبائل سے اس کا گزر ہوا جو اپنے فرماں رواؤں سے سخت بیزار تھے۔ اس کے سر میں تو پہلے ہی سے امارت و سیادت کا سودا سما یا ہوا تھا۔ اسے موقع مل گیا وہ دیکھ رہا تھا کہ جگہ جگہ نبوت کے دعویدار پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ بھی کسی ایسے ہی دعوے پر غور کرنے لگا۔ اس نے ان بدوی قبائل کو اپنی جادو بیانی سے مسحور کرنے کی کوشش کی اس نے ان کے سامنے ایسے اشعار پڑھے جن میں اس نے کبھی خود کو حضرت مسیح سے تشبیہ دی، کہیں حضرت صالح سے، کبھی ان مسلمانوں کو جن میں وہ رہتا سہتا تھا یہود کہا اور کہیں ان کی ”شمود“ سے تشبیہ دی۔

سرزمین نخلہ میں میرا قیام ویسا ہی معاندانہ ہے جیسے حضرت مسیح کا قیام، یہود کے درمیان تھا۔

اگر میں خود پسندی اور غرور کروں تو یہ اس شخص کے جیسا غرور ہوگا جو اپنے سے زیادہ کسی کو نہ پائے۔

میں بخشش کا ساتھی اور ہجولی ہوں۔ اشعار و قوافی کا آقا، دشمنوں کے لیے زہر قاتل اور حاسدوں کو غیظ و غضب

بغاوت کرنا چاہی اور دعویٰ نبوت کیا۔ ان لوگوں نے نبوت مانگا اور کہا، دیکھو یہ اونٹنی مستی میں گر مائی ہوئی ہے اس لیے کسی کو اپنی پیٹھ پر نہیں بیٹھنے دیتی تم اگر اس پر سوار ہو جاؤ تو ہم مان لیں گے کہ تم خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہو۔ وہ کچھ تدبیر کر کے اس پر سوار ہو گیا۔ اونٹنی نے شروع میں سرکشی کی مگر تھوڑی دیر میں رام ہو گئی۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے اور انہوں نے اس کا دعویٰ مان لیا۔

جب اس کی دعوت عام ہونے لگی تو اس کی بغاوت کی خبر حاکم وقت کو ہو گئی۔ امیر حمص نے جو اشیدی حکومت کی طرف سے وہاں کا گورنر تھا اس کی اس جسارت پر اسے گرفتار کر لیا اور قید میں ڈال دیا۔

اس کے بعض شارحین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا ہاں اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا۔ بعض نے لکھا کہ اس نے بغاوت پر لوگوں کو آمادہ کیا تھا لہذا گرفتار کر لیا گیا۔ بعض نے لاطمی ظاہر کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا کہ اس نے ایک لغو اور بے ہودہ دعویٰ کیا جس کی خبر حاکم کو ہو گئی اور گرفتار کر لیا گیا۔

یہ بے ہودہ دعویٰ کیا ہو سکتا ہے۔ یقیناً دعویٰ نبوت۔ بات یہ ہے کہ اس کے شارحین نے اس الزام سے اسے بچانے کے لیے بھی ”بغاوت“ کا لفظ استعمال کیا کبھی محض ”بے ہودہ دعویٰ“ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ قید ہو جانے کے بعد خود اس نے بھی دعوے سے انکار کیا اور اسے حاسدوں کی کارستانی قرار دیا اس نے قید میں رہتے ہوئے چند اشعار امیر حمص کے پاس بھیجے اور اس واقعے سے انکار کیا۔

میرے بارے میں کہا گیا کہ میں نے دنیا کو گمراہ کر کے اس پر ظلم کیا حالانکہ میں تو ابھی نومولود ہوں۔ ابھی اچھی طرح بیٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔

تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو لوگوں کی جھوٹی باتیں مان لیتا ہے حالانکہ گواہی پر گواہ کے مرتبے کے اعتبار سے غور کیا جاتا ہے۔

تو کینہ پرور دشمنوں کی باتیں مت سن اور جھوٹے یہودیوں کی باتوں کا اعتبار مت کر۔

ادھر تو وہ اشعار لکھ لکھ کر امیر حمص کی توجہ اپنی بے گناہی کی طرف مبذول کر رہا تھا دوسری جانب اس کے دعوے کی بدولت اسے جہنمی کہا جا رہا تھا۔ یعنی یہ کہا جا رہا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ پھر یہ لقب اس

میں ڈالنے والا ہوں۔ میں ایک ایسی امت میں ہوں جو میری قدر نہیں جانتی۔ خدا اس کی اصلاح کرے۔ میں ان میں ایسا اجنبی ہوں جیسے حضرت صالح قوم ثمود میں تھے۔

اپنی جا دو بیانی سے اس نے بعض قبائل کو اپنے قابو میں کر لیا اور بہت سے قبائل اس کے ہاتھ پر بیعت کر بیٹھے۔ وہ ایک مقام لاذقیہ میں تھا تو ایک شخص عبداللہ بن معاذ نے اس کی تعریف کی۔

”تم کس لیے بھیجے گئے ہو۔“
”میں دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح مالا مال کروں گا جس طرح اب وہ جو رستم سے لبریز ہے۔“
”یہ کس طرح ہوگا۔ میرا مطلب ہے تم یہ کس طرح کرو گے۔“

”ان لوگوں کو رزق و ثواب عاجل سے فیض یاب کروں گا جو میری اطاعت کریں گے اور ان لوگوں کی گردنیں اڑا دوں گا جو میری اطاعت سے سرکشی کریں گے۔“

وہ شخص (عبداللہ بن معاذ) پہلے تو یہ سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب اس نے دیکھا کہ معاملہ سنجیدہ ہے تو عبداللہ بن معاذ نے اسے ملامت کی اور اس کے ان خیالات کے نتائج سے اسے خبردار کیا۔ احمد بن حسین نے جواب خود کو ابوالطیب کہلوانے لگا تھا شرمندہ ہونے کی بجائے برجستہ یہ اشعار پڑھ دیے۔

”اے عبداللہ معاذ! جنگ میں میرا مرتبہ تجھ سے پوشیدہ ہے۔“

میں نے اپنے عظیم الشان مقاصد کا ذکر کیا ہے۔ بے شک ہم اس کے حصول کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈال دیں گے۔

کیا مجھ جیسے شخص کو مصائب زمانہ گھبرا سکتے ہیں اور کیا مجھ جیسا آدمی موت سے ڈر سکتا ہے۔

اگر زمانہ میرے سامنے مجسم ہو کر ظاہر ہو تو میری تلوار اس کی مانگ کے بال کو اس کے خون سے ضرور رنگ دے گی۔

زمانہ میرے معاملے میں اپنی مراد کو نہیں پہنچا۔ نہ وہ اس طرح چلا کہ میری لگام اس کے ہاتھ میں ہو یعنی نہ وہ مجھے ذلیل کر سکا نہ اپنا تاج بدار بنا سکا۔

جب وہ بنی عدی میں تھا تو اس نے حکومت کے خلاف

کے ساتھ ایسا پھوست ہوا کہ تاریخ میں وہ اسی لقب سے مشہور ہو گیا۔ آج اسے کوئی احمد بن حسین یا ابوالطیب کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ ”مختبی“ کے نام سے سب جانتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو مختبی کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ مختبی کے کیا معنی ہیں تو وہ کہا کرتا کہ یہ لفظ ”نبوہ“ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ”بلند ٹیلہ۔“

وہ یہ بھی کہا کرتا تھا جو لوگ مجھ سے جلتے ہیں انہوں نے میرا نام مختبی رکھ دیا ہے۔ میں ان کو ایسا کرنے سے کیونکر باز رکھ سکتا ہوں۔

وہ مسلسل جیل کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ یہ معمولی سختیاں نہیں تھیں۔ وہ اخلاقی مجرم تھا۔ لوگوں نے امیر حمص کے کان ایسے بھر دیے تھے کہ وہ اس کی طرف سے آنے والی ہر معذرت کو ٹھکراتا رہا۔ ان اشعار نے اس پر مختبی کے شاعرانہ جوہر ظاہر کر دیے تھے۔ ایسے صنائع بدائع، ایسی صنعت گری، ایسی معنویت، ایسی بلاغت اس نے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس کا قائل بھی ہوتا جا رہا تھا لیکن ایسے جادو بیان شاعر کو آزاد کر دینا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔

جیل کی سختیوں نے اسے قریب الموت کر دیا تھا۔ وہ نہایت بہادر اور خوددار تھا لیکن ”بھوک شیروں کو بھی مردار خور بنا دیتی ہے“ مختبی نے اپنی حالت زار کی نہایت درد انگیز تصویر کشی کی اور اپنی غلطی کی معافی طلب کرتے ہوئے چند اشعار امیر کی خدمت میں روانہ کر دیے۔

لائق امیر میری مدد کر، کسی اور وجہ سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ میں ایک پر دہی مسافر ہوں۔

یا اس مہربان ماں (نانی) کی وجہ سے مجھ پر رحم کر جب وہ مجھ کو یاد کرتی ہے تو اس کے دل کا خون آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا ہے۔

اگر تیری ملاقات سے قبل میں نے کوئی خطا کی تھی تو اب تیرے ہاتھوں پر توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دے۔

وہ گھر سے اس امید پر شمالی شام کی طرف آیا تھا کہ کوئی نامور سردار اس کا مربی بنے گا۔ اس کے اشعار کو موتیوں میں تولے گا۔ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھائے گا، عیش و نشاط کی زندگی بسر کرے گا۔ یہ فارغ البالی اس کی شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دے گی لیکن دو سال ہو گئے تھے وہ قید خانے کی خاک چاٹ رہا تھا۔ اس کی

شاعری معذرت اور معافی کی نذر رہ رہی تھی۔ اس کا ہر قصیدہ اب تک ضائع چلا گیا تھا۔ امیر حمص کسی طرح اس کی رہائی پر تیار نہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ایک زوردار قصیدہ امیر کی خدمت میں روانہ کیا۔

”تو مجھ پر حد شرعی جاری کرنے میں جلدی کر رہا ہے اس لیے کہ میں ابھی ناپاک ہوں۔ مجھ پر تو ابھی سجدہ بھی فرض نہیں ہوا۔“

تیری بخششوں میں میری ذات کو بخشا اور آزاد کرنا بھی ہے اگرچہ میں قوم شموذ کا بدترین انسان کیوں نہ ہوں۔ اس نے اس قصیدے میں یہ اقرار کر لیا کہ اس نے دعوے کا ارادہ ضرور کیا تھا لیکن نبوت کا دعویٰ کیا نہیں تھا۔ اس اقرار کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میں نے کیسا ہی تصور کیا ہو اب میں تیری چشم کریم کا امیدوار ہوں۔ تو مجھے معاف کر دے۔

اس کھلی معافی پر امیر حمص کو مختبی کی حالت زار پر رحم آ گیا۔ اس نے علمائے دین اور اکاہر سلطنت کو طلب کیا۔ ان کے سامنے مختبی کا قصیدہ رکھا۔ ان سب نے مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور معافی کا طلب گار ہے تو اسے ایک موقع دینا چاہیے۔

امیر حمص نے اس کی توبہ قبول کی اور اس کی قید سے رہائی کے احکام دے دیے۔ مختبی جو اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اپنی رہائی کی خبر سنی تو خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اس نے امیر حمص جعفر بن یخلف کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔

اس قصیدے سے اسے یہ امید تھی کہ امیر کے دل میں اس کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی اور شاید وہ اسے اپنی ملازمت میں رکھ لے لیکن امیر نے صرف اس کی توبہ قبول کر لینے پر اکتفا کیا اور اسے قید سے رہا کر دیا۔

وہ قید سے رہا ضرور ہو گیا تھا لیکن سخت مایوس تھا۔ ”دنیا نے مجھ کو پیاسا بنا دیا۔ جب میں اس کے پاس سیرابی حاصل کرنے گیا تو اس نے مجھ پر بجائے پانی، مصائب برسادیے۔“

وہ مصائب کی دھوپ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ وہ عجیب دورا ہے پر کھڑا تھا۔

بچھلی زندگی میں اپنی دلی آرزوؤں سے دوچار ہوا تھا اور اب مایوسی و ناامیدی کا شکار تھا۔ یہ بڑا انقلاب تھا۔ وہ مایوسی کے لفظ سے واقف نہیں تھا لیکن اب تھا۔ اس کی عمر

بیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ابھی اس کی پوری زندگی اس کے سامنے تھی اور وہ مایوس تھا۔ پہلے اس کی انگلیں اس کو بڑے بڑے کارناموں کی طرف مائل کر رہی تھیں مگر اب وہ راحت و عافیت کی تلاش میں تھا جس کی اُمید بہت کم تھی۔ وہ اپنے ماضی پر شرمندہ تھا۔ حاضر پر تنگ دل اور اپنے تاریک مستقبل سے حد درجہ مایوس۔ وہ بے گھر بے در اور ایک بے یار و مددگار مسافر تھا۔

وہ بڑی بے دلی کے ساتھ حمص سے حلب کی طرف روانہ ہو گیا۔ معمول کے مطابق اس کے پاؤں ہی اس کی تیز رفتار اونٹنی بنے ہوئے تھے۔ جب وہ ایک مقام فراولیس سے گزرا تو اس نے شیر کی دھاڑ سنی۔ اس نے اپنے کوف کو اشعار کی شکل میں ڈھال دیا۔

”اے فراولیس کے شیرو! کیا تمہارا پڑوسی معزز ہے تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے یا وہ ذلیل ہے اور دشمنوں کے سپرد کیا ہوا ہے۔“

میرے آگے اور پیچھے بہت سے دشمن ہیں۔ مجھے چوروں کا ڈر ہے تیرا ڈر ہے اور دشمنوں کا ڈر ہے۔ کیا تم میرا حلیف بنا پسند کرو گے اس چیز میں جس کا ارادہ رکھتا ہوں اس لیے کہ میں روزی کے ذرائع سے خوب واقف ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو رزق ہر طرف سے تمہارے پاس آئے گا اور تم دولت مند ہو جاؤ گے۔ اس مال سے جو تم لوٹو گے اور میں لوٹوں گا۔

خونخوار شیروں، رہزنیوں اور لٹیروں سے بچتا بچاتا، جنگلوں اور بیابانوں سے گزرتا ہوا حمص سے حلب پہنچ گیا۔ اس کی بد قسمتی تھی کہ حلب میں ان دنوں انتشار کی کیفیت تھی۔ دولت عباسیہ اور دولت رشید یہ دونوں وہاں اپنا قبضہ جمانے پر تلے ہوئے تھے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ کسی قابل ذکر مہربانی کا ملنا دشوار تھا بلکہ اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

وہ حلب سے نکلا اور اٹھتا کیے روانہ ہو گیا۔ یہاں اسے کوئی عظیم الشان ممدوح تو میسر نہ آسکا لیکن روزی کا سامان ہو گیا۔ وہاں کے امراء و اشراف کی مدح سرائی کر کے پیٹ پالنے لگا۔ ان کی شان میں قصائد کہے اور ان سے انعامات حاصل کیے لیکن برائے نام۔ بہت کم لوگوں نے اس کو خاطر خواہ صلہ اور انعام سے نوازا۔ بعض لوگوں نے اس کے اشعار بے حد پسند کرنے کے باوجود چند درہم سے زیادہ انعام و اکرام کا مستحق نہیں سمجھا۔

اس نے ایک ممدوح کی شان میں قصیدہ لکھا تو عجیب

لیفہ سامنے آیا۔ اس نے انعام میں منتہی کو صرف دس درہم دیے۔ جب اس سے کہا گیا کہ منتہی کے اشعار بہت اچھے ہیں تو اس نے کہا مجھے معلوم نہیں اچھے ہیں یا برے، اچھا میں درہم سمی۔

ایک ممدوح نے تو اپنے مدحیہ قصیدے پر اسے صرف ایک دینار انعام دیا۔ اس نے جل کر اس ممدوح کا نام ہی دینار یہ رکھ دیا۔

اس ناقدری کے بازار میں اسے اپنے ایک قصیدے میں یہ شعر شامل کرنا پڑا۔

”ناقدری کے بازار میں اشعار بیچ کر کب تک میں اپنے کو بلند مراتب کے حصول سے باز رکھوں گا۔“

بعض نے اسے انعام و اکرام سے نوازا ابھی، منتہی نے ایسے ممدوحین کی تعریف بھی دل کھول کر کی مثلاً حسین بن علی المدانی کی تعریف میں کہتا ہے۔

”میں نے اس سے پہلے اس کے والد کی تعریف کی تھی جس کے دیدار سے لوگوں کی پیار آنکھوں کو شفا بخشی جاتی ہے۔ اس نے میرے ہاتھوں کو افلاس کی بیماری سے نجات بخشی۔“

اس ناقدری کے ماحول میں اس کی شاعری کیا ترقی کرتی۔ جبل سے رہائی کے بعد سے اٹھتا کیے میں قیام تک اس کی شاعری کچھ ترقی نہ کر سکی۔ اس عرصے میں بے شک اس نے زمانے کی بے مہریوں اور اس کی تکلیفوں پر بے بہا اشعار کہے ہیں اور غم و اندوہ کے ایسے راگ گائے ہیں جس سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

وہ فرصت کے ان دنوں میں بدوی قبائل کی طرف نکل جاتا اور کئی کئی دن وہاں قیام کر کے ان سے عربی محاورے سیکھتا تھا۔

اس کے نقادوں نے صحیح لکھا کہ منتہی بادیہ نشین قبائل کے ساتھ رہا اور چند سالوں میں خالص بدوی بن گیا۔ اسے لغت و بیان پر ایسی قدرت حاصل ہو گئی کہ معرفت لغت میں کوئی مشہور شاعر اس کا ہم پلہ نہیں کہلا سکتا۔ اس کو عربی زبان و لغت پر اس قدر عبور تھا کہ جب اس سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ فوراً کلام عرب سے شہادت پیش کرتا۔ اس کے دشمن تک یہ کہنے پر مجبور تھے۔

علم لغت میں تم سب سے زیادہ علم رکھتے ہو۔ کوئی شخص بھی تم سے زیادہ اس بات کا مستحق نہیں جس سے غریب لغات کے بارے میں دریافت کیا جائے۔

علم لغت میں مہارت ایک ایسی تیاری تھی جو آئندہ اس کے کام آنے والی تھی۔ اسے ایسے مہر و جین میسر آنے والے تھے جو ایسی ہی خالص زبان میں مخاطب کرنے کے لائق تھے۔

آئندہ کیا ہوگا یہ تو تاریخ جانتی تھی فی الحال تو وہ صحرا نوردی اور بے نوئی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ شمالی شام میں امراء کی مدح سرائی کرتا اور اپنی فکر شعری کو جائے پناہ کی تلاش میں کساد بازاری کی نذر کرتا رہا۔ نہ وہ اپنے رنگ شاعری میں کوئی اضافہ کر سکا نہ اس میں کوئی جدت اور ندرت پیدا کر سکا۔ اس تمام عرصے میں وہ صرف شعرا کے منتقدین کی تقلید کرتا رہا۔ اس کو وہ امن و سکون نصیب نہیں تھا جو حوصلہ بڑھاتی ہے اور حوصلہ شاعری کو فروغ دیتا ہے۔ وہ دن رات یا تو کسب معاش کے چکر میں رہتا تھا یا دشمنوں سے محفوظ رہنے کی فکر کرتا رہتا تھا۔ اس کا سارا زور اہل زمانہ کی شکایت اور مذمت پر صرف ہو رہا تھا۔ اسے ان لوگوں کی جھوٹی مدح کرنی پڑ رہی تھی جو اس مدح کے لائق نہیں تھے لیکن اب بھی وہ حوصلہ نہیں ہار تھا۔

”موت میری نذر خواہ ہے اور میرے جیسے بہادر کے لیے زیب دیتا ہے۔ دشت و صحرا میرے لیے بڑی وسیع جولا نگاہ ہے اور دنیا اسی کے لیے ہے جو لڑ بھڑ کر اس پر غالب آجائے۔“

بالآخر اس کا صبر اس کے کام آیا۔ اس کو جنوبی شام میں اُمید کی ایک کرن نظر آئی اور وہ طیر یہ روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ طیر یہ پہنچا ہی تھا کہ جبال لبنان کو عبور کرتے ہی اس کی ملاقات ابوعلی ہارون سے ہوئی۔ یہ شخص صوفی منش تھا۔ منتہی کی شہرت سن چکا تھا۔ اب جو اسے اپنے قریب دیکھا تو اس کے آگے دسترخوان کی طرح بچھ گیا۔ منتہی کی ایسی آؤ بھگت کی کہ وہ ابوعلی کی شان میں قصیدہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

منتہی نے اس کی دل کھول کر تعریف کی اور ایسا زور دار قصیدہ لکھا جو جان بلاغت کہلانے کا مستحق تھا۔ شاعری کا وہ شعلہ جو شمالی شام میں رہ کر بجھ گیا تھا اس قصیدے میں پوری طاقت سے بھڑکا۔ اس قصیدے میں اس کا رنگ شاعری اس وقت سے قطعی مختلف تھا جب وہ شمالی شام میں بے کاری کے دن گزار رہا تھا۔

اس حوصلے کی بنیادی وجہ صرف اتنی تھی کہ اس عرصے میں رشیدی حکومت کا تختہ الٹا جا چکا تھا۔ اسی رشیدی

حکومت کے ہاتھوں اسے قید و بند کی سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔ یہ اس کی زیر دست فتح تھی۔ اب وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد پھر سے بحال ہو گیا۔ اب اس کے کلام میں پھر وہ زور پیدا ہو گیا جو قید و بند کے بعد شمالی شام میں ہرگز نہ تھا۔

جس امیر حمص ابن کیغلیغ نے منتہی کو قید کیا تھا رشیدی حکومت کا نمائندہ تھا۔ جب اس کے حریف بدر بن عمار نے امیر حمص پر غلبہ حاصل کر لیا تو ابوعلی ہارون نے منتہی کو بدر بن عمار کے دربار میں پہنچا دیا۔ اس دربار میں پہنچتے ہی اس کو زندگی کا چین بھی نصیب ہوا اور وہ پرسکون ماحول بھی جو ایک شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ چند ہی مہینوں میں اس کی شاعری ترقی کے اس بلند مقام پر پہنچ گئی جہاں اس سے پہلے وہ پانچ سال میں نہ پہنچ سکتی تھی۔

یہ کیسا انقلاب ہوا کہ وہی بدر بن عمار جس کی وہ بھوک چکا تھا۔

”وہ بدر بن عمار اپنی فوج کے ساتھ ایسا بھاگا جیسے بکری شیر کی آواز محسوس کر کے بھاگے۔“ (یہ اس وقت کی بات ہے جب منتہی بدر بن عمار کے حریف ابن کیغلیغ کے رحم و کرم پر تھا)۔

اب اسی بدر بن عمار کی تعریف ان الفاظ میں کر رہا تھا۔

”کیا ہم خواب دیکھ رہے ہیں یا زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے کہ تمام مخلوق کی خوبیاں ایک زندہ شخص یعنی بدر بن عمار میں پھر جمع کر دی گئی ہیں۔“

اب ابن کیغلیغ کا تختہ الٹا جا چکا تھا لہذا منتہی خوشی سے جھوم جھوم کر بدر بن عمار کی تعریف کر رہا تھا۔

”وہ ایسا سخی ہے جو اس بات میں بخیل ہے کہ سخاوت نہ کرے۔“

وہ بدر بن عمار سے ایسا خوش ہوا کہ یکے بعد دیگرے کئی قصیدے اس کی خدمت میں پیش کیے اور دل کھول کر اس کی مدح سرائی کی۔

منتہی نے ان قصائد میں وہ شاعرانہ جوہر دکھائے کہ بدر اس کے گردیدہ ہو گیا اور حال یہ ہو گیا کہ وہ جلوت و خلوت میں اس کا مقرب بن گیا۔

منتہی کی پذیرائی دیکھ کر درباریوں کے دل رشک و حسد سے جلنے لگے۔ پھر وہی ہوا جو ان درباروں میں ہوتا رہتا ہے۔ اس کے خلاف سازشوں کے جال بنے جانے

لگے۔ ان سازشوں کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح وہ بدر بن عمار کی نظروں سے گر جائے۔ درباریوں کے سازشی ذہن کوشش ضرور کر رہے تھے لیکن ان کی ہر کوشش ہوا مردہ ہو رہی تھی۔ پھر اچانک منتہی کی بد قسمتی نے اس کے حاسدوں کو یہ موقع فراہم کر دیا۔

بدر بن عمار کے حدود امارات میں کچھ اور سواحل شام کا اضافہ ہوا۔ جب وہ ان پر تسلط جمانے کے لیے جانے لگا تو منتہی بعض وجوہ کی بنا پر ان کے ساتھ نہ جاسکا۔ دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے بدر کے خوب کان بھرے۔ بدر اسے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا اور اب وہ ساتھ جانے سے معذرت کر رہا تھا اوپر سے حاسدوں نے اسے خوب بھڑکایا۔ بدر کے دل میں اس کی طرف سے ہال آ گیا۔ اس نے کہا تو کچھ نہیں اور روانہ ہو گیا لیکن بعض لوگوں سے وہ ایسی باتیں کہہ گیا جن سے مخالفت کی بو آتی تھی۔ منتہی کو معلوم ہوا تو بڑا پریشان ہوا۔ اس نے کچھ اشعار کہہ کر رکھ لیے کہ جب بدر لوٹے گا تو وہ اس کی خدمت میں پیش کرے گا۔

جب بدر، طبریہ لوٹ کر آیا تو اس نے یہ اشعار اس کی خدمت میں پیش کیے۔

میں نے اس سفر میں تجھ سے جدا رہ کر جو غلطی کی ہے اس کو میرا دل اچھی طرح سمجھ گیا ہے اور تیرے ساتھ نہ جا کر جس خدمت کو میں نے چھوڑ دیا ہے اس سے بھی میں غافل نہیں ہوں۔

میں تجھ پر قربان ہو جاؤں تو میری غلطی معاف کر دے اور اس کے بعد بھی مجھ پر انعام کرتا کہ تو مجھ کو ایسی بخششوں سے مخصوص کرے جس میں سے خود میری ذات بھی ہے۔

اور جو شخص میرے بارے میں تجھ کو غلط مشورہ دیتا ہے اس کو منع کر۔ چغل خوروں کی باتیں مت سن یہ ہمیشہ شریف آدمی کے دشمن ہوتے ہیں۔

شعرا کی عداوت میرا ذخیرہ ہے کیونکہ وہ ہجو کہہ کر ساری دنیا میں بدنام کر دیتے ہیں۔

بدر عمار نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ پہلے کی طرح پھر اس سے خوش نظر آنے لگا۔ یہ وہ موقع تھا کہ منتہی کو ٹھوکر کھا کر سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن بعض معاملات میں وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ بے حد خود پسند واقع ہوا تھا۔ اپنی برتری کا خیال اس حد تک تھا کہ وہ خود کو شعرا کے مرتبے سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا دل بادشاہوں جیسا

ہے اگرچہ میری زبان شعرا جیسی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہی احساس برتری کہ وہ امراء اور بادشاہوں سے اس طرح خطاب کرتا تھا جیسے ایک دوست دوسرے دوست سے کرتا ہے یا کوئی عاشق اپنے محبوب سے کرتا ہے۔ بدوی قبائل میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں ایک قسم کی سختی اور دوسروں کو کچھ نہ سمجھنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ صرف خیال پیدا نہیں ہو گیا تھا بلکہ وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتا تھا۔

میں کس بلند رتبہ پر ترقی کروں؟ اور کس بڑے شخص سے ڈروں حالانکہ دنیا میں جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں اور جو نہیں پیدا کی ہیں وہ سب میرے عزم و ارادہ کے مقابلے میں ایسی حقیر ہیں جیسے میری مانگ کا ایک بال۔

اس کی یہی شیخیاں تھیں جو اسے بار بار مصیبت میں ڈال دیتی تھیں۔ اس پر نبوت کے دعوے کا الزام لگنا بھی غالباً انہی شیخوں اور خود کو دوسروں سے بلند سمجھنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے اپنے اتنے دشمن پیدا کر لیے تھے جو اسے کسی جگہ ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ مصلحت کا تو جیسے وہ قائل ہی نہیں تھا۔ بے باکی کا

ایسا ہی ایک واقعہ بدر بن عمار کے دربار میں پیش آیا۔ برسرِ دربار شراب کا دور چل رہا تھا۔ منتہی شراب نوشی سے سخت نفرت کرتا تھا اس لیے ان محفلوں سے بچتا رہتا تھا لیکن اس روز بدر بن عمار کے اصرار پر اسے بیٹھنا پڑا۔ بدر بن عمار کے

حاشیہ بردار واقف تھے کہ منتہی شراب نہیں پیتا بلکہ پینے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ انہوں نے یہ سب جانتے ہوئے بھی منتہی کی طرف شراب کا جام بڑھا دیا اس نے انکار کیا۔ اس کے انکار کو دیکھتے ہوئے بدر بن عمار نے بھی اصرار کیا۔

اس کے حاسدوں کو یقین تھا کہ وہ بدر کو منع نہیں کر سکے گا اور بعد میں ہم اسے مذاق کا نشانہ بنائیں گے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے بدر کو بھی انکار کر دیا۔

”آقائے نعمت! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں شراب نہیں پیتا۔“

”ہمیں معلوم ہے لیکن اس وقت ہم پیش کر رہے ہیں۔“

”مجھے پھر بھی انکار ہوگا۔“

یہ سنتے ہی بدر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی درباری اس کے حکم سے انحراف کرے۔ منتہی نے اس انکار پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آداب مجلس کا خیال کیے بغیر فی البدیہہ یہ اشعار بھی پڑھ دیے۔

میں نے شراب کو عقل پر غالب ہونے والی چیز

پایا۔ وہ دل کے شوق کو برانگیختہ کرتی ہے یعنی خواہشات نفسانی کو ابھارتی ہے۔ وہ انسان کے قول و فعل میں اس کی تہذیب کو بگاڑ دیتی ہے لیکن وہ سخاوت اور شجاعت جیسے اخلاق کو بہتر بنا دیتی ہے۔

”انسان کی تمام چیزوں میں نفس ترین چیز اس کی عقل ہے۔ عقلمند اس کو ضائع کرنا اور کھودنا برا سمجھتا ہے۔“

بدر کے حاشیہ بردار اس کے کان پہلے ہی بھر چکے تھے۔ منتہی کے یہ اشعار سن کر وہ برہم ہو گیا۔ اس نے منتہی کو اس محفل سے اٹھ جانے کا حکم دے دیا۔

”اگر تو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہے تو ہمارے درمیان تیرا کیا کام۔“

منتہی سمجھ گیا کہ اب اس دربار میں اس کی خیر نہیں۔ عافیت اسی میں ہے کہ یہاں سے راہ فرار اختیار کی جائے۔

بدر بن عمار کے پاس آ کر وہ یہ سمجھا تھا کہ اسے مصیبتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی لیکن ایک مریضہ اضطراب اور بے چینی کی زندگی پر قناعت کرنی پڑی۔ در بدری پھر اس کا مقدر بن گئی۔ وہ شمالی شام میں ادھر ادھر پھرتا رہا اور مختلف لوگوں کی تعریف میں قصائد کہتا پھرا۔

☆.....☆

خلافت عباسیہ کا آفتاب ڈھل رہا تھا۔ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ عمال حکومت نے مرکز کو اپنے مقبوضہ صوبوں کے خراج سے محروم کر دیا۔ خلیفہ راضی باللہ نے فوراً ابو بکر محمد بن رائق کو جو ”واسط“ کا گورنر تھا اس شرط پر عمان وزارت اور سپہ سالاری افواج سپرد کی کہ وہ تمام مالی بدانتظامیوں کو درست کر دے۔ اس کو امیر الامرا کے ایک نئے عہدے پر فائز کیا جس کے قبضے میں تمام شاہی حقوق پہنچ گئے۔

ابن رائق جس وقت بہ حیثیت امیر الامرا دار الخلافہ بغداد آیا۔ سلطنت عباسیہ کا شیرازہ بالکل بکھر چکا تھا۔ بغداد اور اس کے ملحقہ صوبوں کے علاوہ باقی تمام صوبے خلیفہ کے عملی اقتدار سے آزاد ہو چکے تھے۔ امیر الامرا بننے کے بعد ابن رائق کو مختلف امرا سے مقابلہ کرنا پڑا بالآخر وہ بھاگ کر امداد حاصل کرنے سیف اللہ کے بھائی ناصر الدولہ کے پاس پہنچا۔ (سیف الدولہ اس وقت ”واسط“ پر حکومت کرتا تھا)۔ ناصر الدولہ اس وقت موصل کا فرمانروا تھا۔ ناصر الدولہ نے اس کا پرتپاک استقبال کیا لیکن واپسی میں اسے قتل کر دیا۔

یہ سیف الدولہ کا ترقی کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد اس نے شمالی شام میں ”حلب“ کا علاقہ زحیدہ حکومت سے چھین لیا۔ پھر دمشق اور رملہ پھر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر تو وہ دنیائے اسلام میں مجاہد اعظم بن کر ابھرا رومیوں کے خلاف جنگوں میں اس نے کافی شہرت حاصل کی۔

سیف الدولہ کے جد امجد حمدان بن حمدون روسائے بنی تغلب میں سے ایک سردار تھا جس کے نام سے حمدانی قبیلہ منسوب ہے۔ اس نے 260ھ میں سیاسی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس کی اولادیں بعد میں حکومتوں میں شامل ہوتی گئیں۔ دولت عباسیہ میں اس خاندان نے خوب ترقی کی۔ سیف الدولہ اسی خاندان کا فرد تھا جو گورنری سے بادشاہت تک پہنچا اور بادشاہ بھی ایسا جسے عازمی بادشاہ کہا جاتا تھا جس نے فتوحات میں خلفائے اسلام کی یاد تازہ کر دی تھی۔

اس عرصے میں منتہی، رملہ، طرابلس اور دمشق وغیرہ مختلف مقامات میں امراء اور دوسرے اہل ثروت کی مدح سرائی کر کے پیٹ پالتا رہا۔

وہ سیاسی حالات پر بغور نظر رکھے ہوئے تھا۔ شمالی شام میں ایسا انتشار پھیلا ہوا تھا کہ اس کے قدم کہیں ٹکنے والے نہیں تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ اس کے سابق مربی ابوالعشار کے قدم اٹھا کیے میں جم چکے ہیں تو وہ فوراً ابوالعشار کے پاس جا پہنچا۔

”مجھے کیا ہو گیا کہ میں ابوالعشار حسین بن علی کی تعریف نہیں کرتا اور اس سے ولسی محبت کا برتاؤ نہیں کرتا جیسی محبت اس نے مجھ سے کی ہے۔“

ابھی ابوالعشار اس قصیدے سے لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے دوسرا قصیدہ اس سے بھی بڑھ کر پیش کر دیا۔

لوگ جب تک تجھ کو نہ دیکھیں ایک جیسے ہیں لیکن تجھے دیکھنے کے بعد انہیں معلوم ہو جائے گا کہ سب ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ تو بے نظیر ہے۔

جو دو سخاوت بہ منزلہ آنکھ کے ہے اور تو اسے دیکھنے والا یعنی نور چشم اور بہادری اور دبدبہ بہ منزلہ ہاتھ کے ہے اور تو اس کا دست راست ہے یعنی تو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔

میں اس بہادر پر قربان جاؤں جس سے ہر رنگ اور

غبار آلود میدان میں جگمگ کرنے والے شہسوار بیچے ہیں یعنی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

کو بھی نیا بنا دیا۔
اس باب میں منتہی کے بعد بھی زمانے نے اس کا کوئی ہمسر پیدا نہیں کیا۔

☆.....☆

وہ اٹھا کیہ میں ابوالعشار کے پاس تھا اور عیش و آرام کے دن گزار رہا تھا۔ ابوالعشار بھی اس کے کمالات فن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس بے فکری نے اس کے قصائد میں نیا جوش و ولولہ بھر دیا تھا۔

وہ شاید یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ قدر دانی اور پزیرائی میں اٹھا کیہ اس کی آخری منزل ہے لیکن جس طرح اس کی شاعری برابرترتی کرتی جا رہی تھی اس کی منزلیں بھی تہدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

سیف الدولہ کی دھوم ہر طرف مچی ہوئی تھی۔ اس نے حلب پر قبضہ کر لیا تھا۔ دمشق اور رملہ بھی اس کے تصرف میں آچکے تھے۔ اس کی ذات سے یہ اُمید کی جا رہی تھی کہ اس کی فتوحات سیلاب کی طرح آگے بڑھتی جائیں گی۔ منتہی بھی اس سے نا آشنا نہیں تھا چنانچہ جب سیف الدولہ اپنے ابن عم ابوالعشار سے ملنے اٹھا گیا تو منتہی بھی اس سے ملنے پہنچا۔ منتہی کسی بادشاہ سے ملنے جائے اور قصیدے کے بغیر ہی چلا جائے یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے سیف الدولہ کے شایانہ شان قصیدہ پیش کیا۔

میں نے حوادث زمانہ کو عبور کیا یہاں تک کہ ممدوح سے آ ملا۔ ایک ایسے عزم کی پشت پر سوار ہو کر جس کے پاؤں مضبوط ہیں۔

”جب میں ممدوح کے پاس پہنچا تو میں نے ایسے ماو کال کو دیکھا جس کا نظیر خود چاند نے دیکھا نہ ہوگا اور ایسے دریائے سخاوت سے باتیں کیں جس کا کنارہ کسی تیرنے والے نے نہیں دیکھا۔ ممدوح سے ملنے کے لیے جب میں نے دور دراز مقام کا ارادہ کیا تو میں رات میں چل پڑا گویا میں ایک راز تھا جس کورات کی تاریکی چھپائے ہوئے تھی۔“

سیف الدولہ نے قصیدہ سنا تو پھڑک اٹھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور ناقد بھی۔ اشعار کے حسن و فصیح اس پر ظاہر رہتے تھے۔ صنعت شعری کو پرکھنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اچھے شعر اور نادر ادب پاروں پر جان دیتا تھا۔ ان کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی میں فیاضی اور دریا دلی سے کام لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دربار جلیل القدر علماء قادر الکلام اور برجستہ گو شعرا کا گلجاو ماویٰ بنا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کہا

اس وقت تک وہ ایک پختہ کلام شاعر بن چکا تھا۔ وہ دنیا کے شاعری کا واحد شاعر تھا جس نے اپنے آپ کو صرف قصائد کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس نے کسی دوسری صنف میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ اسی صنف سخن میں دل کی دھڑکنوں کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس لیے اس کے اشعار زبانوں پر ایسے چڑھے کہ فضائیں گونج اٹھیں۔ اس کے کلام میں جادو تھا اس کے نعمات نے کانوں کو ایسا مسحور کیا کہ لوگ ان میں کھو کر رہ گئے۔ جلد ہی اس نے یہ اعزاز حاصل کر لیا کہ وہ سرزمین عرب کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ اس نے اپنے قصائد میں تمام فنی خوبیاں سبجا کر دیں۔ الفاظ کی کثرت، تشبیہ کی بلاغت، استعارہ و تمثیل کی لطافت، مضمون کی گہرائی، طرز ادا کی دلکشی جدت طرازی اور مبالغہ آرائی جو قصائد کی جان سمجھی جاتی ہے اس کے کلام میں ایک خاص ساحرانہ انداز میں جمع ہو گئی۔

اس نے قصیدہ گوئی کو اوج کمال پر پہنچا دیا۔ اس بلندی پر پہنچا دیا کہ مزید آگے بڑھنے کی گنجائش ہی ختم ہو گئی۔ یہ الگ بات کہ اس کی بدولت، قصیدہ اور کاسہ گدائی ایک ہی چیز کے دو نام بن گئے۔

اسے عربی زبان پر شاہانہ فرماں روائی حاصل تھی۔ وہ ایک خود سر جاہر بادشاہ کی طرح تھا جو اپنے گرد و پیش سے جو چاہتا بروتی چھین لیتا۔ لغت کا امام سمجھا جاتا تھا۔ جس لفظ کو جب چاہتا اور جس طرح چاہتا گھنٹوں کے بل اپنے قدموں پر جھکا لیتا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ ایک تو اس کا حافظہ غضب کا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اعراب اور ہادیہ نہیں قبائل میں پل کر پروان چڑھا تھا۔ اس نے عہد شباب انہمی کی صحبتوں میں رہ کر گزارا تھا۔ لہذا زبان، محاورات اور الفاظ کی ہیئت ترکیبی پر پورا عبور تھا۔ اسے لغت پر ایسا عبور ہو گیا تھا کہ اس نے قواعد، حرف و نحو کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس کے پیش نظر ہمیشہ اہل زبان کے شواہد ہوتے تھے۔

شعرا و طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زبان کو محفوظ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو زبان کو آگے بڑھاتے ہیں۔ زبان کو آگے بڑھانے والوں کی اہمیت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ منتہی اسی گروہ کا سرخیل ہے۔ اس نے جو کچھ کہا صنائع بدائع کی خاطر نہیں کہا بلکہ اختراع معانی کی صناعت سے ایک نیا پیکر خیال پیش کیا یا پھر طرز ادا کی جدت سے پرانے خیال

جاتا تھا کہ خلفائے اسلام کے بعد اتنے اہل علم اور اہل قلم کسی بادشاہ یا میر کے دربار میں جمع نہیں ہوئے جتنے سیف الدولہ کے دربار میں جمع ہیں۔

اس نے پہلی ہی نظر میں حسنی کے جوہر کو پہچان لیا۔ حسنی بھی اس کے اندر چھپے ہوئے قدر دان کو شناخت کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بے درپے دو اور قصیدے اس کی خدمت میں پیش کیے۔ ایک قصیدے میں تو اس نے تعریف اور خوشامد کی حد کر دی۔

”کاش ایسا ہوتا کہ جب تو سفر کرتا تو ہم شہداء سفر برداشت کرنے کے لیے تیری سواری بن جاتے اور جب تو کہیں فردکش ہوتا تو ہم تیرے آرام کے لیے خیمہ بن جاتے۔“

یہ قصیدہ اس وقت پیش کیا گیا جب سیف الدولہ انطاکیہ سے رخصت ہونے والا تھا۔ اس قصیدے میں اس سفر ہی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ”کاش ایسا ہوتا کہ جب تو سفر کرتا تو ہم شہداء سفر برداشت کرنے کے لیے تیری سواری بن جاتے۔“

سیف الدولہ اس حسن طلب کو سمجھے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے تو یہ شاعر اس ہیرے کی طرح معلوم ہوا جو بادشاہوں کے خزانے کی زینت ہوتے ہیں۔ اس نے اس نایاب ہیرے کو طلب کر لیا۔ ابوالحسار تو اس کا تابعدار تھا انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اس نے حسنی کو بطور تحفہ سیف الدولہ کے ساتھ کر دیا۔

سیف الدولہ اسے لے کر حلب کی طرف چل دیا۔ حسنی حلب پہنچا ہی تھا کہ سیف الدولہ کی والدہ کے انتقال کی خبر آگئی۔ اسے سیف الدولہ کے مزید قریب آنے کا موقع میسر آ گیا۔ اس نے اس حادثہ جاگاہ پر بڑا درد انگیز مرثیہ لکھا۔

سیف الدولہ کی والدہ کا انتقال ایسی بڑی مصیبت ہے کہ گویا اس سے پہلے موت نے کسی شخص کو درد مند نہیں کیا نہ کسی مخلوق کے دل میں ایسی مصیبت کا خیال آیا۔

اگر تمام عورتیں عقل و فراست میں ایسی ہی ہوتیں جیسی ہم نے کم کی ہیں تو عورتوں کو مردوں پر فوقیت دی جاتی۔

سیف الدولہ ہر طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے ہار ہار ان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونا پڑتا تھا۔ حسنی کی خوبی یہ تھی کہ وہ ان مواقع پر ایسے قصائد پیش کرتا تھا کہ

سیف الدولہ کے ہاتھ اپنی تلوار پر اور زیادہ مضبوطی سے جم جاتے تھے۔ یہ قصائد اتنے دلوانہ انگیز اور پرجوش تھے کہ سیف الدولہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی فتوحات میں حسنی کی شاعری کا بھی بڑا دخل ہے۔

بلند مرتبہ سلطنت وہ ہے جس کی بنیاد نیزوں پر ہو۔ اس سے محبت رکھنے والوں کے نزدیک نیزہ بازی بوسہ محبوب کی طرح لذیذ ہے۔

تلواریں جب تک دشمنوں کے سروں میں دیر تک حرکت میں نہ آئیں اس وقت تک وہ اپنے حدود سلطنت میں اطمینان سے نہیں رہتیں۔

سیف الدولہ جیسے بہادر شخص نے اپنے بھائی کی امداد کا ارادہ کیا تو طویل نیزوں، گھوڑوں اور اونٹوں کے دست و بازو نے منزل مقصود سے اس کو قریب کر دیا۔

وہ ایسا بہادر ہے جو بھل کو بزدلی سمجھتا ہے اور وہ ایسا سخی ہے جو نامردی کو بخشیش کی ایک قسم خیال کرتا ہے۔ وہ ہر فتح کے بعد بغیر کسی غرور اور فخر کے لوٹتا ہے۔

”ہر آنکھ تجھ جیسے بہادر کو دیکھ کر عظمت و جلال سے ہڈے ہو جاتی ہے۔“

بنو قیس کے قبائل سرکشی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیف الدولہ نے ان کا پیچھا کیا۔ ان کی سرکوبی کرنے کے بعد ان کے ساتھ بھی سیف الدولہ نے وہی سلوک کیا جو بنو کلاب کے ساتھ کیا تھا۔ اس واقعے پر بھی حسنی نے قصیدہ پیش کیا۔

”وہ طویل نیزے جن سے تو نیزہ بازی کرتا ہے دشمنوں کو مجروح کرنے میں چھوٹے نیزوں کی طرح کام دیتے ہیں اور بخشش اور جنگ میں تیرا ایک قطرے کے برابر بھی حصہ لینا دریا اور سمندر کے برابر ہے۔“

بنو کلاب کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا تھا۔ سیف الدولہ شروع شروع میں ان پر بڑا مہربان تھا۔ ان کی ہر طرح دل جوئی کرتا تھا اس لیے وہ بڑی ترقی کر گئے اور لوگوں پر ان کی دھاک بٹھ گئی۔ پھر وہ سرکشی پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سیف الدولہ کو خبر ہوئی تو وہ تیزی سے ان پر چاڑھا اور انہیں کچل کر رکھ دیا۔ حسنی نے اس موقع پر بھی اس کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا تھا۔

اس وقت مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن رومی تھے لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ مسلمان سیف الدولہ کی دشمنی

میں ان رومیوں کی مدد کر رہے تھے۔

مارے گئے یا قید ہوئے انہوں نے امیر یعنی سیف الدولہ کے حکم کی نافرمانی کی اس لیے خدا نے ان کو ان کے کیے کی سزا دی۔

تم نے ان کو اپنے مقتولوں کے خون میں سوتا ہوا پایا، گویا تمہارے مقتولوں سے ان کو ہمدردی تھی اور وہ ان کی وجہ سے درد مند ہوئے تھے۔ اس غداری کی سزا خدا نے انہیں دی۔

ان لوگوں کے بارے میں جن کو تم نے قید کیا ہے یہ مت خیال کرو کہ وہ زندہ تھے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ ”بجو“ صرف مردار کھاتا ہے۔ تم بھی بچوں کی طرح ہو جو بے جانوں کو مارتے اور قید کرتے ہو۔

تم کیوں نہ جتھے رہے۔ ان گھائیوں میں جب کہ ممدوح کے شیردل بہادر اس پر چڑھ گئے تھے جو تہا چل رہے تھے جمع ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل رہے تھے۔

اب جو جہاد بھی اس کے بعد ہوگا ممدوح کے حق میں ہوگا اور ہر غازی سیف الدولہ کا فرماں بردار ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیف الدولہ اگلے ہی سال رومیوں سے انتقام لینے اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمان ابھی تک رومیوں کی زبردست طاقت سے خائف تھے۔ ان کا خوف دور کرنے کے لیے ان کا حوصلہ بڑھانے کی ضرورت تھی۔ یہ کام اس نے منتہی کے سپرد کیا۔

”کچھ ایسے اشعار کہو کہ مسلمانوں کا خوف دور ہو اور انہیں جہاد پر آمادہ کرو۔“ منتہی کے لیے یہ بڑا اعزاز تھا۔ اس نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی اس نے ایک ولولہ انگیز قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔

”ہم اس دیار میں جا رہے ہیں جہاں ہم رہنا پسند نہیں کرتے اور وہاں کے باشندوں سے نہیں سیف الدولہ سے وہاں جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔“

منتہی نے یہ قصیدہ مجمع عام میں پڑھا۔ قصیدہ ایسا پر شوکت تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں دلیری کے جذبات ابھر گئے۔ وہ پُر جوش نعرے بلند کرنے لگے۔ شوقِ جہاد نے انہیں بے قابو کر دیا تھا۔ وہ صفیں توڑ کر باہر نکل رہے تھے اور سیف الدولہ سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ رومیوں پر چڑھائی کر دے۔

سیف الدولہ نے ان کا جذبہ جہاد دیکھا تو پھرے ہوئے طوفان کی طرح رومیوں پر چڑھ دوڑا اور دشمن کے چالیس ہزار لشکر جبار کو ہنس نہس کر ڈالا۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ

سیف الدولہ کو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ ایک تو اس کے ملک کے سرکش باغی مسلمان تھے اور دوسرے رومی بلکہ اصلی دشمن یہی رومی تھے۔ اس نے ان کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ یہی وہ جنگیں تھیں جنہوں نے سیف الدولہ کا نام تاریخ اسلام میں محفوظ کر دیا۔ منتہی کا نام بھی اسی لیے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا کہ وہ رومیوں کے خلاف ان جنگوں میں سیف الدولہ کے ساتھ رہا اور اپنے رجز ناموں سے مسلمانوں کا لہو گرماتا رہا۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو شعرائے عرب میں کسی کو حاصل نہیں۔

یہ جنگیں اس تو اتر سے ہو رہی تھیں کہ اسے ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر جانا پڑ رہا تھا۔ واپسی کا راستہ ہی بھول گیا تھا۔ یہاں تک کہ سیف الدولہ کو کہنا پڑا۔

”تو ساری عمر رومیوں سے جہاد کرتا رہے گا۔ اب دار الحکومت لوٹنے کا کب ارادہ ہے۔“

رومیوں سے ویسے تو جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں لیکن 339ھ میں ایک سخت معرکہ ہوا۔ منتہی بھی شریک تھا۔ ایک مخصوص خیمے میں بیٹھ کر جنگ کا مشاہدہ کر رہا تھا تاکہ جب قصیدہ لکھتا ہو تو جنگ کے حالات اسے ازبر ہوں۔ حملے سے پہلے اس نے قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

”کل کے بعد والے دن یعنی پرسوں، مژدہ فتح کی ہر طرف خوشبو ہوگی اور دشمن کے گھروں میں جلتی آگ ہوگی جس کا شعلہ بلند ہوگا۔“

اس معرکہ میں سیف الدولہ کو شاندار کامیابی ہوئی۔ وہ روم کی سرحدوں کو عبور کر کے دور تک شہروں میں گھس گیا۔ اتنا زیادہ مال غنیمت ہاتھ آیا کہ اسے سینٹا غازیوں کے لیے مصیبت بن گیا۔ دشمن گھات میں تھے۔ مسلمان جیسے ہی مال غنیمت لوٹنے میں مشغول ہوئے انہوں نے اچانک حملہ کر دیا۔ سیف الدولہ کی ساری فوج تتر بتر ہو گئی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے مدافعت کی لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ اس موقع پر قصیدہ کہنا بہت مشکل تھا۔ سیف الدولہ کی بہادری کی لاج بھی رکھنی تھی اور حقائق بھی بیان کرنے تھے۔ یہ منتہی کے خیال کا امتحان تھا۔ اسے بے ریک وقت سیف الدولہ کی بہادری کی مدح بھی کرنی تھی اور دشمن کی بزدلی کا مذاق بھی اڑانا تھا۔ اس نے ایک طویل قصیدہ لکھا۔

دشمن سے کہہ دو کہ وہ مسلمان جو تمہارے ہاتھوں

بڑے سور ماموت کے کھاٹ اتر گئے۔ شاہ روم کا بیٹا گرفتار ہو گیا۔ سیف الدولہ کامیابی کا جھنڈا لہراتا ہوا لوٹ آیا۔
حتیٰی اس جہاد میں بھی سیف الدولہ کے ساتھ تھا۔
اس موقع پر بھی اس نے ایک طویل مدتیہ قصیدہ پیش کیا۔
میں سیف الدولہ کی وجہ سے اس رستے کو پہنچ گیا
ہوں جس کی وجہ سے میں نے مشرق سے مغرب تک ساری
دنیا کو روشن کر دیا ہے۔

اہل روم نے جب سیف الدولہ کو اپنے لشکر سے آگے
تہجد دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ وہی کافی ہے باقی سب بے کار ہیں
اور یہ کہ خطی نیزے ممدوح تک نہیں پہنچ سکتے اور ہندی تلوار
اس کے مقابلے میں کند ہے۔
ایک ایسے نوجوان نے ان کو اپنے گھوڑے کے سینے
اور اپنی تلوار کے سامنے رکھ لیا جس کی بیبت اور بدبہاس کی
بخشش کی طرح بڑا ہے۔

☆.....☆

شاہ روم اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے بے تاب ہو
رہا تھا۔ اس نے ایک لشکر جرار لے کر شام و روم کی سرحد پر
سیف الدولہ کے بنوائے ہوئے قلعے پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا
اچانک ہوا تھا کہ مسلمانوں کا گھبرا جانا لازمی تھا۔ اس موقع
پر سیف الدولہ نے کمال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ وہ صفوں کو
چیرتا ہوا شاہ روم پر جا پڑا۔ شاہ روم کے اوسان ایسے خطا
ہوئے کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگتے ہی اس کا لشکر
بھی تتر بتر ہو گیا۔ سیف الدولہ نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔
اس موقع پر بھی حتیٰی نے ایک زوردار مدیہ قصیدہ
کہا۔

”وہ وقت کیسا اچھا تھا جب کہ لڑائی کی آگ نے
کھوٹے ہتھیاروں اور ناقص لوگوں کو ختم کر دیا۔ پھر میدانِ
جنگ میں یا تو قاطع تلوار باقی رہی یا شیر دل بہادر۔
جو تلوار زرہ اور نیزوں کو نہیں کاٹ سکتی تھی وہ خود ٹوٹ
گئی اور شہسواروں میں سے جو دشمن کو نقصان نہیں پہنچا سکتے
تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔“

اے سیف الدولہ تو ایسے وقت میں ثابت قدمی سے
کھڑا رہا جب کہ کھڑے رہنے والے کو موت میں کچھ شبہ نہیں
تھا گویا تو موت کی پلکوں میں تھا اور موت غافل ہو رہی تھی۔
بہت سے بہادر زخمی اور شکست خوردہ ہو کر بھاگے
چار ہے تھے مگر تیرا چہرہ حلقفتہ تھا اور تیرے دانت مسکرا رہے
تھے۔“

رومیوں کے صدر مقام خوشتہ تک پہنچ جائے۔ اس وقت یہ
اس کے لیے مشکل بھی نہیں تھا لیکن برقباری نے اس کا راستہ
روک لیا۔ اسے واپس آنا پڑا لیکن اب وہ ظفر مند تھا۔
پھر رے اڑاتا چلا آتا تھا۔
حتیٰی نے تہنیتی قصیدہ پیش کیا۔

”خدا کے شہروں میں سب سے بد نصیب شہر وہ ہے
جس کے باشندے رومی ہیں اور ان میں کوئی ایسا نہیں جو
تیرے شرف کا منکر ہو۔“

سیف الدولہ کی فتوحات سمندر کی لہروں کی طرح
مسلل آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک سال آرام کرنے کے
بعد وہ 341ھ میں ”مرعش“ پر حملہ آور ہوا اور رومیوں کو
وہاں سے نکال کر قلعے پر قبضہ کر لیا۔

اسی سال شاہ روم کی طرف سے ایک وفد اپنے
قیدیوں کی رہائی کے بارے میں بات کرنے آیا۔ سیف
الدولہ کی اب ایسی حیثیت تھی کہ اس نے اس وفد سے کھلے
اجلاس میں ملاقات کی اور اس طرح کہ اس کے سامنے ایک
مری ہوئی شیرنی اور تین زندہ بچے پڑے ہوئے تھے اور وفد
کا سربراہ کسی سائل کی طرح اپنے قیدیوں کی زندگی مانگ رہا
تھا۔

اس موقع پر حتیٰی نے دربار عام میں یہ قصیدہ پڑھا۔
روم کے بادشاہ نے کرم و بخشش سے تجھے خوش
ہوتے دیکھا اس لیے وہ ایک چالپوسی کرنے والے سائل کی
جگہ آکھڑا ہوا۔

اور ذلیل ہو کر اس نے نیزوں کو چھوڑ دیا اور ایک
ایسے شخص (سیف اللہ) کے مقابلے میں جو نیزہ بازی میں
اس سے زیادہ ماہر ہے۔

اس کا قاصد اسی راستے سے آیا جو تیری طرف آتا
ہے۔ وہ ان کھوپڑیوں پر چلا جو تیری تلوار سے پھاڑی گئی
تھیں۔

☆.....☆

اگلے سال 342ھ میں اس نے ”غتاب“ کی
جانب سے روم پر حملہ کر دیا۔ اس نے رومی حدود کو عبور کیا اور
کئی علاقوں کو تاراج کر ڈالا۔ وہ واپس آ رہا تھا کہ شاہ روم
کے بیٹے سے ملاقات ہو گئی۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت
سخت خطرے میں تھی آگے دشمن تھا پیچھے برقباری سے راستہ
بند۔ معرکہ ایسا تھا کہ شکست یعنی تھی لیکن سیف الدولہ نے
ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بڑے

تھے۔ انہوں نے مسلمان شہسواروں کو دیکھا جن کو موت زندہ کرتی ہے گویا وہ جانداروں میں سے نہیں ہیں یعنی ان کا عقیدہ ہے کہ شہادت کے بعد ان کوئی زندگی ملتی ہے۔
ممدوح کی تلواروں نے رومیوں کو کھل زیادہ کیا ہے
گر قنار کم۔

ایک شائستہ انسان نے موت کو ان کے ہارے میں حکم دیا جس کو انہوں نے خدا کا حکم سمجھ کر قبول کر لیا۔
”اے سیف الدولہ جب میں تیری بہادری اور شجاعت کے کارناموں کو دیکھتا ہوں، تیرے دیدار سے پہلے ہی میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور جب میں تعریف کرتا ہوں تو میری زبان گنگ ہو جاتی ہے۔“

سیف الدولہ کے پاس آنے سے قبل متنبی بہت غریب تھا۔ در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ معمولی لوگوں کی روح میں اپنی شاعری کا جو ہر لٹا رہا تھا۔ اس نے ایک دینار کے عوض تک قصیدہ لکھا لیکن سیف الدولہ کے پاس آتے ہی اس کے دن بدل گئے۔ وہ سونے چاندی کے سکوں سے کھیلنے لگا۔ بلا مبالغہ سونے چاندی کے برتنوں میں

ایک مرتبہ سیف الدولہ کو معلوم ہوا کہ رومی اس کے شہر ”آمد“ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً اس طرف روانہ ہوا۔ رومیوں کو جیسے ہی اس کے آنے کی خبر ہوئی وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سیف الدولہ نے ان کا تعاقب کیا اور ایک مقام پر جا کر انہیں گھیر لیا۔ سخت معرکہ ہوا۔ سیف الدولہ نے انہیں شکست دے دی اور ان کے قلعوں اور محلوں کو تاراج کر ڈالا۔

متنبی اس معرکہ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ایک طویل مدھیہ قصیدہ پیش کیا جس میں وہ سیف الدولہ کی فوج کشی اور جنگی کارناموں کا ذکر اور پہاڑی دروں پر سیف الدولہ کی بے نظیر کامیابیوں کا بیان کیا۔

جب ہم روم کی گھاٹیوں پر تھے۔ لوٹنے میں ذلت و رسوائی تھی اور آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ راستے دشمنوں کے نیزوں کی وجہ سے تنگ اور دشوار گزار تھے اور کفر، دین اسلام کے مقابلے میں اپنی پوری قوت سے ڈٹا ہوا تھا۔

ایسے نازک وقت میں رومیوں نے مسلمانوں کو دیکھا جو ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی وجہ سے بارہ ہائے آہن معلوم ہو رہے تھے اور عقاب جیسے برق رفتار گھوڑوں پر سوار

حکایت سودوزیاں

محببتوں کے سودے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ خسارے کے خوف سے باہر..... زبردستی میں بھی گلابی ساعتوں کی آس.....
آخری صفحات پر **ناہید سلطانہ** اختر کی یادگار تحریر

بہشت زار

کچھ تو میں اپنے قول و فعل کے حوالے سے اس سرزمین کے کچھ خطوں میں اپنی مخصوص پہچان قائم کر گئیں **الیاس سیتا پوری**
کے قلم سے انہی یادگار تاریخی لمحات کا اعادہ

شیش محل

دل کے نازک تاروں کی مدھر موسیقی..... اور تھکن حالات کا راگ.....
اسما قادری کے قلم سے تلخ و شیریں حالات کے نشیب و فراز کا احوال

ماروی

بچپنی رفاقتوں کی بھول..... نئے رستوں کی دھول..... دلچسپ واقعات کا اگلا پڑاؤ.....
محی الدین نواب کے قلم کی حیرانگیزی

محبت اور فاصلے

رومانوی داستان کے رنگین و سنگین مناظر اور چمکی دھوپ میں لہاس کر نے والے مسافروں کا دلچسپ قصہ.....
ظاہر جاوید مغل کا دلربا انداز

جولائی 2016ء کے شمارے کی دلنوازی

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سرسبز
ماہنامہ



مزید
خطوطِ محفل.....
محفلِ شعر و سخن اور
ایک صدقہ حیات کی تہا عیدار کی

منظور امام تنویر ریاض سلیمان اور
محمد ذبیر سلیمان، ابراہیم جمالی
اور علی اختر کی دلچسپ تحریریں آپ کی منتظر

کرتے ہی اپنے ہمعصروں پر چوٹیں شروع کر دیں۔
”شاعر تو درحقیقت میں ہوں۔ باقی شعرا جھوٹے
دعوے دار ہیں۔“

میرے اشعار صحیح معنوں میں شعر کہے جانے کے
قابل ہیں باقی دوسرے شعرا کی کوشش اس بارے میں ایک
سٹی بے قاعدہ ہے۔

جس طرح تلواریں بہت ہیں لیکن زمانے میں سیف
الدولہ ایک ہی ہے اسی طرح دنیا میں تک بندی کرنے
والے بہت ہیں لیکن شاعر بس ایک ہے اور وہ میں ہوں۔

بھی وہ ان شعرا کے بارے میں جن کا چراغ اس
کے شاعرانہ کمال کے سامنے بجھ کر رہ گیا تھا پھر وہ اس کے
منہ آتے تھے تنگ آ کر کہتا۔

”یہ خود ساختہ شاعر جن کو چاہوں تو میں بغل میں دبا
لوں روزانہ میرا مقابلہ کرتے رہیں گے اور چھوٹے ہونے
کے باوجود رتبے کی بلندی میں میری برابری کرتے رہیں
گے۔ میری زبان باوجود قوت گوپائی کے ان کی جھوکنے سے
خاموش ہے اور میرا دل باوجود خاموشی کے ان کی حماقت پر
ہنستا ہے۔“

اس کی یہ بے باکی بڑھتی ہی گئی۔ وہ سمجھتا تھا کہ سیف
الدولہ اس سے محبت کرتا ہے لہذا کوئی اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ
سکتا۔

اس کی زبان کی تیزی صرف شعرا تک محدود نہیں رہی
بلکہ اس نے ان بڑے بڑے فوجی افسروں کی بھی مذمت کر
ڈالی جو رومیوں سے جہاد میں سیف الدولہ کا ساتھ چھوڑ گئے
تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فوجی افسر بھی اس کے خلاف ہو گئے۔

شعرا کے ساتھ فوجی افسر بھی شامل ہو گئے اور ان
دونوں طبقوں نے مل کر سیف الدولہ کے کان بھرنے شروع
کر دیے۔

مختی اس موقع پر یہ بھول گیا تھا کہ بادشاہ کسی کے
وقادار نہیں ہوتے بلکہ خوشامدیوں کے بہکاوے میں بہت
جلد آجاتے ہیں۔

سیف الدولہ بھی رفتہ رفتہ ان سازشیوں کے چنگل
میں پھنستا چلا گیا۔ مختی ان حالات سے بے خبر نہ رہ سکا اور
اپنے بجاؤ کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ ایسے ذہنی انتشار کا شکار
ہوا کہ کئی مہینے تک سیف الدولہ کی خدمت میں کوئی قصیدہ
پیش نہ کر سکا۔ مخالفین کو ایک اور موقع مل گیا کہ وہ سیف
الدولہ کو اس کے خلاف بھڑکائیں۔ انہوں نے مختی کی غیر

کھانے لگا۔ اسے فی قصیدہ ایک ہزار دینار تک ملنے لگا تھا۔
دولت و ثروت کی فراوانی تو رہی ایک طرف سیف الدولہ
اس کے ساتھ برابری کا سلوک کر رہا تھا۔ خلوت و جلوت میں
اپنے ساتھ رکھ رہا تھا۔ اس کے آتے ہی درباری شعرا کا
چراغ گل ہو گیا تھا۔ ہر ایک اپنی جگہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ سیف
الدولہ کی نظروں سے اتر گیا۔ اس کی قدر و منزلت کسی بادشاہ
کی طرح ہو رہی تھی۔

جب یہ سب کچھ حاصل ہو گیا تو مختی کا دل فخر و غرور
سے بھر گیا۔ وہ ہر قصیدے میں کسی نہ کسی بہانے اپنی تعریف
کر بیٹھتا تھا۔

”زمانہ میرے ہی قصائد پڑھتا رہتا ہے۔ جب میں
کوئی شعر پڑھتا ہوں تو لوگ اسی کو گانے لگتے ہیں جو بدذوق
ہیں وہ بھی اسے لے اڑتے ہیں۔ جو کبھی نہیں گاتے وہ بھی
گانے لگتے ہیں۔“

”اے سیف الدولہ! تجھے جب کوئی شعر سنایا جائے تو
انعام مجھے ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ میرے ہی اشعار کے
مضامین کو دوسرے شعرا الٹ پلٹ کر بیان کرتے رہتے
ہیں۔“

”میرے علاوہ تو دوسروں کی آواز سننا چھوڑ دے
اس لیے کہ میں ہی وہ پرندہ ہوں جس کی آواز کی نقل کی جاتی
ہے۔“

ایک قصیدے میں اس نے یہاں تک کہہ دیا۔
شعر و شاعری کی دنیا میں میرے شعر فرشتوں کی
طرح بلند مرتبہ ہیں۔ وہ اس فلک دنیا کا چمکتا ہوا سورج
ہیں۔

خدا نے ہمارے درمیان صحیح تقسیم کی ہے۔ مجھے یہ
شاعرانہ الفاظ عطا فرمائے ہیں اور تیری قسمت میں تعریف کیا
جانا لکھا ہے۔

ان تعلقوں اور اس کی بے پناہ قدر و منزلت کا یہ اثر
ہونا لازمی تھا کہ اس کے دوست کم اور حاسد زیادہ پیدا ہو
جائیں۔ یہی ہوا بھی درباری شعرا اور عام درباریوں میں
شاید ہی کوئی ہو جو حسد کی آگ میں نہ جلنے لگا ہو اور بالآخر
سب نے متحد ہو کر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔
وہ اس آگ کو ٹھنڈا کر سکتا تھا لیکن اس نے اپنی فطرت سے
مجبور ہو کر اس آگ کو مزید بھڑکا دیا۔

سیف الدولہ کی طرف سے ہونے والی عزت افزائی
نے اسے ایسا بے باک کر دیا کہ اس نے اس سازش کو محسوس

حاضری کو اس کے غرور سے تعبیر کیا۔

”آپ کی مہربانیوں سے وہ اتنا خود سر ہو گیا ہے کہ اب آپ کی مدح کرنا بھی کسر شان سمجھتا ہے۔ اب تو یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر مہر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“

سیف الدولہ کے دربار کا دوسرا بڑا شاعر ابو فراس، متنبی کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ اس نے سیف الدولہ کو ایک انوکھی پیش کش کر ڈالی۔

”یہ باچھیں پھاڑ پھاڑ کر شعر پڑھنے والا متنبی آپ سے بڑے خڑے کرتا ہے حالانکہ آپ اس کو تین قصیدوں پر تین دینار دیتے ہیں اگر آپ دو سو دینار میں شعرا پر تقسیم کر دیں وہ اس سے کہیں زیادہ اچھے اشعار آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں گے۔“

سیف الدولہ کو یہ تجویز پسند بھی آگئی۔ اس نے اس وقت عمل بھی کر دکھایا جب متنبی کو یہ قصہ معلوم ہوا اور اس نے سیف الدولہ کے پاس پہنچ کر یہ قصیدہ پڑھا۔

”سیف الدولہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آج مجھ سے ناراض ہے۔ دنیا اس پر قربان ہو جائے وہ شمشیر زنی میں سب سے زیادہ تیز دھار اور قاطع تلوار والا ہے۔“

متنبی قصیدہ پڑھ رہا تھا اور سیف الدولہ گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے متنبی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

سیف الدولہ کے اس رویے سے متنبی کو سخت افسوس ہوا۔ اس نے دریافت حال کے لیے چند اشعار لکھے اور سیف الدولہ کی خدمت میں بھیج دیے۔

”میں اس قربت کا خیال کر رہا ہوں جو پہلے مجھے حاصل تھی اور اب انحراف سے تبدیل ہو گئی ہے اور طویل ملاقاتیں جو اب مختصر ہو گئی ہیں۔“

تو نے آج مجھے ایسا شرمندہ کیا جسے یاد کر کے کبھی میں مرتا ہوں کبھی جیتا ہوں۔

اب شرم سے میں تجھ کو نظر چرا کر دیکھتا ہوں اور گھوڑوں میں اپنے بکھیرے کو شرم کی وجہ سے چھپ کر ہنکاتا ہوں۔ اس نے آگے چل کر اس بات پر معذرت بھی کی کہ وہ تین ماہ تک کوئی قصیدہ پیش نہ کر سکا۔ اس نے بتایا کہ اس کی شعر گوئی کو ایک ایسے شدید غم نے روک دیا جس نے کچھ روز کے لیے میری آنکھوں سے نیند اچاٹ دی۔“

اس نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور معذرت بھی

کی لیکن سیف الدولہ پر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ سیف الدولہ کی اس بے اعتنائی پر متنبی نے طے کر لیا کہ وہ اپنے دشمنوں سے خود غمٹے گا۔ ایک دن وہ پوری تیاری سے دربار میں آیا۔ اس وقت تمام درباری شعرا جمع تھے۔ اس نے مدحیہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع تھا۔

”ہائے افسوس میرے دل کی سوزش اس شخص کی محبت میں جو مجھ سے سرد مہری برتا ہے اور جس کی وجہ سے میرا جسم اور حال دونوں سقیم ہیں۔“

اسی قصیدے میں آگے چل کر اس نے اپنے حرفوں پر ایسی چوٹ کی کہ وہ بلبلاتا اٹھے۔ اس نے سیف الدولہ کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں تیری محبت کو چھپاتا ہوں جس نے میرے جسم کو گھلا کر لاغر کر دیا ہے مگر جو لوگ تیری محبت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا حال اس کے برعکس ہے۔“

اس سے آگے ایک دو شعروں کے بعد اس نے جب یہ شعر پڑھا۔

”میں تیری حقیقت شناس نظروں کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تو پھولے ہوئے ورم والے شخص کو چربی والا فریہ سمجھے یعنی کھوٹے کو کھرا اور گھٹیا درجہ کے شاعروں کو مجھ جیسا بلند درجہ شاعر سمجھے۔“

اس نے نام نہیں لیا تھا جو حلیہ بیان کیا گیا تھا اسے سن کر درباری شاعر ابو فراس سمجھ گیا کہ وہ اس پر چوٹ کر رہا ہے۔ وہ جب نہ رہ سکا ترخ کر بولا۔

”تو کون ہے اے کندہ کے جھوٹے دعویدار۔“

متنبی نے سنی ان سنی کی اور شعر پڑھتا رہا۔ وہ اس شعر پر پہنچا۔

”گھوڑے، راتوں کا سفر، دشت و بیاباں، تلوار، نیزے اور کاغذ و قلم مجھے خوب پہچانتے ہیں۔ میں صاحب سیف اور صاحب قلم ہوں۔“

ابو فراس اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

”تو نے اپنے کو شجاعت و فصاحت، ریاست و سخاوت سب ہی اوصاف سے مستفید کر ڈالا۔ سیف الدولہ کے لیے کیا چھوڑا، انعامات سیف الدولہ سے حاصل کرتا ہے اور تعریف اپنی کرتا ہے۔“

متنبی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بعد یہ قصیدہ مسلسل تنقید کا نشانہ بنا رہا۔ ابو فراس اس کے ہر شعر پر اعتراض اٹھاتا رہا۔ کبھی اس میں

غلطیاں نکالتا کبھی اسے "سرقہ" بتاتا۔

سیف الدولہ کو ابو فراس کی یہ دخل اندازی قطعی پسند نہیں آئی۔ اسے اتنا غصہ آیا کہ سامنے رکھی ہوئی دوات ابو فراس کو کھینچ ماری۔

جب متنتی قصیدہ ختم کر چکا تو سیف الدولہ نے اسے اپنے قریب بلایا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور ایک ہزار دینار فوراً ایک ہزار بعد میں عطا فرمائے۔

جب متنتی دربار سے چلا گیا تو درباریوں نے اس پر سخت نکتہ چینی کی اور ان میں شدید برہمی پھیل گئی۔

اس برہمی کا افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ لوگ گھات لگا کر بیٹھ گئے اور موقع دیکھ کر اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ متنتی نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی اور بھاگ کر اپنے ایک دوست کے گھر پناہ لی۔

اس نے سیف الدولہ کو تمام ماجرا لکھ بھیجا۔

"اگر قتل ہی کرنا ہے تو اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالیے اس لیے کہ شریف کے ہاتھوں مارا جانا بھی عزت کی بات ہے۔"

سیف الدولہ کو معلوم ہوا تو وہ سخت فکر مند ہوا۔ اسے کہیں سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مصر جانے کے لیے پرتول رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جائے لہذا وہ ہر طرح سے اس کی دلداری کر رہا تھا۔ اس موقع پر بھی اس نے معاملہ رفع دفع کر دیا اور متنتی کو اپنی امان میں لے لیا۔

چند مہینے آرام سے گزر گئے لیکن جب دلوں میں نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ یہی اس وقت بھی ہوا۔ معمولی سی چنگاری شعلہ بن گئی۔

ایک دن دربار میں ابو عبدالند بن خالویہ نحوی اور ابو الطیب لغوی کے درمیان کسی مسئلے پر بحث چل پڑی۔ متنتی خاموشی سے سن رہا تھا۔ سیف الدولہ نے متنتی کو بھی بولنے کا حکم دیا جو بہت دیر سے خاموش تھا۔

متنتی نے ابو الطیب کی دلیل کے حق میں فیصلہ دیا۔ ابن خالویہ کو جو سیف الدولہ کا استاد بھی تھا غصہ آ گیا۔ وہ اس سے الجھ پڑا اور اس کو برا بھلا کہنے لگا۔ متنتی کہاں خاموش رہنے والا تھا اس نے بھی ڈانٹ کر کہا۔ "خاموش! تو نجی ہے اور خوزستانی نسل کا ہے۔ تجھے عربی سے کیا واسطہ۔"

یہ سن کر ابن خالویہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے اپنی آستین سے چاہیوں کا کچھا نکالا اور متنتی کے منہ پر دے مارا۔ اس کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ سیف الدولہ بیٹھا تماشا دیکھتا رہا۔ نہ

زبان سے کچھ کہنا نہ عملاً اس کی مدد کی۔ متنتی کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ سیف الدولہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ اس وقت تو خاموشی سے چلا آیا لیکن بعد میں اس نے رخصت کی درخواست دی اور ایک مقام معرۃ النعمان جہاں اس کی کچھ جاہد ادھی چلا گیا۔

سیف الدولہ نے بھی یہ سوچ کر اسے اجازت دے دی کہ اچھا ہے کچھ دن آرام کر لے گا لیکن متنتی کے دل میں کچھ اور تھا۔ اس نے کچھ دن اپنے زخموں کے مندمل ہونے کا انتظار کیا اور پھر مصر کی طرف فرار ہو گیا جہاں کے حکمران "اشیدی" کہلاتے تھے جہاں اس وقت ابوالمسک کا فوراً اشیدی حکومت کر رہا تھا۔

کافور بن عبداللہ سیاہ فام، گداز بدن خواجہ سرا تھا جسے والی مصر ابو بکر محمد بن طح نے بعض روسائے مصر سے خرید کر اپنی خدمت کے لیے رکھ لیا تھا۔ پھر محمد بن طح نے اس کو آزاد کر کے فن سپہ گری میں ایسا ماہر بنایا کہ اس کا شمار سپہ سالاروں میں ہونے لگا۔ شام کی لڑائیوں میں عباسی افواج کی قیادت اسی نے کی تھی۔ سیف الدولہ سے جنگوں کے بعد یہ ہو گیا تھا کہ حلب سیف الدولہ کے پاس رہے اور دمشق زحیدی کی حکومت کے زیر نگیں رہے۔

مختلف حکمرانوں کے انتقال کے بعد عمائدین سلطنت نے کافور کو اپنا امیر تسلیم کر لیا تھا اسی طرح کافور مصر، شام اور حجاز پر حکومت کرنے لگا۔

جب متنتی کافور کے پاس پہنچا تو وہ اس عظیم شاعر کو اپنے پاس دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کے رہنے کے لیے ایک مکان کا بندوبست کیا اور چند نوکر مقرر کر دیے اور اسی انتظار میں رہا کہ متنتی اس کی خدمت میں مدحیہ قصائد پیش کرے گا لیکن متنتی اپنے مدوح سیف الدولہ کو ابھی تک بھلا نہیں سکا تھا۔ کافور سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سیف الدولہ کے پاس سے محض اس کے مصاحبوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بھاگا تھا اور کافور کے پاس اس لالچ میں آ گیا تھا کہ اسے کسی صوبے کا گورنر بنا دیا جائے گا۔

وہ کافور کے پاس آنے کے بعد بہت دن تک خاموش رہا لیکن جب کافور کی طرف سے نوازشیں بڑھنے لگیں تو اس نے مدحیہ قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے وہ قصائد پیش کرتا رہا۔ ان قصائد کے ذریعے وہ کوشش کرتا رہا کہ کافور کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل کر لے مگر ایسا

نہ ہو سکا۔

کافور نے اس کی بے دلی کو دیکھتے ہوئے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے کسی صوبے کا حکمران بنا دے گا۔ منتہی اس لالچ میں کافور کی خوب خوب تعریفیں کرتا رہا لیکن وقت گزرتا رہا۔ وعدہ وفا نہ ہوا۔ اسے یہاں آئے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ وہ کافور کی شان میں 9 قصیدے تحریر کر چکا تھا۔ پھر جب وہ تنگ آ گیا اور مقصد براری نہیں ہوئی تو اس نے ایک قصیدے میں صاف صاف کہہ دیا۔

”تجھ کو میرے بارے میں شک و شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کسی تلوار کے قاطع ہونے میں شبہ ہو اسے آزما کر دیکھ لو، اگر وہ ناکارہ ہو تو اس کو پھینک دو اور کارآمد ہو تو اسے اپنے بچاؤ کے لیے رکھ لو۔“

مطلب یہ کہ تو مجھے آزما کر دیکھ لے۔ اگر میں تیرے لیے مفید مطلب ہوں تو اپنا وعدہ پورا کرو ورنہ پھر صاف انکار کر دے۔

اس کے بعد بھی مطلب براری نہیں ہوئی تو اس نے شاعری کا شاہ کار یہ شعر کہا۔

”اے ابوالسک! تیرے جام میں کچھ باقی ہو تو میں پی جاؤں۔ میں بہت دیر سے تیری تعریف کے گیت گانے جا رہا ہوں اور تو جام پر جام سے جا رہا ہے۔“

اس صاف گوئی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے کافور سے واپسی کی اجازت چاہی۔ کافور کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ وہ اس سے کنارہ کش ہو جائے۔

اب منتہی سمجھ چکا تھا کہ اسے محض سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں۔ اس نے ایک قصیدہ کافور کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ اس کا کافور کے دربار میں آخری قصیدہ ثابت ہوا۔ اس قصیدے میں سراپا مایوس بن کر کافور سے فریاد کرتا ہے۔

”خدا را! میری آرزو پوری کر کے مجھے اس قابل بنا کہ میں اپنے دشمنوں کو منہ دکھا سکوں ورنہ میں ان سے کیا کہوں گا کہ ان کو چھوڑ کر میں تیرے پاس آنے میں حق بہ جانب تھا؟“

اس دردناک نوحے کے بعد بھی اس کی عاجزانہ درخواست قبول نہ ہوئی۔ منتہی بھی اس قدر مایوس ہوا کہ اس کے بعد وہ تقریباً ڈیڑھ سال مصر میں ٹھہرا رہا لیکن اس دوران اس نے ایک شعر بھی کافور کی مدح یا ہجو میں نہیں کہا۔ کافور منتہی کی شاعرانہ حیثیت کا قائل تھا لیکن وہ منتہی کی فرمائش پر اسے کسی صوبے کی عنان حکومت دے کر اپنے

ہاتھ پاؤں نہیں کٹوا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اسے خطرناک آدمی سمجھتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ اپنے درباریوں سے کہا بھی تھا۔

”لوگو! جس شخص نے رسول خدا صلی اللہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا ہو، کیا وہ کافور کے مقابلے میں سلطنت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

منتہی اب ایک معتوب شخص کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے قید نہیں کیا گیا تھا لیکن اس کی کڑی نگرانی کی جارہی تھی۔

منتہی بھی جانتا تھا کہ کافور اسے اس خوف سے آزاد کرنا نہیں چاہتا تھا کہ کہیں وہ بھاگ کر سیف الدولہ کے پاس نہ چلا جائے۔ منتہی کی بدولت سیف الدولہ کی شہرت آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ اسے سیف الدولہ کے دربار میں بھیجنے کے حق میں نہیں تھا۔

منتہی یہاں سے فرار ہونے کا عمل عزم کر چکا تھا لیکن اس کی نگرانی کی جارہی تھی لیکن عین اس وقت جب کافور اور اس کے درباری عید الاضحیٰ کی سرمستیوں میں مدہوش تھے منتہی بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ پیدل چلنے کا عادی تھا۔ راستوں سے واقف بھی تھا اور سختیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ دنوں کی مسافت گھنٹوں میں طے کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کافور کے آدمی اس کا تعاقب کریں گے۔ اس نے معروف راستوں کو چھوڑ دیا۔ اس نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا جو مصر سے عراق کی طرف جاتا تھا۔ نہ وہ مصر سے شام جانے والے راستے پر چلا اور نہ ہی دمشق ہو کر کوفہ جانے والے راستے پر گیا۔ اس نے مصر چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

”کافور بڑا پیڑ ہے۔ وہ میرے توشہ سے کھاتا ہے پھر بھی مجھے روک رکھا ہے تاکہ کہا جاوے کہ کافور بڑا بلند رتبہ ہے جس کے پاس منتہی جیسا عظیم المرتبت شاعر رہنا چاہتا ہے۔“

اب سوچ رہا تھا کہ اگر وہ زندہ کوفہ یا بغداد پہنچ گیا تو کافور کی ایسی ہجو لکھے گا کہ تاریخ میں وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

اس نے ہر وہ راستہ چھوڑ دیا جو معروف تھا بلکہ وہ غیر معروف قبائل، ناقابل عبور خطرناک وشت و صحرا اور نامعلوم وادی اور چشموں پر سے گزرتا ہوا تین ماہ میں کوفہ پہنچا۔

تین ماہ کے سفر کے بعد وہ کوفہ پہنچا تو اس کا دل غصے

اور نفرت سے بھر چکا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اسے اپنے تحفظ کا احساس ہوا اسے یاد آیا کہ جب وہ کافور کے پاس گیا تھا تو اس کی مدح میں قصیدہ کہا تھا۔ اس نے اسی قصیدے کے ردیف قوافی میں اشعار کہے لیکن یہ اشعار مدح کے نہیں ہجو کے تھے۔

”اگر میرا دل کسی بات کو چھپا سکتا تو میں تجھ کو اپنی خوشنودی اور رضا مندی دکھاتا مگر حقیقت یہ ہے کہ میں تیرے پاس آ کر نہ اپنی ذات سے خوش ہوا نہ تجھ سے۔ کیا تو جھوٹ، بد عہدی، غداری، کج بوسی اور بزدلی کرتے ہوئے شرماتا نہیں، کیا تو میرے لیے انسانی حلیہ میں ظاہر ہوا ہے یا پیکر رسوائی بن کر میرے سامنے نمودار ہوا ہے۔ تو میری مسکراہٹوں کو اُمید اور قابل رشک خوشی سمجھتا ہے حالانکہ میں اپنی صرف ان امیدوں پر ہنستا رہا ہوں جو میں نے تجھ جیسے نالائق سے وابستہ کر رکھی تھیں۔“

تیرے دونوں پاؤں جوتوں میں دیکھ کر مجھے تعجب میں ڈالتے ہیں اس لیے کہ جب تو ننگے پاؤں ہوتا ہے جب بھی میں تجھ کو جوتا پہنے ہوئے دیکھتا ہوں یعنی پاؤں کی کھال اس قدر سخت ہے کہ اگر تو ننگے پاؤں ہو جب بھی نقش پوش معلوم ہوتا ہے۔

اور تو جہالت کی وجہ سے یہ بھی نہیں جانتا کہ تیرا رنگ کالا ہے یا اب سفید ہو گیا ہے۔“

اس قدر ہجو سے بھی اس کا دل نہیں بھرا۔ آگے چل کر اس نے اس کی ذات کو براہ راست نشانہ بنایا۔

”اے کافور! کرم اور شرف تیرے جیسے غلام کے پاس کس راستے سے آئے۔ تیرے آلات حجامت اور قینچی کہاں گئی۔“

وہ لوگ اپنے مرتبے سے آگے بڑھ گئے جن پر تیرے دونوں ہاتھ مالک ہو گئے ہیں۔ تیرے ان پر مسلط ہونے سے ان کو یہ بات بتائی گئی ہے کہ کتا بھی ان سے بہتر ہے تمام لوگوں کے سردار انہی میں سے ہوتے ہیں مگر مسلمانوں کے سردار ذلیل غلام ہوتے ہیں۔

کیا تم میں کوئی ایسا نوجوان نہیں ہے جو ہندی تلوار اس کی کھوپڑی میں داخل کر دے تاکہ لوگوں کے شکوک دور ہو جائیں۔“

یہ ایک طویل ”ہجو“ تھی جس میں اس نے کافور کی خوب خیر لی۔ اپنا جتنا غصہ تھا اس نے اس ہجو میں اتار دیا۔ ہجو نگاری اس کے کلام کی امتیازی خصوصیت نہیں تھی

لیکن اس نے یہ ہجو اس خوبی سے کہی کہ ایسی تیزی اور گری کلام جو اس کے کلام میں ہے کسی دوسرے کے کلام میں مشکل سے پائی جائے گی۔

اس نے کافور کی ہجو میں اپنا سارا زور قلم سرف کر دیا۔ کافور کی مدح میں کبھی وہ زور پیدا نہیں ہوا جو ہجو میں ہو گیا۔

اس نے کچھ عرصہ کوفہ میں گزارا اور پھر وہ بغداد چلا گیا۔ اس کی بے چین طبیعت نے اسے یہاں بھی نہیں رہنے دیا اور ایک سال بعد ہی دوبارہ کوفہ آ گیا۔

ابھی وہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کر رہی رہا تھا کہ اس کے دروازے پر خوش قسمتی نے دستک دی۔ سیف الدولہ نے تحائف بھیجے تھے اور اسے حلب طلب کیا تھا۔

وہ سیف الدولہ سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا سنہرا دور اس کے دربار میں گزرا تھا۔ اس کے بعد

ایک ٹھوکری طرح کافور اس کے راستے میں آ گیا۔ منتہی نے اس ٹھوکری سے سبق بھی سیکھ لیا تھا لیکن وہ سیف الدولہ کے

دربار یوں کی طرف سے اس کے دل میں ابھی تک غبار تھا اس لیے وہ سیف الدولہ کے بلاوے پر ”حلب“ تو نہیں گیا

لیکن اظہارِ تشکر کے طور پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھ کر روانہ کر دیا۔

”اے سیف الدولہ! تیرے علاوہ کوئی ایسا بارعب بادشاہ نہیں جس کی تلوار ہی اس کی آبرو کی محافظ ہو۔“

عراق اور مصر کیوں نہ محفوظ ہوں جب کہ تیرا لشکر اور تیرے شہسواران سے پہلے بیچ میں حائل ہوں۔

اگر تو دشمنوں کے درمیان سے ہٹ جائے تو وہ اپنے گھوڑے مصر و عراق کے درختوں سے آ کر باندھ لیں۔

مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو مجھ پر سخاوت اور بخشش کرے اور زمانہ اس بارے میں بھل کرے کہ میں تجھ کو دیکھ سکوں۔

تجھ سے دوری نے عطایا کو بے مزہ کر دیا ہے۔ ان عطایا کی وجہ سے میری چراگاہ سرسبز ہے لیکن تیری جدائی کی وجہ سے میرا جسم لاغر ہے۔

اگر میں اپنی اس دنیا کے علاوہ کہیں اور جا کر رہوں اور وہاں میرے پاس کہیں سے بخشش آوے تو میں بھی سمجھوں گا کہ دینے والا تو ہی۔

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ”خولہ“ کا انتقال ہو گیا۔ منتہی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ”خولہ“ کا انتقال ہو گیا۔ منتہی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ”خولہ“ کا انتقال ہو گیا۔ منتہی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ”خولہ“ کا انتقال ہو گیا۔ منتہی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ”خولہ“ کا انتقال ہو گیا۔ منتہی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

اسی سال سیف الدولہ کی بڑی بہن ”خولہ“ کا انتقال ہو گیا۔ منتہی کو معلوم ہوا تو اس نے ایک طویل مرثیہ لکھ کر

سیف الدولہ کے پاس بھیجا۔

اس مرتبہ شکر گزار ہونے کا موقع سیف الدولہ کا تھا۔ اس نے خود اپنے ہاتھ سے خط لکھ کر حنتی کو بھیجا۔ اس خط میں اس نے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے پاس واپس آجائے۔

اس کے جواب میں بھی وہ خود نہیں گیا بلکہ ایک اور قصیدہ تحریر کر کے روانہ کر دیا۔ اس قصیدے میں اس نے زیادہ کھل کر اپنے نہ آنے کی وجہ بیان کی اور کھل کر کہہ دیا کہ وہ اس کے چغل خور درباریوں کی وجہ سے آنے سے قاصر ہے۔

میں اس خط کے مضمون کو سمجھا جو تمام خطوط میں بہتر ہے۔ میرا سر تسلیم امیر عرب یعنی سیف الدولہ کے حکم کے سامنے خم ہے۔

مجھے اس حکم کی اطاعت کرنا چاہیے مجھے اس سے بے انتہا مسرت ہے اگرچہ میرا عمل اس چیز سے جو مجھ پر واجب ہے قاصر ہے۔

سوائے چغل خوروں کے خوف کے کسی چیز نے مجھ کو تعمیل ارشاد سے نہیں روکا اور بے شک چغلیاں جھوٹ کی راہیں پیدا کرتی ہیں۔

بے شک ممدوح کے کان ان کی چغلیاں سننے لگے تھے مگر ممدوح کا دل اور اس کی شرافت میری مدد کرتی تھی وہ دل سے میری طرف مائل تھا۔

کاش تیری کمواریں ان حاسدوں کے سینوں میں پوسٹ ہو جائیں جو اس بات سے رنجیدہ ہوتے ہیں کہ تو دشمنان اسلام پر غالب ہے۔

☆.....☆

حنتی بغداد میں بڑی شان و شوکت سے رہ رہا تھا اور اس انداز سے رہ رہا تھا جیسے اقلیم شعر کا وہ تہا بادشاہ ہو۔ بغداد کے دوسرے شعرا کو وہ کھٹل کھٹل سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ اس کے فطری غرور نے تمام شعرا کو اس سے بدظن کر دیا۔

اسی اثناء میں ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ معز الدولہ کے وزیر حسن بن محمد اہلی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وزیر موصوف ایک ذی علم، ادیب، شاعر اور نہایت سخی آدمی تھا۔ اس نے حنتی سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس کی مدح میں قصیدہ کہے۔ انعام کی امید بھی تھی اور اہلی ذی علم بھی تھا لیکن حنتی اب غریب نہیں رہا تھا کہ معمولی انعام کے لیے قصیدے لکھتا

رہے۔ وہ خود مختار بادشاہوں کے علاوہ کسی امیر وزیر کی مدح سرائی سے پرہیز کرتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ وزیر کو لامحالہ یہ بات ناگوار گزری۔ اس نے تمام شعرا نے بغداد کو جمع کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ حنتی کی ہجو کہیں۔ وہ شعرا پہلے ہی حنتی سے بدظن تھے۔ انہیں وزیر کی پشت پناہی حاصل ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس کے ہجو کہیں اور اسے سنا سنا کر اسے خوب شرمندہ کیا۔ اس نے ان میں سے کسی کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا یا اپنی توہین سمجھی کہ ان معمولی شعرا کو جواب دیا جائے البتہ یہ ضرور کہا۔

”میں خود ساختہ شاعروں کو دیکھتا ہوں کہ وہ میری مذمت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کون شخص لاعلاج مرض کی تعریف کرتا ہے یعنی میں ان کے لیے بلانے بے درماں ہوں۔ میری وجہ سے ان کی شاعری ماند پڑ گئی ہے۔“

جس مریض کے منہ کا مزہ کڑوا ہو وہ آب شیریں کو بھی تلخ ہی سمجھتا ہے۔ پھر جھنجھلاہٹ میں وہ میرے اچھے اشعار کو برا سمجھتے ہیں تو ان کا کیا قصور۔

وزیر موصوف نے جب دیکھا کہ حنتی کے جواب نہ دینے کی وجہ سے مناقشے کی فضا پیدا نہ ہو سکی تو اس نے حنتی کو لاجواب کرنے کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ اس نے شیخ ابو علی حاتم کو اس کے مکان پر بھیجا تا کہ وہ اس سے مناظرہ کرے اور اسے اس کی حیثیت یاد دلائے۔ ابو علی حاتم نہایت پائے کا عالم تھا۔ ادب و شعر پر اس کی معلومات کا یہ عالم تھا جیسے دریا موتیوں سے بھرا ہوا ہو۔

ابو علی حاتم حنتی کے مکان پر پہنچا اور اجازت لے کر بیٹھ گیا۔ حنتی اس وقت چند لوگوں سے مچو گفتگو تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے حاتم کے علمی مراتب کی طرف توجہ بھی دلائی لیکن اس نے بے اعتنائی برتی۔ بڑی دیر بعد حنتی نے منہ پھیرا اور اس سے مخاطب ہوا۔ ”کیسے آنا ہوا۔“

”میری بد نصیبی نے مجھے تم جیسے آدمی کے پاس آنے پر مجبور کیا۔ خدا تمہیں معاف کرے۔ یہ تو بتاؤ وہ کون سا نبی شرف تمہیں حاصل ہے جس نے تکبر اور غرور پر تمہیں مجبور کیا۔“ حاتم نے کہا۔

”ایک بلند حوصلہ انسان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے نسب پر فخر کرتا پھرے اور اس کے سہارے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرے۔ جب میں اپنے ذاتی فضائل کی وجہ سے اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کر سکتا ہوں تو مجھے کیا ضرورت

ہے کہ میں اپنے بزرگوں کا سہارا ہوں۔“
 ”ذرا میں بھی سنوں کہ تمہارے ذاتی فضائل کیا ہیں۔“ حاتمی نے پھر جمل کر جواب دیا۔

”میرے ذاتی فضائل سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ ورنہ میرے پاس کیوں آتے۔ میں وہ ہوں جس نے سیف الدولہ جیسے بادشاہ کو حیات جاودا بخش دی۔ میں وہ ہوں جس نے عربی قصائد کو اس منزل تک پہنچا دیا کہ اب اس میں مزید ترقی کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ آج کوئی ایسا انشا پرداز نہیں جو میرے اشعار سے مدد نہ لیتا ہو۔ میری شاعری نے لوگوں کو دوسرے شعرا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ میں آج سرزمین عرب کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہوں۔“
 ”اس کے باوجود تمہیں غرور زیب نہیں دیتا۔“
 ”اگر تمہیں میری بے نیازی پر غرور کا شبہ ہوا ہے تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میں پھر پوچھتا ہوں کیسے آتا ہوا۔“

”مجھے تمہارے کچھ اشعار میں شکوک ہے۔ میں ان کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“
 ”وہ کیا ہیں۔“

حاتمی نے ایک ایک کر کے کچھ اشعار ایسے پڑھے جو حاتمی کے مطابق پست درجہ کے تھے یعنی موضوع کی مناسبت سے الفاظ ادا نہیں کیے گئے تھے۔

”تمہنی خاموشی سے سنتا رہا اور پھر بڑی متانت سے کہا۔“ آپ کا میرے ان اشعار کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

اس نے اپنے چند اشعار سنائے اور کہا۔ ”کیا ان اشعار کی بلاغت اور خوبی تم کو میرے شاعرانہ کمال کی طرف سے مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں؟“

”میں تو تمہارے ان شعروں میں بھی کوئی خوبی نہیں پاتا۔ یہ وہ اشعار ہیں جو تم نے دوسرے شاعروں سے سرقہ کیا ہے۔“

حاتمی نے اس کے کئی شعروں کو دوسرے شعرا کا چہ بہ بتا کر اس کی خوبی سے انکار کیا۔

اب حتمنی کے بولنے کی باری تھی۔

”اے حاتمی! میں نے تو تیرے علم کی بڑی شہرت سنی تھی لیکن اب میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ یا تو وہ شہرت جھوٹی تھی یا جس نے تجھے بیجا ہے تو اس کا وکیل بن کر آیا ہے لہذا مجھے سورج بھی چراغ معلوم ہو رہا ہے۔ کیا تجھے

نہیں معلوم کہ سرقہ اور توراہ میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ ایک شاعر بالکل اسی مفہوم کو اپنے انداز میں نظم کر دیتا ہے جسے دوسرا شاعر اس سے پہلے نظم کر چکا تھا۔ اگر تو اسے بھی سرقہ کہتا ہے تو یاد رہے سرقہ مذموم بھی ہوتا ہے اور مستحسن بھی۔ کسی شخص پر محض سرقہ کا (چوری کا) الزام اس کے کلام کے مذموم ہونے کی دلیل نہیں، شعر ایک ایسا راستہ ہے جس میں ایک قدم دوسرے قدم پر پڑتا رہتا ہے۔ پھر اس نے وزیر ابو محمد اہلبلی کے کئی اشعار ایسے پڑھ ڈالے جو اس نے حتمنی کے کلام سے سرقہ کیے تھے۔“

”اے حاتمی! اگر تو سرقہ کا الزام لگا کر میرے کلام کو مذموم کہتا ہے تو اپنے ممدوح وزیر پر بھی یہی الزام لگا اور اسے مذموم قرار دے۔ تجھے یہ بھی معلوم ہوگا کہ تنقید کرنا الگ بات ہے کسی کی پگڑی اچھالنا الگ بات ہے۔ میں تیرے علم کا قائل ہوں لیکن تو خلوص سے عاری ہے۔ اپنے ممدوح کے اکسانے پر یہاں چلا آیا اور اپنی آبرو گنوا بیٹھا۔ اپنے ممدوح سے کہہ دینا حتمنی کے پاس حاتمی کی دلیلوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی اس کا سر جھک گیا۔ وہ بہت خوش ہوگا۔ اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں عنقریب بغداد سے نکلیں اور چلا جاؤں گا۔ یہ میرا اس سے انتقام ہوگا۔ تاریخ اسے طعنے دیتی رہے گی کہ تیرے حسد نے ایک عظیم شاعر کو بغداد میں نہیں رہنے دیا۔“

شام میں سیف الدولہ تھا اور مصر میں کافور۔ وہ ان میں سے کہیں بھی جانے کا آرزو مند نہیں تھا۔ اب وہ اپنی آرزوؤں کا مرکز مشرقی اسلامی ممالک کو بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ابن الحمید سے جو رکن الدولہ کا وزیر تھا روابط بڑھائے تاکہ وہ اس کے ذریعے رکن الدولہ (حاکم بغداد) یا اس کے بیٹے عضد الدولہ حاکم شیراز کے پاس پہنچ جائے۔ اس وقت بغداد پر معتز الدولہ حکومت کر رہا تھا۔ عراق پر رکن الدولہ اور ایران پر رکن الدولہ حاکم عراق کا بیٹا عقید الدولہ حکمرانی کر رہا تھا۔

حتمنی یہ آرزو لے کر ”ارجان“ (عراق) روانہ ہو گیا جہاں ابن الحمید (وزیر رکن الدولہ) مقیم تھا۔ وہ خود ایک بڑا ادیب و انشا پرداز تھا لہذا حتمنی کا استقبال نہایت گرم جوشی سے ہوا۔ شاعری کی محفلیں برپا ہوئیں اور حتمنی کو انعامات سے نوازا گیا۔

حتمنی نے مدیہ قصیدہ پیش کیا۔
 ”مجھے کبھی ایسا اتفاق پیش نہیں آیا کہ میں نے

منگلا ڈیم

پاکستان کا دوسرا بڑا بند۔ یہ دینہ (جہلم) سے میرپور (آزاد کشمیر) جانے والی شاہراہ پر دینہ سے صرف گیارہ میل یا 18 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ ڈیم 1967ء میں دریائے جہلم پر بند باندھ کر تعمیر کیا گیا۔ یہ کثیر المقاصد منصوبہ ہے۔ سطح زمین سے اس کی بلندی تین سو اسی فٹ ہے اور یہ 10300 فٹ لمبا ہے۔ اس میں پچاس لاکھ ایکڑ فٹ پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ اس کی جھیل ایک سو مربع میل رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی تعمیر پر 3199.73 ملین روپے لاگت آئی۔ یہاں پر بجلی گھر بھی تعمیر کیا گیا ہے جس سے 1000 میگا واٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔

مرسلہ: زویا برکاتی۔ کراچی

ابوالفضل بن الحمید جیسا سخن فہم اور سخن سنج شخص دیکھا ہو اور یہ مدحیہ اشعار جو اس کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں حسب عادت معمولی ہیں۔

بے شک اس شخص کے لیے جو موجوں میں ڈوبا ہوا ہو اس بات کا ایک واضح عذر ہے کہ وہ موجوں کی تعداد نہ گن سکا یعنی ممدوح کے اوصاف اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ ممکن نہیں۔

اس کی سخاوت کو میرے مدحیہ اشعار پر سبقت حاصل ہے اس لیے کہ وہ بہت زیادہ ہیں۔

متنبی اپنے ساتھیوں اور نوکروں کے ساتھ تقریباً دو مہینے ابن العمید کے پاس پورے عزت و احترام کے ساتھ رہا اور پھر اسے پیشکش کی کہ وہ رکن الدولہ کے بیٹے عضد الدولہ کے پاس چلا جائے۔

عضد الدولہ خود شاعر تھا اور عربی ادب میں بڑی بصیرت رکھتا تھا۔ اس نے متنبی کی بڑی شہرت سنی تھی اور اسے متنبی سے ملنے کا شدید اشتیاق تھا۔

☆.....☆

عضد الدولہ ایک باغ میں گل گشت کر رہا تھا۔ عمائدین سلطنت اس کے ساتھ تھے۔ اس کے ایک رکن سلطنت عبدالعزیز بن یوسف الحکاری چند خوب صورت پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس عہد کے دو شاعروں کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

”کاش اس وقت ابو تمام اور بختری میں سے کوئی ایک ہمارے ساتھ ہوتا۔“ عضد الدولہ نے بات کو آگے بڑھایا۔

”اگر متنبی ہوتا تو ان دونوں کا قائم مقام ہوتا۔“
”اس کا ہونا کون سا مشکل ہے۔“ ایک درباری نے کہا۔ ”اس وقت وہ آپ کے چچا زاد بھائی ابن الحمید کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ آپ اسے اپنے پاس بلا سکتے ہیں۔“ یہ سن کر عضد الدولہ خوش ہو گیا۔ اسی وقت کاتب کو بلوایا اور نامہ تحریر کرا دیا۔

یہ 354ھ کی ایک چمکیلی صبح تھی جب عرب کا یہ ”پدو“ مرغزاروں کی سرزمین ایران پر اتر اور شیراز کے ایک محلی بادشاہ کی شان میں مدح سرا ہوا۔

اس نے جب پہلا قصیدہ عضد الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو عضد الدولہ نے اس پر انعامات کی بارش کر دی۔ عود و عنبر و مشک، قیمتی ریشمی چادریں، مشکلی گھوڑا، تقریباً پانچ

سو دینار کا ایک عمامہ اور ایک ہندی قیمتی تلوار جس کا دستہ سونے کا تھا قصیدے کے صلے میں بھیجا۔ ان سب اشیاء کی قیمت دو لاکھ دینار سے کم نہیں تھی۔

سرزمین ایران کی ”شعب یوان“ جو دنیا کی جنتوں میں سے ایک خیال کی جاتی تھی، عضد الدولہ کی فرمائش پر اس کی تعریف یوں کی۔

ہم یہاں صبح اس طرح کرتے ہیں کہ درختوں کی ٹہنیاں گھوڑوں کے ایال پر موتی کے دانے جیسے شبنم کے قطرے گراتی رہتی ہیں۔

میں ان ٹہنیوں کے زیر سایہ اس طرح چلا کہ وہ مجھے گرمی کی شدت سے بچاتی تھیں اور اتنی روشنی مجھ کو دیتی تھیں جو میرے چلنے کے لیے کافی تھیں۔

اور آفتاب کی شعاعیں میرے کپڑوں پر ایسے دینار بکھیرتی تھیں جو انگلی لگانے سے بھاگتے ہیں۔

ان درختوں پر ایسے پھل لگے ہوئے ہیں جو رس اور شربت سے بھرے ہوئے ہیں اور جو بغیر کسی طرف کے اس میں قائم ہیں۔

جگہ جگہ اس تیزی سے پانی گرتا ہے کہ ان کے نیچے پڑی ہوئی کنکریاں ایسے دلکش طریقے پر کھٹکتی ہیں جیسے خوب صورت عورتوں کی کلائیوں کے زیور چمن چھناتے ہیں۔

کاش یہ تفریح گاہ دمشق میں ہوتی اور کوئی شخص میرے گھوڑے کی لگام کو اپنی طرف موڑ لیتا۔

ایک دوسرے قسیدے میں تشبیہات کے عجیب و غریب جوہر دکھائے۔

”یہ ایسے منازل ہیں کہ اس میں جب کوئی خاکستری رنگ کی کیوتری گاتی ہے تو گانے والی خوب صورت دو شیرائیں ان کو جواب دیتی ہیں۔

شعب یوان پہنچنے پر میرا گھوڑا کہتا ہے کہ کیا ایسی دلکش سیر گاہ سے نیزہ بازی کے لیے کوچ کیا جاسکتا ہے۔

میں نے اس سے کہا جب تو ابو شجاع عضد الدولہ کو دیکھے گا تو سب لوگوں کو اور اس دلکش جگہ کو بھول جائے گا۔

بے شک انسان اور دنیا کی تمام چیزیں اس شخص تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں جس کا ثانی دنیا میں نہیں۔

منتہی عضد الدولہ کے پاس صرف تین ماہ ٹھہرا۔ اس لکلیل عرصے میں اس نے چھ قسیدے اس کی خدمت میں پیش کیے اور قصائد بھی ایسے کہ جو اس کی کل شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔

اس کے دور شاعری میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اس نے اس کثرت سے شعر کہے۔

عضد الدولہ کے پاس آ کر اس کی شاعری میں آزادی اور نشاط کی جولہر آگئی تھی وہ اس حد تک آگے بڑھی کہ اب نہ وہ اصول لغت اور قواعد کی پروا کرتا ہے نہ بھوک۔ اس کا سارا زور ادائے مطلب پر تھا۔

فن شاعری میں یہ بحث ہمیشہ رہی کہ شعر میں مقصود بالغات معانی ہیں یا الفاظ۔ متنی آفرینی اصل شاعری ہے یا زبان و بیان کا اسلوب قدیم۔ عربی شاعری زبان و بیان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس نے اختراع معانی اور جدت ادا کو جان شاعری سمجھا وہ تخیل کی بلند پروازی کے مقابلے میں الفاظ کی پروا نہیں کرتا۔ منتہی کی اس جدت پسندی نے عربی شاعری میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا اور ایک طرز جدید کی بنیاد ڈال دی۔

☆.....☆

ابونصر محمد جبلی کے لیے فائیک بن ابی الجہل اسدی اجنبی نہیں تھا۔ دونوں میں خوب دوستی تھی۔ فائیک اکثر اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ فائیک کو یہ بھی معلوم تھا کہ ابونصر کی دوستی منتہی سے بھی ہے۔ اس لیے ہر ملاقات میں وہ اس سے منتہی کے بارے میں ضرور پوچھتا تھا۔ منتہی آج کہاں ہے؟

کیا وہ کبھی عراق بھی آئے گا؟ آیا تو تمہارے خیال میں وہ کس راستے سے گزرے گا؟ عموماً اس کے ساتھ کتنے آدمی ہوتے ہیں؟ وہ اگر کبھی ادھر سے گزرے اور تمہیں معلوم ہو تو مجھے ضرور بتانا وغیرہ وغیرہ۔

ابونصر نے ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اس وقت جب اس نے یہی باتیں چھیڑ دیں تو ابونصر نے پوچھ ہی لیا، تم منتہی کے بارے میں کیوں پوچھتے رہتے ہو۔

”اس لیے کہ میں اس کی تاک میں لگا ہوا ہوں اگر میرا اس کا سامنا ہو گیا تو میں اس کا خون بہائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔“

”ایسا کیا کر دیا اس نے۔“

”کیا تمہیں واقعی کچھ نہیں معلوم۔“

”مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک معصوم شاعر ہے۔ ہر طرف اس کی شاعری کی دھوم ہے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرا دوست ہے۔“

”معصوم وہ نہیں تم ہو کہ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔“

”کچھ بتاؤ تو سہی۔ ایسا کیا کر دیا اس نے۔“

”اس نے میرے بھانجے ”ضہبہ“ کی نہایت بے ہودہ بھوک کی ہے۔“

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ شعر ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ شاعروں نے تو بادشاہوں تک کی بھوکہ ڈالی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شاعر محض بھوک کی وجہ سے قتل کر دیا گیا ہو۔“

”اگر وہ صرف ضہبہ تک محدود رہتا تو میں اسے معاف کر دیتا لیکن اس نے ضہبہ کے ساتھ اس کی ماں یعنی میری بہن کے بارے میں بھی بکواس کی ہے۔ اس نے میری بہن کو طوائف سے بھی بدتر الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس نے میرے بھانجے کو کتیا کا بیٹا کہا ہے جس کے بہت سے باپ ہیں۔“

”یہ واقعی اس نے بہت برا کیا۔ وہ کبھی آیا تو میں اسے سمجھاؤں گا۔“

”تم سمجھاتے رہو۔ اب تو جو خدا چاہے گا وہی ہو گا۔“ فائیک نے کہا اور نہایت غصے میں اٹھ کر چلا گیا۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک لڑائی میں عراق کے کچھ لوگوں نے ضہبہ کے باپ یزید اکتھی کو قتل کر دیا اور اس کی ماں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

اس وقت سے ضہبہ عراقیوں کی تاک میں رہتا تھا۔ جب کوئی عراقی ادھر سے گزرتا تو وہ اس کے ساتھ بڑی بدسلوکی سے پیش آتا۔ ایک مرتبہ منتہی اور اس کے ساتھ کوفہ کے کچھ

اشراف ضبہ کے قبیلے کے پاس سے گزرے۔ ضبہ ان کے ساتھ بڑی بدسلوکی سے پیش آیا اور انہیں بخش گالیاں دیں۔ انہوں نے منتہی سے درخواست کی کہ وہ اس کی گالیوں کے جواب میں ویسے ہی بخش لفظوں میں اس کی بھوکہ دے۔ منتہی ایک مہذب انسان تھا پھر بھی اس نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے ضبہ کی بہت ہی بخش بھوکہ ڈالی اور اس کی ماں کو بھی اسی لفظوں میں یاد کیا۔ فائیک بن ابی الجمل اسدی، ضبہ کا ماموں تھا۔ اس نے جب سے یہ ریک اور بے ہودہ اشعار سنے تھے وہ اور اس کے بنی اعمال منتہی کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ وہ ہر آنے والے سے منتہی کا حال پوچھتے رہتے تھے۔

☆.....☆

منتہی نے عضد الدولہ کے دربار سے رخصت ہونے سے قبل آخری قصیدہ لکھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس قصیدے میں اس کی زبان سے بغیر کسی ارادے کے کئی شعرا ایسے نکل گئے جو بدقالی اور بدشگونئی سمجھے جاتے ہیں اس نے اس قصیدے میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ عضد الدولہ کے پاس پھر واپس آئے گا لیکن ساتھ ہی یہ الفاظ بھی لکھ گیا۔

”تیرے پاس آنے کا شوق فراق سے پہلے ہی تلوار کا کام کر رہا ہے۔ میں اس شمشیر فراق سے ابھی مارا نہیں گیا ہوں پھر بھی اس نے ابھی سے مجھے قتل کر دیا ہے۔“ پھر آگے چل کر شوق واپسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

”اے دور میں وطن! تو میری سواریوں کے سامنے سے ہٹ جا اس لیے کہ وہ تیز رفتاری کی وجہ سے تجھ سے اس طرح تیزی سے گزر جائیں گی جیسے تیر، شکر چیر کر پار ہو جاتا ہے یعنی میری سواریاں بڑی تیز رفتار ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد واپس آ جاؤں اور بعد وطن اس میں حائل نہ ہو۔“

پھر کہتا ہے۔

”اے وطن جانے والے راستے تیرا جو جی چاہے کر مجھے جلد واپس آنا ہے چاہے تو اذیت پہنچائے نجات دلائے یا مجھے ہلاک کر دے۔“

ایک جملہ یہ بھی اس کے قلم سے نکل گیا تھا۔

”میرا وطن جا کر واپس لوٹنا اس تیر کی طرح ہے جو فضا

میں چلایا جائے۔“

اسی قصیدے کا آخری شعر اس کی زندگی کا آخری شعر ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس نے کوئی شعر نہیں کہا۔ اس شعر سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنی موت کی خبر سن رہا تھا۔

”مجھے خدا سے شرم آئی ہے کہ وہ مجھے اس حال میں

دیکھے کہ میں تیرے گھر اور تیری محبت سے مفارقت اختیار کر رہا ہوں۔“

ایک بات یہ بھی خوب ہوئی کہ عضد الدولہ نے اسے رکنے پر مجبور نہیں کیا۔ جھوٹے منہ بھی یہ نہیں کہا کہ کچھ دن شیراز میں رہ جائے حالانکہ یہاں آئے اس صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ عضد الدولہ نے بڑے ارمانوں سے اسے یہاں بلایا تھا اور بڑی آسانی سے رخصت کر رہا تھا۔ اس کے یہ حفاظت عراق پہنچنے کا انتظام بھی نہیں کیا۔ منتہی رخصت ہو کر عراق کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ رمضان 354ھ میں شہر واسط پہنچا اور اپنے دوست ابو نصر محمد جبلی کے پاس ٹھہرا۔ منتہی کے ساتھ اس وقت چھ لوگ تھے جن میں اس کا بیٹا بھی تھا۔

ابو نصر اسے دیکھ کر خوش بھی ہوا لیکن فوراً ہی اس کے چہرے پر ملال کی سی کیفیت ابھر آئی۔

”کیا بات ہے ابو نصر، تم مجھے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے۔“

”نہیں، یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ بہت دن بعد تجھے دیکھ رہا ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے میں ایک اچھا قیافہ شناس ہوں۔ کوئی بات ضرور ہے جو تم پریشان ہو۔“

”تم اندر آؤ تو میں بتاؤں۔“

مکان میں پہنچے اور خاطر تواضع کے بعد ابو نصر فائیک کی آمد کے بارے میں اسے بتایا۔

”اس کے اور اس کے قبیلے والوں کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ تمہارے پاس قیمتی سامان بھی ہے اور قیمتی جانیں بھی اور تمہارا گزر بنو اعمام کی طرف سے ہوگا۔ تمہیں احتیاط کرنی ہوگی۔“

شام کے وقت جب منتہی نے کوچ کا ارادہ کیا تو ابو نصر نے ایک مرتبہ پھر اسے خبردار کیا۔

”کچھ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے لو جو اس طرف کے خطرناک راستوں سے واقف ہوں۔“

”تلوار کے سوا مجھے کسی نگہبان کی ضرورت نہیں۔“

منتہی نے کہا اور سوار ہو گیا۔

کچھ آگے چل کر اس کے غلام نے بھی مشورہ دیا۔

”ابو نصر ٹھیک کہتے تھے آپ کو کچھ لوگوں کو ساتھ لے لینا چاہیے تھا۔“

منتہی نے اسے بھی یہی جواب دیا کہ مجھے راستے کی حفاظت کے لیے کسی نگہبانی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے

میری لکوار کافی ہے۔
فانک بن ابی الجبل کو معلوم ہو گیا تھا کہ منتہی مع سازو سامان شہر واسط سے روانہ ہوا ہے۔ وہ اپنی فطری بہادری کی وجہ سے زیادہ آدمی اپنے ساتھ نہیں لایا ہے۔ یوں بھی وہ جنگ کے ارادے سے نہیں نکلا ہے لہذا اس کے ساتھی معمولی ہتھیاروں کے ساتھ چل رہے ہیں۔

ابونصر اس کے مدفن پر کھڑا تھا اور زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ ”وہ ذات جس نے سیادت و ولایت حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، ناکام و نامراد دنیا سے اٹھ گئی اور اپنی نامرادی میں ہزار ہا عبرتیں دنیا کے لیے چھوڑ گئی جس کو زمانہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔“

☆.....☆

اس کے قتل کے بعد بہت سے شعراء نے اس کے بہت سے دردناک مرثیے لکھے، ایک مرثیہ بہت ہی مشہور ہوا جس کے چند شعر یہ تھے

خدا اس زمانے کے لوگوں کی حفاظت نہ کرے
جب کہ انہوں نے ہمارے اسی شیریں زماں شاعر کو قتل کر کے ہم کو مصیبت میں ڈال دیا۔

لوگوں نے منتہی کا ثانی نہیں دیکھا۔ زمانہ جدید کا ایسا بے نظیر شاعر کہاں دیکھا جاسکتا ہے۔

وہ لشکر میں ایک عظیم المرتبت شخصیت کا مالک نظر آتا تھا اور عظمت شان اور بڑائی میں بلند حوصلہ بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ شعر گوئی میں ایک معجز بیان نبی تھا لیکن اس کے معجزات نادر معانی اور بلند مطالب کی بحر بیانی سے ظاہر ہوئے۔

ابن ہارون نامی شاعر نے عضد الدولہ کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ منتہی کا قصاص لے لیکن عضد الدولہ نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

ابن ہارون نے اپنے قصیدے میں کہا۔

”یہی ہیں جنہوں نے تیرے مہمان پر حملہ کر کے تیرے عطایا کو لوٹ لیا جس کا وہ خوش قسمتی سے مالک ہو گیا تھا۔ اے بلند رتبہ بادشاہ منتہی تجھ سے پھر واپس آنے کا عہد کر کے گیا تھا۔ اس ارادے کی وجہ سے اس کا تجھ پر حق ہے تو اس عہد و پیمان کا خیال کر اور اپنے مہمان کا حصہ قصاص طلب کر۔“

عضد الدولہ نے اس مطالبے پر توجہ نہیں دی۔ اسی وجہ سے بعض لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ یہ قتل عضد الدولہ کے ایماء سے ہوا تھا۔

ماخذ:

ابوالطيب متنہی
پروفیسر سید جلیل الرحمن اعظمی

اس نے بدویوں کی ایک جماعت کو ساتھ لیا اور ایک مقام پر چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ ایسا مقام تھا کہ منتہی کوئی بھی راستہ اختیار کرتا اس مقام سے گزرے بغیر حدود عراق میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ منتہی اور اس کے ساتھی قستی سامان کے چھکڑوں کے ساتھ آتے دکھائی دیے۔ یہ تعداد میں چھ یا سات سے زیادہ نہیں تھے جب کہ فانک کے ساتھ ستر آدمیوں کی جماعت تھی۔ وہ سب دائرے کی شکل میں اُدھر اُدھر بکھر گئے۔

منتہی اپنے آراستہ گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے اس کا غلام تھا۔ وہ جیسے ہی دشمنوں کے نرنے میں پہنچا چاروں طرف سے اس پر حملہ ہو گیا۔ وہ نہایت بہادر اور نڈر تھا۔ سیف الدولہ کے ساتھ کئی جہادوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اس قسم کے معرکوں سے نمٹنا خوب جانتا تھا لیکن یہ حملہ نہایت اچانک ہوا تھا اور پھر دشمن تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ وہ کچھ دیر تو لڑتا رہا لیکن پھر خود کو مغلوب دیکھ کر اس نے بھاگنا چاہا لیکن اس کے غلام نے اسی کا ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا۔

”میں صاحب سیف و قلم ہوں۔ مجھے گھوڑے، رات اور جنگل خوب پہچانتے ہیں۔ مجھے لکوار، نیزہ اور قلم اچھی طرح جانتے ہیں۔“

منتہی کی غیرت نے جوش مارا اور وہ بھاگتے بھاگتے پلٹ آیا اور لڑتے لڑتے قتل ہو گیا۔ اس کا بیٹا محمد اور تمام ساتھی بھی مارے گئے۔

ایک راوی علی بن حمزہ بصری کی روایت کے مطابق 28 رمضان 354ھ کا ہے۔

منتہی 303ھ میں پیدا ہوا اور 354ھ میں قتل کر دیا گیا۔ اس حساب سے وہ صرف 53 سال اس دنیائے آب و گل میں رہ سکا۔

کسے معلوم تھا کہ وہ شخص جس کے نعمات سے فضائے عالم گونج اٹھے، تنہا وادی غربت میں اس طرح اس کی آواز گم ہو جائے گی کہ کوئی اس پر دو آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔

اس نے بغداد کی فضاؤں میں لڑکپن گزارا پھر جب وہ پاکستان کے اس حصے میں آیا جہاں ہر طرف گنگناتی ندیاں لہلہاتے سرسبز کھیت اور ہریالی بکھیرتے درختوں کا سلسلہ دور دور تک پھیلا نظر آتا تھا۔ ایسے سہانے منظر اس کے اندر موسیقی کی تانیں اٹھاتے اور وہ گنگنانے لگتا پھر اس کی زندگی میں ایک حسن کی شہزادی آگئی تو اس کی زندگی گویا مکمل ہو گئی اور تب اس نے راگ راگنیوں کا جو میلا سجایا تو لوگ اسے سراہے بنا نہ رہ سکے۔

پاکستان کے ایک بڑے موسیقار کی جیون کتھا

لازوال

اس کا جنم بغداد میں ہوا تھا مگر وہ عربی نہیں تھا۔ ہند کے انتہائی مشرقی علاقے کا باشندہ تھا۔ اس کے والد ایس ایم گھوش برطانوی فوجیوں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ وہ سرسبز میدانی علاقے کے تھے۔ اس لیے انہیں بغداد کی تپش گوارا نہ تھی۔ مگر ملازمت کی وجہ سے نکلے ہوئے تھے۔ اب جب انہیں اطمینان ہوا کہ ان کے وطن میں جس طوفان نے ہزاروں گھرا جاڑ دیے تھے۔ لوگ پاگل ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے تھے۔ وہ قتل عام بند ہو چکا ہے ہر طرح سے



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

امن وامان ہو چکا ہے تو وہ اپنے والد کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ جب اس کے والد اپنی سرسبز دھرتی پر پہنچے تو ان کے ساتھ بیوی اور بچے بھی تھے۔ ان سب کو اپنا وطن بہت پیارا لگا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس نے اور اس کے بھائی بہنوں نے پہلی بار ایسی ہریالی دیکھی تھی۔ بچے پانیوں کا سرم سنا تھا۔ ندی نالوں کی یہ سرزمین ہے ہی ایسی کہ دل و دماغ پر سحر طاری کر دے۔

یہ اس سحر زدہ ماحول کا اثر تھا کہ ایس پی گھوش کے بچوں پر موسیقیت کا جادو چڑھنے لگا۔ تمام بچوں میں روبن زیادہ باشعور تھا جبکہ ابھی وہ صرف چھ سال کا بچہ تھا۔ مگر راگ راگنی کی پہچان ہو چکی تھی۔ یہ شوق اس کی عمر کے ساتھ بڑھتا گیا تھا۔ اس دور کے جو نغمے اسے اچھے لگتے وہ اسے نہ صرف بار بار سنتا بلکہ اپنے طور پر گانے کی بھی کوشش کرتا۔ پھر اسے یہ شوق چرایا کہ وہ خود بھی گائے اور اپنی آواز کے جادو سے دوسروں کو بھی مسح کرے۔

اس دور میں ریڈیو ہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں سے فن کی آبیاری ہوتی تھی۔ موسیقار، گلوکار اور سازندے اپنی فنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے تھے۔ لہذا وہ بھی ریڈیو اسٹیشن کے طواف کرنے لگا۔ اسی دوران اس کی ملاقات کیپٹن احتشام سے ہوئی۔ احتشام ان دنوں اپنی پہلی فلم ”اے دیش تمار آمار“ (یہ وطن تمہارا ہمارا) بنا رہے تھے۔ واضح رہے کہ احتشام اور ان کے بھائی مستفیض کا ایک تقسیم کار ادارہ لیو فلز تھا۔ اب وہ اس کے سینئر تلے اپنی ذاتی فلم پروڈیوس کر رہے تھے۔ اس کے گانوں کے لیے انہیں گلوکاروں کی ضرورت تھی اور اسی مقصد سے وہ ریڈیو اسٹیشن آئے تھے۔ روبن سے مل کر اور اس سے گفتگو کر کے وہ متاثر ہوئے تھے۔ مگر اس کی صلاحیتوں سے ابھی نا آشنا تھے اس لیے فی الحال اس سے کوئی سولو ساگ نہیں گوا سکتے تھے۔ پھر بھی اسے چانس دینا چاہتے تھے۔

”تم میرے دفتر آؤ۔ میں تمہیں چانس دوں گا۔“

اور جب وہ ڈھیر سارے خواب سجائے لیو فلز کے دفتر پہنچا اور ہدایت کار احتشام سے ملا تو انہوں نے کہا۔ ”دیکھو بھئی! ہم تمہیں اپنی فلم کے ایک کورس گانے میں ساتھی گلوکار کے طور پر چانس دیں گے۔“

ہدایت کار احتشام کی بات سن کر اس کے خوابوں کا محل زمین بوس ہو گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی پرچھائیاں دیکھ کر ”اے دیش تمار آمار“ کے موسیقار خان

عطاء الرحمان نے کہا۔ ”ارے پار! اس چانس کو بھی غنیمت جانو۔ فی الحال فلموں کی موسیقی میں تمہاری یہ شمولیت تمہارے آنے والے دنوں کے لیے بہت اہم ہے۔“ خان عطاء الرحمان نے بلڈنگ کے اوپر منزل پر جانے والے زینے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”جس طرح نیچے سے اوپر جانے کے لیے ہمیں ایک ایک قدم پر چل کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اسی طرح کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک ایک قدم چل کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ آج تم کورس ساگ میں حصہ لو گے تو کل تمہیں سولو ساگ میں بھی موقع ملے گا۔ بشرطیکہ تمہاری پرفارمنس متاثر کن ہو۔“

نوجوان کو پختہ کار موسیقار کی باتوں نے بڑا حوصلہ دیا۔ اس نے اپنی مایوسی کو پرے دھکیل کر اپنی فنی سفر کا آغاز ایک کورس گیت سے کیا۔ ساتھی گلوکاروں اور گلوکاراؤں میں اس کی بہن رینا نے بھی حصہ لیا۔ کیونکہ اس کی بہن کو بھی گانے کا شوق تھا ہی نے اپنی بہن کو شامل کرنے پر موسیقار کو رضامند کیا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس فلم سے اداکارہ شبنم کو بھی اپنی فنی زندگی شروع کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی نام جھرنابوس کے نام سے جانی جاتی تھی۔ اس فلم میں اس کی حیثیت ایک ایکسٹرا گرل کی تھی۔ یہ فلم 1959ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ان دنوں ڈھا کے کی فلمی صنعت بہت محدود تھی۔ فن کے جو متوالے تھے وہی گھوم پھر کر فلموں میں کسی نہ کسی عنوان سے شمولیت کرتے تھے۔ جھرنابیل اکیڈمی آف فائن آرٹ کی طالبہ تھی اور وہاں رقص کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

وہ نوجوان جیبہ ”اے دیش تمار آمار“ کے ایک کورس گیت کے سہارے فلم والوں سے گھلنے ملنے لگا تو اس کے شوق کو دیکھ کر کسی نے اسے مشورہ دیا۔ ”اگر تمہیں اس فیلڈ میں کچھ کرنے کا شوق ہے۔ آگے بڑھنے کی لگن ہے۔ تو تمہیں اس کی تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ کسی استاد سے اس فن کی تربیت اور تعلیم حاصل کرو۔“

بات اچھی تھی۔ مشورہ مناسب تھا۔ اس نے پہلے استاد یوسف قریشی کی شاگردی حاصل کی۔ پھر کچھ دنوں تک استاد عبداللطیف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ سرنگیت کے بھید بھاؤ جاننے کے بعد اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ گلوکار کی بجائے اسے موسیقار کی حیثیت سے اپنی شخصیت کی تعمیر کرنی چاہیے۔ لہذا اسی رخ پر وہ سوچنے لگا۔ موسیقاروں کے کام کو غور سے دیکھنے لگا۔ توجہ دینے لگا۔ شاید مولا کریم

بھی اس پر مہربان تھا اور اس کی خواہش کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ہدایت کا ارتحشام نے اپنی پہلی فلم کی کامیابی کے بعد دوسری فلم ”راجدھانی بوکے“ (راجدھانی کے قلب میں) شروع کی تو اس نے کہا۔ ”یارتھ گلوکاری کے چکر میں کب تک خوار ہوتے رہو گے۔“

”جی ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ.....“

”گڈ۔ تم ایک ٹیلنٹڈ نوجوان ہو۔ اپنے مستقبل کے لیے زیادہ روشن راستہ اختیار کرو۔“

”سرجی! آپ کی رہنمائی اور سرپرستی حاصل رہی تو یقیناً میں اس راستے پر چل پڑوں گا۔“

”میں نے سوچا ہے۔“ ارتحشام نے اپنے انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”تم میری آنے والی فلم ”راجدھانی بوکے“ کی موسیقی ترتیب دو۔“

نوجوان کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آپھنسا۔ مگر اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ پہلے ارتحشام کا شکر یہ ادا کیا۔ پھر بولا۔ ”سرجی میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔“

”ہنہ، معیار.....“ کیپٹن نے کہا۔ ”اس وقت یہاں معیار کو کون دیکھتا ہے؟“

اور یہ بات سچ بھی تھی ڈھا کے کی فلمی صنعت اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔ جس طرح بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لیے جو دال دلیہ مل جائے اسی کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس دور میں جو فلمیں بن رہی تھیں تماشائی اسی پر صد شکر کے ساتھ گزارا کر رہے تھے۔ ارتحشام اور اس کے بھائی مستفیض کا اصل مقصد بس بے بچانا تھا۔ کم سے کم خرچ میں فلم بنانا تھا۔ اس نے اپنی پہلی فلم میں موسیقاری حیثیت سے بہت محنت کی۔ اپنی صلاحیتوں سے بڑھ کر کام کیا۔ ہر قدم پر ارتحشام اور مستفیض نے اس کے کام کی تعریف کی۔ وہ بہت خوش تھا۔ مگر جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس کے کریڈٹ پر اپنے ساتھ فردوس بیگم کا نام دیکھ کر اسے بڑا دکھ ہوا۔ فردوس بیگم نے اس فلم میں کئی گیت گائے تھے۔ اور ایک اچھی گلوکارہ کا کردار ادا کیا تھا۔ پھر بھی اس کا نام بطور موسیقار دیا گیا تھا۔ اس دکھ کو اس نے اپنے اندر رکھ لیا۔

اپنے جذبے کا اظہار کسی سے نہیں کیا۔ نہ ہی فلم ساز ادارے اور اس کے کردار و ہر تاؤں سے۔ بعد میں معلوم ہوا

بطور موسیقار ڈھا کے کی اردو فلموں کے نعمات کا انتخاب

| فلم | آواز | گیت کے بول |
|-------|---------------------------|--|
| چندا | فردوس بیگم | اکھیاں توری راہ نہاریں او پروسیا آجا |
| | | رنگ روپ جوانی، دیکھو رت ساون سہانی |
| | فردوس بیگم، نجم الہدیٰ | موت کی ہے پکار، دیپ بچھا دو |
| | اجمن آراء | چاندنی بھلی بھلی، انجانے میں کہاں دل کھو گیا |

کہ فلم ساز و ہدایت کار نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ روبن بالکل نئے نئے تھے۔ اور فردوس بیگم نامور لوک گلوکار عباس الدین کی صاحبزادی اور مدھر آواز کی گلوکارہ تھی یہ حرکت ارتحشام نے اپنی پہلی اردو فلم ”چندا“ میں بھی کی تھی۔ فردوس کا نام شریک موسیقار کی حیثیت سے دیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں دکھائی جانے والی پرنٹ میں فردوس بیگم کا نام زیادہ فٹس کیا گیا تھا۔

”راجدھانی بوکے“ کے بعد مستفیض نے اپنی بنگالی فلم ”ہارا نو دن“ (گمشدہ ایام) شروع کی تو اس میں بھی روبن کو میوزک ڈائریکٹر منتخب کیا۔ مگر اپنے بھائی کی طرح اس نے اس نوجوان کی حق تلفی نہیں کی۔ اس فلم میں اسے سولو موسیقار کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا اور اس حیثیت سے یہ اس کی پہلی فلم تھی۔

”راجدھانی بوکے“ کے گانوں کی دھنیں اس نے بڑی دلکش اور میلوڈیئس بنائی تھیں۔ بلکہ اس کی اس بات نے بھی اس فلم کی مقبولیت میں اضافہ کیا تھا کہ اس کے دو گیت بھارت کے نامور گلوکار طلعت محمود سے بھی گوائے گئے تھے۔ جن میں سے ایک گانا یہ تھا۔ ”تو مارے لگے جھے اتو جے بہا لو چاندو جھی تا جانے“

یہ نغمہ بہت پاپولر ہوا جس کا کریڈیٹ ان کو ملا۔ ملنا بھی چاہیے تھا کہ انہوں نے بھارت جا کر یہ گیت ریکارڈ کرایا تھا۔ چندا نے زبردست کامیابی حاصل کر لی تھی اور اس کا نام ہر جانب کامیابی کی ضمانت سمجھا جانے لگا تھا۔

”پتلا“ کی زبردست کامیابی کے بعد ڈھاکے میں اردو فلموں کا گویا سیلاب آ گیا۔ تلاش، پیسے، چکوری، بندھن اور بھیا وغیرہ میں بھی اس کو پہلی ترجیح کے طور پر کاسٹ کیا گیا۔ اس دوران پنگلہ زبان کی پروڈکشن بہت کم ہو گئی تھی۔ سقوط ڈھاکہ سے قبل بطور موسیقار اس کی دو بنگالی فلمیں ”ناچیر پوتوتل“ (ناچنے والی گزیا) اور ”بیچ ڈھالا پوتھ“ (کوتار سے بنائی گئی سرنگ) ریلیز ہوئی تھی۔

وہ سرنگیت کی سدھ بدھ رکھنے والے موسیقار تھے۔ اس لیے ابتدا ہی سے.... اچھی آواز کی تلاش میں رہتے تھے۔ ”تلاش“ میں انہوں نے گلوکار بشیر احمد کو متعارف کرایا۔ جس نے آگے چل کر نغمہ نگار اور موسیقار کی حیثیت سے بھی آپ اپنے کو پیش کیا اور کامیاب رہا۔ اور پھر جب مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) میں موسیقار کی حیثیت سے اس کے سنہری دور کا آغاز ہوا تو لاہور میں بھی اس نے بہت سی خوبصورت آوازوں کو سامنے لانے کی بڑی مسکن کوشش کی۔ ایسے گلوکاروں میں اخلاق احمد کا نام سرفہرست ہے۔ جبکہ نیرہ نور کو بھی اس نے اپنی فلموں میں خصوصی طور پر پیش کیا۔ اس سے پہلے فلم والوں نے نیرہ نور کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اپنی فلموں کے لیے اس کی آواز میں گانے ریکارڈ کرائیں۔ اس دور میں زیادہ تر موسیقار ملکہ ترنم مادام نور جہاں ہی سے اپنی فلموں کے زیادہ سے زیادہ گانے ریکارڈ کراتے تھے۔ مگر اس نے مادام کی آواز کا سہارا کبھی نہیں لیا۔ اپنی کسی فلم میں ان سے ایک گیت بھی ریکارڈ نہیں کروایا۔ اچھی آوازیں اسے جہاں بھی نظر آئیں انہیں اپنی فلم میں گانے کا موقع دیا۔ اب وہ مستند مانا جانے لگا تھا۔ لوگ ادب سے نام لینے لگے تھے۔ رونا لیلیٰ، ناہید نیازی، نجم نیازی، مہناز، روبینہ بدر، آرن پروین، شبنم مجید، انجن آراء، مالا اور گلوکاروں میں عالمگیر، مسعود رانا، مجیب عالم، نجم الہدیٰ، اے نیر۔ غلام عباس، عبدالجبار کے علاوہ اس دور کی مستند آوازوں مہدی حسن اور احمد رشدی کی آوازوں سے بھی اپنے گیتوں کو سجایا۔ وہ گانے والوں کی قدر و قیمت کو جانتے تھے۔ کہانی اور سچویشن کے پیش نظر جہاں جس کو مناسب سمجھتے تھے۔ اس کی آواز میں گانا ریکارڈ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کمپوزیشن میں تخلیق پانے والے گیت انگوٹھی میں نگینے کی طرح ہوتے تھے۔ ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن وہ بخوبی اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔ احمد رشدی کی آواز کے وہ ابتداء سے ہی اسیر تھے۔ مگر اس سے

وہی گیت گواتے جہاں اس کی آواز کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ”بندش“ کا گانا۔ ”نہ سونا نہ چاندی نہ کوئی محل جان من تجھ کو میں دے سکوں گا“ اخلاق احمد سے ریکارڈ کروایا۔ احمد رشدی یا مہدی حسن سے نہیں جو یقیناً اخلاق احمد سے زیادہ مجھے ہوئے اور مستند گلوکار تھے۔ فلم کی ضرورت کے لحاظ سے وہ اخلاق احمد کو زیادہ مناسب گلوکار سمجھتے تھے۔ یہ گیت فلم کا سپر ہٹ ساٹنگ ہے۔ نغمہ نگار سعید گیلانی نے یہ گانا لکھا بھی بڑے عجیب انداز سے ہے۔ اس میں عام گیتوں کی طرح نہ کوئی قافیہ ہے نہ ردیف۔ اس کی کیفیت نثری نظم جیسی ہے۔ ایسے کسی نغمہ کو کمپوز کرنا بھی ہنرمندی کا کمال ہے۔

انہوں نے مادام نور جہاں اور ناہید اختر جیسی منجھی ہوئی اور پختہ گلوکاراؤں سے ایک بھی گیت نہیں گویا۔ اس کی وجہ ان سے کوئی ناراضگی یا دشمنی نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر موسیقار یہ سمجھ کر ان سے اپنی فلموں کے گیت ریکارڈ کرواتے تھے کہ ان کے خیال کے مطابق ان دونوں میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ ہر ٹائپ، ہر قسم کے گیت گاسکتی تھیں۔ روبن ایسی سہل پسندی کے قائل نہیں تھے۔ وہ فلم کے سبکیٹ، فلموں کی کہانی کی سچویشن کو سامنے رکھ کر موسیقی کمپوز کرتے تھے اور جس گلوکار یا گلوکارہ کی آواز کو بہترین تصور کرتے تھے اسی کی آواز میں گیت ریکارڈ کرتے تھے۔ دراصل یہ ان کی اس تربیت کا نتیجہ تھا جو اس نے ابتدائی دور میں حاصل کی تھی۔

یوں تو انہوں نے موسیقی کا سہلا سبق استاد یوسف قریشی اور استاد عبداللطیف سے لیا تھا لیکن جب وہ موسیقار کی حیثیت سے فلموں کی موسیقی ترتیب دینے لگے تو خیال آیا کہ اس فیلڈ میں جو مستند لوگ ہیں ان سے بھی کچھ سیکھنا چاہیے۔ لہذا وہ نکلے گئے اور موسیقار سلسل چوہدری سے مل کر مدعا بیان کیا۔ ”گرودیو! میں آپ سے فلمی موسیقی کے بارے میں تربیت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

چوہدری صاحب نے سر سے پاؤں تک اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ بیس بائیس سال کا چمڑے بدن کا ایک نوجوان ان کے سامنے موجود تھا۔ اپنے لباس اور انداز گفتگو سے وہ کسی اچھے خاندان کا لگتا تھا۔ ”کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کیا کرتے ہو؟“

نوجوان نے اختصار کے ساتھ بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا تمہیں بتا دوں گا۔“

سلیل چوہدری بنگالی موسیقاروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ فلموں کی میوزک ڈائریکشن میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ ان کا شمار ہندوستان کے عظیم بنگالی موسیقار ایس ڈی برمن اور ہمننت کمار جیسے فنکاروں میں ہوتا تھا۔ جن کی فلمی دھنوں کا جاوید سرا چڑھ کر بولتا تھا۔ جن کی عظمت اور شہرت کے ڈنکے آج بھی بج رہے ہیں۔ ایسے موسیقار کا شاگرد ہونا ہی بڑے اعزاز اور فخر کی بات تھی۔ روبن نے ان سے فلمی موسیقی کے بھید بھاؤ ہی نہیں سیکھے دیگر اچھی اور سو مند باتوں کی بھی تعلیم حاصل کی۔ انہی باتوں میں سے یہ بات بھی تھی کہ وہ گلوکار، یا گلوکارہ جو بہت زیادہ پاپولر ہو اس سے گانے ریکارڈ کرواؤ گے تو گانے کی مقبولیت کا سارا کریڈیٹ گانے والے کے کھاتے میں جائے گا۔

”تو پھر کیسے گانے والوں کو اپنی فلم کے لیے منتخب کیا جائے؟“

”اچھے موسیقار کی یہ خوبی ہوتی چاہیے کہ فلم کی کہانی اور سچو لیش کے مطابق فیصلہ کرے کہ کس کی آواز کردار پر پوری اترے گی۔“

”استاد محترم! وہ لوگ جو تاجی اور محمد رفیع سے ہی اپنے گانے ریکارڈ کرواتے ہیں کیا ان کا ایسا کرنا درست نہیں؟“

نہیں بالکل درست نہیں، تا، محمد رفیع، کشور کمار اور کئی نگر ایسے ہیں جو ہر طرح کے گیت گانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے گائے ہوئے گانے ہٹ ہوتے ہیں تو گانے والے کو اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ موسیقی کی دھنیں کمپوز کرنے والے موسیقار کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ نہیں ہوتا۔ تمہیں اچھا میوزک ڈائریکٹر بننا ہے تو بڑی اور مستند آوازوں کا سہارا نہ لو۔ فلم کی ڈیمانڈ کے مطابق جس کی آواز مناسب ہو، اس سے گانے ریکارڈ کرواؤ خواہ وہ کتنی ہی غیر معروف اور نئی آواز ہو۔

یہ اور ایسی بہت سی باتیں اس نے سلیل چوہدری کے زیر سایہ رہ کر سیکھیں۔ موسیقی کے بنیادی اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کی جو اس کے بعد کے کیریئر میں ہمیشہ اس کے کام آئی۔ یہ تجربہ اس کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ ایک موسیقار گلوکاری کی صلاحیت سے کس طرح بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ ہنر اس نے سلیل

روبن گھوش نے جب ڈھاکے میں میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو اسے کئی پرانے اور پختہ کار موسیقاروں کے علاوہ کچھ نئے میوزک ڈائریکٹروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ پختہ موسیقاروں میں خان عطاء الرحمان، بل داس، مصلح الدین اور دھیر علی منصور موجود تھے جبکہ نئے موسیقاروں میں جنہوں نے اس کے ساتھ یا بعد میں فلم انڈسٹری میں قدم رکھا ان میں کریم شہاب الدین، بشیر احمد، علی حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن روبن گھوش نے نہ پرانوں کی موجودگی سے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کیا، نہ ہی نئے مد مقابل کو خاطر میں لایا۔ بس اپنے کام سے کام بہرہ رکھا۔ اپنے گیتوں کی دھنوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے پر توجہ دی۔ کسی تعصب یا کاروباری رقابت سے بالا ہو کر کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی موسیقی میں نکھار آتا گیا۔ اس کی صلاحیتوں اور فنی خوبیوں کی خوشبو مغربی پاکستان تک جا پہنچی اور جب وہ یہاں آیا اور گراچی، لاہور میں اپنے کیریئر کا نیا دور شروع کیا تو یہاں بھی اسے ٹف ٹائم ملا۔ یہاں مشرقی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ مہان کلاکاروں کی حکمرانی تھی۔ خواجہ خورشید انور، دیبو بھٹا چاریہ، جی اے پستی، سہیل رعنا، حسن لطیف، فیروز نظامی، ایم اشرف، عنایت حسین بھٹی، ماسٹر عبداللہ، کمال احمد، نذیر علی، صفدر حسین، تصدق حسین، رفیق غزنوی اور ماسٹر غلام حیدر جیسے موسیقاروں کا فلم انڈسٹری میں طوطی بولتا تھا۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے اور جوان سال کمپوزر کا ٹکنا اور اپنی فنی صلاحیتوں کا چراغ جلانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس کے استادوں نے اسے کامیابی حاصل کرنے کا جو سبق پڑھایا تھا اس پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنی ہر فلم پر جو موسیقی ترتیب دی۔ اس نے نہ صرف اس کے گیتوں کو مقبول عام بنایا بلکہ فلم کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔

چوہدری کی شاعری میں رہ کر سیکھا۔

یہ سلسلے چوہدری نے جنہوں نے طلعت محمود جیسے منفرد گلوکار کے جوہر کو پرکھا اور اپنی فلم کے ذریعہ متعارف کروایا۔ یہ بات بھی روبن کو چوہدری سلسلے کی شاعری کی دوران معلوم ہوئی اور انہوں نے اسی زمانے میں یہ سوچ لیا کہ وہ بھی اپنے استاد کی طرح نئی اور ابھرتی ہوئی آوازوں کو اپنی موسیقی کے ذریعے شہرت کی بلندیوں تک پہنچائے گا۔

ڈھا کا واپس آنے کے بعد انہوں نے ڈھا کے میں موجود بنگالی موسیقار مصلح الدین سے بھی رابطہ کیا۔ مصلح الدین اردو فلم ”ہمسفر“ کی موسیقی ترتیب دے کر خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے دو گانے ہمست کمار اور سندھیا کھرچی کی آوازوں میں ریکارڈ کیے گئے تھے۔ یہ فلم 1960ء میں ریلیز ہوئی تھی اور خاصی پسند کی گئی تھی۔ اس کو مصلح الدین کے بارے میں یہ جانکاری ملنے ہی میں ہوئی تھی۔ واپس ڈھا کے آ کر پہلی فرصت میں ان سے ملا اور اکتساب فن حاصل کیا۔ مصلح الدین نے انہیں بتایا تھا کہ کبھی کبھی مستند آوازوں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے۔ مگر موسیقار کو اس وقت عزت اور شہرت حاصل ہوتی ہے جب وہ ابھرتی ہوئی آوازوں کو جلا بخشتے ہیں۔ ناہید نیازی اور نجمہ نیازی اس کی مثالیں ہیں۔ مصلح الدین نے جنہیں اپنی فلموں کے ذریعے شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔

روبن کے خمیر میں ابتدا ہی سے موسیقی رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ جب اس میدان میں اترے تو شروع ہی سے انہوں نے موسیقی کی تعلیم و تربیت کو اہمیت دی۔ جس کے نتیجے میں وہ استادوں کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے۔ مستند آوازوں کا سہارا لینے کی بجائے ان آوازوں سے کام لیا جنہیں سہارے کی ضرورت تھی۔ ندیم اور عالمگیر اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ ندیم کو ندیم بننے سے پہلے جب وہ نذیر بیگ تھے گانے کا موقع دیا۔ اور عالمگیر جب وہ کراچی ٹیلی ویژن کا ایک منکر تھا۔ اسی طرح شہناز بیگم کو بھی انہوں نے فلمی گیت گانے کا موقع دیا جو اسٹیج پر یا تقریبات میں گاتی تھیں۔

بشیر احمد، نیرہ نور اور اخلاق احمد کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں کہ انہوں نے ہی انہیں گتائی کے اندھیرے سے نکال کر شہرت کے آسمان پر چاند سورج بنایا تھا۔ فریجہ پرویز کو بھی اخلاق احمد کے ساتھ فلم ”گھونگھٹ“ میں گانے کا اس وقت

موقع دیا جب وہ غیر معروف تھی اور اس نے ”چنگ باز جہاں سے“ کا کرشمہ حاصل نہیں کی تھی۔ اسی طرح گتائی کا گلوکار محمد علی شہکی کو بھی اپنی فلم ”انمول محبت“ میں گانے کا موقع دیا جو صرف اسٹیج کی حد تک جانا پہچانا جاتا تھا۔

جب کہ سارے میوزک ڈائریکٹرز اس بات کے متحقی ہوتے تھے کہ ملکہ ترنم مادام نور جہاں ان کی فلم میں گانے پر رضامند ہو جائیں۔ روبن نے اس دور میں بھی فردوسی بیگم، رونا لیلیٰ، مہناز، ناہید نیازی اور نیرہ نور جیسی جونیر گلوکاراؤں کی آوازوں سے اپنے گیتوں کو سجایا اپنی موسیقی کو کامیاب بنایا۔

گویا اس کے ذکر کے بغیر پاکستانی فلمی موسیقی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ رتبہ یہ مقام ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ جنہیں نصیب ہوتا ہے انہیں بھی ایک دن میں نہیں ملتا۔ انہوں نے بھی اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت اسٹریگل کیا ہے۔ بڑی جدوجہد کی ہے۔ اب تو آپ پہچان ہی گئے ہوں گے کہ ہم کس کا ذکر کر رہے ہیں جی ہاں روبن گھوش کا جس کے انتقال کو ابھی کچھ ہی دن گزرے ہیں۔

بے بی اسلام کی اردو فلم ”تہا“ بہت کم لوگوں نے دیکھی ہے جن لوگوں نے دیکھی ہے انہوں نے روبن گھوش کو اس فلم کے ایک منظر میں جو کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ کا تھا اس میں ایک ٹیبل کے گرد بیٹھا بیٹھا ہوا دیکھا ہوگا۔ ”تہا“ چندا سے پہلے بننے والی اردو فلم تھی۔ جسے احتشام نے سنسر بورڈ کے چکر میں پھنسا کر اپنی فلم چندا پہلے ریلیز کر دی تھی۔ یہ ایک طویل کہانی ہے جو پھر بھی سناؤں گا۔ اس وقت اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ روبن گھوش نے ایک ایکسٹرا اداکار کی حیثیت سے بھی کام کیا ہے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح انہیں اداکاری کا شوق تو نہیں تھا لیکن ضرورت اور وقت کے تقاضے کے تحت انہوں نے اداکاری بھی کی۔ قاضی ظہیر کی فلم ”بندھن“ اور رحمان کی ”درشن“ میں بھی وہ مہمان اداکار کی حیثیت سے نظر آئے۔ اور گیٹ آرٹسٹ کے طور پر روبن گھوش کا نام ٹائٹل پر بھی موجود ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ ایک موسیقار کی حیثیت سے اسٹیبلش ہو چکے تھے۔ وہ ابتداء ہی سے خوش پوش تھے اس لیے کسی ہیرو سے کم نظر نہیں آتے تھے۔

جبرنا بھی ایک مدت تک ایکسٹرا اداکارہ کے طور پر فلموں میں کام کرتی رہی تھی۔ جسے ”چندا“ میں پہلی بار ایک مکمل اداکارہ کے طور پر اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا

موقع ملا۔ احتشام نے اسے جہرنا سے شبنم بنا دیا۔ اس فلم کی ہیروئن سلطانہ زمان تھی مگر چندا کی نمائش کے بعد شبنم کے کام کو زیادہ سراہا گیا۔ مستفیض نے تلاش بنائی تو شبنم کی اسی عوامی مقبولیت کو سامنے رکھ کر اسے رحمان کے مقابل لیڈنگ روم میں پیش کیا اور حسب توقع اس نے فلم دیکھنے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ تلاش فنی لحاظ سے چندا سے بہتر فلم تھی۔ کہانی کے علاوہ اداکاری اور اپنے گیتوں کی وجہ سے بھی اس فلم نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یہ فلم 3 مئی 1963ء کو عید الاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں روبن گھوش کی موسیقی نے اس کی مقبولیت میں چار چاند لگا دیئے۔ روبن گھوش نے بشیر احمد کو تلاش میں متعارف کرایا اور اس نئے گلوکار سے ایسے گیت ریکارڈ کرائے کہ وہ مستند گلوکاروں کی صف میں شامل ہو گیا۔ ”کچھ اپنی کہیے۔ کچھ میری سنئے۔ یہ شام یہ تنہائی۔ یوں چپ تو نہ رہیے۔“ اس گیت کو بشیر احمد اور شبنم یا سیمین نے الگ الگ گایا تھا جبکہ ”میں رکشا والا متوالہ۔ رنگ برنگے شہر کے کونے کونے کا رکھوالا۔“ اسی طرح اس کا دور سرا سولو گیت۔ ”میں نے آج پی لی تو کیا ہوا۔ تھوڑا تھوڑا ہوش میں تو ہوں۔“ دیگر گانوں میں فردوسی بیگم، نینا، ملکہ پروین اور جیوتی مرزا کی آوازوں میں کورس گیت۔ ”جان گئی رے، چپکے سے دل میں تیرے کون آیا رے“ نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی۔ روبن گھوش نے اس فلم کے لیے دس گیت کمپوز کیے تھے جو سب کے سب سرور بارہ بنگلوی نے لکھے تھے۔ روبن گھوش کو اس فلم کی عمدہ موسیقی کے صلے میں 1963ء کے بہترین موسیقار کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔ جو کسی موسیقار کی دوسری ہی فلم میں حاصل کرنا بڑے اعزاز کی بات تھی۔

جب کوئی فلم ہٹ ہوتی ہے۔ اس کے ماتھے پر عوامی مقبولیت کا جھومر جگمگاتا ہے تو اس میں بہترین پر فارم کرنے والوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ ”تلاش“ کی کامیابی سے نہ صرف مستفیض کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی بلکہ روبن گھوش کو بھی ایک باصلاحیت موسیقار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ نئے گلوکار بشیر احمد کو بھی زبردست عوامی مقبولیت ملی۔ جبکہ رحمان اور شبنم کی جوڑی کو بھی بہترین سمجھا گیا۔ اب روبن گھوش کے آگے کھلا راستہ تھا جس پر چل کر اس نے اپنی فلمی جولانیوں کا مظاہرہ کیا۔ ”پیسے“۔ ”بند سن“۔ ”تم میرے ہو“۔ ”کارواں“۔ ”بھیا“۔ ”چکوری“ ایک سے بڑھ کر ایک فلم کی موسیقی ترتیب دے کر اس نے اپنے لیے

☆ ہدایتکار حسن محسکری کی فلم ”ہم اور تم“ جو 27 دسمبر 1985ء کو ریلیز ہوئی تھی جس کے موسیقار روبن گھوش تھے۔ سلمیٰ آغا کی خواہش تھی کہ وہ اس فلم میں پلے بیگ سگر بنے مگر روبن گھوش یہ نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مہناز سے اس فلم کے گیت گنوائے۔ مگر سلمیٰ آغا نے جانے کیسے ان نعمات کو بیرون ملک لے جا کر مہناز کی جگہ اپنی آواز ڈب کروائی، مہناز کے گائے ہوئے گیت ”اس موسم میں دل نہیں بھرتا کبھی کبھی“ کی ریکارڈنگ اپنی آواز میں کروائی، مگر سلمیٰ آغا کی آواز میں گایا ہوا یہ گیت فلم میں شامل نہ ہو سکا۔ جبکہ دیگر چار سولو اور ایک دو گانا فلم میں شامل تو ہوئے مگر کوئی تاثر نہ چھوڑ سکے۔

☆☆☆

☆ روبن گھوش کو دلوں کو چھو لینے والی موسیقی ترتیب دے کر فلموں کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے صلے کے طور پر تلاش، چکوری، چاہت، آئینہ، امیر اور دوریاں میں بہترین موسیقار کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔ جبکہ دیگر ایوارڈز سے بھی اس کی فنی عظمت کا اظہار کیا گیا۔

☆☆☆

☆ 1976ء میں ایک فلم ”پلاس“ کے لیے روبن گھوش نے 7 نئے ریکارڈ کروائے تھے۔ لیکن یہ فلم کسی وجہ سے ریلیز نہ ہو سکی۔ اسی طرح 1987ء میں ایک فلم جانے انجانے کے نام سے بنائی گئی۔ جس کی موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی۔ بنگلہ دیش کے ساتھ کو پروڈکشن تھی۔ یہ فلم بنگلہ دیش میں بنگالی زبان اپوش کے نام سے ریلیز کی گئی مگر پاکستان میں اردو ورژن ”جانے انجانے“ کے نام سے ریلیز نہ ہو سکی۔“

☆ محمد جاوید فاضل کی فلم ”آہٹ“ کے پانچ نعمات کی موسیقی روبن گھوش نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم 1982ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم ”آہٹ“ کے دو نئے بعد میں 1995ء میں فلم ”آوارگی“ میں بھی شامل کیے گئے۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

پاکستانی فلمی صنعت میں ایک ممتاز اور مستحکم مقام حاصل کر لیا۔

چونکہ روبن گھوش ایک جینون موسیقار تھا۔ اس لیے اس نے اپنی مقبولیت میں کبھی کسی نغمہ نگار یا گلوکار کا سہارا نہیں لیا۔ کسی کو یہ کہنے کو موقع نہیں دیا کہ چندا اور تلاش میں اس کے گانے اس لیے مقبول ہوئے کہ وہ سرور صاحب جیسے بڑے شاعر نے لکھے تھے۔ ”بیے“ شاعر صدیقی کے چارہ قاضی ریاض کا ایک، فیاض ہاشمی کے تمن اور بی اے دیپ (بشیر احمد) ایک گیت شامل تھا۔ ”کارواں“ کے گیت شاعر صدیقی اور بی اے دیپ نے لکھے تھے۔ ”بے گانہ“ کے نغمہ نگار شاعر صدیقی تھے۔ ”بھیا“ کے گیت شاعر صدیقی اور عشرت کلثوی کے زور قلم کا نتیجہ تھے۔ اسی طرح ”چکوری“ کے آٹھوں گیتوں کا خالق بالکل ایک نیا شاعر اختر یوسف تھا۔ مگر دیکھیے چکوری کے یہ گانے کس قدر مقبول ہوئے ”کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہیں یہ بہاریں یہ سماں“۔ ”وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں“۔ ”کبھی تو تم کو یاد آئیں گی، وہ بہاریں وہ سماں“۔ ”کارواں“ کے گیتوں میں سلیم رضا کا گایا ہوا گیت ”تیری تصویر بناتا ہوں مٹا دیتا ہوں“ اور بشیر احمد کا لکھا ہوا اور گایا ہوا گیت ”جب تم اکیلے ہو گے ہم یاد آئیں گے“ اور قلم ”بھیا“ کے لیے شاعر صدیقی کی لکھی ہوئی یہ توالی۔

مدینے والے سے میرا سلام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے تمہارا قلام کہہ دینا
نے عوامی مقبولیت کی سند حاصل کی۔ یہ سارے نغمے وہ ہیں جو آج بھی کل کی طرح مقبول ہیں اور شوق سے سنے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں دستور یہ ہے کہ فلساز و ہدایہ کار فنکاروں اور دیگر ہنرمندوں کی طرح نغمہ نگاروں کا انتخاب بھی خود کرتے ہیں اور موسیقار سے یہ کہتے ہیں کہ آپ اپنی کمپوز کی ہوئی دھنوں میں ان سے گیت لکھوائیں۔ روبن گھوش کو جب جہاں اور جو گیت نگار ملا اس نے اسی سے اپنے من پسند گیت لکھوائے۔ جس کی کامیابی میں اس کی کمپوزیشن کا بڑا حصہ ہوتا تھا۔

روبین گھوش نے ڈھاکہ کی فلموں ہی سے اپنی شہرت کے ڈکے بھجوا دیے تھے۔ مگر جب اس نے کراچی اور لاہور کی فلموں کی موسیقی ترتیب دینی شروع کی تو اس کی فلمی خوبیاں سرچڑھ کر بولنے لگیں۔ یہاں پہلے سے ایک سے بڑھ کر

ایک موسیقار تھے۔ ان کی موجودگی میں کسی نئے آنے والے کا قدم جمانا آسان نہ تھا۔ لیکن روبن گھوش کو اللہ اور اپنی خداداد صلاحیتوں پر بھروسہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے کام پر توجہ دی اور محنت اور لگن کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ اس لیے یہاں بھی بڑی سے بڑی کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

یہاں آنے کی تفصیل سے پہلے ڈھاکہ کی موجودگی میں ہونے والی کچھ باتوں کا ذکر ہو جائے۔ جن میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات ان کی شادی ہے۔ سابقہ جھرنات اور موجودہ شبیم کے ساتھ ان کی شادی خانہ آبادی 21 دسمبر 1965ء کو ہوئی۔ شبیم نے بھی اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو اسے بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ جوڑ کیاں ایکسٹرا کے طور پر اپنی فنی زندگی کا آغاز کرتی ہیں انہیں کامیاب اداکارہ بننے کے لیے بہت ٹھن اور دشوار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن ڈھاکہ کی فلمی صنعت چونکہ ان دنوں ابتدائی مرحلے میں اور بہت محدود تھی۔ اس لیے جھرنات یا اس جیسی دیگر لڑکیوں کو بہت زیادہ دشواریاں نہیں جھیلنا پڑیں۔ اردو فلموں کی شروعات اور ان کی کامیابی سے انڈسٹری میں وسعت آئی تو چھوٹے موٹے کردار ادا کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ جھرنات کو بھی چندا میں بڑا کردار ملا اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر وہ آگے بڑھتی رہی۔ قلم انڈسٹری میں اس کا سپورٹر اور سہارا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے اسے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اس نے روبن گھوش سے جو دوسرے قلم والوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب اور شاکھہ تھا دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ روبن کو اندازہ تھا کہ اگر یہ غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تو ایک ابھرتی ہوئی باصلاحیت اداکار کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ اس سوچ نے روبن کو شبیم کے قریب کر دیا۔ اب وہ قلم اور قلم والوں کے بہت سے معاملات میں اس سے مشورے کرنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی دوستی محبت میں بدل گئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو اپنا جیون ساکھی بنا لیا۔

ان کی شادی کی تقریب ڈھاکہ کا قلم انڈسٹری کی بہت بڑی اور بے حد شاندار تقریب تھی۔ اس سے پہلے کسی فلمی فنکار یا شخصیت کی شادی اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہوئی تھی۔ روبن گھوش نے اس تقریب میں پوری قلم انڈسٹری ہی کو مدعو نہیں کیا تھا بلکہ عمائدین شہر اور سرکاری اور تجارتی شخصیتوں کو بھی دعوت دی تھی۔ صحافیوں کو بھی اس شخصیتوں

سے بالاتر ہو کر کہ اس کا تعلق شو بزم سے ہے یا نہیں سب کو بلایا تھا۔ شرکاء کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود بڑے نظم و ضبط کے ساتھ یہ پروکار اور شاندار تقریب اختتام پذیر ہوئی تھی۔

شادی کی دوسری بڑی تقریب جوڑھا کے میں ہوئی تھی وہ ندیم اور فرزانہ کی شادی کی تقریب تھی۔ مگر شہید ہے کہ یہ بن بلائے مہمانوں کی وجہ سے بد نظمی کا شکار ہوئی۔ احتشام اور مستفیض نے بھی بڑا اہتمام کیا تھا اور شبنم اور روبن کی شادی کی تقریب سے بڑی تقریب کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مگر ندیم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے چاہنے والوں نے وہ ہڑ بونگ مچائی کہ تقریب کا سارا حسن ملیا میٹ ہو گیا۔ معزز مہمانوں کو بیٹھنے اور کھانے پینے کی سہولت بھی حاصل نہ ہو سکی اور اچھی خاصی تقریب کا ستیا ناس ہو گیا۔

بات جب شبنم اور روبن گھوش کے ملن کی ہو رہی ہے تو اس تناظر میں یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ شبنم کو اس کی پہلی اردو فلم چندا ہی میں نگار ایوارڈ حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ چندا میں شبنم نے معاون اداکارہ کے طور پر کام کیا تھا۔ اس لیے اسے بہترین معاون اداکارہ کا ایوارڈ ملا۔ جبکہ روبن کو اس کی دوسری فلم تلاش میں بہترین موسیقار کا نگار ایوارڈ ملا۔

ان ابتدائی دو اردو فلموں سے مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) کے فلمی حلقوں میں یہ دونوں ابھرتے ہوئے فنکار نہ صرف متعارف ہوئے بلکہ عوامی حلقوں میں بھی ان کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور وہ جو کہتے ہیں کہ بہترین صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو پھر روکا نہیں جاسکتا۔ تو ان دونوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شبنم نے اداکاری اور روبن گھوش نے موسیقی کے میدان میں ایسی کامیابیاں حاصل کیں کہ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

ہمارے ہاں فلم والوں کی آپس کی شادیاں تو بہت ہوتی ہیں مگر ان میں زیادہ دنوں تک تعلقات استوار نہیں رہتے۔ لیکن شبنم اور روبن کی جوڑی مثالی ثابت ہوئی۔ برے سے برے وقت میں بھی دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی رہے۔ لاہور میں ان کے گھر ڈھکتی اور زیادتی کے بعد بھی دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ برقرار رہا۔ اس موقع پر روبن گھوش نے شبنم کا جس طرح ساتھ دیا،

☆ پرویز ملک کی فلم ”جہاں تم وہاں ہم“ کی کامیاب موسیقی ترتیب کرنے کے باوجود کراچی یا لاہور کے کسی فلمساز نے روبن گھوش کو چار سال تک بطور موسیقار سائن نہیں کیا۔ چار سال کے بعد الیاس رشیدی نے اپنی فلم ”احساس“ کی موسیقی سے روبن گھوش سے کمپوز کروائی اس کے بعد روبن گھوش بطور موسیقار چل پڑے۔

☆☆☆

☆ روبن گھوش کے بطور موسیقار پاکستان میں آخری ایام بہت ٹھ گزرے۔ 29 جنوری 1993ء کو ریلیز ہونے والی فلم ”رنجش“ اور 1993ء کو ریلیز ہونے والی فلم ”خواہش“ میں اس سے ان فلموں کا صرف بیک گراؤنڈ میوزک مرتب کروایا گیا۔ ہدایتکار اکبر رومی کی فلم رنجش کے موسیقار علاؤ الدین علی تھے جبکہ خواہش کے فلمساز معین الرحمان اور ہدایتکار نذر الاسلام تھے۔ موسیقی جاوید اللہ نے مرتب کی تھی۔

☆☆☆

☆ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ”جوڈر گیا وہ مر گیا“ روبن گھوش کی آخری فلم تھی۔ سگیٹا کی نکاح جو جون 1998ء میں ریلیز ہوئی تھی اس میں بھی روبن کا تیار کیا ہوا گیت موجود تھا اس لیے کچھ لوگ نکاح کو اس کی آخری فلم قرار دیتے ہیں۔ یہ قصہ کچھ یوں ہے کہ فلمساز و ہدایتکار شہزاد رفیق نے بہت پہلے اپنی فلم ”پرواز“ کے لیے روبن گھوش سے دو گانے کمپوز کروائے تھے۔ مگر یہ فلم بوجہ بتائی نہ جاسکی۔ لہذا جب شہزاد رفیق نے سگیٹا سے اپنی فلم نکاح بنوائی تو اس میں سے ایک گیت شامل کر دیا۔ یہ دل سے سوئے دلدار کا، پیاسا ہے پیار کا“ آواز اخلاق احمد کی تھی۔ اس فلم نے باکس آفس پر زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ ”پرواز“ کا دوسرا گیت 1996ء میں ریلیز ہونے والی فلم گھونگھٹ میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ گیت فریحہ پرویز اور اخلاق احمد کی آواز میں تھا۔ جس کے بول تھے ”کیسے جیسے تیرے بن، کیسے کئے رات دن“ سید نور اس کے ہدایتکار تھے اور اس فلم نے گولڈن جوبلی کی تھی۔ اس کے فلمساز بھی شہزاد رفیق تھے۔

اس کے زخموں پر اپنی محبت اور ہمدردی کا مرہم رکھا، اس کی دلجوئی کی اس سے رو بن گھوش کی وسعت قلبی اور اخلاقی بلندی کا ثبوت ملتا ہے۔ دونوں کی اس کامیاب جوڑی کو موت ہی توڑ سکی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ دونوں کی دوستی، محبت اور شادی میں ان کے مذہبی عقائد کبھی دیوار نہیں بنے۔ جھرنات پيساک (شبنم) ہندو مذہب سے تعلق رکھتی تھی جبکہ روبن گھوش عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ دونوں نے شادی کے لیے دوسرے پر یہ دباؤ نہیں ڈالا کہ اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارا مذہب اختیار کر لو۔ دونوں اپنے اپنے مذہب پر ہمیشہ برقرار رہے۔ کہتے ہیں کہ روبن کا خاندان بھی کبھی ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر روبن گھوش کے والد ایس ایم گھوش نے عیسائی مذہب اپنالیا تھا۔ ان کے بعد ان کے بچوں نے بھی عیسائیت ہی کو مذہب کے طور پر اپنائے رکھا۔

ڈھا کے میں قیام کے دوران ان کی زندگی میں دوسرا خوشگوار وقوعہ اس وقت ہوا جب ان کی اگلتائی میں ان دونوں کی محبت کا پھول کھلا۔ یہ روئی گھوش تھا ان کی نرینہ اولاد۔ 1966ء ان دونوں کے لیے اس لیے بہت اہم سال تھا کہ اس میں ان دونوں کی زندگی کا سرمایہ روئی کی شکل میں انہیں ملا تھا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد جہاں روبن گھوش کی موسیقی میں اور نکھار آیا وہاں شبنم کی بے پناہ مسرت نے اس کے خدو خال میں انقلابی اضافہ کیا۔ ”درشن“ کی شوٹنگ کے دوران میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ شبنم نہیں تھی جو پہلے نظر آتی تھی۔ پہلے وہ دہلی پٹی، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سوگھی ہوئی اور نسوانی کشش سے عاری نظر آتی تھی۔ مگر اب رحمان کے ساتھ اداکاری کرنے والی شبنم بھرے بھرے جسم کی مالک تھی۔ جسم کا ہر عضو سیڈول اور تپتا ہوا۔ نظریں ٹھہرتی نہیں تھیں۔ میں نے وہاں موجود ایک صحافی دوست سے پوچھا۔

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا

کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

دوست نے کہا ”جس طرح غم انسان کو دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے اسی طرح خوشی زندگی کی کھیتی کو پہلہ لادیتی ہے اور جب خوشی اندر کی ہو اور روحانی ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماں بننا عورت کی خوشی کی معراج ہے۔ اس خوشی اور اس کی تمنائیت ہی نے اس کے بدن کی سوگھی شاخ کو ہرا بھرا کر دیا ہے۔“

”ملن“ کے بعد رحمان کی کئی فلمیں باکس آفس پر کامیاب نہیں ہو سکی تھیں مگر ”درشن“ نے توقعات سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کامیابی میں جہاں دوسرے عوامل شامل تھے وہاں اس فلم کی ہیروئن شبنم کا پُرکشش اور پُرشباب سراپا بھی تھا۔ اس ذکر کا مطلب و مقصد یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر فلم والے یہ سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد اداکاروں اور اداکاروں کی عوامی مقبولیت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر آرٹسٹ فنی خوبیوں سے مالا مال ہو تو اس کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہر اچھی فلم اسے پہلے سے زیادہ شہرت اور مقبولیت عطا کرتی ہے۔

قاضی ظہیر کی فلم ”بھیا“ میں وحید مراد کو ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا۔ چتر اس فلم کی ہیروئن تھی جبکہ روبن گھوش اس کے موسیقار تھے۔ اس فلم کے دوران وحید مراد شبنم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنی فلم میں کام کرنے کے دعوت دے دی۔ اگرچہ وہ ”بھیا“ کی کاسٹ میں شامل نہیں۔ یہ پیش کش انہوں نے روبن گھوش کے توسط سے کی تھی۔

”ٹھیک ہے ہم سوچ کر جواب دیں گے۔“ دونوں میاں بیوی نے اس مسئلے پر غور کیا۔ کچھ مخلص احباب سے مشورہ کیا اور بلاخر فیصلہ کیا کہ وحید مراد کی آفر قبول کر لی جائے۔ پہلے دونوں کو اس بات پر تشویش تھی کہ نئی جگہ نئے ماحول میں ہم نئے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ بھی کر سکیں گے؟ بہر حال دونوں میاں بیوی 1967ء کے وسط میں کراچی پہنچ گئے اور ”سمندر“ سائن کر لی پھر وحید مراد نے اس کی شوٹنگ کا آغاز کر دیا۔ معروف ہدایت کار پرویز ملک نے وحید مراد کی وساطت سے روبن گھوش سے رابطہ کر کے ذاتی فلم ”جہاں تم وہاں ہم“ کے لیے بطور موسیقار معاہدہ کر لیا۔ اس طرح مغربی پاکستان میں روبن گھوش کی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ فلم جس کے ہیرو وحید مراد تھے 1968ء میں ریلیز ہوئی اور روبن گھوش کی دلکش دھنوں کی وجہ سے خاصی پسند کی گئی۔ سرور انور نے تمام گیت لکھے تھے۔ جن میں یہ بہت مقبول ہوئے۔

☆ مجھے تلاش تھی جس کی وہ ہمسفر تم ہو۔ مرے حسین خیالوں کی رہگور تم ہو (مالا احمد رشدی)

☆ اے دیکھا، اے چاہا اے بھول گئے (احمد رشدی)
احمد رشدی روبن گھوش کے پسندیدہ گلوکار تھے۔
روبن چونکہ آوازوں کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے کا مالک

رکھتے تھے۔ اس لیے احمد رشدی کی سدا بہار آواز کے رسیا تھے۔ انہوں نے احمد رشدی کو پہلی بار جس قلم میں ریکارڈ کیا وہ ”پیے“ تھی اور بطور موسیقار یہ ان کی تیسری قلم تھی۔

بی اے دیپ کے لکھے ہوئے پہلے گیت

اف اللہ یہ تر بھی چتون

اف اللہ یہ بن ٹھن

اف اللہ یہ حسن زن

احمد رشدی نے کچھ اس طرح گایا کہ گانے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ”پیے“ مستفیض کی قلم تھی جو 1969 میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس کے بعد روبن کی تقریباً ہر اس قلم میں کوئی نہ کوئی رشدی کا گیت ضرور ہوتا تھا جس کی ضرورت ہوتی تھی۔

☆ محفل میں دو نظریں ٹکرائیں پھر کیا ہوا (بیگانہ۔

احمد رشدی)

☆ بہنا میری پیاری ہے۔ بچی ہے دلاری ہے

(بھیا۔ احمد رشدی)

☆ کبھی تو تم کو یاد آئیں گی وہ بہاریں وہ سال

(چکوری۔ احمد رشدی)

☆ پیارے پیارے یار ہمارے ہاتھ دکھاتے جانا۔

(چکوری۔ احمد رشدی)

☆ ندیا بہتی جائے، بہتی جائے۔ آئے رے کوئی

آئے (تم میرے ہو، احمد رشدی۔ آرن پروین)

☆ تھوڑی سے پیاز ڈالو۔ تھوڑا تھوڑا گھی (بھول۔

احمد رشدی، نیرہ نور)

یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ روبن گھوش محض

اپنی پسندیدہ آوازوں سے ہی کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ قلم کی

ضرورت اور ڈیمانڈ کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ اس لیے نئی

آوازوں کو بھی ان کی مناسب جگہ گانے کا موقع دیتے تھے۔

نذیر بیگ (ندیم) بشیر احمد، اخلاق احمد محمد علی صدیقی، عالمگیر

محمد علی شکی زندہ مثالیں ہیں۔

روبن گھوش نے موسیقار کی حیثیت سے اپنی 37

سالہ پیشہ وارانہ زندگی میں تقریباً 35 قلموں میں 150

گیتوں کی موسیقی ترتیب دی۔ جن میں سے چند ایک گیت

ایسے ہیں جن کی وجہ سے اردو زبان کی فلمی موسیقی کی تاریخ

میں روبن گھوش ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور کئی زمانوں

تک ان کے سچے گیتوں کی گونج سنی اور محسوس کی جائے گی۔

روبن گھوش کی مقبول ترین قلموں میں چند، تلاش، بھیا،

☆ روبن گھوش جس کی پیدائش 1966ء

میں ڈھاکے میں ہوئی تھی۔ باپ کے انتقال کے

وقت اس کی عمر چند مہینے کم پچاس کے قریب

ہوئی۔ پاکستانی میڈیا میں اس کی جو تصویر ماں

باپ کے ساتھ موجود ہے وہ اس کی کسنی کی ہے۔

اس کے بعد کی کوئی تصویر یا کسی خبر کی ہمیں

جانکاری نہیں، وہ برطانیہ سے اپنی تعلیم مکمل کرنے

کے بعد کب ڈھاکے گیا۔ جانے کے بعد اس نے

اپنی عملی زندگی کا آغاز کس حیثیت سے کیا۔ اس کی

شادی کب ہوئی، کب ہال بچے دار ہوا۔ شوبز سے

اس کا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ ایسے کسی سوال کا

جواب ہمارے پاس نہیں۔ چونکہ ماں باپ دونوں

ہی گوشہ گیر ہو گئے تھے شاید اس لیے بھی ڈھاکا

میڈیا نے اس کے بارے میں کچھ بتانے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔

چکوری، جہاں تم وہاں ہم، احساس، چاہت، بھول،

شرافت، آئینہ، امیر، بندش، نہیں ابھی نہیں، کرن اور کلی،

دوریاں شامل ہیں۔ اس طرح روبن گھوش نے جن

ہدایتکاروں کی قلموں کی موسیقی ترتیب دی ان میں احتشام،

مستفیض، ایس ایم پرویز، پرویز ملک، نذر الاسلام، رحمان،

ایس سلمان، شباب کیرانوی اور سرور بارہ بٹکوی کے نام

قابل ذکر ہیں۔ جبکہ وہ شعراء... جن کی شاعری کو لے کر

روبن گھوش نے دھنیں کپڑائیں اور گیت مقبول بھی ہوئے۔

ان میں سرور بارہ بٹکوی، شاعر صدیقی، اختر یوسف، سرور

انور، خواجہ پرویز، فیاض ہاشمی، کلیم عثمانی، تسلیم قاضی، ریاض

الرحمان ساگر، سعید گیلانی اور بی اے دیپ شامل ہیں۔

روبن گھوش نے اپنے دور کی تقریباً تمام ان

آوازوں کو اپنی دھنوں میں سمویا جن کو عوام پسند کرتے

تھے۔ سوائے ملکہ ترنم نور جہاں اور ناہید اختر کے۔ ایسے

گلوکاروں اور گلوکاراؤں میں احمد رشدی، مہدی حسن، رونا

لیلیٰ، مہناز، فردوسی بیگم، نجم نیازی، ناہید نیازی، نیرہ نور،

بشیر احمد، اخلاق احمد، نذیر بیگ (ندیم)، اے نیرہ، غلام

عباس، عالمگیر، مسعود رانا، روینہ بدر، آرن پروین، شبنم

مجید، عبدالباق، محمد علی شکی، فریحہ پرویز، مالا، سلیم رضا، مجیب

عالم، انجمن آراء، محمد علی صدیقی شامل ہیں۔

سال تک نہ صرف اسے اچھی اور بڑی فلمیں ملتی رہیں بلکہ ان کی کامیابی اس کے قدم چومتی رہی۔ اس کی فنی عظمت کا پرچم لہرائی رہیں۔ ”چاہت، شرافت، دوساھی، جیو اور جینے دو، امبر، دوریاں، بندش اور آئینہ“ کی موسیقی نے روبن گھوش کو پاکستان کے صف اول کے موسیقاروں میں شامل کر دیا۔

اچھا کام ہی کامیابی کا سبب بنتا ہے۔ روبن گھوش میوزک کے مزاج کو سمجھتے تھے۔ فلم کی کہانی اور سچویشن کو بھی اچھی طرح جانچتے اور پرکھتے تھے اور اس کے بعد کرداروں کے جذبات اور احساسات کو سامنے رکھنے کے بعد ہی موسیقی کی دھنیں ترتیب دیتے تھے۔ اتنی سوچ بچار۔۔۔ کے بعد دھنوں کا تعین کرنا اور دھنیں بھی ایسی بنانا جو ساعت کے راستے دلوں میں اتر جائے۔ یہی وہ عوامل تھے جن کی وجہ سے ان کے گیت لازوال ثابت ہوئے۔ پاکستانی فلموں کی کامیابی میں اس کے گیتوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے پاکستانی فلمی موسیقی میں اس کا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روبن گھوش جس طرح سے اپنے گیتوں کو تیار کرتے اور اس کے لیے آوازوں کا انتخاب کرتے وہ کسی دوسرے میوزک کمپوزر کے بس کی بات نہیں تھی۔ دراصل یہ اس کی اس تربیت کا اثر تھا جو انہوں نے اپنے استادوں سے حاصل کی تھی۔

فلم کی کامیابی کے لیے کسی ایک آدمی سے توقعات وابستہ نہیں کی جائیں۔ کیونکہ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ فلم کے لیے ضروری ہے کہ اگر موسیقی اچھی ہے تو آوازیں اور شاعری بھی ویسی ہی اچھی ہو۔ اداکار اور ہدایت کار بھی اچھا ہو۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ فلم کو کامیاب بنانے میں موسیقی کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اگر شاعری، موسیقی، اداکاری، عکاسی سمیت تمام اچھے شعبوں کو روبن گھوش جیسا موسیقار میسر آجائے تو پھر بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ روبن گھوش کی ترتیب دی ہوئی موسیقی سے اداکاروں اور اداکاروں کو بہت زیادہ مدد ملتی تھی۔ اس کی دھنوں سے ہر کردار میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ جس پر اس کے گیت فلم بند کیے جاتے کیونکہ اس کی دھنوں میں بے پناہ میلوڈی تھی۔

نئی نسل کے وہ ابھرتے فنکار جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ

یوں تو روبن گھوش کی کامیاب فلموں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سلور جوبلی سے لے کر ڈائمنڈ جوبلی فلمیں بھی شامل ہیں۔ مگر ”آئینہ“ اس کی ایسی فلم ہے جس کی جادو بھری دھنوں نے اس کو شہرت کے آسمان تک پہنچا دیا۔ آئینہ کی مقبولیت نے عوامی پذیرائی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ اس فلم کو روبن گھوش کے فنی کیریئر کی معراج کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ جس نے کراؤن جوبلی (401 ہفتے) کا اعزاز حاصل کیا۔ اس کامیابی میں جہاں فلم کے تمام شعبے اپنی مثال آپ تھے۔ وہاں شعبہ موسیقی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ روبن گھوش نے آئینہ کی کہانی اور کرداروں پر صد فیصد فٹ ہونے والے گیتوں کی ایسی دھنیں کمپوز کیں کہ فلم کی کامیابی کو چار چاند لگا دیئے۔ روبن گھوش نے یہ بات ثابت کر دی کہ فلم کی کامیابی میں اس کی موسیقی کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

”آئینہ“ کے یہ گانے جنہوں نے اس کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا کل کی طرح آج بھی تروتازہ ہیں، سماعتوں میں شہد شکاتے ہیں۔

☆ مجھے دل سے نہ بھلانا۔ چاہے رو کے یہ زمانہ (مہناز۔ عالمگیر)

☆ روٹھے ہو تم، تم کو کیسے مناؤں پیا۔ بولونا (نیرہ نور)

☆ وعدہ کرو سا جتنا (مہناز۔ عالمگیر)

یہ بات بتانے والی ہے کہ کراچی میں روبن گھوش کی پہلی فلم پرویز ملک کی ”جہاں تم وہاں ہم“ جو 1968ء میں پیش کی گئی کامیابی کے باوجود دوسرے فلم سازوں اور ہدایتکاروں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ جبکہ اس کی شریک حیات شبنم کو سمندر کے بعد دوسری فلموں میں بھی تواتر سے کاسٹ کیا جاتا رہا۔ اس دوران روبن گھوش ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ ان کی قسمت کے دروازے 1972ء میں اس وقت کھلے جب فلم ”احساس“ کے لیے انہیں بطور موسیقار لیا گیا۔ یہ نگار اور نگار ایوارڈ کے بانی الیاس رشیدی کی فلم تھی۔ جن سے شبنم اور روبن گھوش کی پرانی دوستی تھی۔ شبنم اس فلم کی ہیروئن تھی اور نذر الاسلام ہدایت کار۔ اس فلم کے لیے روبن گھوش کی کمپوز کی گئی دلوں کو چھو لینے والی دھنوں نے اس کی قسمت کو گویا سوتے سے جگا دیا۔ پھر اس کے بعد یوں ہوا کہ مسلسل 13

ایک دم شہرت کے آسمان کے چاند ستارے بن جائیں، انہیں رو بن گھوش کی محنت، لگن اور جدوجہد سے سبق سیکھنا چاہیے۔ رو بن کو جو مقام حاصل ہوا۔ وہ چند دنوں کی کہانی نہیں۔ اس کے پیچھے برسوں کی سچی لگن اور ایماندارانہ جدوجہد شامل ہے۔

”جب اکیلے ہو گئے۔ ہم یاد آئیں گے“ ہدایت کار ایس ایم پرویز کی فلم ”کارواں“ کا یہ گیت جب رو بن گھوش نے ترتیب دیا۔ اس کی دھنیں کپوز کی تھیں تب شاید انہوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ آنے والے دنوں میں ایسے سریلے نغمے مرتب کر لیں گے جو یادگار ہوں گے۔ انہوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنے اور منصوبہ بندی کرنے کی بجائے اپنے کام پر توجہ دی۔ ہر فلم جس میں انہیں میوزک دینے کا موقع ملا۔ اس پر پہلے سے زیادہ محنت کی۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ ان کا کام جتنا اچھا ہوگا اس سے کیریئر کو اتنا ہی فائدہ پہنچے گا۔ انہوں نے کبھی اپنے کام سے بددیا تھی نہیں کی۔ اپنے کام کو مزید بہتر بنانے کے لیے انہوں نے موسیقی کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ڈھاکے میں موجودہ اساتذہ سے اکتساب فن کو ہی انہوں نے کافی نہیں سمجھا۔ اس کے لیے کلکتے کا سفر بھی کیا۔ واپس ڈھاکے آ کر مصلح الدین سے بھی رابطہ کیا ان کے ساتھ کام کر کے موسیقی کی کچھ نئی باتیں سیکھیں۔

1962ء میں چندا، 1963ء میں ”ملاش“ 1964ء میں ”بندھن“ اور ”پیسے“ 1966ء میں ”بے گانہ“ اور ”بھیا“ اور 1967ء میں ”چکوری“ ایسی فلمیں ہیں جن کی موسیقی سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فن ہندرج آگے اور آگے کی جانب ہی گامزن رہا۔ مشرقی پاکستان کی ان فلموں کی موسیقی مغربی پاکستان تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ موسیقی کی روح کو جاننے اور سمجھنے والوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ تیزی سے ابھر کر سامنے آنے والا جواں سال موسیقار آنے والے دنوں میں نئے کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔

1999ء کے وسطی مہینے کی بات ہے رو بن گھوش نے اپنی اداکارہ شریکہ حیات شبنم کو ساتھ لے کر بڑی خاموشی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین کو خیر باد کہہ دیا۔ کسی کو کچھ بتایا نہ ہی اس ضمن میں کچھ اطلاع دی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اپنے یا بیوی کے ذمے کا کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑا۔ اس حال میں گئے کہ کسی سے کسی قسم کے لین دین کا کوئی حساب

کتاب بھی نہیں تھا۔ ان دنوں کا بیٹا رونی گھوش برطانیہ میں زیر تعلیم تھا۔ جس سے ملنے یہ دونوں میاں بیوی جاتے آتے رہتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ لوگوں نے یہی سمجھا کہ شاید دونوں بیٹے سے ملنے گئے ہیں۔ بعد میں یہ راز افشا ہوا کہ وہ ڈھاکے پہنچ گئے ہیں۔ یہاں پاکستان میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ دونوں یہاں سے کیوں گئے؟ لوگوں نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق خیال آرائی کی۔ کسی نے کہا ان کے گھر ہونے والی ڈکیتی کے بعد سے اپنے آپ کو یہاں غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اسی لیے اپنی جان اور عزت کی حفاظت کے لیے واپس چلے گئے۔ کسی نے خیال آرائی کی۔ ان کی شہرت، مقبولیت اور دولت نے شاید کچھ لوگوں کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔ شاید دونوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ جس کی سمجھ میں جو آیا اس کا اظہار کیا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اصل وجہ جو تھی یا تو اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا یا جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ دونوں کو اپنے زوال کا احساس ہو گیا تھا۔

1988ء سے 1995ء کا دور رو بن گھوش کے لیے انتہائی مایوس کن رہا۔ اس دوران اس کی صرف تین فلمیں سینما اسکرین کی زینت بنیں۔ وہ بھی کامیابی کے لحاظ سے قابل ذکر نہیں تھیں وجہ یہ تھی کہ اب آئینہ، بندش، دوسا تھی یا چاہت جیسی فلمیں نہیں بن رہی تھیں۔ کچھ نان میکینکل اور نان پروفیشنل قسم کے لوگوں نے فلمیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ جن سے فلموں کا معیار تیزی سے گرنا شروع ہو گیا تھا۔ اس طرح رو بن گھوش جیسے لوگ گھر بیٹھ گئے۔

دوسری طرف شبنم کی ڈیمانڈ میں بھی کمی آتی جا رہی تھی۔ ڈھلتی عمر کی وجہ سے اس کی دلکشی اور جا ذبیت رخصت ہو گئی تھی۔ چہرے پر دانے نمودار ہو گئے تھے جو دبیز میک اپ کے بعد بھی چھپائے نہیں جاسکتے تھے۔ اب اس میں ہیروئن جیسی بات نہیں رہی تھی۔ جو لوگ اسے ماضی کی شہرت اور ورثا اداکارہ کی وجہ سے اسے کاسٹ کر رہے تھے تماشا کی ایسی فلموں کو مسترد کر دیتے تھے۔

رو بن گھوش کی کمائی تو ہر دور میں شبنم سے کم رہی تھی۔ اب جب دونوں میاں بیوی کی مارکیٹ ویلیو برقرار نہیں رہی تو ان دونوں نے حقیقت پسندانہ فیصلہ کیا کہ ایسے حالات میں یہاں رہ کر مزید اپنی مٹی پلید کرنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے کوچ کر لیا جائے۔ خاموشی سے اور رازداری سے

راہ فرار اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو بتانے اور مطلع کرنے سے کہیں کچھ لوگ جانے نہ دیں۔ ضد کر کے روک لیں۔ جبکہ یہ دونوں اب کسی حالت میں یہاں رک کر اپنی مزید خرابی نہیں کروانا چاہتے تھے۔

ڈھا کے پہنچے تو روبن گھوش کے چھوٹے بھائی اشوک گھوش نے اپنی بنگالی فلم میں اپنی بھابی شبنم کو بطور ہیروئن پیش کیا۔ روبن جس دوران پاکستان میں تھے اشوک نے ڈھا کے میں ہدایتکاری شروع کر دی تھی۔ جب بھائی، بھابھ اور واپس آئے تو اس کی حیثیت مستند ہدایتکار تھی۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ اس کی بھابھ نے پاکستانی فلموں میں جو عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے اس کا کچھ فائدہ اٹھائے۔ مگر اس کی فلم ریلیز ہوئی تو اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بنگلہ دیشی تماشائیوں نے بھی شبنم کو اس کی زائد عمری کی وجہ سے بطور ہیروئن قبول نہ کیا تھا۔ روبن گھوش کی موسیقی بھی ایک دو بنگالی فلموں سے آگے نہ جاسکی۔ حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ڈھا کے کی فلمی دنیا سے کٹ کر رہ گئے۔

کچھ لوگ اپنے بارے میں کچھ غلط فیصلے کرتے ہیں جن کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جیسے شبنم کا اپنی ذہنی عمر کے باوجود ہیروئن کا کردار ادا کرتے رہنے کا فیصلہ، شبنم بلا شبہ بڑی ٹیلنٹڈ اور زبردست فنی صلاحیتوں کی اداکارہ تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اب وہ اولڈ ایج کیریئر کرنا شروع کر دیتی۔ جس طرح صبیحہ خانم، نیر سلطانہ یا اب نغمہ اور بہار بیگم کر رہی ہیں۔ صبیحہ خانم سے بڑی اور سپر ہیروئن ان کے دور میں کوئی اور نہیں تھی۔ مگر جب ان کی عمر ہیروئن کے کردار کے لیے مناسب نہیں رہی تو انہوں نے کیریئر رول ادا کرنا شروع کر دیے۔ جس کے بعد ان کے کریڈٹ پر ایسی فلمیں آئیں جو تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ ہیروئن کے طور پر اداکاری کر کے انہوں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ شہرت اور مقبولیت انہیں اولڈ کیریئر کر کے حاصل ہوئی۔ ان کی فنی صلاحیت آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ اس طرح وہ بہت دنوں تک اور بہت دیر تک بطور اداکارہ کام کرتی رہیں۔ آج کل اس راستے پر ہمارے ہاں ندیم صاحب بھی عمل پیرا ہیں۔ اب وہ ہیرو کا کردار نہیں کرتے کہ ان کی عمر اس کے لیے موزوں نہیں رہی۔ کیریئر اداکاری کر کے اپنی صلاحیتوں سے فلم والوں اور خود کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

ہر ہوش مند اور حقیقت پسند فنکار یہی کرتا ہے۔

ایسا بھ بچن کو ہی دیکھ لیجئے جب انہیں احساس ہوا کہ ان کی عمر ہیرو بننے کے قابل نہیں رہی تو انہوں نے کیریئر رول کرنا شروع کر دیے اور اب بھی... وہ فیلڈ میں موجود ہیں اور ان کی گاڑی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔

شبنم اگر کیریئر رول کرنا شروع کر دیتی تو ورسٹائل اداکارہ ہونے کی حیثیت سے ماں، بڑی بہن، یا پانی، دادی کے کرداروں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتی اور عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیتی۔ اسے میدان چھوڑ کر بھاگنا نہ پڑتا۔ اس طرح اس نے فلم انڈسٹری کو تو نقصان پہنچایا مگر اس کے ساتھ خود پر بھی ظلم کیا۔ وہ اداکارانہ صلاحیتیں جو اس کے اندر موجود تھیں۔ انہیں بھی باہر آنے کا موقع نہیں دیا۔

تماشا کی مرد فنکاروں کو تو اور راتج ہونے کے باوجود کسی نہ کسی وجہ سے برداشت کر لیتے ہیں۔ جیسے ماشی میں ہمارے ہاں لالہ سدھیر، سنتوش کمار، اور سلطان راہی وغیرہ اور حال میں اداکار شان اور بولی ووڈ میں شاہ رخ خان، سلمان خان، عامر خان، اکشے کمار، اے بی دیوگن اور سنی دیول وغیرہ جو اپنی عمر کی نصف سچری مکمل کر چکے ہیں مگر ان کے ہیرو بنے رہنے کا شوق اب تک پورا نہیں ہوا ہے۔

شبنم اور روبن گھوش پاکستان چھوڑ کر بنگلہ دیش چلے گئے مگر شبنم کی اداکاری اور روبن گھوش کی موسیقی سے پیار کرنے والے پاکستانی انہیں بھولے نہیں۔ ان کے دلوں میں دونوں کی محبت کے چراغ جلتے رہے۔ جہاں شبنم کی فلمیں پاکستانی فلمی صنعت کے سنہری دور کی ترجمان کی حیثیت سے یاد رہیں۔ وہیں روبن کی سدا بہار موسیقی سے بچے گیت اور گانے کو اس دور کی فلمی موسیقی کی کامیابی کا سبب گردانتے رہے۔ اور یہ پاکستانیوں کی اسی اٹوٹ محبت کا نتیجہ تھا کہ دونوں میاں بیوی کو 2012ء کو سرکاری طور پر پاکستان آنے کی دعوت دی گئی۔ دونوں ممی کے مہینے میں پی ٹی وی کی خصوصی دعوت پر کراچی پہنچے تو ان کا ہر تپاک استقبال کیا گیا۔ ان دنوں اداکار لہری شدید علیل تھے۔ شبنم نے روبن گھوش کے ساتھ جا کر لہری کی عیادت کی۔ لہری، شبنم کے ساتھ بہت سی فلموں میں بطور کامیڈین کام کر چکے تھے۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا ان کے پرانے دوست اور ساتھی خود آ کر ان سے ملاقات کرتے رہے یا یہ خود جا کر ان سے ملتے رہے۔ دونوں معزز مہمانوں کو قافیو اشار ہوٹل پرل کانسٹیٹینٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر وہ دن /

بھی آیا جب ان کے اعزاز میں 10 مئی 2012ء کی شام کو ادارہ نگار اور آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے اشتراک سے ایک فقید المثال اور یادگار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو اپنے پھنڑے ہوئے پسندیدہ فنکاروں کو دیکھنے آیا تھا۔ اس تقریب میں جب سابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے دونوں کو یادگار ایوارڈ دیا تو تالیوں کی گونج شبنم اور روبن گھوش کے سنہری دور کی یاد تازہ ہو گئی۔ جب یہ جوڑی اپنی اپنی برقرار منس سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دیا کرتی تھی۔ اس موقع پر اس فنکار جوڑی نے انتہائی جذباتی انداز میں اپنی احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے لیے یہ بات انتہائی حیرانگی کی ہے کہ اس دنوں بعد بھی پاکستان میں ہمیں اس قدر محبت ملی ہے۔ ہم سے اس قدر پیار کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ لوگ تو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھی کچھ دنوں بعد بھول جاتے ہیں۔ ہم یہاں سے جانے کے 13 سال بعد واپس آئے ہیں اس کے بعد ہم سے جس والہانہ محبت کا اظہار کیا جا رہا ہے یہ ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔“

یہ قدرت کا نظام ہے آدمی جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے۔ شبنم اور روبن گھوش کو جو محبت جو پذیرائی ملی اس کے وہ مستحق تھے۔ پاکستان میں اپنے دوران قیام نہ صرف انہوں نے اپنا کام بے حد محنت اور دیانتداری کے ساتھ کیا بلکہ اس دوران اپنے اعلیٰ اخلاق سے بھی سب کو گرویدہ بنائے رکھا۔ کسی کسی سے لڑائی جھگڑا تو دور کی بات ہے۔ کسی کو اپنی کسی بات سے ناراض بھی نہیں کیا۔ بے شک یہاں سے خاموشی سے رخصت ہوئے مگر کسی کو کسی شکایت کا موقع نہیں دیا کہ میرا کام ادھورا چھوڑ کر چلے گئے یا ہمارا قلاں حساب چکنا کر کے نہیں گئے۔ ان کے جانے کے بعد ان کو یاد رکھنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی فنی خوبیوں سے پاکستانی فلموں اور فلمی صنعت کو ناقابل فراموش قائدہ پہنچایا۔

روبن گھوش پاکستان کے صفِ اول کا موسیقار بن گئے۔ پھر بھی ان کی طبیعت کی عجز و انکساری پہلی جیسی ہی رہی۔ ہر ایک سے ہنس کر، مسکرا کر، محبت اور شفقت سے ملنا۔ خوش پوشی اور خوش لباسی میں بھی ایک منفرد حیثیت کے حامل انسان تھے۔ کس موقع پر یا کس نشست میں کس وقت کیا بات کرنی چاہیے۔ اس کا عمل اور اک رکھتے تھے۔ دوسروں کا خیال رکھنے کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا

تھا۔ اپنے شعبہ سے متعلق لوگوں، گلوکاروں اور سازندوں سے ہمیشہ نرم لہجے میں بات کرتے۔ انہوں نے بہت سے نئے گانے والوں اور ولیوں کو متعارف کرایا۔ مگر سب کے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ کیا۔ اس شفقت اور محبت سے پیش آئے کہ سب نے ہمیشہ ان کے اعلیٰ اخلاق کی تعریف کی۔ بشیر احمد کو انہوں نے بطور گلوکار متعارف کرایا جو جلد ہی موسیقار کی حیثیت سے ان کے مد مقابل کھڑا ہو گیا مگر بشیر احمد کے ساتھ ہمیشہ ان کے تعلقات خوشگوار رہے۔ بشیر احمد نے بھی انہیں ہمیشہ اپنا محسن اور استاد سمجھا۔ اچھے فنکار تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر اچھے فنکار کے ساتھ اچھا انسان ہونا بہت بڑی بات ہے۔ روبن گھوش ایک بہت بڑے موسیقار ہی نہیں۔ اعلیٰ اخلاق و اطوار کا حامل ایک اچھا بلکہ بہت اچھے انسان بھی تھے۔

دل اور دماغ انسان کی زندگی میں بڑے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دل انسان کو اچھا اور چاہنے والا بناتا ہے اور دماغ اسے نمایاں کامیابی عطا کرتا ہے۔ شہرت، مقبولیت کے آسمان تک پہنچا دیتا ہے۔ مگر یہی دماغ جب مضحل ہو جاتا ہے۔ کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ مگر اس حالت میں بھی اس سے پہلے کی طرح کام کرنے پر جب مجبور کیا جاتا تو اس کی رگیں پھٹ جاتی ہیں۔ شاید روبن نے بھی اپنے بوڑھے اور تھکے ہوئے دماغ کو فعال رکھنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نتیجے میں کئی سال پہلے ان کا برین میجرج ہو گیا تھا۔ جس کے بعد وہ مسلسل ڈاکٹروں کے زیر علاج رہا ہے۔ مگر نرم خواہش جو طبیعت کا حامل ہونے کی وجہ سے فرشتہ اجل سے کوئی مفاہمت نہ کر سکا۔ 13 فروری 2016 کو بڑی شرافت سے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ بغداد میں جنم لینے والے، مشرقی پاکستان میں پروان چڑھنے والے، مغربی پاکستان میں فن موسیقی کی بلندیوں کو چھونے والے عظیم اور لاقانی موسیقار کو بنگلہ دیش کی مٹی میں دفن کر دیا گیا۔ بنگلہ دیش کے علاوہ پاکستان میں بھی صفِ ماتم بچھ گئی۔

خاک کی جسم مٹی میں ضرور مل جاتا ہے مگر جانے والے نے جو اچھا اور بڑا کام کیا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ روبن گھوش بھی اپنی مدد و دھنوں اور ریلے گیتوں کے سہارے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہ لاقانی انسان تھا مگر اس کا فن لاقانی ہے۔ اس کے نغمے ہمیشہ سامعوں۔۔۔ میں شہد چکا کر اس کی موجودگی کا احساس دلاتے رہیں گے۔



مخترائے عیسیٰ

زویا اعجاز

خدمتِ انساں سے بڑھ کر اور کوئی کام نہیں، یہ عبادت سے قریب تر جذبہ ہے۔ وہ لٹ پٹ کر ہجرت پر مجبور ہوئی تھی لیکن اس کے جذبے سرد نہیں ہوئے تھے۔ وہ بے سرو سامانی کے عالم میں بھی علم کی شمع جلاتے میں کوشاں رہی۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتوں کو پاٹوں کی چوٹی سمجھا جاتا تھا، تعلیم نسواں عام کرنے پر کمر بستہ ہو گئی۔ یہ اسی کا جذبہ تھا کہ اس نے حالات کی سختی کو رد کرتے ہوئے اپنا وہ مقام بنا لیا کہ دنیا بھر میں واہ واہ ہونے لگی۔

سے برسرِ ماں میں بے بسن کس نے۔ ان واقعہ میں برسرِ است

ارضی دنیا میں زندگی کی نوعیت آدمی کا شاخصانہ ہے۔ رب کائنات نے جب آدم کی خلافت کا عندیہ دیا تو عرشِ دنیا میں حیرت و خوف کی ملی جلی لہر دوڑ گئی۔ نوری مخلوق نے دستِ بسترِ عرض کی۔ ”کیا تو ایسی مخلوق کو نائب بنانا چاہتا ہے جو زمین پر فساد پھیلانے کی اور عین بھانے کی جبکہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تسبیح کرتے ہیں۔“ پروردگار نے حضرت آدم کو چند اشیاء کے نام سکھائے پھر فرشتوں سے ان کے بیان کا حکم فرمایا۔ فرشتے اس حکم

کی تعمیل نہ کر سکے لیکن حضرت آدم نے بحکم الہی اپنا علم بیان فرما دیا۔ اللہ پاک نے ان سے فرمایا۔ ”کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں باخبر ہوں اس سے جو تم نہیں جانتے۔“ (البقرہ) نوری مخلوق نے خالق کی ایما پر خاک کے اس پتلے کو سجدہ کیا۔ کھڑکھڑاتی مٹی سے تخلیق کردہ یہ خاکی پتلا نوری و ناری مخلوق سے افضل قرار پایا اور اس فضیلت کی بنیاد ”علم“ تھی۔

اسی ضمن میں ”معلم“ کا مقام و مرتبہ بھی مسلمہ ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جس کا درجہ والدین کے متوازی قرار پایا۔ والدین انسانی روح عرش سے فرش پر لانے کا موجب بنتے ہیں تو معلم اسے فرش سے عرش کی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی اور اوج کمال معلمین ہی کی مرہون منت رہے ہیں۔ لیکن چند افراد ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی لگن، پیشہ وارانہ ذمہ داری اور جنون سے تاریخ میں اپنا نام امر کر لیا۔ عقیلہ آصفی کا شمار بھی انہی نایاب افراد میں ہوتا ہے۔ 49 سالہ افغانی نژاد اس معلمہ نے اپنے شب و روز فروغ تعلیم اور مہاجرین کی فلاح کے لیے شخص کر رکھے ہیں اور پچھلے 24 سال سے سینکڑوں طلبہ کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اس کی بے لوث خدمات بین الاقوامی سطح پر کافی مقبول ہو چکی ہیں یہ مقبولیت حادثاتی طور پر اسے نصیب نہیں ہوئی بلکہ وہ ہائیں تک عقیلہ کی انتھک جدوجہد کا ثمر ہیں۔

☆☆☆

عقیلہ آصفی کی پیدائش افغانستان کے مشہور تاریخی شہر کابل میں اس عہد میں ہوئی جب وہاں امن و آشتی کا دور دورہ تھا۔ فضاؤں میں محبت و خلوص کی مہک رچی تھی اور اقدار و روایات کی تابناکی بشری زندگی کو منور کیے ہوئے تھی۔ عقیلہ کا بچپن خوشیوں کے ہنڈولے میں جمولتے گزرا۔ زندگی کسی مصور کی شاہکار تصویر کی مانند کامل اور خوبصورتی کے تمام رنگوں سے مزین تھی۔ جان چھڑکنے والے والدین نے اولاد کو دنیا کی ہر نعمت سے مستفیض کیا۔ بچپن کی سہانی یادوں کے متعلق عقیلہ کا کہنا ہے۔ ”رب کائنات کی عطا کردہ اس زندگی اور نعمتوں کے شکرانے کا حق میں غالباً کبھی ادا نہیں کر سکتی۔ میں خود کو بہت خوش قسمت گردانتی ہوں کہ میری پیدائش ایک روشن خیال اور فراخ دل گھرانے میں ہوئی۔ ہمارے والدین ہم بہن بھائیوں کے لیے زندگی کے تمام تر امور میں بہت مددگار ثابت ہوتے تھے۔“

کابل کی حسین یادیں آج بھی اس کے دل و دماغ پر

نقش ہیں۔ بیچاس ہزار افراد کے قتل عام اور اسی فیصد شہر کی تباہی کی تلخ حقیقتیں اسے بے اختیار گرم گشتہ سنہرے ماضی میں پہنچا دیتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے۔ ”کابل ایک خوشحال اور متمول شہر تھا جہاں جنسی امتیاز روا نہ رکھا جاتا تھا۔ میں افغانستان کے تہذیبی عروج کی صحنی شاہد ہوں۔ محبتوں اور چاہتوں سے گندھا وہ دور موجودہ وقت میں اکثریت کی سوچ و تصور سے بالاتر ہے۔“

عقیلہ کی زندگی کیف و سرور سے لبریز تھی حصول تعلیم اس کے لیے ایک مذہبی فریضہ تھا جسے وہ مکمل لگن سے سرانجام دیتی تھی۔ عام نوجوانوں کی مانند اس نے ڈاکٹر، انجینئر یا پائلٹ بننے کے خواب آنکھوں میں کبھی بھی نہ سجائے تھے۔ وہ ایک معلمہ بن کر ”امتی“ ہونے کا حق ادا کرنا چاہتی تھی۔ لہذا اس نے تاریخ اور جغرافیہ کے مضامین کی تدریس شروع کر دی۔ اپنے ایک بیان میں اس نے بتایا۔ ”مستقبل کے متعلق میری زندگی کا لائحہ عمل آغاز ہی سے طے شدہ تھا۔ شعور کی پہلی منزل پر پہنچنے ہی میں نے معلمہ بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اپنے اساتذہ سے بے حد متاثر تھی اور انہی کی طرح فروغ تعلیم کے ذریعے چراغ و چراغ جلانے کی خواہاں تھی۔“

بحر حیات عقیلہ آصفی پر بہت مہربان تھی۔ ایک محبت کرنے والے شوہر کے بعد اولاد کی نعمت نے اس کی زندگی کی تکمیل کر دی تھی لیکن فلک کج رفتار کو اب کچھ اور ہی منظور تھا۔ نعمتوں پر شکرانے کے بعد اب مشکلات پر صبر کی آزمائش کا وقت آن پہنچا تھا۔

بیسویں صدی کا آخری عشرہ افغانستان میں کسی درویش کی بددعا ثابت ہوا۔ نفرتوں، سازشوں اور بے حسی کی بادِ سموم نے رواداری، اخوت و باہمی محبت کا گلشن خزاں رسیدہ کر دیا۔ 1992ء کی خانہ جنگی نے وہاں کے عوام کی زندگیوں کا رخ ہی تبدیل کر ڈالا۔ نجیب اللہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد طالبان تمام تر شعبہ ہائے زندگی پر تابض ہو گئے اور عوام الناس کے لیے ایک کڑے وقت کا آغاز ہوا۔ عقیلہ آصفی کو بھی لامحالہ طور پر اپنے شوہر اور بچوں سمیت ہجرت کرنی پڑی۔ اس مشکل ترین وقت کی یاد آج بھی اسے آبدیدہ کر دیتی ہے۔ ”حکومت کے خاتمے کے بعد مجاہدین نے ملکی نظم و نسق سنبھال لیا تھا۔ لیکن امن و محبت کا گہوارہ میرا وطن خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ ہر جانب انتشار کا دور دورہ تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور اپنے ہی اپنوں کا خون بہا رہے تھے انسانی خون انتہائی ارزاں ہو چکا تھا۔ جلا وطنی نا

گزرتھی۔ مال و متاع اور اسباب زندگی سب وہیں کے وہیں دھرے رہے۔ جانے کیوں مجھے لگا کہ میرا اسکول میرے طلبہ اور میرا گھر سبک رہے تھے۔“

گھر اپنا گھر۔ کسی بھی عورت کی زندگی کا سب سے سہانا خواب ہوتا ہے۔ گھریلو زندگی کی افزائش اس کی جبلت میں ودیعت شدہ ہے۔ عقیدہ آصفی کا وجود ہری آزمائش کے ٹکڑے میں جکڑا تھا۔ اپنے گھر اور وطن سے انخلانے اس کی روح چھلنی کر دی تھی۔ واپسی کی کسی معینہ مدت کی کوئی امید نہ تھی۔ اس کا کہنا ہے۔ ”کابل میں تعمیر شدہ اس گھر کی تکمیل چھ سال کے عرصہ پر محیط تھی اور کوئی بھی سامان باندھے بغیر بے سرو سامانی کی حالت میں ہمیں سب کچھ چھوڑ دینا پڑا۔ میرے لیے وہ وقت انتہائی کریناک تھا۔“

بقا کی جبلی خواہش اسے پاکستان لے آئی۔ پنجاب کے مشہور شہر میانوالی کے ایک پسماندہ گاؤں کوٹ چندن میں سکونت اس کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب برپا کرنے والی تھی، جس سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔ اس کی عمر اس وقت محض چھبیس سال تھی۔ عمر عزیز کا یہ دور کسی بھی انسان کے لیے امتگوں، خواہشوں اور ستاروں پر کند ڈالنے کے

جذبات سے بھرپور ہوتا ہے۔ کابل جیسے متمول اور ترقی یافتہ شہر سے آمد کے بعد کوٹ چندن کی خاک اڑاتی ٹیڑھی میڑھی گلیاں اور کچے پکے راستے اس کے دل میں لاتنا ہی اداسی پیدا کرتے تھے۔ اپنے وطن اور گھر میں کسی ملکہ کی سی شان سے زندگی بسر کرنے والی عقیلہ کے لیے ایک پسماندہ گاؤں میں محتاجی کی زندگی بسر کرنا بہت کٹھن تھا۔ آبائی وطن کی کشش اسے بے حال رکھتی تھی۔ یہاں اسے انوکھے تجربات و حادثات کا سامنا کرنا پڑا جن کا تصور ہی کابل میں اس کے لیے بعید از قیاس تھا۔ وہ یہاں اکیلی مہاجر نہ تھی۔ کوٹ چندن نے اپنی پائیں ان گنت افغان مہاجرین کے لیے وا کی تھیں۔ غریب الوطن عقیلہ ایک عجیب محسوسے کا شکار تھی۔ ہم وطنوں کی موجودگی بیک وقت باعث تقویت و آزار تھی۔ ان کی سوچ اور طرز عمل اس کے لیے کسی صدمہ سے کم نہ تھے۔ اپنے جذبات کی ترجمانی وہ کچھ یوں کرتی ہے۔ ”ہاں! ہم سبھی افغان تھے۔ ہمارا خیر ایک ہی وطن کی مٹی سے گندھا تھا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ کابل میں بسر شدہ میری زندگی و سوچ افغانستان کے دیگر علاقہ جات کے ان رہائشیوں سے یکسر مختلف تھی۔“

کوٹ چندن میں رہائش پذیر ہونے کے بعد عضو

میدیکل پوسٹ سائنس
جولائی کے شمارے کی انوکھی کہانیاں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

اولین سوغات ● دعا بازی اور فریب کاری کے جال میں ابھی ایک

انوکھی داستان، ایچ اقبال کے قلم کی سوغات

انگاریے ● شریف کوئی کوہ معاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عورت کی یکجائی

چشم لینے والا ہولناک سلسلہ طاہر جاوید مغل کے قلم سے

آوارہ گرد ● چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پانی...

عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرور کی کہانیاں

بھارنگ ● معصومیت اور پاکیزگی کو داغ دار بنانے والے عوامل کی معاشرتی کہانی

دوسرا رنگ ● جرم اور قانون کی بیروی میں آگے بڑھتی کہانی کے بیچ و خم



اصلی
لکھنے
صلی

آپ کے تہرے...
مشورے... بھیتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

چاہتی تھی لیکن خواتین کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا اس کے نزدیک اخلاقی ہی نہیں بلکہ مذہبی فریضہ بھی تھا۔ تعلیم ایک بنیادی انسانی حق ہے جسے وہ بہر صورت انہیں دلوانا چاہتی تھی۔ عقیلہ آصفی کا کہنا ہے۔

”میں نے مہاجر کیمپ میں ایک چھوٹے سے مستعار شدہ خیمہ سے پڑھانے کا آغاز کیا۔ گاؤں کے معزز سردار نے مجھ سے تنخواہ کی بابت پوچھا لیکن میرے لیے یہی بہت تھا کہ انہوں نے مجھے اعتماد کی انمول دولت بخش دی تھی۔ میں ان کی اقدار و روایات سے اب بخوبی واقف ہو چکی تھی اور انہیں کوئی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ لہذا میں نے ایسے موضوعات کی تعلیم کا آغاز کیا جو ان کے لیے بے ضرر اور غیر متنازعہ تھے۔ ابتدا میں والدین خاص ایک ہفتے کے لیے بچیوں کو بھیجنے پر رضامند ہوئے۔ گھریلو امور کے انتظام و انصرام کے علاوہ حفظانِ صحت کے اصول اور بنیادی مذہبی تعلیم سے آشنا کروایا۔ میں ان کے سر پرستوں کو یہ شعور دینا چاہتی تھی کہ تعلیم ایک فطری عمل ہے اور فطرت کبھی خوفناک نہیں ہوتی۔ یہ حیاتِ انسانی کی ازسرنو ترمیم و آرائش کا ایک انمول وسیلہ ہے۔ تعلیم ایک بحر ہے جس کی روانی کہیں بھی نہیں روکی جاسکتی۔“

مہاجر کیمپ میں فروغِ تعلیم کا وہ سفر عقیلہ آصفی کے لیے خازر ثابت ہوا تھا مشکلات کا ایک طوفان تھا جسے اس جیسی اولو العزم خاتون ہی برداشت کرنے کی تحمل تھی۔ والدین کی نیم رضامندی کا پڑاؤ طے ہونے کے بعد وسائل کی کمی کا مسئلہ جوں کا توں برقرار تھا۔ لڑکیاں سرے سے ہی ان وسائل کے وجود سے لاعلم تھیں۔ کتابیں، چاک اور تختہ سیاہ جیسی بنیادی ضروریات ناپید تھیں۔ لیکن چٹانی عزم و ہمت کی حامل عقیلہ نے زور بازو پر اکتفا کیا اور ذاتی کاوشوں سے متبادل ذرائع تخلیق کیے۔ اس خیمہ اسکول میں تختہ سیاہ کے لیے وہ رات کو کپڑوں کے ٹکڑے سلائی کرتی اور اگلے دن پڑھایا جانے والا سبق ان پر تحریر کر کے خیمہ کی دیوار کے ساتھ لٹکا کر طالبات کو حروف آشنا کرتی تھی۔ عالمی تاریخ میں یہ منفرد محکمہ تھے جنہوں نے حروف سازی اپنی خاک آلود زمین پر سیکھی تھی۔ ان کی انگلیاں پینسل اور فرش گویا کا پیاں تھیں۔

عقیلہ کی محنت و لگن رنگ لانے لگی، بستی کے مقامی افراد کے علاوہ مہاجر والدین بھی اپنی بچیوں کو بلا خوف و خطر اس کے پاس بھیجنے لگے۔ تین ماہ کے قلیل عرصے میں

معطل جیسی زندگی گزارنے کا احساس عقیلہ آصفی کے لیے موت سے بھی بدتر تھا۔ اس نے اپنا ادھورا خواب مکمل کرنے کی ٹھان لی اور ایک بار پھر فروغِ تعلیم کے لیے کمر کس لی۔ لیکن آزمائشوں کا سلسلہ ابھی نہ تھا تھا۔ کوٹ چندن کے رہائشیوں کی زندگی کا کیوس نامکمل تھا۔ وہاں تعلیم نسواں کا سرے سے کوئی رواج ہی نہ تھا۔ لڑکے کبھی کبھار اسکول چلے جایا کرتے تھے لیکن اس نے کبھی کسی لڑکی کو اسکول جاتے نہ دیکھا۔ لڑکوں کے پاس بھی کتابیں یا نصاب نامی کوئی مواد نہ تھا۔ کابل کی سرکاری مغلہ کے لیے یہ امر حیران کن ہی نہیں افسوس ناک بھی تھا کہ بچہ حکمت عملی یا تعلیمی منصوبہ بندی کے بغیر جہالت کے اندھیروں کے راہی بن رہے تھے۔ عقیلہ کا بیان ہے۔ ”لوگ بے حد مہربان، مہمان نواز، سخی لیکن انتہائی روایت پسند تھے۔ لڑکیاں گھر سے تنہا نکلنے اور حصولِ تعلیم کی مجاز نہ تھیں۔ مقامی خواتین اکثر شام کو مجھ سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ جب میں نے ان سے لڑکیوں کی اسکول سے مستقل غیر حاضری کے متعلق استفسار کیا تو وہ کہنے لگیں۔ بہن! آپ یہاں نووارد ہیں اور ہمارے رسم و رواج سے واقف نہیں۔ آئندہ ایسی کوئی بات مت کیجیے گا۔ لڑکیاں کیونکر اسکول جاسکتی ہیں؟ یہ تو صرف لڑکوں کا حق ہے۔“

لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسے اپنے شوہر کی مکمل اعانت حاصل تھی۔ انہوں نے گاؤں کے سردار اور امام مسجد سے بارہ ملاقات کی اور انہیں اپنا ہمنوا بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ مقامی آبادی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے وہ کوٹ چندن کے ہر گھر میں گئے اور تعلیم نسواں کے لیے انہیں قائل کرنے کی جان توڑ کوششیں کیں۔ وہاں کے سادہ لوح عوام کے لیے عقیلہ آصفی ایک عجوبہ روزگار تھی۔ ”خاتونِ مغلہ“ ان کے لیے ایک انوکھی اصطلاح تھی۔ بالآخر گاؤں کے سردار نے اسے لڑکیوں کو پڑھانے کی رضامندی دے دی اور ایک خیمہ مستعار دے دیا جسے عقیلہ نے اپنے گھر کے سامنے نصب کر کے ایک انقلابی قدم کا آغاز کیا۔ منزل دشوار تھی اور راستہ کٹھن تر۔ ذادراہ کے طور پر صرف ہمت، حوصلہ اور لگن ہمراہ تھی۔

اس کے سفر کا آغاز انتہائی محتاط تھا۔ وہ ان کے معاشرتی رسوم و رواج کا احترام کرتی تھی اور ان کے متعلق کوئی بھی منفی اظہارِ خیال اس کے لیے احسان فراموشی تھی۔ کوٹ چندن نے اسے اور اس جیسے سینکڑوں مہاجرین کو پناہ دی تھی اور وہ انہیں رانی برابر بھی تکلیف نہیں دینا

عقلیہ نے کبھی بھی تصور نہ کیا تھا کہ اس کی یہ کاوشیں اس معاشرے کو یکسر بدل کر ان کے ذہن روشن کر دیں گی۔ اس کی چند طالبات افغانستان واپس چلی گئیں اور ایک ماہ کے بعد ہی انھوں نے وہاں کے ایک گاؤں میں ایک درسگاہ قائم کی۔ اس کے قیام کو اب پارہ سال گزر چکے ہیں اور اس گاؤں کی ہر لڑکی وہیں پڑھتی ہے۔ ایک مقامی طالبہ بعد ازاں قابل سرجن بنی۔ کمپیوٹر، سائنسی مضامین اور دیگر شعبوں میں گرانقدر خدمات سرانجام دینے والی ان طالبات پر عقلیہ کو بجا طور پر بہت فخر ہے۔

1992ء میں شروع ہونے والا سفر بلخ صدی کی تکمیل کے قریب ہے لیکن اس کا لگن اور جذبہ آج بھی روز اول ہی کی طرح قائم و دائم ہے۔ دو دہائیوں قبل اس نے جن طالبات کو تعلیم دی اب ان کی بیٹیاں بھی اسی کے اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ دوسری نسل تک تعلیمی ورثے کی منتقلی اس کے لیے پروردگار دو عالم کا خصوصی انعام ہے۔ اس کی طالبات مکمل طور پر اسی کا پرتو ہیں۔ ان کا نظریہ حیات و طرز عمل دیگر طلبہ سے بے حد مختلف ہیں عقلیہ ان کے لیے مشعل راہ ہے۔ ایک بین الاقوامی صحافی ”مللی ماؤ“ نے اپنے جریدے کے مضمون کے لیے اس کے اسکول کا خصوصی دورہ کیا اور طلباء اساتذہ کے تاثرات قلمبند کئے۔ وطن واپسی پر اس کا کہنا تھا۔ ”عقلیہ آصفی کی طالبات کی سوچ اور ذہنی معیار دیکھ کر میں انگشت بدنداں تھی ان بچیوں کے خواب و عزائم ہمالیہ سے بلند تر ہیں۔ ایک بچی عقلیہ ہی کی طرح معلمہ بن کر ناخواندگی کے اندھیرے مٹانے کے لیے پُر عزم تھی تو دوسری ایک قابل ڈاکٹر بن کر اپنی قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھی۔ اور ان کے آہنی ارادے بذاتِ خود ان کی کامیابیوں کے ضامن ہیں۔“

اس کامیاب سفر کے باوجود عقلیہ کے دل کا ایک گوشہ تا حال اداس، بے نکل اور خون کے آنسو روتا ہے۔ اس کے وطن کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ افغانستان کا طویل بحران لائیکل ہے۔ 2.6 ملین سے زائد افغانی جلا وطنی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہر دو میں سے صرف ایک بچہ پرائمری اسکول میں پڑھنے کا سہولت کار ہے۔ سکیڈری سطح پر یہ تناسب مزید تنزلی کا شکار ہے اور چار میں سے صرف ایک بچہ ہی تعلیم حاصل کر پا رہا ہے۔ پاکستان میں یہ صورت حال مزید ابتر ہے جہاں مقامی آبادی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے، مہاجرین کیونکر اس ”عیاشی“ سے مستفید ہو

طالبات کی تعداد چالیس سے متجاوز ہو گئی۔ تبدیلی کسی باضمیم کی مانند کوٹ چندن کو معطر کرنے لگی تھی۔ پھر وہ لمحہ بھی آیا جب اس نے اپنا مرتب شدہ نصاب دو حصوں میں منقسم کر کے صبح اور شام میں پڑھانا شروع کیا۔ دسمبر 1996ء میں اس کا یہ نصاب ایک باقاعدہ اسکول کی شکل اختیار کر گیا اور اس کی طالبات کی تعداد 75 ہو گئی۔ نصاب کو باقاعدہ حکومتی توثیق و منظوری دلوائی گئی۔ حکومتی نمائندوں نے اس موقع پر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور انہیں باقاعدہ کتابیں اور کاپیاں بھیجی گئیں۔ اسکول میں طلبہ کی تعداد دھیرے دھیرے 170 ہو چکی تھی۔ بچیاں پہلے سے خود اعتماد تھیں۔ ایک طالبہ اس کی یادداشت کے نہاں خانوں سے کبھی محو نہ ہوئی۔ اس نے اپنے چچا کو مشورہ دیا کہ وہ اون کی خرید و فروخت کا حساب رکھنے کے لیے کاپی استعمال کریں۔ چچا نے اس کی بات کو بالکل سنجیدہ نہ لیا لیکن بعد ازاں اسکول میں سیکھے گئے بنیادی حساب کتاب کے عمل کی مدد سے اس نے چچا کو کاروباری معاملات میں بھرپور اعانت دی۔ چچا اس ہونہار بچی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اپنی بہو بنا لیا۔

اسکول سے فارغ التحصیل طالبات عقلیہ کے کارواں میں شریک ہو گئیں اور دیگر طلبہ کو تعلیم دینے لگیں۔ اس کی مثبت سوچ، جنون اور خلوص نیت اس کے طلبہ میں بھی منتقل ہو چکا تھا۔ خیمہ اسکول اب ایک مستقل عمارت بن گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی نے کوٹ چندن کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو والدین اسکول کے نام سے نابلد تھے وہ بخوشی اپنی بچیوں کو عقلیہ کے پاس بھیجے گئے۔ ان کا طرز حیات یکسر بدل گیا۔ کھانا پکانے کے طریقے، سوچ، لائحہ عمل سب کچھ اب بدل چکا تھا۔ والدین اب بچیوں کی پڑھائی کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ وہ ان کی تعلیمی ترقی کے متعلق پوچھنے آتے اور اساتذہ کی طویل غیر حاضری پہ ناراضگی کا اظہار کرتے۔ ویسٹمنیشن کے عمل سے خائف اپنے بچوں کو چھپا دینے والے لوگ اب صاف ستمرے رہتے اور بچوں کی تمام تربیتی و تعلیمی ضروریات پوری کرنے لگے۔ گاؤں کے جس سردار نے اس خیمہ اسکول کی منظوری دی تھی اس کا کہنا ہے۔ ”میں اکثر خود پہ حیران ہوتا ہوں کہ میں نے لاعلمی اور جہالت کے اندھیروں میں زندگی کیونکر بسر کی؟ میں خود تو اس نعمت سے فیض یاب نہ ہو سکا لیکن مجھے خوشی ہے میں نے اپنی اولاد کو اس خزانے سے بے بہرہ نہ رکھا۔“

جسکی امتیاز سے قطع نظر بہترین تعلیمی سہولیات فراہم کرنی چاہئیں۔ جب میں نے افغان لڑکیوں کو تعلیم دینے کا آغاز کیا تو ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہ تھا کہ ایک دن اس ایوارڈ کی حقدار ٹھہروں گی۔ میری لگن کی اس قدر پزیرائی پر میری خوشی ناقابل بیان ہے۔“

عقیدہ مستقبل قریب میں افغانستان واپسی کی شدت سے متنی ہے۔ 49 سال کی عمر میں بھی وہ اپنے تباہ حال ملک کی تشکیل نو میں نوجوانوں جیسی توانائی و جوش کے ساتھ ایک نئی تاریخ رقم کرنا چاہتی ہے۔ وہاں موجود ان گنت بچوں کے لیے وہ ذاتی درسگاہیں قائم کرنے کی خواہشمند ہے۔

اقوام متحدہ نے اسے The Global Teacher Prize کے لیے بھی نامزد کیا۔ یہ خصوصی ایوارڈ دس بہترین عالمی اساتذہ میں سے کسی ایک کا مقوم قرار پاتا ہے اور جیتنے والے کو ایک ملین ڈالر کی خطیر رقم عطا کی جاتی ہے۔ پاکستانی نوبیل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے اس نامزدگی پر عقیدہ کو ذاتی طور پر مبارکباد دی۔ ملالہ کے والد فیاض الدین یوسف زئی نے مشہور سماجی ویب سائٹ ٹوئٹر پر ایک پیغام میں کہا۔ ”ملالہ اور میں عقیدہ آصفی کو دس بہترین عالمی اساتذہ میں شمولیت پر تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں ان کی تعلیمی خدمات لاجواب ہیں۔“

مارچ ۲۰۱۶ میں اس اعزاز کی حقدار فلسطینی معلمہ ”حنان المحروب“ قرار پائیں جن کی زندگی بذات خود حوصلہ برداشت کی ایک الگ داستان ہے۔

ایک خیمہ سے افزائش پانے والا اسکول اب 9 درسگاہوں پر محیط ہو چکا ہے لا تعداد خواتین وہاں بطور اساتذہ خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ فی الوقت اس کے زیر نگرانی 1500 طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں جن میں 900 لڑکیاں شامل ہیں۔ اس کے اسکول سے فارغ التحصیل 1000 طلبہ گریجویٹ بن چکے ہیں جن میں مقامی بچوں کے علاوہ افغان طلبہ کا تناسب زیادہ ہے یہ افغانی طلبہ اپنے وطن میں اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئر، سرکاری ملازمین ہیں۔ اس کی لگن اور خدمت خلق کا جذبہ ان سبھی میں ایک مشترک قدر ہے۔ اس کی تربیت یافتہ کئی طالبات آج اساتذہ کے مقدس عہدے پر فائز ہو کر تعلیمی چراغاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس دنیا سے جہالت اور لاعلمی کے اندھیرے مٹا کر تخلیق آدم بہترین حق ادا کر رہی ہیں۔

سکتے ہیں۔ عقیدہ کی ان تھک جدوجہد کی بازگشت عالمی ایوانوں میں بھی گونجنے لگی ہے۔ 2015ء میں اسے اقوام متحدہ کی جانب سے UNHCR Nansen Refugee Award دیا گیا۔ یہ خصوصی ایوارڈ

مہاجرین کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں افراد کو دیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر انٹونو نے اسے میڈل اور 100000 امریکی ڈالر عطا کیے۔ تقریب کے دوران اپنے بیان میں اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انٹونو نے کہا۔ ”بہترین تعلیم تک محفوظ رسائی بچوں کے لیے از حد ضروری ہے۔ یہی ایک وسیلہ ہے جس کی مدد سے وہ روزگار کے مواقع حاصل کرنے کے علاوہ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں موجودہ دور میں بچے عدم تحفظ، جسمانی و جنسی استحصال اور کشاکش کا شکار ہیں۔ عقیدہ آصفی جیسے نایاب افراد ہی اس امر سے آگاہ ہیں کہ مستقبل میں مہاجر بچوں کو معاشرے کا کارآمد شہری بننے کے لیے تعلیم کی اشد ضرورت ہے ان کی تمام تر کوششوں اور عظمت کو ہم سلام پیش کرتے ہیں۔“

UNHCR کے سفیر خالد حسینی نے اپنے بیان میں کہا۔ ”حصول تعلیم کے ذرائع تک باعزت رسائی ہر انسان کا بنیادی حق ہے اور لاکھوں کروڑوں مہاجر بچوں کے لیے تو اس کی قدر و قیمت مزید بڑھ جاتی ہے یہی ایک ذریعہ ہے جس کے توسط سے وہ اپنا مستقبل خود تعمیر کر سکتے ہیں۔ میں نے کتنے ہی نوجوان مہاجر دیکھے ہیں جو اپنے مدار سے جدا ہو کر بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ تعلیمی سرمایہ کاری ہی کے ذریعے انھیں امید اور حیات کی تعمیر نو کا ایک موقع فراہم کیا جاسکتا ہے۔“

اس ایوارڈ کا حصول عقیدہ آصفی کے لیے مسرت و انبساط کا ناقابل فراموش لمحہ تھا۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”تعلیم یافتہ ماؤں کی موجودگی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی ضامن ہے۔ لڑکیوں کو علم دیا جائے تو نسل در نسل چراغاں رہے گا۔ میری ایک نشہ آرزو ہے کہ مستقبل میں لوگ افغانستان کو خانہ جنگی کی بجائے معیاری تعلیمی نظام اور بہترین طلبہ کی بدولت یاد رکھیں۔ یہ ایوارڈ میرے عزم کو مزید تقویت بخشنے گا۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ میری شناخت افغان مسلم خاتون اور بطور معلمہ مستند ہو چکی ہے۔“

اگر عالمی حکمران ترقی پذیر ممالک کو خوشحالی کی راہوں پر گامزن کرنا چاہتے ہیں تو انھیں ترجیحی بنیادوں پر کسی بھی

ملکہ مارجوری

سلمیٰ اعوان

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ اور اس سے ہو انکار بھی شاید ہی کسی کو مگر تہذیبِ حاضر کے گرفتار کیا جانیں؟ وہ تو اپنی ملت پر بھی قیاس اقوامِ مغرب سے کرتے ہیں۔ انہیں تو یاد بھی نہ ہو کہ ہمارے پاس وہ گوہر ہے بہا تھے جنہوں نے خدمتِ ملک و ملت ہی نہیں کی، انسانیت کو بھی دوام بخشا۔ ایسا ہی ایک کردار ہے ملکہ مارجوری کا جس نے وفا کی بھی مثال قائم کی۔ وہ یورپین تھی لیکن جب اس نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر محبوب کا ہاتھ تھاما اور کلمہ پڑھ کر اس کی زندگی میں آئی تو لوگ اس کی مثالیں دینے لگے۔ اس نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ یہ عشق نہیں آسان، ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ اس نے آگ کے دریا کو پار کیا کیونکہ اس کی سگی پھوپھی اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر کے اس کا محبوب ہتھیانا چاہتی تھی۔

بلتستان کی ایک ملکہ کی وقار پرستی کا بیان



**DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM**

گوشتے کہیں نہیں تھے۔ گاڑی رکی۔ میں جست لگا کر باہر کودی اور دیوانہ وار سیدھی بھاگنے لگی تھی۔ مجھے بہت دور سے اپنے چھوٹے بیٹے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ میرا کہیں تھوڑو تو نہیں ہے کہ مجھے ان عمروں کی ہر صورت

پندرہ اگست کی اس رات کا پہلا پہر جس سے بھرپور تھا۔ میں نے ٹرین کی کھڑکی سے پلیٹ فارم پر نظریں دوڑائیں۔ گاڑی کی رفتار بہت آہستہ ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ آسانی سے پہچان میں آ رہے تھے پر میرے جگر

جولائی 2016ء

69

ماہنامہ سرگزشت

پر اب ان کا گمان ہونے لگا ہے۔ پر نہیں وہ سچ میرے بچے تھے جو اپنے باپ کے ساتھ مجھے کیئے آئے تھے کیونکہ ان کی ماں شمالی علاقوں کی سیاحت سے کوئی بیس (20) دن بعد لوٹی تھی۔ پچھتے چلاتے وہ سب مجھ سے لپٹ گئے تھے اور جب نصف ماہ سے زائد کی جدائی کا سوکھا پن اس ملاپ سے کچھ سیراب ہوا تب انہوں نے گردنیں اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں ان کی نظروں کا مفہوم پہچانتی تھی وہ جاننا چاہتے تھے کہ میں ان کے لیے کیا لائی ہوں؟ میرے کندھے پر بیگ تھا جس میں فقط، میرے دو جوڑے کپڑوں کے اور قابلآ دو تین سو روپے کی ریزگاری ہوگی۔

میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کے گال چومے اور کہا۔
 ”میری جان اسکر دو کے خبری سب ابھی کچے تھے۔
 خوبانیوں کا موسم ختم ہو گیا تھا۔ تو تومی میں ہی تک مکا جاتے ہیں۔ چلو میں تمہیں راستے میں سے جو کوہے خرید دیتی ہوں۔“

میں انہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں ڈھیر سارا روپیہ بلتستان کی وادیوں میں کرائے بھاڑوں میں ختم کر آئی ہوں اور اب بمشکل گھر تک پہنچی ہوں۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر میرے میاں نے پھل خریدا کہ گھر میں دیوانوں کے بچے بھی انتظار میں تھے۔

”آخر آپ وہاں سے کیا لائی ہیں؟ اتنے وعدے کر کے گئی تھیں اور خالی ہاتھ آگئی ہیں۔“ بڑا بیٹا چیخا۔
 ”دیکھو بہت سی کہانیاں لائی ہوں۔ سچی، تاریخی، بے حد دلچسپ اور پیاری پیاری۔“

اس رات بیٹی نے گلے میں ہانپیں ڈال دیں۔ بیٹے سر ہانے پانستی بیٹھ گئے۔ ”چلو اب سناؤ جو لائی ہو۔“

اور میں نے ان روح پرور نظاروں اور رنگ رنگ کہانیوں کے دامن میں جھانکا اور یوں گویا ہوئی۔

بس تو من و من و منی نظارہ تھا۔ شام کے گھنے بادلوں میں جب دفعتاً بجلی چمکتی ہے اور اردگرد کا سارا ماحول روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں چیلو بالا میں برانے محل کی بیرونی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی اس بجلی جگہ آ کر ٹھہری تھی جس کے مشرقی طرف نیا محل اور اس سے ملحقہ چھوٹا باغیچہ، مغربی سمت بڑے باغ اور بیگم فتح علی خاں کے کمروں کی طرف جانے کا راستہ، جنوب میں پرانا محل اور شمال میں مزید سیڑھیاں اور شگتہ کمرے تھے۔ بس اسی بجلی جگہ پر جو مجھ سے کوئی چار فٹ کے فاصلے پر تھی کڑکتی بجلی لٹکارے پر لٹکارے مار رہی تھی۔

میں پڑ پڑ آنکھوں کے پٹ پھاڑے اسے دیکھتی تھی جس کے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال کانوں کے پاس دو چوٹیوں کی صورت تیز گلجانی چشم کے پراندوں میں گندھے کمر اور سینے پر جمبول رہے تھے۔ تائیوان کا مہندی رنگا چھوٹے چھوٹے پھولوں والا خوبصورت چمکتا سوٹ جس کی شلوار کے پائینچوں تلے ایرانی پلاسٹک کا جو تاج گورے گورے گداز پاؤں کو مقید کیے کھڑا تھا۔ میں ہیروں کی بہت سی اقسام سے شناسائی حاصل کر بیٹھی ہوں۔ اسی لیے حق بجانب ہوں کہ کہوں ان آنکھوں سے پھوٹی کر نہیں ہیروں کی چمک لیے ہوئے تھیں۔

”کون ہیں آپ؟“ اس نے سوال کیا۔
 ”میں ایک سیاح ہوں جسے وطن کی دلکش وادیاں اپنے نظاروں سے محفوظ کرنے کے لیے بھجلائی ہیں۔ اور آپ؟“

میں نے استفہامیہ نظریں اس پر گاڑ دیں۔
 ”شاہ جہاں۔ چیلو کے شاہی۔ بگو خاندان کی بہورانی۔“
 میں نے دیکھا تھا اس کی تئی گردن جواب دیتے ہوئے کچھ اور تن گئی تھی میں ہنسی اور بولی۔ ”گلتا ہے آپ کا نام بہت جگت میں رکھا گیا یا پھر کسی نے غور ہی نہیں کیا؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں۔

”بھئی آپ تو نور جہاں ہیں۔“
 اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔ وہ ہنسی اور میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولی۔ ”تو آئیے پھر آپ کو چائے پلواتے اور راجا فیملی سے ملواتے ہیں۔“
 میرے ساتھ اس وقت چیلو سول اسپتال کے ڈاکٹر اسماعیل کا چھوٹا بھائی یوسف تھا۔ شاہ جہاں نے یوسف سے محذرت کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ جائے اور یہ کہ ان کا نوکر مجھے چھوڑ آئے گا۔

یوسف نے میری طرف دیکھا۔ مجھے کچھ سخت سی محسوس ہوئی۔ بے چارے کو گا بیٹھنا کر ساتھ لائی تھی۔ اب راستے ہی سے وداع کر رہی تھی۔ مجبوری تھی۔ میں نے عاجزی سے کہا۔
 ”یوسف میں مغرب تک آ جاؤں گی۔ ڈاکٹر صاحب کو بتا دینا۔“

ساری راجا فیملی بڑے کمرے میں جمع ہو گئی تھی۔ راجا کھر منگ کی والدہ فاطمہ بیگم بھی کھر منگ سے ایک شادی کے سلسلے میں آئی ہوئی تھیں۔ سب سے بچے بچوں اور بھانجے نے روک لیا تھا۔

حسین ماضی مہارانی کھر منگ کی آنکھوں سے چمک

پھٹک پڑتا تھا۔ شاہ جہاں کی ساس مہارانی چیلو بھی پاس بیٹھی تھیں۔ میں نے ان آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔
 ”جاگیرداری ختم ہونے سے کیسا محسوس ہوتا ہے؟“
 لہجے میں زمانے کا درد سمٹ آیا تھا۔

”حال تو بہت تکلیف دہ ہے۔ خیر اب عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ درد کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے آخر کار دو ابن جاتا ہے۔“

شاہ جہاں پلیٹ میں اسمبلی خوبانیاں لائی، سفید، رسیلی خوبانیاں۔ زبان پر رکھو اور کھلتی ہوئی حلق میں اتر جائیں۔
 میں کھاتی گئی اور فاطمہ بیگم کی باتیں سنتی گئی۔ پھر چائے آگئی۔ نمکین سبز چائے۔ باہر شام اتر رہی تھی مہارانی چیلو ایک صورت کی مانند بیٹھی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ سے چائے پیتی تھی۔

اور جب شاہ جہاں گود کی بیٹی کو لیے میرے پاس آ کر بیٹھی اس نے کہا۔ ”یہ ہماری چچی مار جوری بلز کی بھیلی بہو ہے۔“
 ”مار جوری بلز“ یہ نام میں نے گلگت میں سنا۔ اس نام سے میرے کان ہنرہ میں آشنا ہوئے اور جب میں اسکو رو آئی تو را جا افتخار علی خاں اور مار جوری بلز کے نام ایک بار پھر

ساعت سے لکرائے اور جب میں نے کوہ ہندو کش اور کوہ قراقرم کی وادیوں کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تھا یہ نام وہاں بھی موجود تھا۔

شاہ جہاں کے ساتھ میں باہر نکل آئی تھی۔ چڑی کی لکڑی کے تختوں سے بنی راہداری جس کے چوٹی جھگڑے پر کہنیاں ٹکائے میں اپنے سامنے جھاگ اڑاتے شفاف پانی کے چشمے کو شور مچاتے دیکھ رہی تھی۔ کچے پیلے رنگ کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ناک میں گھس کر عجیب سی لطافت پیدا کرتی تھی۔
 ان پھولوں کے بارے میں جب میں نے پوچھا تو پتا چلا کہ یہ کشمیر سے لا کر لگائے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف پر سے آتی ہوائیں اب بہت خشک ہو گئی تھیں۔ تب میں نے کہا۔

”شاہ جہاں اپنی مرحوم چچی مار جوری بلز کے متعلق کچھ نہیں بتاؤ گی؟“

”سامنے دیکھو!“ اس نے دور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

”دیکھ رہی ہوں۔ بولو۔“ سینکڑوں فٹ اونچے اس پہاڑ پر میری نظریں جم گئی تھیں۔

اس پہاڑ پر چیلو کا تاریخی قلعہ اور محل ہے۔ یہ تھور سے کھر کہلاتا ہے۔ قلعہ تو کھنڈر بنا ہے پر مسجد جوں کی توں ہے۔ کل وہاں چلیں گے اور تمہیں میں وہیں وہ کہانی سناؤں گی جو سچی ہے اور تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔

میں نے سہم کر ایک بار پھر اپنے سامنے سر اٹھائے کھڑے اس پہاڑ کو دیکھا جو ایک دیو جیکل جن کی طرح پر پھیلائے کھڑا تھا اور جس پر ”تھور سے کھر“ کا شکتہ قلعہ اور محل واقع تھا اور جہاں جا کر وہ بہت طنائز اس الف لیلوی داستان سنانے کا کہہ رہی تھی جسے سننے کی میں زبردست خواہش رکھتی تھی۔

”کمال ہے۔ تم فضا میں معلق ہوئے بغیر یہ کہانی نہیں سنا سکتی ہو۔“

”لو سچی اور افسانے سے زیادہ دلکش کہانی کی تم اتنی سی قیمت نہیں دے سکتی ہو کہ خود چل کر ان جگہوں کو دیکھو جو اسے بہت محبوب تھیں۔ پہاڑ کے پچھلی طرف ہماری زمینیں ہیں۔ چچی مار جوری ان دنوں اوپر جایا کرتی تھیں۔“

مغرب کی اذان نے گفتگو اور سوچوں کے سارے راستے بند کر دیئے تھے۔ میں نے سر پر دوپٹا لیا اور نماز کے لیے چل دی۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب میں نے اسے کہا۔

”سنو! ڈاکٹر اسماعیل میرا انتظار کرتے ہوں گے۔ مجھے واپس بھجواؤ اب۔“

وہ پری جمال ایک ادا سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اس اندھیری رات میں اس وقت تم نے باہر نکل کر کیا اپنے گئے گوڈے تڑوانے ہیں۔ دوستی کر لی ہے میں نے تم سے، بھول جاؤ اب ڈاکٹر اسماعیل کو۔ جتنے دن چیلو میں رہو گی میرے پاس رہنا ہوگا۔ میرا بیٹا ڈاکٹر اسماعیل کو بتا آیا ہے۔“

رات کو نئے محل کے بڑے کمرے میں راگ و رنگ کی محفل جمی۔ شاہ جہاں بتا رہی تھی کہ ابھی پندرہ دن پہلے لاہور کالج کی پروفیسروں کا ایک گروپ چیلو آیا تھا اور اسی کمرے میں اس رات بھی ایسا ہی ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے بعد میں رضائی میں دبک کر پھر سو گئی تھی۔ نوبے کے قریب شاہ جہاں نے رضائی میرے اوپر سے کھینچ کر کہا۔

”کچھ خوف خدا کرو۔ چلنا نہیں کیا؟ ڈیڑھ گھنٹا چڑھائی میں لگے گا۔ ادھر پارگاؤں میں بھی جاتا ہے۔“

وہ اس وقت بائکن، وجاہت، دلاویزی اور سن و جمال کے آخری ذیے پر کھڑا تھا۔ سچی بات ہے راجا افتخار علی خاں چلو کے بیکو خاندان کی انگوشی کا وہ بیش قیمت ہیرا تھا جس کے بغیر انگوشی دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ ترک نسل کی ساری خصوصیات اس کے وجود میں سمٹ آئی تھیں۔ وہ سرینگر کی گلیوں کا ہارسنگار تھا۔ ایس۔ پی کالج سرینگر کا طالب علم جو کالج اور ہوٹل ہر جگہ اپنے حسن و جوانی کی بنا پر غیر معمولی شہرت رکھتا تھا۔

یہ جاتی بہاروں کی ایک رنگین سی شام تھی۔ چناروں کے پتروں پر کھلے پھولوں نے فضاؤں اور دلوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ بارش ابھی ابھی برسی تھی اور فضا میں بادلوں کے ٹکڑے یوں تہرتے پھر رہے تھے جیسے جمیلوں کے نیلگوں پانیوں میں گلیشٹر کے چھوٹے چھوٹے تودے۔

اس شام راجا افتخار اپنے جگری یار کے ساتھ اٹلیین کینے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ چھ فٹ سے نکلتی قامت پر ڈارک بلیو سوٹ، سرخ نکلائی اور سیاہ چم چم کرتے جوتے۔ دروازہ کھول کر وہ جس انداز میں اندر آیا تھا اور بیروں نے جس انداز میں اسے تعظیم دی تھی وہ پرنس آف ویلز نظر آتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ واقعی وادی چلو کا شہزادہ تھا۔

مار جوری بلز ایک برطانوی دو شیزہ جولندن سے سیرو سیاحت کے لیے ہندوستان اپنے عزیزوں کے پاس آئی تھی۔ مدراس میں اپنی حقیقی خالہ کے پاس دو ماہ رہنے کے بعد وہ ابھی ایک ہفتہ ہوا اپنی پھپھی مسز ولیم کے پاس سرینگر آئی تھی اس وقت وہ کینے کے ایک کونے میں بیٹھی کافی سے دل بہلاتی تھی۔ مسز ولیم جوں گئی ہوئی تھی۔

افتخار، غلام وزیر مہدی ممبر سابق مجلس شوریٰ اور سلطان ڈوپٹہ آف کشمیر تینوں لنگوٹینے یار ایک میز کے گرد بیٹھے تھے، بیروں نے چائے کی سروس دی۔ وہ کپ ہاتھوں میں تھامے باتیں کر رہے تھے جب مار جوری اپنی جگہ سے اٹھی ان کے پاس آئی اور افتخار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ عظیم برطانیہ کے کس حصے سے ہیں؟“

افتخار بڑا شوخ و شنگ جوان تھا۔ ہنسی ہونٹوں میں دبا گیا تھا۔ چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت لاتے ہوئے بولا۔

”آپ کو کہاں کا نظر آتا ہوں؟“

”اسکاٹ لینڈ۔“ مار جوری نے فوراً کہا۔

”بس تو ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے۔ میں وہیں

کا ہوں!“

شاہ جہاں نے چھوٹی بیٹی کو کبیل میں لپیٹ کر چورنگ (تنگوں کی لمبی نوکری) میں لٹائی اور اسے کمر پر کس لیا۔ میں نے چائے کی بوتل، کپ، پراسھے اور انڈے نوکری میں ڈالے اور اسے شاہ جہاں کی طرح کمر پر لادا اور جب وہ اس کی طنائیں درست کر رہی تھی میں نے کہا۔ ”شاہ جہاں تم نے یہ من پکا وزن بھی مجھ پر لاد دیا ہے۔ اگر کہیں میرا پاؤں رپٹ گیا تو یاد رکھنا میرا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔“

اس چلبلی نار نے جیکھی نظروں سے مجھے گھائل کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھلی میں سردیتی ہو اور موسلوں سے بھی ڈرتی ہو۔ وطن کے دشوار گزار حصے دیکھنے اور ان کے بارے میں لکھنے کا شوق بھی ہے اور راستوں کی صعوبتوں سے خوفزدہ بھی ہو۔ چلو سیدھی طرح اور ہاں تمہارے کون سے مرنے کے دن ہیں؟ دنیا تھوڑی بڑی ہے اس نیک کام کے لیے۔“

شاہ جہاں ان لوگوں میں سے تھی جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔

کتنے حسین لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہو گئے دل میں سما گئے

اس نے سارے قاصدے مٹانے میں صرف چند گھنٹے لیے تھے۔

فضا میں خفیف سی خنکی تھی۔ میرا جسم پسینا پسینا ہو رہا تھا۔ پہاڑ ایسا عمودی تھا کہ جب میں ذرا آنکھ کی خفیف سی جھری سے دائیں بائیں جھانکتی تو لمبے بھر کے لیے مجھے اپنا خون جیسے رگوں میں نمود سا محسوس ہوتا۔ شاہ جہاں آگے آگے باتیں کیے جا رہی تھی۔

”تھوڑے کمر۔“ پہنچ کر جب میں نے دیکھا تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ جنہوں نے اسے بنایا انسان تھے یا جن۔ اللہ، منوں وزنی پتھر کیوں کے ان عمودی پہاڑوں پر لائے گئے ہوں گے؟

پھر اس نے چورنگ میں سے بیٹی کو نکالا اور پتھروں کے پاس ایک ہمواری جگہ پر لٹا دیا۔ وہ لم بخت ابھی تک سو رہی تھی۔ معلوم نہیں کیا ایفون کھلائی ہوئی تھی اسے۔ جب میں اور وہ دونوں اس نکھری اور روشن فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اٹھاتے ہوئے چائے پی رہے تھے۔ سامنے دریائے شیوق چاندی کی طرح ایک لمبی لکیر کی مانند چمکتا تھا اور نیچے چلو بالا اور چلو پائٹن کے گھر گڑیوں کے گھر وندوں کی مانند نظر آتے تھے۔

شاہ جہاں نے ماضی میں چھلانگ لگادی تھی۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ مارجوری بولی۔

”ضرور ضرور شوق سے۔“

پر غلام وزیر مہدی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور یوں بھاٹا اچھوٹ گیا۔

سلطان ڈوپٹہ نے افتخار کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”معاف کیجیے گا محترمہ میں نے اسکاٹ لینڈ چھوڑ سارا انگلستان دیکھا ہے۔ اس جیسا انمول ہیرا تو وہاں ایک بھی نہیں۔ یہ ہندوستانی مسلمان ہے۔ آپ کو غلط بھی ہوئی۔“

”اوہ۔“ کہتے ہوئے مارجوری نے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”میں نے ایسا حسین مرد آج تک نہیں دیکھا۔“ غلام وزیر نے بلیتی زبان میں ہنس کر کہا۔ ”لو افتخار اب لوٹیا ہوئی عاشق۔“

مارجوری اس وقت ہالی عمریا کے دور میں تھی۔ سبز آنکھیں شراب کے تھمکتے پیمانے تھے۔

اگلے دن جب افتخار پھر کیفے گیا۔ مارجوری اپنی پھپی مسز ولیم کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ مسز ولیم نے افتخار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور ہونٹوں کو گولائی میں لاتے ہوئے بولی۔ ”ہاؤ ڈی شک۔ مارجوری نے کل رات اور آج سارا دن تمہارا ذکر کر کے میرے جذبہ تجسس کو اتنا شدید کر دیا تھا کہ میں کیفے بھی وقت سے پہلے پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ مارجوری تعریف کرنے میں سو فیصد حق بجانب تھی۔“

اب ہوا یہ..... اس سے آگے کہانی کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ جہاں کی بیٹی جاگ گئی تھی۔ اس نے اسے گود میں لٹایا اور دودھ پلانا شروع کر دیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے کپڑا پھیلا یا۔ انڈے پرائیٹے نکالے اور ہم دونوں نے کھانا شروع کر دیا۔ سر پر سورج چمک رہا تھا۔ جب ہم نیچے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ دیوتا ”تھور سے کھر“ کی چوٹی پر لٹکا ہوا ہے۔ وہاں بچپن کے تو ہاتھ بڑھا کر اسے توڑ لیں گے۔ بروہ اتنا ہی اونچا پھر تھا۔

اور جب اس نے کھانے کے بعد چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تب پھر بولی۔ ”اب ایک گھمبیر مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلو کے اس حسین شہزادے کی محبت کے دودھ عویدار پیدا ہو گئے تھے۔ بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کی سگی پھپی مسز ولیم جو افتخار کو سمو جانگل جانا چاہتی تھی۔ جو اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر جھٹکے دیتی اور کہتی افتخار تم جان نہیں پاؤ گے کہ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں۔“

پر افتخار فکر ٹ کرنے والا نوجوان نہیں تھا اور نہ ہی وہ

ایسی باتوں کو پسند کرتا تھا۔ اس کے لیے یہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ تھی۔

ایک دن جب مسز ولیم کسی اہم کام کے سلسلے میں جوں گئی ہوئی تھی مارجوری افتخار سے ملنے آئی۔ دونوں ایک پارک کے ویران سے گوشے میں بیٹھ گئے۔ مارجوری نمناک آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ساری صورت حال اس کے سامنے تھی۔ اس کی پھپی ایسی چنڈال اور بااثر شخصیت تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ افتخار کو اپنانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

دفعاً آنسو اس کی سبز آنکھوں سے موتیوں کی طرح بہنے لگے۔ افتخار نے انہیں اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا اور بولا۔

مارجوری تمہیں اس ترقی یافتہ آسائشوں سے پر ماحول سے بہت دور ایک پس ماندہ علاقے میں جہاں زندگی کی بیشتر سہولتیں حاصل نہیں رہنا ہوگا۔ کیا تم رہ لوگی؟ مارجوری نے گیلی آنکھوں کو لانا ہی انکھوں سے صاف کیا اور بچے جیسی مصومیت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”رہ لوں گی!“

جب اس نے یہ کہا تھا کہ میں رہ لوں گی۔ افتخار کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے چہرے پر قد ملیں جل آئی ہوں۔

افتخار نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اس نے سینے سے لگایا اور پوچھا۔ ”مارجوری تمہیں اپنا مذہب تبدیل کرنا ہوگا۔ کروں گی؟“

اور اس نے اس کے سینے پر سر مارتے ہوئے کہا۔ ”میں کروں گی۔“

تب افتخار جھکا اس نے اس کے بالوں پر پیار کیا اور اس کی پیشانی پر ایک طویل بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ”مارجوری تمہیں بردہ کرنا ہوگا۔ کروں گی؟“

”سب کچھ کروں گی۔ تم کہو گے تو آگ میں کود جاؤں گی۔“

اور افتخار نے اس کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ”نہیں جان افتخار آگ میں نہیں چلو کے محل میں کودنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

پر مارجوری ان سب کے باوجود فکر مند تھی۔ یہ فکر اس کی آنکھوں میں جھلملاتی تھی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ اس کی سوچوں میں نمایاں تھی۔

”افتخار تم مجھے کیسے حاصل کرو گے؟ یہ انگریز کا دور حکومت ہے۔ کہیں تمہیں نہ کچھ ہو جائے!“
 ”ارے اتحق! بھلا مجھے کیا ہوگا؟ گھبرایا مت کرو۔ سب ٹھیک ہوگا۔“

اور پھر مار جوری بلزا خواہوئی۔ پہلے اسے پنڈی پہنچایا گیا۔ چند دن بعد اسے سرینگر میں ایک ہاؤس بوٹ میں رکھا گیا۔ ان دنوں غلام وزیر مہدی (ممبر سابق مجلس شوریٰ پاکستان) کی ڈیوٹی لگی کہ وہ اسے ارکان اسلام سکھائے۔ وہ ہر روز ہاؤس بوٹ میں پہنچتا اسے قرآن مجید پڑھاتا اور نماز کے بارے میں سمجھاتا۔

ایک دن جب وزیر مہدی اسے قرآن مجید پڑھا رہا تھا اس نے دفعتاً کہا۔ ”مار جوری، جب آپ چلو چلی جائیں گی تو ہم سے کیا پردہ کریں گی؟“
 اور اس نو عمر دوشیزہ نے نہایت متانت سے کہا۔ ”اس کا انحصار تو افتخار کی مرضی پر ہوگا۔ اب مار جوری بلزا تو رہی نہیں۔ قافلہ مغربی ہے جو شوہر کی مرضی کے بغیر قدم نہیں اٹھائے گی۔“

پھر نکاح ہوا۔ گواہوں میں سلطان ڈو پٹہ آف کشمیر اور غلام وزیر مہدی تھے۔ اسے سرخ لباس پہنایا گیا۔ سرینگر کے ایک معزز گھر میں طعام و قیام کا بندوبست کیا گیا اور جب افتخار نے سرخ دوپٹا ہٹا کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا وہاں آنسو چھلکتے تھے۔

”افتخار مجھے ڈر لگتا ہے میری پھوپھی جوں سے آکر طوفان کھڑا کر دے گی۔“
 ”اوہو! اسٹو پڈ۔“ افتخار نے اسے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ ”تم کیوں ہلکان ہوتی ہو؟ یہ درد سہی اب میری ہے کہ مجھے اس بلا سے کیسے نمٹنا ہے؟“

اور پندرہ بیس دن بعد جب مسز ولیم لوٹ کر آئی اور بیٹی کو غائب پایا تو اس نے آفت مچا دی۔ اسے جیسے پختہ یقین تھا کہ اسے غائب کرنے میں افتخار کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں۔ انگریز لڑکی غائب ہو جائے اور طوفان نہ آئے۔ طوفان آیا پر اس طوفان کے آنے سے پہلے ہی افتخار اسے سرینگر سے لے بھاگا۔ جس شام انہیں سرینگر سے روانہ ہونا تھا مار جوری کے ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں میں دہشت و خوف کے سائے لرزیدہ تھے۔ وہ آزاد ماحول کی پروردہ لڑکی تھی پر افتخار کی محبت اور مسز ولیم کی دینگ شخصیت نے اسے بزدل بنا دیا تھا۔ کہیں یہ پھپھی کا

جملہ سن چکی تھی کہ میں اسے پاتال سے کھینچ لاؤں گی وہ جائے گی کہاں؟ میرے جیتے جی افتخار کے بازوؤں میں سوئے؟ ممکن ہی نہیں!“

پر مسز ولیم اور اس کے حواریوں کے کانوں میں اس گھوڑے کے سموں کی گرداڑاتی ہوا کا ایک ننھا سا بگولہ بھی نہ پہنچا جس کی نگلی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ کارگل کے راستے کھر منگ پہنچی تھی۔

کھر منگ میں اسے انٹوک کھر محل کے خوبصورت کمرے میں ٹھہرایا گیا۔

مسلل گھوڑے کے سفر میں اس کی ٹانگیں خون اتر جانے کے باعث سوچ گئی تھیں۔ پر اسے تو جیسے کسی دکھ اور مصیبت کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ہنستی تھی۔ تہمت لگاتی تھی اور اب اسے شاید یقین ہو گیا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس نے محبت کی بازی جیت لی ہے۔ اس نے اپنے محبوب کو حاصل کر لیا ہے۔

وہ بھی کیسے دن تھے۔ میری زبیری (بلیتی زبان میں ماں) بتاتی تھیں۔ بڑے راجا صاحب کو معلوم ہو گیا تھا کہ بیٹا ایک انگریز چھو کری بھگائے لا رہا ہے۔ پردہ جوانی کے منہ زور گھوڑے پر پند و نصائح کی کاٹھی ڈالنے کے خلاف تھے۔ اب جب وہ اسے قبول کر بیٹھا تھا تو بلا وجہ ہنگامہ آرائی کرنے کا فائدہ۔ پردادی رانی ماں سخت غصے میں تھیں۔ ”شاہ جہاں اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ دھوپ نے اس کا چہرہ قندھاری انار کی مانند کر ڈالا تھا۔“ ان کا خیال تھا کہ خاندان کے لیے افتخار کا یہ قدم شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے۔ اس صبح وہ راجا صاحب سے بھی الجھی تھیں کہ انہوں نے افتخار پر سختی نہیں کی۔ بھلا اس ماحول میں ایک انگریز لڑکی کیونکر رہ سکتی ہے۔ بھاگ جائے گی وہ چند مہینے رہ کر۔ محبت کا سارا جنون صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔“

”دیکھو، محبت انسان کو قربانی دینا سکھاتی ہے۔ اگر اسے افتخار سے سچا پیار ہوگا تو وہ تباہ کرے گی۔“
 ”خاک کرے گی۔“ دادی رانی ماں جھلا ہیں۔
 ”غصہ چھوڑو اور استقبال کی تیاریاں کرو۔“

شاہ جہاں نے اس وقت مجھے دیکھا اور کہا۔ ”آج میں سوچتی ہوں دادی رانی ماں کی سوچ کتنی غلط تھی؟“
 ہاں تو پھر جاروق (محل میں راجا کے بیٹھنے کی جگہ) میں بیٹھے بیٹھے راجا صاحب نے اپنے ولی عہد یعنی میرے

سسر راج فتح علی خاں کو آواز دی۔ جب وہ آئے تو انہیں کہا۔
 ”جاؤ اپنی زیزی سے کہو کہ اس کے لیے بلتی لباس
 تیار کروایا جائے۔ یہ لباس انہیں کھر منگ پہنچائے جائیں۔
 میں چاہتا ہوں وہ ہمارے اپنے لباس میں ہماری سر زمین پر
 قدم رکھے۔“

پھر بکسوں کی تہوں سے سرسراتے ریشمی کپڑے نکلے۔
 ان کی کتر بیونت شروع ہوئی۔ سارا محل راگ و رنگ میں
 ڈھل گیا۔

مردوں نے محل کے سامنے چھوٹے لان میں تھین کار
 کی چھ دھنیں بجاائیں اور دو دو آدمیوں نے مل کر رقص کیا۔
 دونوں ابھی کھر منگ اپنی پچھسی فاطمہ کے انٹوک کھر
 میں ہی تھے۔ چلو آنے کا اذن ابھی نہیں ملا تھا۔ وہ ہر روز
 پوچھتی۔ ”افتخار ہم تمہارے کھر کب جائیں گے؟“

اور وہ بظاہر ہنستے ہوئے کہتا۔ ارے بھئی چلے
 جائیں گے۔ کوئی باہر تھوڑی بیٹھے ہیں۔ باپ کا کھر نہ سہی
 باپ کی بہن کا سہی۔ پر وہ اندر سے کچھ پریشان بھی تھا۔
 اسے تشویش تھی کہ کہیں باپ اور اماں پھڈانہ ڈال بیٹھیں۔
 جس سہ پہر فتح علی خاں نوکروں کے ساتھ پہنچا اور اس نے
 صورت حال واضح کی۔ تب کہیں جا کر ہمہ وقت ذہن میں
 کلبلاتے اندیشے شتم ہوئے۔

پھر مار جوری کہ جس کا اسلامی نام صغریٰ فاطمہ تھانے
 بلتی لباس پہنا۔ بلتی گن مو (قمیص) جس کے کھلے بازوؤں
 کو وہ شوق بھری آنکھوں سے بار بار بازو اٹھا اٹھا کر دیکھتی
 تھی۔ اس نے گلے میں فلا اور سر پر بلتی ٹوپی جس پر طومار
 (منتقل زیورات) سجے ہوئے تھے پہنے۔ سر پر چادر
 اوڑھی۔ افتخار اس وقت اس کے پاس موجود تھا۔ جب وہ
 تیار ہو کر افتخار کی طرف مڑی اور بولی۔
 ”دیکھو تو میں کیسی لگتی ہوں؟“

اس نے سگار اپنے منہ سے نکالا۔ اس کی آنکھوں میں
 جھانکا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے نازک شانے
 دبائے اور بولا۔ ”تم چیلو کی ملکہ نظر آتی ہو۔“

وہ ہنسی۔ پر اب افتخار نے سنجیدگی کا روپ دھار کر کہا۔
 ”مار جوری۔“ وہ اسے مار جوری ہی کہتا تھا۔ ”دیکھو میری
 ماں میرے اس قدم پر سخت ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے کہ
 اس ماحول میں تم نباہ نہیں کر سکو گی اور ایک دن مجھے چھوڑ کر
 چلی جاؤ گی۔ دیکھو مار جوری میں نے اپنے خاندان کی حسین
 ترین لڑکیاں روند کر تمہیں پسند کیا۔ تمہیں زندگی کے کسی

موڑ پر یہ احساس نہیں دلانا ہے کہ میں نے اپنی زندگی کا یہ
 فیصلہ کرتے ہوئے اندھے جذبات سے کام لیا تھا۔“

مار جوری کا چہرہ پہلے دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید
 پڑا، سکڑا، پھر اس کی آنکھوں میں آنسو اترے۔ ”افتخار
 تمہاری ماں نے اگر ایسا سوچا تو وہ اپنی سوچ میں حق بجانب
 ہیں کہ وہ مجھے نہیں جانتیں پر تمہیں تو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔
 تمہیں میرا اور میرے اندر کے سارے جذبات کا علم ہے۔“
 اور وہ اس شدت سے روئی کہ افتخار کو اسے سنبھالنا
 دو بھر ہو گیا۔ جب وہ اس کی گیلی آنکھوں کو خشک کر رہا
 تھا مار جوری نے کہا تھا۔

”افتخار۔۔۔ وفا کو تم مشرق کی میراث سمجھتے ہو۔ میں
 اس پر سے مشرق کی اجارہ داری کو ختم کر دوں گی۔“
 پھر وہ پالکی میں بیٹھی اور کھر منگ سے اس کلیہ سحر کے
 راستے چیلو میں آئی۔ جو منگ جیسے کہلاتا ہے۔ سارا چیلو اس
 وقت پولو گراؤنڈ میں جمع تھا۔ رعایا نے ہاتھوں میں تھالیاں
 پکڑی ہوئی تھیں جن میں ان کی حیثیت کے مطابق نذرانے
 تھے۔

اس وقت سینو پا کی دھنیں بجنی شروع ہوئیں۔ سات
 مردوں کا نکوار کے ساتھ رقص کا آغاز ہوا اور کہاروں نے
 پالکی پولو گراؤنڈ کے سامنے لا کر رکھ دی۔

پردے اٹھائے گئے۔ وہ نکلی۔ پولو گراؤنڈ میں آہستہ
 آہستہ چلتے ہوئے اس نے رعایا سے تحائف قبول کیے اور
 ان کی دعائیں لیں، افتخار اس کے ساتھ تھا۔

پھر وہ محل میں داخل ہوئی۔ سسرانی عزیزوں سے ملی
 اور جب افتخار کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوئی وہ اس
 کے قدموں میں جھکی تھی اس نے اس کے پاؤں پر اپنے
 مرمریں ہاتھ رکھے اور گلوگیر آواز میں بولی تھی۔

”افتخار، یہ زندگی تمہارے نام رقم ہوئی۔“
 اس وقت میں نے گھڑی دیکھی۔ ظہر کی نماز کا وقت
 ہو رہا تھا۔ پینے کے لیے جو پانی ہم بوتل میں ڈال کر لائے
 تھے اس سے وضو کا ہونا بہت مشکل تھا۔ میں نے شاہجہاں
 سے پوچھا۔

”کہیں نزدیک پانی ہے؟“
 وہ بولی۔

”چلو اس طرف“ ”تھوڑے کھر“ کی طرف چلتے
 ہیں۔ ذرا نیچے جہاں گندم پکی گھڑی تھی۔“
 میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بخت اب پھر مجھے

اتر دئے گی چڑھائے گی۔ باز آئی میں تیری زمینیں دیکھنے سے۔“

ہے نہیں۔ تھینا میں اتنی ایثار پسند ہو ہی نہیں سکتی۔“
 ”میری بچی، جو چلو تمہیں آج نظر آتا ہے اس چلو سے بہت مختلف ہے جب ماہجوری یہاں آئی تھی۔ تب بجلی نہیں تھی، اسپتال نہیں تھے، سڑکیں نہیں تھیں، لوگ بڑھے لکھے نہیں تھے۔ جاگیرداری روایات میں پلا ہوا گھرانہ تھا جس کی عورتیں محلاتی سازشوں کا شکار تھیں۔ توڑ جوڑ جن کی فطرت تھی۔ وہ بہت نمگسار اور شفیق عورت تھی۔ اسے چلو آئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا جب گھر کی ایک ملازمہ نے اس کے اس سویٹر کی بہت تعریف کی جو وہ پہنے ہوئے تھے اس نے اشارے سے پوچھا۔
 ”لوگی؟“

ملازمہ نے اشارہ سمجھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ اس نے سویٹر اتارا اور اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔
 اس واقعے کو بڑی مہارانی کے کانوں تک پہنچنے میں اتنی ہی دیر لگی تھی جتنی اسے اپنے کمرے میں پہنچنے میں۔ بڑی مہارانی آگ بگولہ تھی۔ فی الفور اسے طلب کیا۔ افتخار کے سامنے اسے وہ بے بجاؤ کی سنائیں کہ بیچاری ہونٹوں کی طرح ان کی صورت دیکھتی رہی۔ پھر جب کمرے میں آئی تو افتخار نے پوچھا۔
 ”تم نے نوکرانی کو سویٹر کیوں دیا تھا؟“ اور وہ حیرت زدہ سی بولی۔

”اس نے مانگا تھا۔ افتخار بھلا کسے نہ دیتی؟“
 ”کل کوئی تم سے مجھے بھی مانگ سکتا ہے۔ دے دو گی مجھے؟“

”تمہیں کیوں؟ کون مانگے گا تمہیں مجھ سے؟“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”میری زیزی جو ادھار کھائے بیٹھی ہے۔“ افتخار نے سچی سے کہا۔

”مارجوری یاد رکھو یہاں رہتا ہے تو ہونٹوں کو کسی لو اور کانوں کو کھول لو۔“

اور اس نے ہونٹوں کو سی لیا تھا اور کانوں کو کھول لیا تھا اور ساری زندگی اسی انداز میں اس گھر میں گزار دی تھی۔

”کیا کوئی لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟ ارے خود ہماری بہو بیٹیاں ایسی نہیں۔“

میں مہارانی کی بات کا کیا جواب دیتی کہ خود مجھے اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت تھی۔

میں نے تیم کیا۔ نماز پڑھی۔ یہ حقیقت ہے کہ نماز میں ایسی سپردگی اور ایسا جذب بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جیسا بلتستان، گلگت، ہنزہ اور نگر کی وادیوں میں۔ شاید خدا کے وجود کا ایک بڑا ذرہ بنگا نظر آتا ہے یہاں۔ انسانی کاریگری اور شان کا فقدان ہی اس کے وجود کا بھرپور احساس دلاتا ہے۔ دعا مانگنے کے بعد میں نے کہا۔ ”شاہ جہاں مارجوری بلز کی زندگی کا یہ ایک پہلو تو ختم ہوا۔ میرے خیال میں زور دار قسم کا عشق کرنا تو کوئی معرکے کی چیز نہیں۔ اصل چیز عشق کے بعد اس تعلق اور ناطے کو نباہنا ہے۔ مارجوری کا یہ پہلو بھی دکھاؤ۔“

شاہ جہاں نے بیٹی کو اٹھا کر چورنگ میں ڈالا۔ اسے کمر پر کسا اور بولی۔ ”اس پہلو کے بارے میں میری ساس بہتر جانتی ہیں ان سے پوچھنا۔“

پھر ہم دیرے دیرے نیچے اتر آئیں۔ اترائی میں بہت دشواری محسوس ہوئی تھی۔ لڑھکنے والی کیفیت تھی۔

محل میں آ کر میں نے وہ الہم دیکھا جو اس کی تصویروں سے بھرا پڑا تھا۔ کہیں وہ اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔ کہیں اپنی ساس اور جیٹھانوں کے ساتھ ہنس رہی ہے۔ کہیں افتخار کے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اس کی وہ تصویر بھی تھی جس میں وہ سفید کفن پہنے سرخ پھولوں سے لدی پھندی خاک ہونے جا رہی تھی۔

میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں مجھے اپنے چاروں طرف اس پھول کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے صفحہ پلٹ دیا تھا۔ ایک اور تصویر ہنسی مسکراتی سبز آنکھوں سے محبت اور خلوص کی بارش کرتی ہوئی سامنے آگئی تھی۔

رات کو مہارانی سے باتیں ہوئیں۔ میں نے وہی سوال کیا تھا جس کے بارے میں شاہ جہاں نے کہا تھا۔

”میری ساس اس پہلو پر زیادہ بہتر بات کر سکتی ہیں۔“
 پر ہوا یہ کہ مہارانی نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

”بولو اگر تمہیں کسی سے عشق ہو جائے اور اس کے ساتھ کسی ایسے ماحول میں رہنا پڑے تو بتاؤ رہ سکو گی؟“

میں شپٹا اٹھی تھی۔ پر چند لمحوں سوچنے اور اپنے آپ میں ڈوبنے کے بعد میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ”میرا خیال



شمال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

انسان اگر خود پر غور کرے تو سمجھ آئے کہ وہ کیا نہیں ہے، ناخدا ہے، بحر ہے، کشتی ہے، ساحل ہے یہی نہیں ہے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساقی بھی ہے، محفل بھی ہے۔ اسی لیے اس نے سوچا کہ اب وہ راہ، رہو، رہبر ہی نہیں منزل بھی بن کر دکھائے گا۔ اپنے اسی خواب کو تعبیر دینے کے لیے وہ ارضِ پاک سے نکلا، کہ وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا، عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا، لیکن عزت کا تاج سر پر رکھنے کے لیے اسے وطن عزیز میں رہ کر جو عزت و شہرت ملی ہوئی تھی، اپنوں کی جو محبت و شفقت کا ہالہ اس کے گرد تھا اسے تیاگنے کے بعد دل کی حالت کیا ہوئی، کن کن مصائب کا سامنا رہا اسی جہدِ مسلسل کی لفظی تصویر۔

ایک الگ انداز کی سفر کہانی کا چوتھا حصہ

کادن تھا۔ ہم سب عجیب نمھے میں پھنس گئے تھے کہ اب کیا ہو گا۔ پورا شہر انواہوں کی زد میں آ گیا تھا اور ہر زبان پر نئی نئی خبریں تھیں مگر ایک بات پر سب متفق تھے کہ جس کو کاشا سمجھ کر نکالا گیا ہے وہی نواز شریف کی حکومت کے تن میں پیوست ہو

یہ خبر ایسی تھی کہ پورے ملک میں ہلچل مچ گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ نواز شریف نے اپنے آرمی جنرل پرویز مشرف کو ہٹا کر کسی اور کو چیف آف آرمی اسٹاف بنا دیا تھا۔ ٹی وی کی نشریات اس خبر کے چند گھنٹوں بعد بند ہو گئیں۔ وہ 12 اکتوبر

جولائی 2016ء

77

ماہنامہ سرگزشت

چکا ہے۔

رات گئے خبر آئی کہ فوج نے نواز شریف کو ہٹا کر اقتدار سنبھال لیا ہے۔ میں کچھ دیر تک بے یقینی کا شکار رہا کہ کہیں میری فلائٹ اس سے متاثر نہ ہو جائے مگر میری فلائٹ میں ڈیڑھ ماہ باقی تھا، اس لیے دل کو تسلی دے دی کہ جو ہونا ہے وہ دو چار دن میں ہو جائے گا۔ فلائٹ کی ڈیٹ تک حالات معمول پر آ جائیں گے، اس لیے میں دوبارہ سے بے فکر ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آ گیا۔ کہیں سے کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا۔ زندگی اپنے معمول کے سفر پر بڑھتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب میرے ہاتھوں میں میری روانگی کا ٹکٹ آ گیا۔

چھ سات مہینے کا میرا خرچ بھی زرمبادلہ کی شکل میں آچکا تھا اور اپنی عدم موجودگی میں فیملی کے لیے بھی میں نے انتظام کر دیا تھا۔ اس کے بعد اب مجھے صرف اپنے اندر ہمت پیدا کرنی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کینیڈا میں میرے ساتھ کیا ہوگا۔ بات یہاں تک رہتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ جو کسک میرے دل میں تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ میں اپنے بچوں سے کیسے دور رہوں گا۔ میں اپنی چار سالہ بیٹی قدیل کے بغیر ایک دن بھی نہ رہ سکتا تھا۔ وہ آدھی رات کو نیند کی حالت میں اپنے پیٹھ کوڑے سے اپنا انتھاسا کیے اٹھا کر گرتی پڑتی میرے پاس آتی اور اپنا ایک ہاتھ میرے چہرے پر رکھ کر سو جاتی تھی۔ اریبہ ابھی چند ماہ کی تھی اور وہ اتنی مانوس نہ ہوتی تھی۔ اپنے کنبے سے جدا ہو کر ایک نامعلوم عرصے کے لیے وطن سے دور جانا ایک بڑا ہی مشکل فیصلہ تھا اور اب بھگتنا بھی مجھے ہی تھا۔

میری دوستی کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ میں نے سوچا کہ چند دنوں کے لیے جا کر اپنے دوستوں سے مل لوں۔ ملتان سے میں نے فارمسی میں ایم فل کی ڈگری لی تھی اور بہت سے دوست بنائے تھے۔ ان سے ملنے میں ملتان گیا اور پھر لاہور آ گیا۔ وہاں میری بہن کا گھر تھا۔ ادھر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو نورتھو میں چار سال رہ کر آئے تھے۔ میرے بہت سے سوالوں میں موسم کے سوال پر اس نے کہا۔ ”نورتھو میں سردی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر آپ اپنا چہرہ ڈھانپ کر نہیں نکلتے تو آپ کی ناک کڑک کر نیچے گر سکتی ہے۔“ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ناک بھی کٹ سکتی ہے یا نہیں۔ مگر کی عزت پر حرف آنے سے ناک کٹنے کا سنا تو بہت تھا مگر سردی سے بھی ناک کٹ سکتی ہے۔ پہلی بار سنا تھا اس لیے خوف کی

سردی اسی وقت جسم میں دوڑتی محسوس کی اور اس کے سدباب کی تیاری پر کمر بستہ ہو گیا۔ یوں بھی میں لکھنؤ کے بانکوں جیسا بہادر تو تھا نہیں شاید آپ نے بھی لکھنؤ کے بانکوں کے قصے سنیے ہوں گے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں کوئی ایک ہانکا نخاس کے چوراہے پر کھڑا ہو جاتا اور پھر آواز لگاتا ہے کوئی ہم سا پھر پانی کا مٹکا اٹھا کر نہانا شروع کر دیتا۔ جواب میں کسی اور محلے کا پانکا دو مٹکے سے نہا کر کہتا ہم ہیں تمہارا جواب۔ ایک نواب کے مصاحب کا بیٹا پانکا بن گیا۔ مصاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ بانک پن چھوڑ دے۔ نواب صاحب نے کہا اپنے بیٹے سے جا کر کہو کہ اگر اس نے روش ترک نہ کی تو میں نخاس میں کھڑا کر کے اس کی ناک کاٹ لوں گا۔ مصاحب نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا اٹھ کر باہر گیا اور کچھ دیر بعد گھر لوٹا۔ بند ٹھی باپ کے سامنے کھولی اور کہا۔ ”یہ رہی میری ناک۔ میں نے نخاس میں کھڑے ہو کر خود کاٹ دی۔“

میں نہ تو اپنے ہاتھ سے اپنی ناک کاٹ سکتا تھا اور نہ ناک کٹوا سکتا تھا۔ اس لیے سمجھ گیا کہ سردی بلا کی ہوتی ہے اور اس کے سدباب کے اسباب جمع کرنے لگا۔ میرے پاس گرم کپڑوں میں ایک لیڈر کی جیکٹ تھی۔ اتنی سردی میں یہ کسی کام کی نہ تھی۔ ہمارے کئی جاننے والے لیڈر کی جیکٹ اور اوننی جرسیاں لے جاتے ہیں۔ جو وہاں کسی بھی موسم میں نہیں پہنی جاسکتی ہیں۔ اتنی بے پناہ سردی سے بچاؤ کے لیے میں نے لاہور کے لنڈا بازار سے ایک بڑا لہبا اوننی کوٹ خریدا۔ گھنٹوں تک آتی اوننی جرابیں لیں اور کچھ اوننی ٹوپیاں خرید لیں۔ میرا ایک سوٹ کیس تو انجی سے بھر گیا۔ وہ لہبا کوٹ تو میں نے کینیڈا میں ایک پارہی پہنا اور پھر اس لیے اتار پھینکا کیونکہ جو دوست بھی دیکھتا تھی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ اوننی جرابیں مگر اس سردی میں کام آگئیں۔ پھر لاہور میں بہن سے مل کر اسلام آباد آیا، میری فلائٹ بھی اسلام آباد ہی سے تھی۔ لطیف نے کہا کہ وہ فلائٹ سے پہلے ڈیرہ آ جائے گا اور کچھ دن اکٹھے گزاریں گے۔ ایک شام اپنی پسندیدہ جگہ جو فیصل مسجد کے پیچھے ہے، وہاں گزاری اور میں اپنی تر آنکھوں سے فیصل مسجد کے مینار دیکھتا رہا کہ یا نصیب یہ فرصت کے لمحات پھر سے لوٹ کر آئیں گے یا نہیں..... اور نہ پھر فرصت کے لمحات ملے اور نہ کبھی تصور جاناں کی مہلت مل سکی۔

وہاں سے پشاور آیا۔ مجھے فلائٹ سے پہلے بھی آنا تھا مگر مجھے اپنی ٹکٹ رشید علی زئی سے اٹھانی تھی۔ میں اس کی ٹریول ایجنسی کے دفتر میں بیٹھاپی آئی اے کے اس بڑے

پوسٹر کو دیکھ رہا تھا جس پر ٹورنٹو کے سی این ٹاور کی فوٹو تھی۔ اس ٹاور کی باتیں میں پہلے بھی سفر نامے میں پڑھ چکا تھا اور اب میں اس کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا تھا۔ دفتر میں ایک صاحب بیٹھے تھے جو ایک بار ٹورنٹو جا چکے تھے۔ وہ مجھے وہاں کے کلب اور ریڈ ایریا کی باتیں بتانے لگے۔ یہ بتاتے ہوئے اس کی رال بھی ٹپک رہی تھی۔ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا مگر مجھے ان چیزوں سے کھن آ رہی تھی۔ میرے خیال میں انسان کچھ میں پھسل سکتا ہے مگر کوئی نہیں سکتا۔ رشید صاحب نے میرا ٹکٹ مجھے تھما دیا۔ آج کل تو پی آئی اے کی فلائٹ پاکستان سے اڑتی ہے تو سیدھی ٹورنٹو جاتی ہے۔ 99ء میں ٹورنٹو کی فلائٹ پاکستان سے ایئر لائنز کے شہر شین (Shanon) میں ٹھہرتی ہوئی نیویارک جاتی ہے۔ وہاں کے مسافروں کو اتار کر بقیہ میں چالیس مسافروں کو ٹورنٹو لے آتی۔ ان دنوں اتنے امیگریشنز ابھی کینیڈا نہیں پہنچے تھے اور خال خال نظر آتے تھے۔ اب تو پاکستان سے تین فلائٹس ہر پنتے سیدھا ٹورنٹو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قطر ایئر لائن، ترکش، اتحادہ ایمریش بھی ٹورنٹو سے پاکستانوں کو بھر کر لارہی ہیں اور لے بھی جا رہی ہیں۔

میں ٹکٹ لے کر ڈیرہ واپس آ گیا۔ ایک ماہ رہ گیا تھا میرے اگلے سفر کو نکلنے میں۔ دن جیسے جیسے قریب آتے گئے اور میں کمزور پڑتا گیا۔ چند ماہ پہلے جو خوشی اور جذبہ میرے اندر تھا وہ اب مفقود ہو چکا تھا۔ میرا دوست لطیف کچھ دن میرے ساتھ گزارنے کے لیے ڈیرہ آ گیا تھا۔ اس کا گھر دریا سندھ کے کنارے پر تھا۔ ہم دونوں اکثر شام سے پہلے دریا کی ریت پر دور تک چلے جاتے اور جہاں دریا کے پانی ہمیں روکتے ہم وہیں بیٹھ جاتے سامنے پھیروں کی کشتیاں ہوتیں اور وہاں کوئی بانسری بجا رہا ہوتا۔ وہیں بیٹھ کر ہم اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے لمحات کو یاد کرتے۔ ڈیرہ میں گزرے سب دکھ اور سکھ کے لمحات مجھ پر اترتے۔ کبھی باتیں ہوتیں اور کبھی ایک لمبی خاموشی جو میں آسمان کو نکتے گزارتا۔ میں ایک دو ماہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا۔ جب میں یہ سوچتا کہ کیا کوئی ملک اتنا بھی جاذب ہو سکتا ہے جس کے لیے میں ہمیشہ کے لیے اپنی سرزمین کو چھوڑ دوں۔

گر میوں کے دن گزر چکے تھے۔ سردیوں کی آمد تھی۔ مغرب سے سفروں کے مارے پرندے لمبی لمبی اڑان کے بعد دریا میں بنی جھیلوں پر اترتے تھے۔ ان پرندوں نے تو شکار ہو جانا تھا اور جو باقی بچتے وہ واپس لوٹ جاتے۔ میں کیسا پرندہ تھا

جس کی منزل یکطرفہ تھی۔ میں شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ جانے کا ارادہ چھوڑتا تو بھی نہ چھوڑ سکتا تھا اور جانے سے بھی ہول سا اٹھتا تھا۔

انہی دنوں میں نے ابو بن ادھم کا ایک واقعہ پڑھا۔ وہ شام کو ہر روز مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ ایک شام ان کو ایک بندہ ملا جس نے بتایا کہ کل میں تجارت کے لیے دور کے سفروں پر نکل رہا ہوں، میرے لیے دعا کریں۔ دعا کی گئی اور وہ اگلے دن چلا گیا۔ تین چار دن بعد ابو بن ادھم نماز پڑھنے مسجد میں آئے تو اسی شخص کو مسجد میں پایا۔ حیران ہوئے اور پوچھا تم تو ایک لمبے سفر پر تجارت کے لیے نکلے تھے اور واپس کیوں آ گئے؟ اس بندے نے کہا کہ میں جب سفر پر نکلا تو پہلا پڑاؤ شہر سے دور ایک بیابان ویرانے میں ہوا۔ میں نے اپنا اونٹ ایک درخت سے باندھا اور خیمہ لگایا۔ شام کا وقت تھا اور وطن کی یاد میں آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اتنے میں سامنے درخت پر دیکھتا ہوں کہ ایک بیمار چڑیا کا بچہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اڑنے کی سکت نہ تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس کو اللہ کیسے رزق دیتا ہوگا؟ یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھا اور ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی۔ اس کی چونچ میں دانہ تھا۔ اس نے وہ دانہ اس بیمار چڑیا کے بیچ کے منہ میں ڈالا اور پھر اڑتی ہوئی کہیں دور چلی گئی۔ وہ بندہ حضرت ادھم سے کہنے لگا کہ میں نے سوچا کہ اگر ایک بیمار چڑیا کو اللہ اس کے گونسلے میں رزق دے سکتا ہے تو مجھے کیا اپنے وطن میں نہیں دے سکتا؟ اور یہی سوچ کر میں واپس آ گیا۔ یہ سب سن کر حضرت ادھم نے اس سے کہا کہ تم اپنے آپ کو اس بیمار چڑیا کی جگہ کیوں رکھتے ہو؟ اس تو اتنا چڑیا کی جگہ کیوں نہیں رکھتے جو کھلے آسمانوں میں اڑ کر اپنا رزق بھی تلاش کرتی ہے اور ناتواں اور بیمار چڑیا کا رزق بھی اللہ کے حکم سے اس کے منہ میں ڈالتی ہے۔ یہ سن کر وہ بندہ رونے لگا اور اگلے دن رزق کے لیے لمبے سفر پر نکل گیا۔

یہ پڑھ کر میرے اندر بھی کوئی احساس اترا اور دل و دماغ پر بیٹھ سا گیا۔ کیا معلوم میرا رب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ یہ سارے کام اس ذات نے ایک کمال سے پورے کیے ہیں تو یہی اس کی مصلحت ہے۔ اس سے میرا حوصلہ قدرے بہت بلند ہو گیا اور صرف بچوں سے جدا ہونے کی غلغلہ دل میں رہ گئی۔

میرے جانے کے دن جیسے جیسے قریب ہوتے گئے، میں اتنا ہی اداس ہوتا گیا۔ انہی دنوں طارق نے نیویارک سے فون کر کے کہا کہ جمال بھی آج کل ٹورنٹو میں ہوتا ہے اور

چکا ہے۔

رات گئے خبر آئی کہ فوج نے نواز شریف کو ہٹا کر اقتدار سنبھال لیا ہے۔ میں کچھ دیر تک بے یقینی کا شکار رہا کہ کہیں میری فلائٹ اس سے متاثر نہ ہو جائے مگر میری فلائٹ میں ڈیڑھ ماہ باقی تھا، اس لیے دل کو تسلی دے دی کہ جو ہونا ہے وہ دو چار دن میں ہو جائے گا۔ فلائٹ کی ڈیٹ تک حالات معمول پر آ جائیں گے، اس لیے میں دوبارہ سے بے فکر ہو گیا تھا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آ گیا۔ کہیں سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ زندگی اپنے معمول کے سفر پر بڑھتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب میرے ہاتھوں میں میری روانگی کا ٹکٹ آ گیا۔

چھ سات مہینے کا میرا خرچ بھی زرمبادلہ کی شکل میں آچکا تھا اور اپنی عدم موجودگی میں فیملی کے لیے بھی میں نے انتظام کر دیا تھا۔ اس کے بعد اب مجھے صرف اپنے اندر ہمت پیدا کرنی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کینیڈا میں میرے ساتھ کیا ہوگا۔ بات یہاں تک رہتی تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ جو کسک میرے دل میں تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ میں اپنے بچوں سے کیسے دور رہوں گا۔ میں اپنی چار سالہ بیٹی قدیل کے بغیر ایک دن بھی نہ رہ سکتا تھا۔ وہ آدمی رات کو نیند کی حالت میں اپنے پیٹھ کوڑے سے اپنا تنہا سا تکیہ اٹھا کر گرتی پڑتی میرے پاس آتی اور اپنا ایک ہاتھ میرے چہرے پر رکھ کر سو جاتی تھی۔ اریہ ابھی چند ماہ کی تھی اور وہ اتنی مانوس نہ ہوتی تھی۔ اپنے کنبے سے جدا ہو کر ایک نامعلوم عرصے کے لیے وطن سے دور جانا ایک بڑا ہی مشکل فیصلہ تھا اور اب بھگتنا بھی مجھے ہی تھا۔

میری دوستی کا حلقہ بھی بہت وسیع تھا۔ میں نے سوچا کہ چند دنوں کے لیے جا کر اپنے دوستوں سے مل لوں۔ ملتان سے میں نے فارسی میں ایم فل کی ڈگری لی تھی اور بہت سے دوست بنائے تھے۔ ان سے ملنے میں ملتان گیا اور پھر لاہور آ گیا۔ وہاں میری بہن کا گھر تھا۔ ادھر ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ٹورنٹو میں چار سال رہ کر آئے تھے۔ میرے بہت سے سوالوں میں موسم کے سوال پر اس نے کہا۔ ”ٹورنٹو میں سردی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اگر آپ اپنا چہرہ ڈھانپ کر نہیں نکلتے تو آپ کی ناک کڑک کر نیچے گر سکتی ہے۔“ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ناک بھی کٹ سکتی ہے یا نہیں۔ گھر کی عزت پر حرف آنے سے ناک کٹنے کا سنا تو بہت تھا مگر سردی سے بھی ناک کٹ سکتی ہے۔ پہلی بار سنا تھا اس لیے خوف کی

سردی اسی وقت جسم میں دوڑتی محسوس کی اور اس کے سدباب کی تیاری پر کمر بستہ ہو گیا۔ یوں بھی میں لکھنؤ کے بانکوں جیسا بہادر تو تھا نہیں شاید آپ نے بھی لکھنؤ کے بانکوں کے قصے سنیے ہوں گے۔ کڑکڑاتی سردیوں میں کوئی ایک ہانکا نغاس کے چوراہے پر کھڑا ہو جاتا اور پھر آواز لگاتا ہے کوئی ہم سا پھر پانی کا مشکا اٹھا کر نہانا شروع کر دیتا۔ جواب میں کسی اور محلے کا ہانکا دو منٹے سے نہا کر کہتا ہم ہیں تمہارا جواب۔ ایک نواب کے مصاحب کا بیٹا ہانکا بن گیا۔ مصاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ ہانکا پن چھوڑ دے۔ نواب صاحب نے کہا اپنے بیٹے سے جا کر کہو کہ اگر اس نے روش ترک نہ کی تو میں نغاس میں کھڑا کر کے اس کی ناک کاٹ لوں گا۔ مصاحب نے بیٹے سے کہا۔ بیٹا اٹھ کر باہر گیا اور کچھ دیر بعد گھر لوٹا۔ بند مٹھی باپ کے سامنے کھولی اور کہا۔ ”یہ رہی میری ناک۔ میں نے نغاس میں کھڑے ہو کر خود کاٹ دی۔“

میں نہ تو اپنے ہاتھ سے اپنی ناک کاٹ سکتا تھا اور نہ ناک کٹوا سکتا تھا۔ اس لیے سمجھ گیا کہ سردی بلا کی ہوتی ہے اور اس کے سدباب کے اسباب صحیح کرنے لگا۔ میرے پاس گرم کپڑوں میں ایک لیڈر کی جیکٹ تھی۔ اتنی سردی میں یہ کسی کام کی نہ تھی۔ ہمارے کئی جاننے والے لیڈر کی جیکٹ اور اوننی جرسیاں لے جاتے ہیں۔ جو وہاں کسی بھی موسم میں نہیں پہنی جاسکتی ہیں۔ اتنی بے پناہ سردی سے بچاؤ کے لیے میں نے لاہور کے لنڈاپازار سے ایک بڑا ہلبا اوننی کوٹ خریدا۔ گھنٹوں تک آتی اوننی جرابیں لیں اور کچھ اوننی ٹوپیاں خرید لیں۔ میرا ایک سوٹ کیس تو انہی سے بھر گیا۔ وہ ہلبا کوٹ تو میں نے کینیڈا میں ایک بار ہی پہنا اور پھر اس لیے اتنا پیچھنکا کیونکہ جو دوست بھی دیکھتا ہلہلے سے لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ اوننی جرابیں مگر اس سردی میں کام آگئیں۔ پھر لاہور میں بہن سے مل کر اسلام آباد آیا، میری فلائٹ بھی اسلام آباد ہی سے تھی۔ لطیف نے کہا کہ وہ فلائٹ سے پہلے ڈیرہ آ جائے گا اور کچھ دن اکٹھے گزاریں گے۔ ایک شام اپنی پسندیدہ جگہ جو فیصل مسجد کے پیچھے ہے، وہاں گزاری اور میں اپنی تر آنکھوں سے فیصل مسجد کے مینار دیکھتا رہا کہ یا نصیب یہ فرصت کے لمحات پھر سے لوٹ کر آئیں گے یا نہیں..... اور نہ پھر فرصت کے لمحات ملے اور نہ کبھی تصور جاناں کی مہلت مل سکی۔

وہاں سے پشاور آیا۔ مجھے فلائٹ سے پہلے بھی آنا تھا مگر مجھے اپنی ٹکٹ رشید علی زئی سے اٹھانی تھی۔ میں اس کی ٹریول ایجنسی کے دفتر میں بیٹھانی آئی اے کے اس بڑے

پوسٹر کو دیکھ رہا تھا جس پر ٹورنٹو کے سی این ٹاور کی فوٹو تھی۔ اس ٹاور کی باتیں میں پہلے بھی سفر نامے میں پڑھ چکا تھا اور اب میں اس کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا تھا۔ دفتر میں ایک صاحب بیٹھے تھے جو ایک بار ٹورنٹو جا چکے تھے۔ وہ مجھے وہاں کے کلب اور ریڈ ایریا کی باتیں بتانے لگے۔ یہ بتاتے ہوئے اس کی رال بھی ٹپک رہی تھی۔ میں اپنی تعریف نہیں کر رہا مگر مجھے ان چیزوں سے کھن آ رہی تھی۔ میرے خیال میں انسان کچھ میں پھسل سکتا ہے مگر کوئی نہیں سکتا۔ رشید صاحب نے میرا ٹکٹ مجھے تمہا دیا۔ آج کل تو پی آئی اے کی فلائٹ پاکستان سے اڑتی ہے تو سیدھی ٹورنٹو جا اترتی ہے۔ 99ء میں ٹورنٹو کی فلائٹ پاکستان سے ایئر لینڈ کے شہر شین (Shanon) میں ٹھہرتی ہوئی نیویارک جاتی ہے۔ وہاں کے مسافروں کو اتار کر بقیہ میں چالیس مسافروں کو ٹورنٹو لے آتی۔ ان دنوں اتنے امیگرٹس ابھی کینیڈا نہیں پہنچے تھے اور خال خال نظر آتے تھے۔ اب تو پاکستان سے تین فلائٹس ہر پنتے سیدھا ٹورنٹو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قطر ایئر لائن، ترکش، اتحاد، ایمریش بھی ٹورنٹو سے پاکستانوں کو بھر کر لارہی ہیں اور لے بھی جا رہی ہیں۔

میں ٹکٹ لے کر ڈیرہ واپس آ گیا۔ ایک ماہ رہ گیا تھا میرے اگلے سفر کو نکلنے میں۔ دن جیسے جیسے قریب آتے گئے اور میں کمزور پڑتا گیا۔ چند ماہ پہلے جو خوشی اور جذبہ میرے اندر تھا وہ اب مفقود ہو چکا تھا۔ میرا دوست لطیف کچھ دن میرے ساتھ گزارنے کے لیے ڈیرہ آ گیا تھا۔ اس کا گھر دریا سندھ کے کنارے پر تھا۔ ہم دونوں اکثر شام سے پہلے دریا کی ریت پر دور تک چلے جاتے اور جہاں دریا کے پانی ہمیں روکتے ہم وہیں بیٹھ جاتے سامنے پھیروں کی کشتیاں ہوتیں اور وہاں کوئی بانسری بجا رہا ہوتا۔ وہیں بیٹھ کر ہم اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے لمحات کو یاد کرتے۔ ڈیرہ میں گزرے سب دکھ اور سکھ کے لمحات مجھ پر اترتے۔ کبھی باتیں ہوتیں اور کبھی ایک لمبی خاموشی جو میں آسمان کو نکتے گزارتا۔ میں ایک دو ماہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا۔ جب میں یہ سوچتا کہ کیا کوئی ملک اتنا بھی جاذب ہو سکتا ہے جس کے لیے میں ہمیشہ کے لیے اپنی سرزمین کو چھوڑ دوں۔

گر میوں کے دن گزر چکے تھے۔ سردیوں کی آمد تھی۔ مغرب سے سفروں کے مارے پرندے لمبی لمبی اڑان کے بعد دریا میں بنی جھیلوں پر اترتے تھے۔ ان پرندوں نے تو شکار ہو جانا تھا اور جو باقی بچتے وہ واپس لوٹ جاتے۔ میں کیسا پرندہ تھا

جس کی منزل یکطرفہ تھی۔ میں شدید ذہنی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ جانے کا ارادہ چھوڑتا تو بھی نہ چھوڑ سکتا تھا اور جانے سے بھی ہول سا اٹھتا تھا۔

انہی دنوں میں نے ابو بن ادھم کا ایک واقعہ پڑھا۔ وہ شام کو ہر روز مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے۔ ایک شام ان کو ایک بندہ ملا جس نے بتایا کہ کل میں تجارت کے لیے دور کے سفروں پر نکل رہا ہوں، میرے لیے دعا کریں۔ دعا کی گئی اور وہ اگلے دن چلا گیا۔ تین چار دن بعد ابو بن ادھم نماز پڑھنے مسجد میں آئے تو اسی شخص کو مسجد میں پایا۔ حیران ہوئے اور پوچھا تم تو ایک لمبے سفر پر تجارت کے لیے نکلے تھے اور واپس کیوں آ گئے؟ اس بندے نے کہا کہ میں جب سفر پر نکلا تو پہلا پڑاؤ شہر سے دور ایک بیابان ویرانے میں ہوا۔ میں نے اپنا اونٹ ایک درخت سے باندھا اور خیمہ لگایا۔ شام کا وقت تھا اور وطن کی یاد میں آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اتنے میں سامنے درخت پر دیکھتا ہوں کہ ایک بیمار چڑیا کا بچہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اڑنے کی سکت نہ تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اس کو اللہ کیسے رزق دیتا ہوگا؟ یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھا اور ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی۔ اس کی چونچ میں دانہ تھا۔ اس نے وہ دانہ اس بیمار چڑیا کے بیچ کے منہ میں ڈالا اور پھر اڑتی ہوئی کہیں دور چلی گئی۔ وہ بندہ حضرت ادھم سے کہنے لگا کہ میں نے سوچا کہ اگر ایک بیمار چڑیا کو اللہ اس کے گھونسلے میں رزق دے سکتا ہے تو مجھے کیا اپنے وطن میں نہیں دے سکتا؟ اور یہی سوچ کر میں واپس آ گیا۔ یہ سب سن کر حضرت ادھم نے اس سے کہا کہ تم اپنے آپ کو اس بیمار چڑیا کی جگہ کیوں رکھتے ہو؟ اس تو اتنا چڑیا کی جگہ کیوں نہیں رکھتے جو کھلے آسمانوں میں اڑ کر اپنا رزق بھی تلاش کرتی ہے اور ناتواں اور بیمار چڑیا کا رزق بھی اللہ کے حکم سے اس کے منہ میں ڈالتی ہے۔ یہ سن کر وہ بندہ رونے لگا اور اگلے دن رزق کے لیے لمبے سفر پر نکل گیا۔

یہ پڑھ کر میرے اندر بھی کوئی احساس اترا اور دل و دماغ پر بیٹھ سا گیا۔ کیا معلوم میرا رب مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ یہ سارے کام اس ذات نے ایک کمال سے پورے کیے ہیں تو یہی اس کی مصلحت ہے۔ اس سے میرا حوصلہ قدرے بہت بلند ہو گیا اور صرف بچوں سے جدا ہونے کی غلغلہ دل میں رہ گئی۔

میرے جانے کے دن جیسے جیسے قریب ہوتے گئے، میں اتنا ہی اداس ہوتا گیا۔ انہی دنوں طارق نے نیویارک سے فون کر کے کہا کہ جمال بھی آج کل ٹورنٹو میں ہوتا ہے اور

پھر اس کا فون نمبر بھی دے دیا۔ جمال ناصر سے میری دوستی کبھی نہ رہی تھی۔ وہ مجھ سے تین کلاسیں آگے تھا اور وہ دوسرے اسکول میں پڑھتا تھا مگر وہ اپنے اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کپٹن تھا اور بعد میں جب میں فارمیسی کرنے کے لیے یونیورسٹی گیا تو وہ وہاں کی ٹیم کا کپٹن بن چکا تھا۔ میں نے اسے زندگی میں کم ہی دیکھا تھا اور مجھے اس کی اتنی ہی شکل یاد تھی کہ سانولے رنگ کا لمبا سا لڑکا جو ہمیشہ دوستوں میں گھرارہتا تھا۔ اس کے دوست بہت تھے اور ہمیشہ اونچی آواز میں بات کرتا تھا۔ کراچی کا رہنے والا ڈیرہ میں پلا بڑھا تھا اور کھل ڈیرہ والا بن گیا تھا۔ سرائیکی بولنا اور وہ بھی ڈیرہ والے اسٹائل میں یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس زمین کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ معلوم نہیں کب پاکستان چھوڑ کر یورپ گھومتا رہا اور پھر امریکا میں جا بسا۔ اس کے ایک بھائی کے گردے ختم ہو گئے اور اس کا بھائی زندگی کی بازی ہارنے لگا۔ جمال نے لندن جا کر اپنے گردے کی قربانی دی مگر بھائی جانبر نہ ہو سکا۔ وہ امریکا آیا اور کینیڈا کی امیگریشن بھی لے لی۔ ایک دن امریکا میں جاب پر تھا کہ بے ہوش ہو گیا۔ لوگ اسپتال لے گئے اور ٹیسٹ ہوئے تو معلوم ہو کہ باقی ماندہ ایک گردے نے بھی کام کرنے سے جواب دے دیا ہے۔ امریکا میں اس کے پاس انشورنس نہ تھی۔ اللہ کا کرم تھا کہ کینیڈا کی امیگریشن موجود تھی۔ کینیڈا میں ہر شہری کو طبی سہولیات فری ملتی ہیں تو اس کو کینیڈا لایا گیا۔ زندگی سے جنگ کرتا رہا۔ نہایت دلیر انسان تھا اور اللہ کی مدد سے سنبھل گیا پر کھل طور پر ڈیالیسیس (Dialysis) برا گیا۔ میں جب کینیڈا پہنچا تو اس کے ہاتھ روم میں ڈیالیسیس کا سامان موجود تھا۔ پھر اسے کچھ انفیکشن ہو گیا مگر اللہ کے فضل سے پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گردے کی پیوند کاری کے لیے لائن میں تھا۔ جن دنوں میں کینیڈا پہنچا تھا تو اللہ نے اس کو ایک خوب صورت سی بیٹی کی خوشی بھی دی تھی۔ میں کینیڈا سے امریکا آ گیا۔ جمال اپنی نیکی کے ساتھ میرے پاس آتا رہتا تھا اور ہم بھی ٹورنٹو اسی کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ ایک بار مجھے پاکستانی کرچمن سوسائٹی والوں نے فون کیا کہ انڈیا کا مشہور کامیڈین جانی اولیور آ رہا ہے۔ چند لوگ ہیں اور آپ بھی تشریف لائیں۔ میں نے جمال کو بھی فون کر کے بلوایا کہ میں اکیلے کیا کروں گا اور تم بھی آ جاؤ تو وہ بھی آ پہنچا۔ جانی بھائی نے کچھ آسٹم کیے اور خوب ہنسیا۔ پھر وہ اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے بتاتے یہ کہنے لگا کہ اللہ نے اس کی دعا میں بڑی شفا رکھی ہے۔ اس نے کچھ اپنے تجربات بتائے کہ کس طرح مریض مجھ سے ملے اور میں

نے دعا کی اور وہ اللہ کے کرم سے شفا یاب ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو عیسائی ہے۔ اس کی دعا اللہ کیسے سن سکتا ہے۔ ہم کوئی بیس پچیس لوگ جو خصوصی مہمان تھے وہ ڈنر کے لیے ایک اور کمرے میں آ گئے۔ جمال بھی ساتھ تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ پچھلے پانچ سال سے اس انتظار میں ہے کہ کب اسے میچ کرتا گردہ ملے اور اس کا ٹرانسپلانٹ ہو۔ مجھے اپنی طرف سے ایک مذاق سوچا اور میں نے جانی اولیور کو بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا اور بولا۔ ”جانی بھائی! اللہ نے آپ کی دعا میں تاثیر رکھی ہے اور میرے دوست کا یہ مسئلہ ہے۔ مہربانی کر کے اس کے لیے دعا کریں۔“

جانی بھائی نے کہا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

میں نے اشارے سے جمال کو بلوایا تو جانی نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ پڑھا۔ میں اور جمال ہنسی روکے کھڑے تھے۔ کچھ پڑھنے کے بعد جانی بولا۔ ”کام ہو گیا۔“ ہم نے کھانا کھایا، جانی بھائی کا شکر یہ ادا کیا اور واپس قہقہے لگاتے گھر آ گئے۔ جمال اگلے دن ٹورنٹو چلا گیا۔ دو دن بعد میں نے اسے فون کیا کہ معلوم تو کروں کہ خیریت سے پہنچ تو گئے ہیں۔ بھائی نے فون اٹھایا۔ میں نے پوچھا کہ جمال کہاں ہے تو کہنے لگیں۔ ”کل رات دو بجے اسپتال سے فون آیا تھا کہ کسی ایکسیڈنٹ کے ہلاک بندے کا گردہ جمال سے میچ کر رہا ہے اور ابھی پہنچا اور اسی وقت جمال کو گردہ لگ گیا۔“ میں حیرت سے گنگ ہو گیا اور پھر مجھے قرآن پاک کی پہلی آیت یاد آئی۔ ”تعریف اس خدا کی جو سب جہانوں کا رب ہے۔“ وہ سب کیسے ہوا؟ اس کا جواب تو ایک ہی ہے کہ یہ اس رب کی ذات نے کیا جس کے ایک اشارے پر تمام کائنات چل رہی ہے اور کیا اس میں جانی اولیور کی دعا کا اثر نہیں تھا؟ یہ فیصلہ آپ لوگ خود کریں۔ میں الحمد للہ مسلمان ہوں اور توحید میرے ایمان کا حصہ ہے اگر میں کہوں کہ جانی بھائی کی دعا بھی لگی تھی تو اس میں میرے عقیدے پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔ یہاں جمال کا تذکرہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ میرا اسیا دوست بن گیا تھا کہ میں ذہنی دباؤ میں اسی کا سہارا لیتا تھا۔ آج کل بھی ہم ایک دوسرے سے فون پر یا مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ بات سے بات نکل رہی ہے اور یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ سب کردار ٹورنٹو کے سفر نامے میں آپ کو نظر آئیں گے۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا اور میرے دل کے موسم قابل اعتبار نہ رہے تھے۔ بھئی جوش اور ولولہ ابھر آتا اور کبھی افسردگی

نت نئے کرداروں کو الفاظ کے حسین
فتالب میں ڈھالتی پُراثر اور
حاس تحسیروں کی حنلق

ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی

مایہ ناز مصنفہ محترمہ

رفعت سراج

کے مشاق قلم کا ایک اور شاہکار ناول

عظیم شاعر مرزا اسد اللہ غالب

کی لازوال شاعری کے ایک

قطعہ سے مستعار لیا عنوان

.....پہ

کہاں بچیں
کہ دل ہے

انشاء اللہ بہت جلد پاکیزہ کے

صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

اتر آتی۔ میری ٹکٹ کنفرم ہوئی تو میں نے طارق کو نیویارک
فون کر کے اطلاع کر دی تاکہ وہ ٹورنٹو میں سہیل مفتی کو بتادے
کہ میں 26 نومبر کو پہنچ رہا ہوں۔ میں نے نا تجربہ کاری سے
ایسے سوٹ کیس لے لیے تھے جو اگر خالی بھی ہوتے تو آٹھ کلو
وزن کے ہوتے۔ ایک میں میرا نڈے سے خریدی لانگ کوٹ،
لیڈر کی دو جیکٹس اور ٹھوڑا بہت اور سامان آ گیا۔ دوسرے میں
میرے چند کپڑے اور باقی تحائف سے ہی وہ سوٹ کیس فل
ہو گیا۔ میری فلائٹ میں دو تین ہفتے رہ گئے تھے میری فلائٹ
میں اور میں دن کو لوگوں کی مبارکبادیں وصول کرتا اور رات کو
سوچوں میں گم ہو جاتا۔ بچوں کو اپنے ساتھ رکھتا۔ درود دیوار کو
تکنا، ٹیکے میں منہ چھپا کر چپکے سے آنسو بہا لیتا، بچوں کو اپنے
سے لپٹائے رکھتا تھا۔

ایک دن لطیف مجھے اور نا نگا پر بت کے ساتھی شاہ جی
کو دریا پر لے گیا۔ دریا کی لہریں مدھم مدھم پڑ گئی تھیں اور بہاؤ کم ہو
گیا تھا اور دریا اپنے کناروں سے دور نہیں پرے ہو کر بہ رہا
تھا۔ لطیف اور شاہ جی نے بار بی کیو کا انتظام کیا تھا۔ کونٹے،
انگلیٹھی، پانی اور مسالا لگا گوشت اور سب سے خوبصورت چیز
دور ایک ویرانے میں جنگلی گھاس سے بنا دریا کے پانیوں سے
کچھ پہلے ریت کے ٹاپو میں ایک خالی جمونپڑا جو سوکھے دریا کی
ریت میں کسی مقبرے کی طرح اکیلا اور خالی کھڑا تھا۔ بادل گھر
آئے تھے اور ہم اس جمونپڑے کے اندر بیٹھے دور بہتے پانیوں
اور اس پر تیرتی چھیروں کی کشتیوں کو دیکھ رہے تھے اور شاہ جی
بار بی کیو تیار کر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا بادلوں کو گھیر کر ہمارے
جمونپڑے کے آسمان پر لے آئی تھی اور ان کے پانی مینہ کی
صورت برسنے لگے۔

دور دور تک کسی جاندار کا وجود نہ تھا۔ شاہ جی میرے اتنی
دور جانے کے خلاف تھے۔ وہ دیکھتے کوٹوں کی انگلیٹھی پر تنکوں
کی سیخیں پلانتے ہوئے ناراضگی سے میری جانب اشارہ کر
کے کہہ رہے تھے۔ ”میں اسے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کیا دھرا ہے
فرنگیوں کے ملک میں، پھر سے کسی اور کے نو پر چڑھتے ہیں۔
خیمے لگاؤں گا اور میں خود بار بی کیو بھی اس کے لیے کروں
گا..... مگر یہ کہتا ہے کہ میں فرنگیوں کو اسلام کی تعلیم دوں گا اور
دنیا بھی دیکھنی ہے اور انگریزوں کو اسکول میں بھی پڑھانا
ہے۔“

اگر شاہ جی کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں تبلیغ کے لیے نہیں یا
کسی اسکول میں پڑھانے نہیں بلکہ صرف اللہ کی کائنات
دیکھنے جا رہا ہوں تو وہ میرے ارادے کے آگے سیدھے پلائی دیوار

سکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں بیوی کو تسلی دیتا رہا اور وہ میری ہمت بڑھاتی رہی، ہم دونوں کو معلوم تھا کہ یہ سب جمہورنی تسلیاں ہیں۔ میں نے فون بند کر دیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا اور گلی میں ویرانگی پھر رہی تھی جب میں گھر واپس آیا۔ کل صبح میری پشاور سے اسلام آباد کی فلائٹ تھی اور پھر رات ایک بجے اسلام آباد سے ٹورنٹو۔

دراصل میں نے سفر نامے اتنے زیادہ پڑھ لیے تھے جس میں چمکتے ایئر پورٹ، صاف ستھرے اور خوشبوؤں سے لپٹیں لڑکیاں، مہذب دنیا، اشیاء سے بھرے بڑے بڑے اسٹور مختلف مزاج کے لوگ جو ہر بات پر مسکرا کر آپ سے پیش آتے ہیں۔ میں یہ سب پڑھ کر دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے بھی یہ سب دیکھنا تھا۔ میں بھی ان سب چیزوں کو دیکھ کر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی لوگوں کے مزاج، نظام کی افادیت، کھلے موسم، رنگین نظارے، شفاف جھیلیں اور آرام دہ زندگی کو قریب سے دیکھ کر اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا اور یہی اشتیاق مجھے پاکستان سے باہر لے کر جا رہا تھا۔ آپ لوگ یقین کریں کہ میرے باہر جانے میں پیسے کمانے کی رتی برابر بھی تمنا نہ تھی۔ بس صرف یہی کہ ایک چھوٹا سا خوبصورت سفر ناموں والا گھر اور ایک گاڑی اور گھر کے خرچ چلانے کے لیے مناسب پیسے ملتے رہیں تو میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ میں اپنا پرانا ٹینٹ بھی ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ یہ وہی ٹینٹ تھا جو کئی ٹریک میں ہمسفر رہا تھا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میرا اپنا سامان بہت کم تھا۔ مجھے اس ٹینٹ میں کیمنپنگ کرنی تھی اور میں نے بعد میں کی بھی۔ جب میں نے امریکا میں اپنا گھر لے لیا تو اس ٹینٹ کو خوب استعمال کیا۔ جب کیمنپنگ کو نہ جاسکتا تو گھر کے پیچھے لان میں ٹینٹ لگا لیتا اور گھر کو لاک کر دیتا کہ کوئی گھر میں واٹس روم کی ضرورت کے علاوہ نہیں جائے گا۔ پھر ٹینٹ میں لائٹیں روشن کر کے ہم اپنی کیمنپنگ کرتے۔ باہر فولڈنگ کرسیاں رکھتا۔ کوئی بچہ کتاب پڑھ رہا ہے اور کوئی کھیل رہا اور بیوی غصے سے گھور رہی ہے۔ ایک دلچسپ زندگی ہو جاتی۔

رات پشاور میں نیند اور جاگ کی کیفیت سے دو چار رہا۔ صبح جلدی اٹھ کر نماز ادا کی۔ بارہ بجے فلائٹ تھی۔ سعید جاں بھی مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے کے لیے آ گیا۔ سب سے مل کر میں پشاور ایئر پورٹ پر بیٹھا اپنی اسلام آباد کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ جہاز میں بیٹھا تو میرے اندر کا سفر نامہ نگار بیدار ہو گیا تھا۔ میں مسافروں کی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا

نکلا۔ ایئر پورٹ پر سب ایک جانب اداس کھڑے تھے اور میں پھسکی ہنسی سجائے سب سے مل رہا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آ گیا۔ دل رنجیدہ تھا جیسے مجھ سے بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ قندیل کو میں نے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس معصوم کو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو بہت پیار کیا اور پھر گود سے اتارا اور بورڈنگ کارڈ لے کر آگے بڑھا۔ قندیل نے اچانک مجھے جاتے دیکھا تو میرے پیچھے دوڑی۔ میرے بھائی نے پکڑ کر اسے اٹھالیا۔ وہ دونوں بازو میری جانب پھیلا کر رونے لگی اور میں اندر ہی اندر سکتا ہوا ویننگ روم میں آ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ یہ میری زندگی کا بہت بھاری اور کمزور لمحہ تھا جسے میں مصنوعی طور پر طاقت ور بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاز نے پرواز کی تو میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ جو گاڑی مجھے چھوڑنے آئی تھی وہ رن وے کے ساتھ والی سڑک پر کھڑی ہے۔ سب ہاتھ ہلا ہلا کر اس جہاز کو الوداع کر رہے ہیں اور قندیل کار کے بونٹ پر بیٹھی دونوں ہاتھ جہاز کی جانب بڑھائے رو رہی ہے اور اتنے میں جہاز نے رخ بدلا اور پشاور کی جانب پرواز کر گیا۔

چالیس منٹ کی فلائٹ کے گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ میں اپنے اندر ایک مٹلاطم لیے پشاور اترا۔ بہن کا گھر ایئر پورٹ کے ساتھ تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی سعید جان بھی ملنے آئے ہوئے تھے۔ سعید جان پشاور میں کسی انٹورنس کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ میری طرح گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور کئی بار یورپ، امریکا اور کینیڈا جا چکے تھے۔ ان کا ذکر بھی اس داستان میں آئے گا کیونکہ ان سے جڑی کئی کھٹی میٹھی یادیں ہیں، وہ دس سال میں پانچ مرتبہ میرے پاس کینیڈا اور امریکا آچکے ہیں۔

پشاور کی وہ شام اداسی کے اندھیرے لیے اتر آئی تھی۔ لوگ، گلیاں، سڑکیں اور آسمان..... سب مجھ سے زیادہ افسردہ تھے۔ سفر تو مجھ میں ولولہ بھرتے تھے مگر یہ کیسا سفر تھا جو میری چاروں جانب افسردگی بھر رہا تھا۔ حالانکہ ابھی میں پاکستان میں تھا مگر سوچوں کے دائرے اپنے گھر کی جانب تیرتے جاتے تھے۔ میں بسن کے گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے گھریات کرنی تھی اور میں اپنے اندر کے درد کو ظاہر نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ ایک بی بی اس سے گھر فون کیا تو سمیہ نے اٹھایا۔ بچوں کا پوچھا تو بتایا کہ قندیل روتے روتے سو گئی ہے۔ میرے بیٹے فہد نے اپنے آپ کو ڈر اسٹیک روم میں بند کر لیا تھا اور وہاں سے

بنی جاتے..... پھر کہنے لگے۔ ”یہ اپنے ارادے سے باز نہیں آتا جب شان لے تو اڑ جاتا ہے۔ ہم سب فیری میڈو جانے کے مخالف تھے مگر یہ ہی ہمیں لے گیا۔“ اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاہ جی بولے۔ ”اس کا تو میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا کہ اس نے مجھے دنیا کے خوب صورت مناظر دکھائے۔“

یہ شہر کتنا چھوٹا اور کتنا خوبصورت ہے اس کا اندازہ میں آج کرتا ہوں۔ ہم چادروں میں لپٹے کونکوں کی آگ سے اپنے آپ کو گرم رکھتے اور باربی کیو گوشت کی مہک دھوئیں کے ساتھ نتھنوں میں اترتی تھی۔ اس دن بارش بہت زور سے بری اور میں خاموش بیٹھے سامنے ریت میں جذب ہوتے پانی دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ ماحول، یہ مخلص دوست اور یہ مختلف دو بارہ میرے نصیب کی کتاب کے کسی دوسرے صفحے پر لکھی ہیں یا نہیں؟

بارش بدتی رہی اور میں یادوں میں بھیلتا رہا۔ شام اتری اور بارش ختم گئی۔ جب ہم واپس کیلی ریت پر چلتے آ رہے تھے تو میں اندر سے بھیگ چکا تھا۔ اتنا سارا پانی میرے اندر جذب ہو گیا تھا جتنا اس ریت نے بھی جذب نہ کیا ہوگا۔ میں نے یہ پانی سنبھال کر رکھ لیا تھا کہ جب میں کہیں تہا اور افسردہ ہوں گا تو یہی پانی میرے اندر سلتی یادوں کی پیش کو کم کرنے میں میری مدد کریں گے۔

ایک دن میرا کزن کہنے لگا کہ ہمارے واپڈا کا ایک ایکسین (En-Ex) بھی اگلے ماہ امیگریشن لے کر نورٹو جا رہا ہے اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا کہ اتنی بڑی پوسٹ پر فائز ایک ایکسین کیوں جانا چاہتا ہے؟ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ دوسرے دن ایک پرانی موٹر سائیکل پر سوار ایکسین صاحب ملنے آئے۔ اس سے ان کی ایمانداری کا اندازہ ہوا تھا۔ میرے سامنے عجز و انکساری کا پیکر بنے بیٹھے تھے۔ انتہائی شریف انفس انسان دیکھتے تھے۔ ایسے بیٹھے تھے کہ جیسے مجھ سے ادھار مانگنے آئے ہوں۔ اور میری کسی بات پر نظریوں اٹھا کر ایک لمحے کو میری جانب دیکھتے اور پھر سمٹ کر نظریں جھکا دیتے۔ دبے پتلے، چھوٹی جسامت کے شاہد صاحب کہتے تھے۔ ”سرجی! سنا ہے آپ نورٹو جا رہے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے ملاقات کر لوں کیونکہ میں بھی اگلے ماہ نورٹو جا رہا ہوں۔“

سرجی ان کا تکیہ کلام تھا، ہر ایک کو سرجی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں ٹھہریں گے۔“

تو فرمانے لگے۔ ”سرجی! میری سالی کے خاوند نو یارک میں بہت بڑا کاروبار کرتے ہیں۔ وہ نورٹو مجھے لینے آئیں گے اور میں ان کے ساتھ نیو یارک چلا جاؤں گا اور وہیں کاروبار کروں گا۔ مجھے نورٹو میں نہیں رکھنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو آپ کے لیے بہت اچھا ہو جائے گا۔“ پھر میں نے سہیل مفتی کے گھر کا فون نمبر انہیں دے دیا اور کہا کہ میں اسی نمبر پر ہوں گا اور رابطے میں رہنا۔ زندگی میں کئی اتفاق ایسے بھی ہوتے ہیں جو بعد میں آپ پر بہت زیادہ اثر چھوڑتے ہیں۔ شاہد صاحب کے ساتھ بعد میں جو کچھ ہوا وہ بہت سے لوگوں کے لیے سبق آموز بھی ہوگا اور آنکھیں کھولنے کے لیے اس میں بہت سے پیغام بھی پوشیدہ ہوں گے۔ یہ میں وقت آنے پر آپ لوگوں کو بتاؤں گا بس تھوڑا سا انتظار کریں اور پھر یہی سرجی میرے دوست بن گئے اور ہم نے بہت سے سفر اٹھائے کیے۔

میری ہجرت کے دن قریب آ رہے تھے۔ میری بیوی سمیہ مجھے کم دیکھتی تھی تاکہ اس کی آنکھوں میں اترے آنسو کہیں میں دیکھ نہ لوں۔ قدیل کو کچھ معلوم نہ تھا کہ بابا اسے چھوڑ کر دور بہت دور جانے والے ہیں اور وہ تو قلمی زبان میں مجھ سے لپٹی کچھ نہ کچھ ہمیشہ کی طرح کہتی رہتی تھی۔ اریہہ ہنگوڑے میں بڑی مجھے پہچاننے کی کوشش کرتی تھی اور پھر وہ دن آ گیا جب سرجی فلائٹ ڈیرہ اسماعیل خان سے پشاور کو جانی تھی۔ وہاں سے اگلے روز اسلام آباد اور پھر سات سمندروں پار.....

رات مجھے نیند نہ آسکی۔ سمیہ بھی اداس تھی کیونکہ میں اس کو کوئی ٹائم فریم نہ دے سکتا تھا کہ کب انہیں اپنے پاس بلوا سکوں گا۔ میں کتنا ان کو فون کر سکوں گا۔ ان دنوں فون کے چار جز بہت زیادہ تھے۔ دو ڈالر میں ایک منٹ بات ہوتی تھی، نہ آج کل کی طرح فیس بک تھی اور نہ وائبر تھا۔ آپ نارٹو امریکا گئے تو پاکستان کی ہر چیز سے کٹ جاتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ ان حالات میں اپنے بچوں کو چھوڑ کر کہیں دور جا بسا۔

صبح اداسی سے بھر پور تھی۔ گھر میں سب خاندان کے لوگ مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع تھے۔ قدیل اتنے سارے لوگ اکٹھے دیکھ کر خوشی سے چپک رہی تھی اور میرے لیے یہ مشکل تھا کہ میں کس طرح اپنی بیٹی کو گلے لگا کر اس سے رخصت ہوں گا۔ سب ل کر دعا میں دے رہے تھے اور پھر دو کاروں میں ایک قافلہ مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے کے لیے

سکیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں بیوی کو تسلی دیتا رہا اور وہ میری ہمت بڑھاتی رہی، ہم دونوں کو معلوم تھا کہ یہ سب جھوٹی تسلیاں ہیں۔ میں نے فون بند کر دیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا اور گلی میں ویرانگی پھر رہی تھی جب میں گھر واپس آیا۔ کل صبح میری پشاور سے اسلام آباد کی فلائٹ تھی اور پھر رات ایک بجے اسلام آباد سے ٹورنٹو۔

دراصل میں نے سفر نامے اتنے زیادہ پڑھ لیے تھے جس میں چمکتے ایئر پورٹ، صاف سحرے اور خوشبوؤں سے لپٹیں لڑکیاں، مہذب دنیا، اشیاء سے بھرے بڑے بڑے اسٹور مختلف مزاج کے لوگ جو ہر بات پر مسکرا کر آپ سے پیش آتے ہیں۔ میں یہ سب پڑھ کر دیوانہ سا ہو گیا تھا۔ مجھے بھی یہ سب دیکھنا تھا۔ میں بھی ان سب چیزوں کو دیکھ کر کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی لوگوں کے مزاج، نظام کی افادیت، کھلے موسم، رنگین نظارے، شفاف جھیلیں اور آرام دہ زندگی کو قریب سے دیکھ کر اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا اور یہی اشتیاق مجھے پاکستان سے باہر لے کر جا رہا تھا۔ آپ لوگ یقین کریں کہ میرے باہر جانے میں پیسے کمانے کی رتی برابر بھی تمنا نہ تھی۔ بس صرف یہی کہ ایک چھوٹا سا خوبصورت سفر ناموں والا گھر اور ایک گاڑی اور گھر کے خرچ چلانے کے لیے مناسب پیسے ملتے رہیں تو میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو حیرت ہوگی کہ میں اپنا پرانا ٹینٹ بھی ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ یہ وہی ٹینٹ تھا جو کئی ٹریک میں ہمسفر رہا تھا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میرا اپنا سامان بہت کم تھا۔ مجھے اس ٹینٹ میں کیمنٹنگ کرنی تھی اور میں نے بعد میں کی بھی۔ جب میں نے امریکا میں اپنا گھر لے لیا تو اس ٹینٹ کو خوب استعمال کیا۔ جب کیمنٹنگ کونہ جا سکتا تو گھر کے پیچھے لان میں ٹینٹ لگا لیتا اور گھر کو لاک کر دیتا کہ کوئی گھر میں داخلہ نہ ہو۔ پھر ٹینٹ کے علاوہ نہیں جائے گا۔ پھر ٹینٹ میں لائٹیں روشن کر کے ہم اپنی کیمنٹنگ کرتے۔ باہر فولڈنگ کرسیاں رکھتا۔ کوئی بچہ کتاب پڑھ رہا ہے اور کوئی کھیل رہا اور بیوی غصے سے گھور رہی ہے۔ ایک دلچسپ زندگی ہو جاتی۔

رات پشاور میں نیند اور جاگ کی کیفیت سے دو چار رہا۔ صبح جلدی اٹھ کر نماز ادا کی۔ بارہ بجے فلائٹ تھی۔ سعید جاں بھی مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے کے لیے آ گیا۔ سب سے مل کر میں پشاور ایئر پورٹ پر بیٹھا اپنی اسلام آباد کی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ جہاز میں بیٹھا تو میرے اندر کا سفر نامہ نگار بیدار ہو گیا تھا۔ میں مسافروں کی حرکات کا بغور جائزہ لے رہا

نکلا۔ ایئر پورٹ پر سب ایک جانب اداس کھڑے تھے اور میں پھینکی ہنسی سچائے سب سے مل رہا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آ گیا۔ دل رنجیدہ تھا جیسے مجھ سے بہت کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ قدیل کو میں نے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس معصوم کو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں نے اس کو بہت پیار کیا اور پھر گود سے اتارا اور بورڈنگ کارڈ لے کر آگے بڑھا۔ قدیل نے اچانک مجھے جاتے دیکھا تو میرے پیچھے دوڑی۔ میرے بھائی نے پکڑ کر اسے اٹھالیا۔ وہ دونوں بازو میری جانب پھیلا کر رونے لگی اور میں اندر ہی اندر سسکتا ہوا دیننگ روم میں آ گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ یہ میری زندگی کا بہت بھاری اور کمزور لمحہ تھا جسے میں مصنوعی طور پر طاقت ور بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جہاز نے پرواز کی تو میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ جو گاڑی مجھے چھوڑنے آئی تھی وہ رن وے کے ساتھ والی سڑک پر کھڑی ہے۔ سب ہاتھ ہلا ہلا کر اس جہاز کو الوداع کر رہے ہیں اور قدیل کار کے بونٹ پر بیٹھی دونوں ہاتھ جہاز کی جانب بڑھائے رو رہی ہے اور اتنے میں جہاز نے رخ بدلا اور پشاور کی جانب پرواز کر گیا۔

چالیس منٹ کی فلائٹ کے گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ میں اپنے اندر ایک تلامم لیے پشاور اتر ا۔ بہن کا گھر ایئر پورٹ کے ساتھ تھا۔ میرے خالہ زاد بھائی سعید جان بھی ملنے آئے ہوئے تھے۔ سعید جان پشاور میں کسی انشورنس کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ میری طرح گھومنے پھرنے کے شوقین تھے اور کئی بار یورپ، امریکا اور کینیڈا جا چکے تھے۔ ان کا ذکر بھی اس داستان میں آئے گا کیونکہ ان سے جڑی کئی کھٹی میٹھی یادیں ہیں، وہ دس سال میں پانچ مرتبہ میرے پاس کینیڈا اور امریکا آ چکے ہیں۔

پشاور کی وہ شام اداسی کے اندھیرے لیے اتر آئی تھی۔ لوگ، گلیاں، سڑکیں اور آسمان..... سب مجھ سے زیادہ افسردہ تھے۔ سفر تو مجھ میں ولولہ بھرتے تھے مگر یہ کیسا سفر تھا جو میری چاروں جانب افسردگی بھر رہا تھا۔ حالانکہ ابھی میں پاکستان میں تھا مگر سوچوں کے دائرے اپنے گھر کی جانب تیرتے جاتے تھے۔ میں بہن کے گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے گھبراتے کرنی تھی اور میں اپنے اندر کے درد کو ظاہر نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ ایک بی بی سی او سے گھر فون کیا تو سمیہ نے اٹھایا۔ بچوں کا پوچھا تو بتایا کہ قدیل روتے روتے سو گئی ہے۔ میرے پیچھے فہد نے اپنے آپ کو ڈرائنگ روم میں بند کر لیا تھا اور وہاں سے

تھا۔ ان کی نفسیات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا اور باقاعدہ ایک ادیب سا بننا بیٹھا تھا۔

میرے ساتھ ایک صاحب بیٹھے تھے۔ میرے علاوہ سارا جہازنی وی کے اداکاروں سے بھرا تھا۔ یہ سب اپنے ایوارڈ لینے اسلام آباد کی کسی تقریب میں شرکت کرنے جا رہے تھے۔ میرے ساتھ نی وی کا ایک نامور اداکار بیٹھا تھا۔ نام نہیں بتاؤں گا۔ اس نے میرا نام پوچھا اور پھر جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکال کر میرا نام لکھا اور ساتھ ہی دن، تاریخ اور نام لکھا۔ میں حیرت سے یہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور کاغذ پر اس ڈرنک کا نام لکھا اور ساتھ میں وقت، مقام اور تاریخ لکھی۔ پھر کہنے لگا۔ ”میرے ایک دوست نے بھی لاہور سے آنا تھا مگر اس کی فلائٹ مس ہو گئی۔“ پھر مشروب کی چسکی بھرتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید اس کی قسمت میں یہ مشروب نہیں تھا۔“ میں اپنے لمبے سفر کا درد ایک طرح سے بھول کر اس کی حرکتیں دیکھتا اور سنتا رہا۔ اگرچہ جس منٹ میں اسلام آباد نہ آتا تو وہ فنکار معلوم نہیں اپنے فن کے کیا کیا جو ہر دکھا چکا ہوتا۔

اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر اترا تو ابھی میری نورنٹو کی فلائٹ میں بارہ گھنٹے باقی تھے۔ ایئر لائن والوں نے مجھے مرینا ہوٹل میں ایک کمرالے دیا۔ میرا اسٹوڈنٹ مسعود بھی ایئر پورٹ آیا ہوا تھا۔ سامان ہوٹل کے کمرے میں رکھا تو اتنے میں میرے فیری میڈو کے ٹرپ کا ساتھی اشفاق آ گیا۔ ان دونوں نے مجھے باہر جانے کی میری خواہش پوری ہونے پر مبارکباد دی اور میں نے محل سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ جناح سپر سے میں نے ڈھیر ساری ڈی وی ڈیز خریدیں جن میں بیشتر فلمیں تھیں۔ آج بھی میرے پاس وہ سب اپنے اور بجٹل پیک میں پڑی ہیں جنہیں آج تک دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔

پھر میں اور مسعود لطیف کے گھر آئے۔ وہاں اس کی بیوی نے میرے کپڑے استری کیے۔ میں نے غسل کیا۔ لطیف بہت اداس تھا۔ وہ بھی ڈیرہ کارہنے والا تھا اور جب بھی چھٹیوں میں ڈیرہ آتا تو سارا دن ہم اکٹھے رہتے۔ عید کے دن ہم گھر سے باہر نکلتے تو رات ایک بجے گھروں کو لوٹتے تھے ہمارا ٹھکانہ عید کی رونقیں دیکھنے کے بعد دریا سندھ کا کنارہ ہوتا یا ہم اپنے دوست شاہ جی کی دکان پر بیٹھ کر لوگوں کو عید کی خریداری کرتے دیکھتے۔ چاند رات کو دو بجے رات تک ہم وہیں بیٹھے رہتے۔ لطیف اسلام آباد چلا جاتا تو پھر میں اور شاہ جی ہر شام کو دریا کے کنارے بیٹھ کر باتیں کرتے جس میں، میں ہی زیادہ

بولتا تھا۔ کبھی ناگ پربت اور کبھی شمشال اور اکثر کینیڈا کا ذکر ہوتا۔ آج لطیف خفا تھا کیونکہ دو ماہ بعد چھوٹی عید آنے والی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ بیس سالوں کے معمول کو وہ کیسے تبدیل کر پائے گا۔ مجھے بھی یہی یادیں ناگ کی طرح ڈستی تھیں۔ لطیف کی باتیں سن کر میں کمزور پڑ رہا تھا۔ آج کے بعد میری زندگی میں کئی نئے موڑ آنے والے تھے۔ میں سوچتا کہ یہ ٹیب و فرافز میں کیسے عبور کر پاؤں گا۔ یہاں میری زندگی ایک ڈگر پر گزر رہی تھی۔ گزارہ اچھا ہو رہا تھا۔ سوچتا یہ میں کیا کر بیٹھا ہوں کہ ایک لگے لگائے معمول کو توڑ کر ایک انجانی دنیا کے سمندر میں چھلانگ لگانے جا رہا ہوں۔ مجھے تو اس نئی دنیا کے سمندر کی تیراکی بھی نہیں آتی تھی۔ ایک اللہ کی مدد کا سہارا تھا جو میں یہ قدم اٹھا بیٹھا تھا۔

لطیف کے گھرات کا کھانا کھایا مگر نوالے مشکل سے حلق میں اتر رہے تھے۔ لطیف سے جب گلے مل رہا تھا تو آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔ کیا پتا یہ مخلص دوست دوبارہ کب ملے۔ یہی سوچتا ہوا میں مسعود کی گاڑی میں آ بیٹھا جس کو وہ اشارت کیے میرا انتظار کر رہا تھا۔

ہم وہاں سے مرینا ہوٹل واپس آئے۔ میں سارے راستے خاموش رہا۔ پنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں کو دیکھتا رہا۔ فیض آباد سے گزرا تو مجھے چند سال پہلے کے وہ لمحات یاد آ گئے جب کینیڈا ایسوسی نے میرا وزٹ ویزا لینے کی درخواست مسترد کر دی تھی اور میں ایک پاگل پن میں فیض آباد کی چھپر مارکیٹ میں خالی دماغ گھوم رہا تھا۔ اس کے بعد امریکا والوں نے بھی ویزا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دن ایسے تھے کہ جیسے خدا ناخواستہ میری دنیا لٹ گئی ہو اور آج اسی کینیڈا نے مجھے مستقل رہنے کی اجازت دے دی تھی اور آج میں کینیڈا جانے پر مغموم تھا۔ انسان کسی بھی حالت میں شکر گزار نہیں رہ سکتا۔

ابھی فلائٹ کے جانے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ مسعود واپس آنے کا کہہ کر کہیں چلا گیا۔ میں نے اسے سامان کا جائزہ لیا اور پھر بیڈ پر سیدھا دراز ہو کر سوچوں میں گم ہو گیا۔ میں تو بڑے باعزت طریقے سے کینیڈا جا رہا تھا اور اس وقت یہی سوچ رہا تھا کہ لوگ کیسے غیر قانونی طور پر سات سمندر پار چلے جاتے ہیں۔ کس طرح وہاں دھکے کھاتے ہیں۔ پکڑے جاتے ہیں تو ہولڈنگ سینٹر اور جیلوں میں رہتے ہیں۔ ان کی اولادیں اور والدین اس لگائے بیٹھے ہوتے ہیں کہ بیٹا کب اپنی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع کرے گا۔ یہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب میں کینیڈا میں امیگریشن ہولڈنگ

اینٹر میں سیکورٹی کی جانب کرتا تھا۔ پاکستانی، انڈین، مشرقی یورپ، ساؤتھ امریکا اور روس کے لوگ کس طرح جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے بھی بچے ہوتے ہیں مگر کس طرح وہ ان سے بے پروا ہو کر ایک جدوجہد میں زندگی کے قیمتی لمحات کو غرق کر رہے ہوتے ہیں اور حاصل کیا ہوتا ہے کہ فیکٹریوں میں کوئی سخت مزدوری کر رہے ہوتے ہیں۔

مسعود اپنی گاڑی لے کر آیا تو ساتھ بی آئی اے کی گاڑی بھی مجھے لاد کر لے جانے کے لیے آ پہنچی۔ سامان ایئر لائن کی گاڑی میں رکھا اور ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں اشفاق بھی آیا ہوا تھا۔ میں اپنا سامان زمین پر رکھے اس گیٹ کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں سے واپسی کا کچھ پتا نہ تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مجھے اپنی بیوی سے بات کرنی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس وقت جاگ رہی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ میری فلائٹ کچھ گھنٹوں بعد ہے۔ موبائل فون عام نہ تھا۔ اشفاق ایک کالنگ کارڈ لے آیا۔ میں نے وہاں سے اسے فون کیا اور دوسری تیل پر اس نے اٹھالیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی میں ایئر پورٹ کے اندر جا رہا ہوں۔ وہ رونے لگی۔ میں اداس ہو گیا۔ قدیل کا پوچھا تو بتایا کہ وہ سو گئی ہے اور سونے سے پہلے بابا بابا کر رہی تھی۔ اریہ تو ابھی چھ ماہ کی تھی۔ اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ اس کا باپ انہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا ہے۔ مجھ سے کوئی اور بات نہ ہو رہی تھی۔ مسعود اور اشفاق دور ہو گئے۔ میں نے فون بند کیا تو غم سے نڈھال تھا۔ میں ابھی تک اس لمحے کو نہیں بھول سکا جب میں فون بند کر کے ایئر پورٹ کے ستون سے لپٹ کر کھڑا تھا۔

میں اپنے دوستوں سے گلے مل کر جلدی جلدی اپنے سامان کی ٹرالی ٹھینٹا بین الاقوامی پرواز کے گیٹ کے اندر چلا گیا۔ ایک جم غفیر تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ کچھ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ اس جہاز پر امریکا اور کینیڈا کے سب مسافر ایک ساتھ تھے۔ پہلے بھی لکھا ہے کہ اس جہاز نے آئر لینڈ کے شہر شین سے نیویارک اور وہاں سے ٹورنٹو جانا تھا۔ کل ملا کر بائیس چوبیس گھنٹے کا سفر بنتا تھا۔

ایک دو سیکورٹی پوائنٹ سے گزر کر آگے ایک اور کشم کے افسر کے ہاتھ لگ گیا۔ میں پہلی بار باہر کا سفر کر رہا تھا۔ تھوڑا سا روس بھی تھا۔ جنرل مشرف نے عنان حکومت سنبھال لی تھی۔ ایئر پورٹ کے اندر بھی فوجی کھڑے تھے۔ ایک کشم افسر

نے پوچھا کہ کیا کام کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ فارماسٹ ہوں۔ وہ یہ سمجھا کہ میں کینیڈا میں فارماسٹ ہوں۔ اس نے میرے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کہا کہ تمہارا سامان چیک نہیں کروں گا بس تم بھی اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ ڈال بیگ میں رکھ دو اور میں تلاشی کے بہانے بیگ میں ہاتھ ڈال کر نکال لوں گا اور پھر کہنے لگا کہ دھیان کرنا کہ سامنے کھڑے فوجی کی نظر نہ پڑے۔ میں نے سامنے کھڑے چاق و چوبند فوجی کو دیکھا اور پھر کشم افسر سے کہا کہ ایک ڈالر بھی نہیں دوں گا، تم میرا سامان چیک کرو۔ اس نے میرے پیور دیکھے تو قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے مجھے جانے کو کہا۔

ایک ہنگامہ تھا جو ہر جانب برپا تھا۔ میں اس سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا اور اس کے درمیان اپنا راستہ بھی تلاش کر رہا تھا۔ پہلے میں ان لوگوں کو دیکھا کرتا تھا جو یورپ یا امریکا سے پاکستان اپنی چھٹیاں گزارنے آتے تھے۔ میں جب کالج میں پڑھتا تھا تو ہمارے محلے میں ایک صاحب جو امریکا میں رہائش پذیر تھے، وہ ایک جاپانی لڑکی کو بیاہ کر لائے تھے۔ میں نے ایک دن کالج میں پہلے ایک دو پیرینڈ لیے اور گھات لگا کر ان کے گھر کے باہر گلی میں بیٹھ گیا۔ سوچا اگر لڑکیا جاپانی نظر نہ آئی تو وہ شکل تو دیکھ لوں جو امریکا میں ہوتی ہے جو ایک جاپانی کو ساتھ لائی ہے۔ یہ اور بات کہ میں کئی گھنٹے بیٹھا رہا مگر کوئی اپنے درشن کرانے باہر نہ نکلا۔ اس کے علاوہ جب میرے خاندان سے لوگ امریکا جاتے تھے تو واپسی پر میں ان کی باتیں سنتا، سوالات کرتا، اندازے لگاتا اور سوچتا کہ انہوں نے اس دنیا کو کیسے دیکھا ہوگا، کیا تاثرات ان کے چہرے پر ہوں گے جب وہ یورپ یا امریکا یا کینیڈا میں اترے ہوں گے اور آج میں ان لوگوں میں تھا جو نارتھ امریکا جا رہے تھے۔ میں تو اب تک صرف امریکا پلٹ مہذب اور ڈین فنتیں پاکستانیوں سے ملا تھا اور آج انہیں امریکا اور کینیڈا جاتے ہوئے دیکھ کر ششدر تھا کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا میں تصور کرتا تھا۔ ایک ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ بہت سے مسافروں نے اپنے الاؤنس سے زیادہ سامان اٹھایا ہوا تھا۔ ان کے مقابلے میں میرا سامان تو بہت ہی کم تھا۔ اپنے زیادہ سامان پر شرمندگی کی جگہ ان کے بگڑے پیور تھے۔ کوئی قلیوں سے الجھ رہا تھا اور کوئی بچوں کو ڈانٹ رہا تھا اور کوئی ایئر لائن کے اسٹاف پر چڑھ دوڑا رہا تھا۔ صرف ایئر لائن پر وہ بہت مؤدب ہو گئے تھے کیونکہ اب وہاں فوجی وردیوں میں ملبوس جوان بیٹھے یا سپورٹ چیک کر رہے تھے۔ میرا سامان بک ہو گیا اور پھر ایئر لائن کا مرحلہ

لیا۔ پھر ایک آفیسر میرا سامان اٹھا کر مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے بعد میں نے یہ سبق سیکھا کہ جتنی بات کی جائے ہاں یا ناں میں جواب دو اور فالتو کی سہولت کے طالب گار کبھی نہ بنو۔

بات کہیں اور نکل گئی ہے اور واپس اسلام آباد کے ایئر پورٹ پر آتا ہوں۔ جب میں اس گورے کے سر کے اشارے کو سمجھتے ہوئے روانگی کے لاؤنج میں آ بیٹھا تو یہاں میری ملاقات احمد شانی سے ہوئی۔ وہ مرینا ہوٹل میں میرے ساتھ تھا۔ میں بھی ان دنوں ہر ایک سے بے تکلف ہو کر معلومات لیتا رہا اور اب میں احمد شانی سے بات کر رہا تھا۔ فلائٹ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے باقی تھے۔ احمد شانی بلوچستان کا ایک قبائلی سردار تھا۔ باپ اور دو بھائی قبائلی دشمنی میں مارے گئے تھے اور خود اس دشمنی سے تنگ آ کر امریکا جا بسا تھا اور گاڑیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے مجھے اپنا فون نمبر دیا اور کہا کہ گاڑی لینی ہو تو مجھے بتانا میں اچھی اور سستی گاڑی دلوادوں گا۔ میں نے نمبر سنبھال کر رکھ لیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ میں تو کینیڈا جا رہا ہوں اور یہ امریکا میں کاروبار کرتا ہے۔ میرے لیے کینیڈا اور امریکا ایک طرح سے ایک ہی ملک کے دو حصے تھے۔ ان دنوں آپ اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھلا کر ایک دوسرے کی سرحد پار کر جاتے تھے مگر آج کینیڈا کے پاسپورٹ ہولڈر تک واپس کر دیے جاتے ہیں۔ امریکا نے خود کو ایک مضبوط قلعے میں بدل لیا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ تمام مسافر لائن میں لگ کر ریٹے ریٹے طیارے میں سوار ہو گئے۔ میں ان دنوں اسموکنگ کرتا تھا اور اس لیے مجھے سب سے پیچھے اسموکنگ والے حصے میں سیٹ ملی تھی، آجکل تو اسموکنگ بند ہے مگر ان دنوں جہازوں میں سگریٹ نوشی ممنوع نہ تھی۔ میرے ساتھ اناوہ میں رہنے والا ایک افغانی بیٹھا تھا اور اس کا نام سلطان تھا اور وہ بتاتا تھا کہ وہ اکیلا جا رہا ہے اور اناوہ میں ایک اسٹور چلاتا ہے۔ میں نے اس سے گلنے گلنے کی کوشش کی مگر اس نے مجھے کوئی لفظ نہ کرائی۔ احمد شانی بھی کہیں آس پاس آ بیٹھا تھا۔ میں راہداری کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور دوسری جانب سیٹ پر ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ جہاز کچھ بھرا تھا۔ کچھ دیر ہنگامہ سا رہا۔ میں پرجوش تھا۔ ایک مسرت کا عالم تھا۔ بیوی اور بچے یاد آرہے تھے مگر کینیڈا کی اڑان میرے دماغ پر حاوی ہو رہی تھی۔ پھر کچھ اعلانات ہوئے، تلاوت کی گئی اور پھر جہاز رن دے پر ریٹے لگا۔ کچھ لمحوں میں اس کے پہیوں نے پاکستانی

آیا جو جلد ہی ٹنٹ گیا۔ تن جگہ تو مجھے اسکین کیا گیا۔ اب میرے پاس ایک ہینڈ بیگ تھا۔ سب سے فارغ ہو کر کچھ زینے چڑھا تو ایک گورا امریکی کھڑا مجھ سے پاسپورٹ مانگ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی ادب سے پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں دے کر سر جھکا لیا اور منوڈب کھڑا ہو گیا۔ اس نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے پھر مجھے دیکھا اور سر کے اشارے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ میں نے پہلی اور آخری مرتبہ کسی امریکی افسر کو سر کے اشارے سے اپنی بات سمجھاتے دیکھا۔ اپنی زمین پر وہ نہایت ہی مہذب انداز سے بات کرتے ہیں۔ ایک بار میں بینکاک سے براستہ ٹوکیو امریکا آرہا تھا۔ بینکاک پر ایمیگریشن اور سیکورٹی سے ایک بار گزرا۔ امریکا نے ہر ایئر پورٹ پر اپنا ایک علیحدہ نظام بنایا ہوا ہے۔ آپ ایئر پورٹ کی سیکورٹی سے گزر کے ایک بار پھر سے امریکا کے حصار میں داخل ہو کر اپنا سب کچھ چیک کرواتے ہیں۔ یہ میں بہت سے ملکوں کے ایئر پورٹ پر دیکھ چکا ہوں۔ میں جب بینکاک میں امریکن سیکورٹی کے حصار میں داخل ہوا تو میری نازک طبیعت پر یہ ناگوار گزرا کہ یہ دو بار تلاشی اور ایمیگریشن کا کیا مطلب ہے؟ اور میں نے اپنی ناراضگی کا کھل کر اظہار کیا۔ وہاں ایک تھائی آفیسر نے ادب سے میرا پاسپورٹ لیا، ایک کاؤنٹر پر گیا اور بڑی تمیز سے واپس کر دیا۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ میرے احتجاج نے کام جلدی کروا دیا۔ پھر جہاز نے پرواز بھری اور ٹوکیو جا ٹھہرا۔ وہاں بھی امریکا کے لیے دوبارہ سے یہ سب مراحل طے کرنے پڑے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا اور پھر ایک بڑی تھکا دینے والی فلائٹ کے بعد امریکا آ پہنچا۔ ایمیگریشن آفیسر کے پاس پہنچا۔ اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور کہا۔ ”سفر کیسا گزرا۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”بہت تھک گیا ہوں اور جلدی گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔“ اس نے میرا پاسپورٹ اور ایمیگریشن کا فارم مجھے دے دیا جس پر کوئی کوڈ سا لکھا تھا۔ پھر میں کسٹم سے جب گزر رہا تھا تو ایک آفیسر آیا اور مجھے علیحدہ لے گیا۔ پھر جو میرے سامان اور کاغذات کی تلاشی ہوئی وہ میرے لیے ایک بڑی پریشانی بن گئی۔ میرے بٹوں تک کو کھنگالا گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جو ہوشیاری میں نے بینکاک ایئر پورٹ پر دکھائی تھی اور جو سہولت میں نے یہاں کے ایمیگریشن آفیسر سے مانگی تھی کہ میں تھکا ہوا ہوں اور جلد گھر پہنچنا چاہتا ہوں، یہ سب اسی کا خمیازہ ہے۔ دو گھنٹے کی سخت آزمائش کے بعد انہوں نے مجھے کلیئر کیا۔ پھر وہ سواری کرتا رہا کہ آپ کا قیمتی وقت ہم نے لے

سرزمین کو خدا حافظ کہا اور آسمان میں بلند ہوتا چلا گیا۔

پہلے جہاز میں کھانے پینے کا سلسلہ چلا۔ اب رات کے دو بجے کیا بھوک لگتی مگر یہ رسم چل پڑی تھی اور میں نے بھی سب کے ساتھ نبھائی۔ ہر میٹ کے سامنے ایک اسکرین تھی جہاں فلمیں، موسیقی، ڈرامے دکھائے جا رہے تھے۔ میرے لیے ان دنوں جہاز میں ٹی وی کا ہونا نئی بات تھی۔ مختلف چینل پر مختلف پروگرام لگے تھے۔ ایک چینل پر جہاز کی پوزیشن، رفتار اور بلندی کے علاوہ آئر لائنڈ کے شہرین پر اترنے کا ٹائم بھی نظر آ رہا تھا۔ میں اسی جی۔ پی۔ ایس کو دیکھ رہا تھا اور کچھ دیر بعد ہمارا جہاز پاکستانی سرحدوں سے نکل کر افغانستان میں داخل ہو گیا۔ میرا پاکستان سے باہر جانے کا خواب اسی طرح پورا ہو رہا تھا اور میں اب کہہ سکتا تھا کہ میں نے بھی غیر ملکی سفر کیا ہے۔ پہلا تجربہ ہمیشہ پُر جوش ہوتا ہے اور میں اسی کیفیت میں جتا تھا۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد اپنی سگریٹ سلگائی تو ساتھ میں بیٹھے بزرگ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ یہ نان اسموکنگ ایریا ہے۔ میں ان دنوں مہذب نہ ہوا تھا اسی لیے میں بھی اڑ گیا۔ ایئر ہوٹس کو بلایا گیا اور اس نے میرے موقف کی تائید کی اور میں دوسروں کی تکلیف کے احساس سے بے نیاز سگریٹ نوشی کرتا رہا اور آج میں اپنے اس رویے پر بہت نادم ہوں۔

سلطان کے برابر ایک خاتون اپنے بچوں سمیت بیٹھی تھیں۔ ان بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنے بچے یاد آ رہے تھے اور آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ آس پاس کے مسافر اونگھنے لگے اور میں اپنے مختلف قسم کے سفر کی وجہ سے نیند سے کافی دور تھا۔ وقت گزرتا رہا اور جب جہاز مشرقی یورپ کے اوپر پرواز کر رہا تھا تو میں اپنے آپ کو یورپ میں محسوس کر رہا تھا۔ ہم رات ایک بجے اندھیرے میں روانہ ہوئے تھے اور چھ گھنٹے گزارنے کے باوجود جہاز کی کھڑکیوں سے باہر ابھی تاریکی تھی۔ یہ مسلسل تاریکی مجھے بے چین کر رہی تھی۔ آٹھ گھنٹے گزرے تو اعلان ہوا کہ ہم شین (Shanon) میں اترنے والے ہیں۔ سوئے مسافر بیدار ہونا شروع ہو گئے۔ جہاز آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا۔ باہر ابھی اندھیرا تھا اور کھڑکی سے شہر کی روشنیاں جگمگ کرتی نظر آئیں تو میں پہلو بدلنے لگا۔ کسی یورپ کے شہر کی روشنیاں میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں کسی بچے کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھے سلطان کو جھنجھوڑا اور کہا۔ ”یورپ کے شہر کی روشنیاں تو دیکھو۔ کتنی خوبصورت نظر آتی ہیں۔“

اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور یقیناً یہی سوچ رہا ہوگا کہ یہ تو مجھ سے بھی بڑا پینڈو ہے۔

جہاز لینڈ کر رہا تھا تو میں بچوں کی طرح ایئر پورٹ کی عمارت دور سے دیکھ رہا تھا۔ اللہ مغفرت کرے علی سفیان آفاقی صاحب کی۔ یہ لت ان کی لگائی ہوئی تھی۔ ہر ایئر پورٹ اور شہر کا تذکرہ اس دلچسپی سے کرتے رہے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ اسی جگہ پہنچ جاتا تھا اور اس دن بھی میں اسی قسم کے خوش کن خیالات کی زد میں گھرا، ایئر پورٹ کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ٹیوب کے ساتھ جہاز جا لگا اور ٹیوب سے جہاز میں سے آنا بھی کوئی عجیب سا مزادیتا تھا۔ وہاں سے نکلا اور سیدھا ایئر پورٹ کی عمارت میں آ گیا۔

میں اسلام آباد ایئر پورٹ سے یہاں اترتا تھا۔ پہلا تجربہ کسی پہلے پیار کی طرح ہوتا ہے جس میں کوئی بھی کسی سرسراتی کیفیت میں آ جاتا ہے۔ میں اپنے اس تجربے کو دیکھنے سے زیادہ محسوس کرتا تھا۔ چمکتے فرش، آرام دہ نشستیں، سجاوٹی دکائیں جو اشیاء سے بھری تھیں۔ کرسس اگلے ماہ تھی اور پورے ایئر پورٹ پر جا بجا کرسس کے درخت اپنے گرد اپنے ققموں کی روشنی میں جگمگ کر رہے تھے۔ میں ایک ایک چیز کو بخور دیکھ رہا تھا۔ پورا ٹرمینل روشنیوں سے نہایا ہوا تھا اگر میں موازنہ اسلام آباد ایئر پورٹ سے کرتا تو کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔

ڈیوٹی فری شاپس تھیں جو معلوم نہیں کن کن اشیاء سے بھری پڑی تھیں۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیرت زدہ کیا وہ شراب کی کئی اقسام کی بوتلیں تھیں جو سینکڑوں کے حساب سے تکی تھیں۔ یہ میرے لیے انوکھی چیز تھی۔ میں شراب کی بوتل پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ یہ چیز سرعام بکتی ہوئی مجھے حیران کر رہی تھی۔ کافی شاپس، ریستورانٹ، گفٹ شاپس پر رونقیں۔ یہ سب مجھے ششدر کر رہی تھیں۔

ایک کونے میں اسموکنگ ایریا تھا۔ میں وہاں آ بیٹھا۔ ایک انڈیا کا گجراتی بیٹھا دھویں اڑا رہا تھا۔ نام پوچھا تو بتایا کہ میں، عزیز ہوں، میں عزیز کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں ایک بزرگ پاکستانی بھی ساتھ آ بیٹھے۔ ہر ایک سے سوال کرنا میرا مشغلہ تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے امریکا جا رہے تھے۔ ان کا بیٹا وہیں رہتا تھا۔ میری امیگریشن کا ان کو معلوم ہوا تو مجھے مبارک دینے لگے اور ظاہر ہے کہ میں نے سب انہیں بتایا تھا۔

ان کے ہاتھ میں ڈیوٹی فری شاپ کا بیگ تھا۔ پھر اس میں سے شراب کی بوتلیں نکال کر خوشی خوشی بتلا رہے تھے کہ بہت سستی مل گئی ہے اور قیمت صرف چار ڈالر ہے۔ ایک مسلمان کو ہاتھ میں شراب پکڑ کر اترتے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اور سونے پر سہا کہ وہ سستی خریدنے پر خوش بھی نظر آ رہے تھے۔ مسلمان پیتے تو ہیں مگر گناہ سمجھ کر۔ اور اسی لیے چھپ چھپا کر جام لٹاتے ہیں اور اس حرکت پر پردہ بھی رکھتے ہیں مگر یہاں ایک بزرگ سے یہ سن کر میں ششدر تھا۔ میں سالوں سے باہر کے ملکوں میں پھر رہا ہوں مگر اس کے بعد کسی بھی پاکستانی کو شراب نوشی پر ناز کرتے نہیں دیکھا۔ میں ان دنوں ایک نئے تجربات اور مشاہدات سے گزر رہا تھا۔ اتنے سارے واقعات متواتر ہو رہے تھے جو مجھے حیران کر رہے تھے۔

میں پچھلے کئی گھنٹوں سے تاریکی دیکھ رہا تھا۔ باہر پارش ہو رہی تھی مگر اندر حرارت کی وجہ سے باہر کے موسم کی سختی کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ یہاں سے ہماری پرواز نیویارک کی تھی اور پھر نیویارک سے ٹورنٹو جانا تھا۔ اب پرواز سات گھنٹے بحر اوقیانوس پر تھی اور میرے ذہن میں ٹائی ٹینک آ گیا جو اسی سمندر میں غرق ہوا تھا۔ اندر ہی اندر کسی خوف سے میں لرز گیا۔ سوچا اتنے گھنٹے میں ایک سمندر کے اوپر سے گزروں گا؟ اگر خدا نخواستہ یہ سمندر میں گر گیا تو میری کیا حالت ہوگی؟

کچھ دیر میں ہم دوبارہ جہاز میں سوار ہوئے۔ مسافر بیٹھ رہے تھے اور کچھ دیر بعد جہاز نے دوبارہ اڑان بھری اور اب ریخ نیویارک کی جانب تھا۔ میری سیٹ کے پیچھے ایک پاکستانی نوجوان شراب کی بوتل کو منہ لگائے غنائت لی رہا تھا۔ اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ وہ بہک رہا تھا اور مسلسل کہہ رہا تھا۔ ”پاکستان میں میری بڑی عزت ہوتی ہے کیونکہ میرے پاس سالگرہ کا کارڈ ہے۔ ورنہ میرے خاندان والے پہلے مجھے پوچھتے ہی نہ تھے۔ اب جاتا ہوں تو سب آگے پیچھے پھرتے ہیں۔“ پھر دو چار گھونٹ چڑھاتا اور پھر شروع ہو جاتا۔ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ بے سدھ ہو کر اپنی سیٹ پر گر گیا۔ میں حیرت سے گنگ بیٹھا یہ سب تک رہا تھا۔

مجھے مسلسل تاریکی اور اس میں لگا تار سفر مضطرب کر رہا تھا۔ میں واٹس روم گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو ہلکی سی روشنی تھی مگر سورج نظر نہ آتا تھا۔ ہم زمین سے دس کلومیٹر بلند ہو کر پرواز کر رہے تھے۔ باہر درجہ حرارت منفی پچاس تھا اور جہاز کی

رفتار نو سو کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ اب میں باقاعدہ بے آرام ہو رہا تھا۔ مسلسل چودہ گھنٹوں کی تاریکی اور اتنا لمبا سفر۔ ایک دہلا دینے والا احساس میرے اندر آ بیٹھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کہیں میں زمین سے کٹ تو نہیں گیا۔ میرے اپنے لوگ، میرا گھر میرے دن رات کہیں کھو تو نہیں گئے۔ کیا میں انہوں سے بہت دور آ نکلا ہوں اور واپسی کے دروازے بھی بند ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ کوئی اور ہیں، میرے نہیں۔ میرے بچے اور رشتہ دار کہیں کھو گئے ہیں اور میں تنہا ہو چکا ہوں۔ اسی پریشانی میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ سب مسافر نیند میں تھے۔ شراب پینے والا اپنی سیٹ پر اوندھا پڑا تھا۔ میں کیا کرتا؟ ایک بے چینی مجھے ستاتی اور لاتی تھی۔

کچھ دیر بعد افاق پر کوئی آتشیں روشنی سی ابھری اور آہستہ آہستہ واضح ہوتی گئی..... کچھ دیر بعد سورج ایک آہستہ گولے کی طرح چمکتا ہوا نمودار ہوا اور اب اس پر نظر نہ لگتی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سوسکا تھا۔ ارد گرد کے مسافر بیدار ہونے لگے۔ کچھ ہل چل پیدا ہوئی۔ ایک ازبک خاندان جس میں زیادہ عورتیں تھیں۔ انہوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ ویڈیو بنا رہے تھے۔ بھڑکیلے لباس میں ملبوس عورتیں اپنے ساتھ کے کسی نہ کسی مرد سے لپکتی جا رہی تھیں۔ سب مسافر نا پسندیدہ نظروں سے ان کی جانب دیکھ کر منہ پھیر لیتے مگر لپٹنے والوں کو کوئی پرواہ نہ تھی۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا تو تاحد نظر برقیں ہی برقیں نظر آتی تھیں۔ جہاز اپنی رفتار سے اڑتا جا رہا تھا، سب مسافروں کو ناشائدا دیا گیا۔ انڈوں کے آلیٹ کے ساتھ فرائی آلو اور جوس، چائے اور پھل دیے گئے۔ نیویارک قریب آنے لگا اور اب ہم سمندر کے اوپر تھے۔ طیارہ نیچے ہوتا گیا اور میرے کان کے پردے پھٹنے لگے۔ ہوا کا دباؤ میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔

جہاز نیویارک ایئر پورٹ پر اتر اور رن وے سے ہو کر ٹرمینل سے کہیں دور جا کھڑا ہوا۔ میں پہلے یہ سوچ رہا تھا کہ ایئر پورٹ سے طارق کوفون کر کے بتاؤں گا کہ میں امریکا سے بات کر رہا ہوں۔ نیویارک اور امریکا جسے میں سالوں سے اپنے خوابوں میں بسائے ہوئے تھا۔ میں کھڑکی سے چاروں طرف مجسمہ آزادی دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ جس کی تصویریں میں نے ایئر لائن کے دفاتر میں دیکھی تھیں وہ مجھے دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یہ احساس بھی اچھا لگتا تھا کہ میں امریکا کی زمین پر سے امریکا کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین

کہ پہلے اپنا سوشل انشورنس نمبر (SIN) لینا ہوگا تب ہی کوئی نوکری کر سکوگا، یہ نمبر میری شناخت تھی۔ پھر پوچھا کہ رقم کتنی ہے۔ میں نے بتائی تو اس نے گن کر میرے کاغذات پر درج کر لی اور کہا کہ اپنا بینک اکاؤنٹ کھلوانا تو یہ کاغذات دکھلا دینا ورنہ اتنے کیش پر کوئی چیک اکاؤنٹ نہیں کھولے گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ اور مجھے ہدایات دیں اور آخر میں کہا کہ کوئی سوال ہے؟ میں نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

اب میں اس جگہ موجود تھا جہاں بہت سی برقی بیلٹ چلتی تھیں اور یہیں سے اپنے بیگ وصول کیے جاتے تھے۔ جہاں پی آئی اے لکھا تھا میں وہاں اپنے سامان کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا سامان آیا تو ایک قلمی بھی آ گیا۔ وہ مجھ سے یہ دو بیگ باہر لے جانے کے بیس ڈالرا مانگ رہا تھا اور میں اتنی رقم دینے سے انکاری تھا۔ وہاں ایک دیسی قلمی نظر آیا۔ نام مجید تھا۔ اس نے کہا کہ صرف دو بیگ ہیں، انہیں ٹرائی میں ڈال کر خود لے جاؤ۔ ٹرائی لینے کے لیے ایک ڈالرا کا سکے میشن میں ڈالنا پڑتا تھا۔ میرے پاس امریکن ڈالر تھے۔ اس نے مجھ سے ایک امریکن ڈالر لے کر کینیڈین ڈالرا کا سکے تھا دیا۔ میں نے ٹرائی نکالی، سامان اس پر رکھا اور ایک کاؤنٹر پر اپنا شکم کارڈ دیا اور باہر کی طرف چلا آیا۔

سارا ماحول، لوگ، زبان، ایئر پورٹ کی عمارت۔ ہر چیز اجنبی تھی۔ میں خود یہاں اجنبی تھا اور ایک ایک قدم پر کسی نئے تجربے سے روشناس ہو رہا تھا۔ مجھے لیتے سہیل مفتی کو آنا تھا جس سے میں آج تک ملاؤں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں اسے یادہ مجھے کیسے پہچانے گا؟ اسی اثنا میں میں باہر آ گیا۔ بہت سے لوگ اپنے مہمانوں یا رشتہ داروں کو وصول کرنے کے لیے کھڑے تھے اور ہر نکلنے والے کا چہرہ دیکھتے تھے۔ ایک عجیب منظر تھا کہ آپ کئی نگاہوں کی زد میں ہوتے ہیں اور آپ کی نظر۔۔۔ کسی ایک چہرے کو ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں۔ ایک ریلنگ کے ساتھ لگا کوئی مجھے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ میں نے بھی اپنی باچھیں کھول دیں۔ میں نے نام پوچھا تو وہی سہیل مفتی تھا۔ گورا چٹا، قدرے فرہہ سا سہیل مفتی، جو بعد میں مفتی کہلوا یا جاتا تھا، مجھ سے گلے مل رہا تھا۔ میری ٹرائی پکڑی اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ قدرے موٹا سا، جس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ نمایاں تھی، مفتی نے تعارف کروایا کہ یہ شہباز فخری ہے۔ نامور

اداکار جمیل فخری کا بیٹا، جو تین دن پہلے ایگریگیشن لے کر ٹورنٹو پہنچا تھا اور مفتی کے ساتھ آٹھ گھنٹہ تھا۔

ہم اسی تعارف میں باہر آ کر کھڑے تھے، جہاں ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ایک ٹیخ اور نامانوس ہوا کا جھونکا مجھ سے ٹکرایا اور میں کپکپا گیا۔ یا اللہ یہ کیسی سردی ہے جس سے میں پہلے بھی آشنا نہ تھا۔ ہر فضا اپنے اندر ایک علیحدہ احساس رکھتی ہے۔ ہوا سونگھ کر آپ کسی شہر یا علاقے میں زندگی کے چال چلن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہاں ٹورنٹو کی فضا میں جیسے برف کی دیواریں میرے آس پاس ایستادہ تھیں۔ ہوا منجمد ہو کر ٹھہر سی گئی تھی اور اس سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہ تھا کہ زندگی یہاں خاص طور پر سردیوں میں کتنی ہوگی۔ بادل، بارش اور برقیلی ہوائیں جو آپ کو چہرے پھاڑ دیں گی۔

شہباز نے ایک ٹیکسی کی ڈنگی میں سامان رکھا اور بولا۔ ”بہت برے حالات ہیں، کوئی نوکری نہیں، مرناسیابا ہے“ میرے پوچھنے پر کہا تین دن پہلے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ سہیل ہونے کے لیے تو کئی ماہ لگ جاتے ہیں اور آپ تو تین دن میں گھبرا رہے ہیں۔ میں بہت پر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ مفتی میری اس ہمت اور جرأت کی داد دیتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری یہ حالت دو ہی دنوں میں بگڑنے والی تھی۔

ٹیکسی ایک گورا چلا رہا تھا۔ بھگی ہوئی صاف ستھری سڑکوں پر ہماری ٹیکسی دوڑ رہی تھی، سڑکوں کا ایک جال تھا۔ چار رو یا پانی وے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ میں ادھر ادھر دیکھتا کہ شاید کسی این ٹاور نظر آ جائے۔ مجھے ہر وہ عمارت پہلی نظر میں دیکھنی تھی جو میں پی آئی اے کے آفس میں دیکھ چکا تھا۔ مفتی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور شہباز میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر ایک پریشان زدہ اور پسینے سے بھرے چہرے سمیت بیٹھا۔ کینیڈا کو گالیاں دیتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا پسینا کسی موسمی تغیر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اندر کے مدوجزر سے نکلتا ہے۔ بادل بہت نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ آس پاس بلند عمارتیں، ہوٹل اور دفاتر تھے۔ ہم دس پندرہ منٹ میں ایک آٹھ منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے شیٹے والے گیٹ کے باہر آ کے۔ سفید اور سرخ رنگوں سے پینٹ کی گئی یہ عمارت تھی اور اس کی ہو بہو نقل اس کے سامنے بھی تھی۔ دو ایک طرح کی بلڈنگز کے درمیان میں ایک بڑا سالان تھا جس میں چنار کے درخت لگے تھے۔ سامنے والی بلڈنگ کے پیچھے ہیں ہیں منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ سر اٹھائے سردی میں خاموش اور اس کھڑی نظر آتی تھیں۔

میں آس پاس کا جائزہ لے کر ٹیکسی سے نکلا اور اسے
میں ڈرائیور نے گاڑی کی ڈیگی سے میرا سامان نکالتے ہوئے
کہا۔ ”اس میں کیا پتھر رکھ کر لائے ہو۔“

ظاہر ہے کہ وہ انگریزی میں کہہ رہا تھا اور مجھ سے کوئی
جواب انگریزی میں نہ بن پڑا اور میں ”میں میں“ کرنے لگا۔

مفتی نے اس کو کراہیہ ادا کیا اور شہباز میرے ایک سوٹ
کیس گھسیٹنا شیشے کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا کیونکہ باہر بلا کی
ٹھنڈ تھی اور میں کپکپا رہا تھا۔ دوسرا سوٹ کیس مفتی نے سنبالا
اور ہم اس گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہم گیٹ سے گزر کر لابی
میں کھڑے ہوئے تو یہاں حرارت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ
دیواروں اور چھت میں لگی ڈسک سے گرم ہوا باہر آرہی
تھی۔ اس لابی کے آگے ایک اور شیشے کی دیوار تھی جس میں
ایک دروازہ لاک تھا۔ بائیں جانب دیوار پر ایک بورڈ
دیوار میں تھا اور فون کا ریسیور بھی لگا تھا۔ بورڈ پر اپارٹمنٹ کے
نمبر لکھے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اگر کوئی مہمان آتا ہے اور
اس کے پاس دروازے کی چابی نہیں ہوتی تو وہ ریسیور اٹھا کر
اپارٹمنٹ کا نمبر دباتا ہے تو اپارٹمنٹ میں فون بج اٹھتا
ہے۔ جب آپ کو فون پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرا کوئی دوست یا
مہمان ہے تو آپ فون پر زبرد کا نمبر دباتے ہیں اور دروازہ
ایک چرکی آواز سے کھل جاتا ہے۔

مفتی کے پاس تو چابی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ہم
ایک راہداری میں آکھڑے ہوئے۔ زمین پر ٹمبل کی طرح
سرخ رنگ کا کارپٹ بچھا تھا۔ سامنے دو لفٹیں تھیں مگر ہم بائیں
جانب مڑے تو پہلا دروازہ مفتی کے اپارٹمنٹ کا تھا۔ گراڈنڈ
فلور پر 101 نمبر اپارٹمنٹ اگلے آٹھ ماہ میرا ٹھکانا رہا۔ مفتی
نے ایک چابی نکالی، دروازہ کھولا اور میں اپارٹمنٹ میں داخل
ہوا۔

دروازہ کھولتے ہی سیدھے ہاتھ پر کچن تھا اور سامنے
لیونگ روم تھا۔ جہاں بائیں جانب دیوار سے لگی ایک بڑی میز
رکھی تھی اور اس پر ایک پرانا کمپیوٹر تھا اور ساتھ ہی فون رکھا
تھا۔ میز کے ساتھ گھومنے والی دو کرسیاں رکھی تھیں۔ لیونگ
روم میں دائیں ہاتھ پر سامنے والی دیوار سے لگا ایک بڑا
میٹرز پڑا تھا اور ساتھ میں کوئی بیس ایچ کا پرانا ٹی وی ایک
ٹائٹ ٹیبل پر رکھا تھا اور بہت سی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے باہر
کی جانب پوری دیوار شیشے کی تھی جس پر دبیز پردے لٹکے
تھے۔ یہ مفتی کا بیڈ روم بھی تھا، ہمارا یہ ڈائنگ روم بھی تھا اور
فارغ وقت میں لیونگ روم بھی تھا۔ اس لیونگ روم کے پیچھے

ایک بیڈ روم تھا اور ساتھ ہاتھ روم تھا۔ ہاتھ روم سے باہر
سیدھے ہاتھ پر ایک بڑی الماری تھی جس میں میرے دونوں
سوٹ کیس آسانی سے ساگنے تھے اور وہاں شہباز کا سوٹ کیس
بھی پڑا تھا۔ اس میں سب کے کپڑے لٹکے تھے۔ یہ ایک
صاف ستھرا اپارٹمنٹ تھا جس کو مفتی ہر وقت صاف ستھرا رکھتا
تھا۔

میرا سامان رکھ دیا گیا اور میں میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھا
سگریٹ چیتا تھا۔ شہباز کہتا تھا کہ غلطی کر لی جو لاہور میں
دو اینٹوں کی کپنی میں اچھی بھلی جاب چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ مفتی
کی فیملی پاکستان میں تھی اور ایک پار آ کر واپس پاکستان میں
بیٹھی دوبارہ آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ شہباز غیر شادی شدہ تھا
اور ٹیٹ پنچابی میں بات کرتا تھا۔ میرے لیے مفتی نے چائے
بنائی اور میں انہیں اپنے سفر کے بارے میں بتانے لگا جس میں
ان دونوں کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اتنے میں بیڈ روم سے لمبا
ترنگا شخص آنکھیں ملتا برآمد ہوا۔ اس نے سیکورٹی گارڈ کی وردی
پہنی ہوئی تھی اور شاید اسی میں آ کر سو گیا تھا۔ ابھی دوپہر کے
تین بجے تھے اور وہ، خان قیصر، رات کو سیکورٹی کی جاب کر کے
تھکا ہارا اپنی یونیفارم میں ہی سو گیا ہوگا اور اب شور سن کر باہر
آ گیا تھا۔ اس سے تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی
فارماسٹ ہے اور چھ ماہ سے آیا ہوا ہے اور سیکورٹی گارڈ کی
جاب کرتا ہے۔

شہباز کہنے لگا۔ ”کم بخت ہمیں تو سیکورٹی گارڈ کی جاب
بھی نہیں ملتی۔“ اور پھر بولا۔ ”بہت برے حالات ہیں۔“
خان قیصر کی فیملی بھی پاکستان میں تھی اور اس نے انھیں
اسپانسر کیا ہوا تھا اور اسے امید تھی کہ ایک ماہ میں بچے آجائیں
گے۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا سیکورٹی گارڈ کی جاب میں اتنا
بن جاتا ہے کہ بندہ فیملی ساتھ رکھ سکے۔“
وہ بولا۔ ”تنخواہ کے علاوہ بچوں کا الاؤنس بھی مل جاتا
ہے تو گزارہ ہو جائے گا۔“

خان قیصر کچن میں کھس گیا اور کہا کہ وہ میرے لیے
مرغ کڑا ہی بنائے گا۔ کچن سے ایک بڑی کھڑکی لیونگ روم
میں کھلتی تھی اور وہ وہیں کڑا ہی گوشت تیار کرتا تھا۔ مجھ سے
پوچھنے لگا۔ ”فیملی تو ہے ناں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ہنس کر کہنے لگا کہ انہیں
کب بلوائے گے؟

میں نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور کہا۔ ”ابھی میری لہ

پلاننگ میں یہ نہیں ہے۔ پہلے میں اپنے آپ کو سیٹ کروں گا کوئی اچھی نوکری ڈھونڈوں گا اور پھر انہیں سانس کروں گا۔“ اس نے یہ سن کر وہیں سے دل کھول کر ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”اچھا نوکری، سیٹ ہوؤں گا۔ ہاں اور کیا کہا۔“ یہ کہہ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ”ابھی ایک گھنٹا پہلے پہنچے ہو ناں۔ آگے آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔ جب بچے یاد آئیں گے تو نہ چین سے بیٹھ سکو گے اور نہ سو سکو گے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر سے کھی ہنسنے لگا۔

مفتی اس تمام عرصے میں خاموش اور ناراض سا بیٹھا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں میں کچھ چپقلش چل رہی ہے۔ میں اب خود بھی شہباز اور خان قیصر کے حالات سن کر تھوڑا سا نروس ہو رہا تھا۔ خان ایک زندہ دل اور دل کا بادشاہ لگتا تھا۔ ہر بات قہقہے سے شروع ہو کر قہقہے پر ہی ختم کرتا۔ میں نے اسے ایک لمحے کے لیے بھی پریشان نہ دیکھا۔ پنجابی کے علاوہ کوئی اور بولی اس کے ساتھ چلتی بھی نہ تھی۔ ان میں صرف مفتی تھا جو ایک اچھی جا ب کرتا تھا اور اس لیے وہ سب کی نظر میں بڑا خوش قسمت تھا۔ خان پھر مجھ سے میری ڈگریاں اور تجربہ پوچھنے لگا۔ میں نے بتایا کہ میں یونیورسٹی میں فارماسیوٹیکل کیمسٹری پڑھاتا تھا اور انڈسٹری کا بھی چار سال کا تجربہ ہے تو وہ وہیں چکن سے بولا ”پروفیسر صاحب۔ بس آپ کو تو فوراً جا ب مل جائے گی۔ ابھی مجھ سے لکھو لو۔“ اس کے الفاظ سے میری کچھ تسلی ہوئی مگر اتنے میں منہ بسورتا شہباز بولا۔

”یہاں بہت برے حالات ہیں۔“ یہ شہباز کا ایک ٹکڑے کلام سا تھا جو میں ایک دو گھنٹوں میں درجنوں بار سن چکا تھا اور ان دو گھنٹوں میں خان نے میرا نام پروفیسر رکھ دیا تھا اور آج پندرہ سال ہو گئے ہیں اور مجھے آج بھی پروفیسر کہتا ہے۔ جب اس نے یہ کہا کہ آپ کو جا ب جلد مل جائے گی تو وہ آج تک یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس نے کہا تھا کہ تمہیں تو جا ب جلد مل جائے گی اور تم تین مہینوں میں مفتی کے ساتھ اچھی جا ب پر آگئے تھے۔

خان واقعی ایک بہترین دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے میری ہمت بڑھانے رکھی تھی۔ آج بھی جب بات ہوتی ہے تو وہی قہقہہ لگا کر کہتا ہے کہ تم کس طرح سگریٹ کے کش لے کر کہتے تھے کہ ابھی میری پلاننگ مختلف ہے..... مجھے وہ دن یاد آتے ہیں تو مفتی اور خان قیصر کی دوستی اور محبت یاد آتی ہے۔ میں خوش قسمت تھا کہ مجھے آتے ہی اچھے دوست مل

گئے۔ ان دو کے علاوہ بھی بہت سے پر خلوص دوست اللہ پاک نے دے دیے تھے اور اللہ کی مدد سے میں پھر آگے بڑھتا گیا۔ سب دوست یہی کہتے تھے کہ کینیڈا نے صحیح طریقے سے تم کو خوش آمدید کیا ہے۔ وہ سب اس کتاب کا ذکر کرتے تھے جو کاغذات ملنے پر کینیڈا کی ایک سی سی سب کو دیتی ہے۔ ”ویل کم ٹو کینیڈا.....“

شہباز پاکستان کا پوچھتا کہ وہ کیسا ہے، حالات کیسے ہیں؟ حالانکہ وہ تین دن پہلے ہی پہنچا تھا۔ مفتی کو پاکستان سے کوئی غرض نہ تھی اور نہ وہ پوچھتا تھا۔ مفتی کی بہن کئی سالوں سے یہاں ٹورنٹو میں مقیم تھیں اور وہ کم ہی بہن کے ہاں جاتا تھا۔ وہ اپنی ایک علیحدہ دنیا میں رہتا تھا۔ اس کے دوست نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ سب سے کٹ کر رہنے والا آدمی تھا۔ ایک فاصلے پر اپنے آپ کو رکھتا تھا۔ اور خان ہر ایک کے ساتھ دوستی بنا لیتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ خان کی میرے ساتھ بے تکلفی اسے پسند نہیں آ رہی تھی اور شہباز اپنے بھاری بھر کم وجود کو کارپٹ پر ڈھیر کیے بڑبڑا رہا تھا۔

باہر سردی تھی اور اندر لیونگ روم کی بیس فٹ لمبی اور زمین سے چھت تک بڑی کھڑکی کے نیچے ڈسکس لگی تھیں جہاں سے گرم ہوا اندر کے ماحول کو گرم رکھتی تھی۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار پھینکی تھی۔ مرغ کڑا ہی تیار ہوئی اور دسترخوان بچھایا گیا۔ فرنیچ سے روٹیوں کا پیکٹ نکالا گیا اور اس میں سے خمیر لگی روٹیوں کو اودون میں رکھ کر گرم کیا گیا۔ ان روٹیوں میں کوئی عجیب سی باس اٹھتی تھی۔ میرے پوچھنے پر مفتی نے بتایا کہ یہاں یہی روٹیاں ملتی ہیں۔ مجھے ایک دم سے اپنی بیوی یاد آگئی جو میرے گھر آنے پر توڑے پر گرم روٹیاں گندم کی مہک لیے میرے لیے بنا کر لاتی تھی۔ مجھ سے آج دونوں لے بھی نہ نکلے گئے اور میں ایک مایوسی میں گرتا چلا گیا کہ یہ کیسی جگہ ہے جہاں نہ کوئی دوست ہے اور نہ غمخوار۔ بلکہ سب ہی ڈپریشن میں لگتے ہیں۔ اور تو اور نہ بھوک میں ٹھیک سے کھانا ملتا ہے۔

میرا عادت رہی ہے کہ کھانے میں مجھے تازہ اور گرم روٹی چاہیے ہوتی ہے۔ کچی پکائی، پلاسٹک کے لفافوں میں بند روٹیاں مجھ سے کبھی نہیں کھائی گئیں۔ اور مجھے دونوں وقت تازہ سالن بھی چاہیے ہوتا تھا۔ یہ عادت تو یہاں کے حالات نے بدل ڈالی ہے مگر روٹی کا معاملہ ابھی تک پھنسا ہوا ہے۔

اتنی دیر میں شہباز کا رشتے میں ایک ماموں آیا۔ وہ آئی ٹی ایکسپٹ ہوں بہت اچھی جا ب پر فائز تھا۔ اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی مگر قباحت یہ تھی کہ وہ اس خود اعتمادی میں بہت زیادہ

اور اونچا بولتا تھا۔ مگر میں اسے بڑی حسرت سے دیکھتا تھا کیونکہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ آتے ہی وہ شہباز کو تسلیاں دینے لگا۔ ”تم گھبرائے ہوئے کیوں لگ رہے ہو؟ میں ہوں ناں اور جا ب کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ پھر اپنا موبائل فون نکالا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔ یہ ماموں خورشید تھے۔ ان دنوں کینیڈا میں موبائل فون کم ہی تھا اور اس کا ہونا ایک بڑی حیثیت کی نشان دہی کرتا تھا۔ فون پر اپنے دوستوں سے بات کرتا تھا کہ میرا ایک بھانجا ٹورنٹو میں آیا ہے اور اس کے لیے جلد سے جلد جا ب کا انتظام کرنا ہے۔ وہ فون کرتا اور شہباز کو تسلی بھری نظروں سے دیکھتا اور پھر ہماری جانب ستاسی نظروں سے دیکھ کر اپنی بات جاری رکھتا۔ میں شہباز کی قسمت پر رشک کرتا کہ اس کا ماموں تو یہاں ہے جو اس کے لیے اتنا تردد کر رہا ہے اور ساتھ ہی دلا سہ بھی دے رہا ہے۔ مجھے ایسے نہیں سوچنا چاہیے تھا کیونکہ میں ابھی تو پہنچا تھا۔ مگر اتنی لمبی پرواز کے بعد میں اپنے آپ کو بہت دور اور تنہا محسوس کر رہا تھا اور سوچتا تھا کہ اڑ کر واپس چلا جاؤں۔ پھر اس نے شہباز سے کہا کہ تم مجھے پریشان نکتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ دو چار دن میرے ساتھ میرے گھر پر رہو گے تو تمہارے زرد چہرے کا رنگ پھر سے نکھر آئے گا۔

کل دیک ایڈ شروع ہو رہا تھا اور وہ شہباز کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جاتے جاتے شہباز یہی بڑ بڑا رہا تھا ”یہاں بڑا سیا پا ہے۔ بہت برے حالات ہیں۔“

خان قیصر بھی دوبارہ سے تیار ہو کر اپنی رات کی سیکھوٹی گارڈ کی ڈیوٹی دینے کے لیے تیاری پکڑنے لگا۔ میں تھکاوٹ اور نیند سے بے حال تھا۔ خان چلا گیا تو مفتی کہنے لگا کہ خان کچھ دنوں میں یہاں سے جا رہا ہے۔ تم اور شہباز اس کمرے میں رہو گے۔ وہ مجھے بیڈروم دکھا رہا تھا۔ بارہ ضرب چودہ کا کمرہ تھا جس میں باہر کی جانب پوری دیوار میں ایک شیشے کی کھڑکی تھی اور جس میں ایک سلائیڈنگ دروازہ بھی تھا۔ کمرے میں ایک میٹرز بڑا تھا۔ کمرہ حرارت کی وجہ سے تندور کی طرح کھول رہا تھا۔ مفتی نے مجھے ایک کالنگ کارڈ دیا اور پھر کہا کہ پاکستان اپنے چننے کی اطلاع کروں۔ ابھی تو وہاں صبح بھی نہ ہوئی ہوگی، اسی لیے میں نے کارڈ شکرے کے ساتھ رکھ لیا۔ اتنے میں طارق کانویارک سے فون آ گیا۔ اس نے مجھے بہت تسلی دی۔ تمنا بھائی نے میری ہمت بڑھائی۔ ان دنوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا جو میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔

میں نے کمرے میں آ کر باہر کا دروازہ تھوڑا سا کھولا کیونکہ اندر کی گرمی سے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔۔۔ جیٹ لاگ میں تھا۔ معمول پر آنے کے لیے کچھ دن چاہیے تھے۔ میرا جسم ابھی پاکستان کے وقت کے مطابق چل رہا تھا، جس میں دن کو نیند آتی اور رات کو بیداری کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن میں پچھلے تیس گھنٹے سے سو یا نہ تھا اور اسی لیے بستر پر جاتے ہی سو گیا۔ سونے سے پہلے مفتی نے مجھے ہاتھ روم کا نظام سمجھایا کہ تل کیسے کھلتا ہے۔ پانی ہاتھ روم کے فرش پر نہیں آنا چاہیے۔ ٹب میں نہاتے وقت گرم اور ٹھنڈے پانی کی نسبت کس طرح برقرار رکھی جاتی ہے۔ میں ہر لمحے کچھ نہ کچھ سیکھ رہا تھا۔ یہاں مفتی نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی۔

کچھ دیر ہی سو یا تھا کہ اٹھ بیٹھا۔ خوشی اور سناٹا تھا اور ساتھ ہی گھپ اندھیرا جیسے شاید قبر میں ہوتا ہوگا۔ پہلے تو کچھ دیر سوچتا رہا کہ میں کہاں ہوں اور یہ میرا بستر تو نہیں ہے۔ محسوس کیا کہ قدیل کیوں آج میرے پاس آ کر نہیں سوئی۔ ٹیلا تو وہ نہیں تھی۔ پھر دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو معلوم پڑا کہ میں چھبیس گھنٹے کا سفر کر کے دنیا کے اس کونے میں آ گیا ہوں جہاں سے واپسی کے سب راستے بند ہیں۔ میں پچھتاتے لگا۔ یا اللہ یہ میں کیا کر بیٹھا کہ اپنے شوق میں بچوں تک کو چھوڑ آیا۔ میں دل شکستگی اور ذہنی دباؤ میں آتا چلا گیا۔ یہاں تو سب اجنبی ہیں۔ مفتی اور خان سے میں پہلی بار ملا ہوں اور میرا نمکسار کوئی نہیں ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں سسک سسک کر رونے لگا۔ میں اتنا کمزور تو کبھی نہ تھا اور آج مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میں اپنا رونا دبا تا تھا کہ کوئی سن نہ لے مجھے پاکستان میں اپنے گھر کا کمرہ اور اس کا ایک ایک کونہ یاد آنے لگا تھا۔ سیمہ، قدیل اور اریبہ یاد آنے لگی۔ جتنا سوچتا تو اتنا ہی زیادہ رونے لگتا۔ یہ سوچتا کہ یہاں میں کیا کروں گا؟ جتنے لوگ بھی مجھے آج ملے وہ ہمیشوں تک بے روزگار رہے ہیں۔ سب اپنے بچوں، والدین اور دوستوں سے دور ہیں۔ ایک متوازن زندگی چھوڑ کر میں کہاں آ گیا ہوں؟ وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ میں نے اپنے آنسو صاف کیے۔ نیند کو سولہ دور تھی۔ شدید پریشانی میں پڑا تھا۔ میں نے لائٹ جلائی۔ یہاں ٹین اوپر کریں تو لائٹ جلتی ہے اور پاکستان میں ٹین نیچے کریں تو کمر روشن ہوتا ہے۔ مجھے یہاں ہر چیز اٹنی نظر آنے لگی۔ میں تو کسی اور دنیا کا رہنے والا تھا اور یہاں کی دنیا میری نہ تھی۔ میں نے حساب لگایا کہ ابھی پاکستان میں دن کے

گیارہ بجے ہوں گے۔ میں نے فون ملایا تو سمیہ نے فون اٹھایا۔ میری آواز سنتے ہی اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کب پہنچے، کیسے ہیں، سفر کیسا گزرا؟ جواب دیتے ہوئے میں روہانسا ہو گیا۔ میری آواز پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔ میں اپنی حالت اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اپنی آواز پر قابو پانا بھی مشکل تھا۔ وہ بھانپ گئی کہ میں کس مشکل سے دوچار ہوں۔ دس منٹ کا کالنگ کارڈ تھا۔ سمیہ اور قدیل سے بات ہوئی۔ قدیل پوچھتی کہ بابا آپ کب آئیں گے؟ میں اس کے سوال پر پھر رو پڑا۔ سمیہ مجھے تسلی دینے لگی۔

ان سے بات کر کے میرا دل ہلکا ہو گیا۔ دس منٹ ایک لمحے میں گزر گئے۔ میں اٹھا اور گرم پانی سے غسل کیا۔ شاور سے پانی ایک تیز رفتاری سے برس رہا تھا۔ ساری کسمندی دور ہو گئی۔ جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ لیونگ روم میں جھانک کر دیکھا تو مفتی خرائے لے رہا تھا۔ میں نے تجدد پڑھی اور اپنے بستر پر آ گیا۔ کچھ ہی دیر میں دوبارہ سو گیا۔

دیر تک سوتا رہا تھا۔ بیدار ہوا تو دیکھا کہ خان کارپٹ پر پڑا بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کے بستر پر میں سویا ہوا تھا۔ وہ رات کسی وقت اپنی ڈیوٹی کر کے پہنچا ہوگا اور اپنے بستر پر مجھے سوتا دیکھ کر کارپٹ پر ہی سو گیا تھا۔

نامم دیکھا تو دن کے نونج رہے تھے۔ باہر لیونگ روم میں آیا تو مفتی ٹی وی کے سامنے بیٹھا کوئی شو دیکھ رہا تھا۔ ان دنوں پاکستانی ٹی وی ابھی امریکا یا کینیڈا میں نہیں آیا تھا۔ پاکستانی ٹی وی چینل ابھی شروع نہیں ہوئے تھے اور وہاں کی کوئی خبر ہمیں نہ ملتی تھی۔ انٹرنیٹ ابھی شروع ہو رہا تھا۔ فون کے ساتھ لنک ہو کر انٹرنیٹ چلتا تھا اور ہمارے پاس کمپیوٹر تو تھا مگر انٹرنیٹ کا نظام نہ تھا۔ ہفتے اور اتوار کو آدھے گھنٹے کے لیے ایک انڈین شو ہوتا تھا۔ جس میں پاکستان کی بھی بات کر لیتے تھے۔ ہم پورا ہفتہ اسی شو کا انتظار کرتے تھے۔ فون بھی بہت مہنگا تھا۔ دس ڈالر میں آٹھ منٹ بات ہوتی تھی۔ نہ کوئی فیس بک اور نہ اسکا پ اور نہ کوئی واہبر قسم کی کوئی چیز تھی اس لیے دور ہونے کا احساس بہت ہی زیادہ تھا۔ ہم پاکستان خط لکھا کرتے تھے اور روزانہ ہمیں خطوں کا انتظار ہوتا تھا۔ آجکل تو دوری تو دوری ہی نہ رہی۔ کسی بھی وقت چاہا اور اپنے موبائل فون سے بات کر لی۔ کہاں ایک ڈالر میں ایک منٹ بات ہوتی تھی اور اب ایک سینٹ میں ایک منٹ بات ہوتی ہے۔ ٹی وی کے سارے چینل براہ راست آتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ہر اخبار اور اب ڈیش چوبیس گھنٹے ہوتے رہتے ہیں۔ ان دنوں سمندر پار

پاکستانی اپنے ملک سے مکمل طور پر کٹ کر رہے تھے۔ جو لوگ ستر اور اسی یا نوے کی دہائی میں آئے تھے، وہ بتاتے ہیں کہ ہم تو صرف عید پر پاکستان فون کرتے تھے۔ آپریٹر یہاں سے لندن کی لائن لیتا، وہاں سے ترکی اور پھر کراچی کے آپریٹر سے بات ہوتی اور وہ پھر پاکستان کے کسی شہر میں وہاں کے آپریٹر سے رابطہ کرتا۔ یہاں اور پاکستان میں لوگ پورا دن ایک دوسرے کی آواز سننے کے لیے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے۔ اسی لیے جوان دنوں یہاں پیدا ہوئے وہ پاکستان سے مکمل طور پر کٹ گئے تھے۔ نہ پاکستان کے ماحول کا پتا اور نہ مذہب کی خبر تھی۔ حلال گوشت لینے کے لیے یہاں میلوں دور جانا پڑتا تھا۔ ان دنوں کے بچے اپنے ماں باپ کے علاوہ پاکستان میں اپنے کسی رشتہ دار کو نہیں پہچانتے تھے اور اگر کبھی وہ پاکستان جاتے تو ان کے چہروں پر اجنبیت ہوتی تھی۔

اب حالات بدل گئے ہیں۔ مواصلاتی رابطے آسان تر ہو گئے ہیں اور بچے اپنے رشتہ داروں کو جانتے ہیں۔ ہر روز فیس بک پر رابطہ ہوتا ہے۔ مذہب کے بارے میں سب چیز انٹرنیٹ پر ہے۔ یہاں بیٹھ کر پاکستان کا ٹی وی دیکھتے ہیں۔ مسجدیں ہر جگہ بن چکی ہیں۔ حلال ریسٹورنٹ ہر کونے پر موجود ہے۔ اب کسی کا کوئی یہ بہانا بھی نہیں ہے کہ مذہب حلال نوڈیا اپنی تہذیب سکھانے کا ذریعہ نہیں ہے۔ بلکہ مذہبی آزادی یہاں کے ملکوں میں پاکستان سے بھی زیادہ ہے۔ رمضان میں مسجدیں بھری ہوتی ہیں۔ چاند رات منانگی جانی ہیں۔ عید میلے ہوتے ہیں۔ عبادتیں مکمل آزادی سے ہوتی ہیں۔ اب تو اللہ کا بہت شکر ہے۔ میں اس کو پاکستان کا مکمل بدل نہیں کہہ رہا۔ اس کا تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں صرف اب اور پہلے سے موازنہ کر رہا ہوں۔

میں اٹھ کر باہر آیا تو مفتی نے رات گزرنے اور نیند کا پوچھا۔ میرے بتانے پر بولا کہ کچھ دن میں سب معمول بن جائے گا۔

مفتی جب گھر میں ہوتا تو اپنے میٹرز پر ہی پایا جاتا تھا۔ یا سو یا ہوا ہے یا ٹیکے سے ٹیک لگائے ٹی وی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ پر ہتا اپنے میٹرز پر۔ اس سے نیچے اترنے کے لیے اس کو ایک جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ میٹرز پر رہنے کے علاوہ میں نے اسے کچھ کرتے نہیں دیکھا۔ کچن میں بوجہ مجبوری جاتا تھا۔ ابھی بھی ٹیک لگائے ٹی وی کے سامنے انڈین شو دیکھ رہا تھا۔ آج سینچر کا دن تھا اور آج مفتی کی چھٹی تھی۔ مجھے کہا کہ تیار ہو جاؤ اور آج سب دے چلتے ہیں۔

سب دے یہاں زبردستی زمین ریلوے کے نظام کو کہتے ہیں۔ لندن میں ٹیوب اور نیو یارک میں میٹرو اور پیرس میں بھی میٹرو کہلاتی ہے۔ نورٹھ کی سب دے مجھے ان تمام سے چھوٹی لگی۔ لندن اور نیو یارک میں تو اس کا بہت بڑا جال زمین کے نیچے بچھا ہوا ہے۔ میں بھی مفتی کے سامنے سعادت مندی دکھا رہا تھا کیونکہ وہ میری بہت زیادہ مدد کر رہا تھا۔

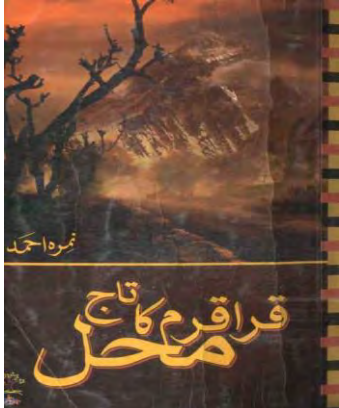
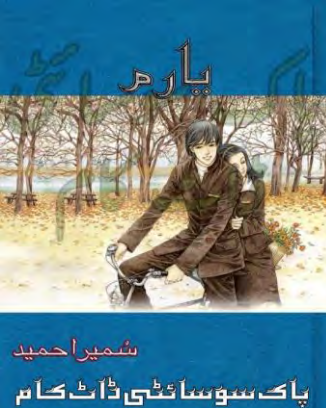
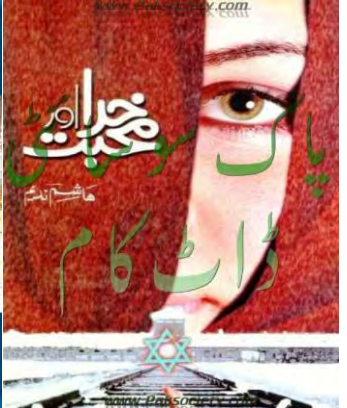
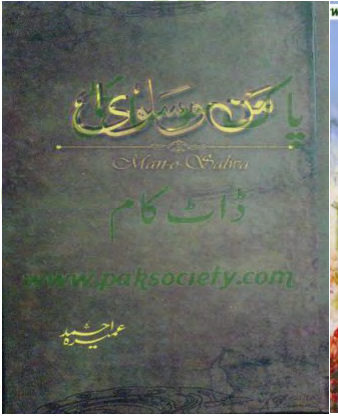
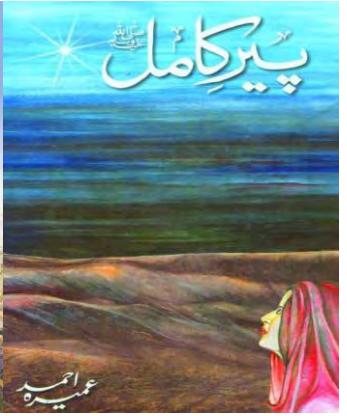
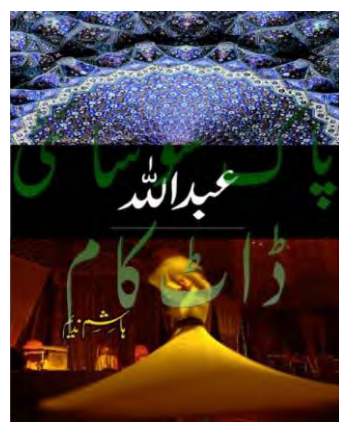
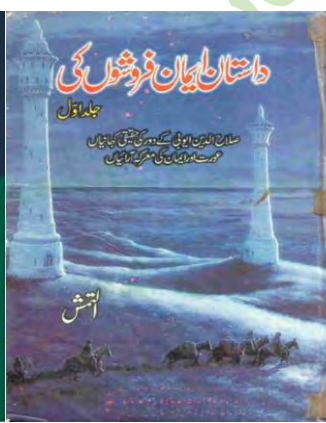
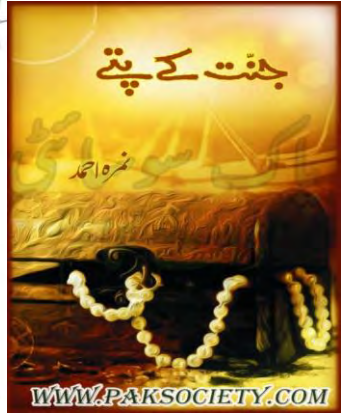
میں نے گرم پانیوں کا شاندار شاؤر لیا۔ آپ پورا دن بھی شاؤر کے نیچے کھڑے رہیں تو بھی گرم پانی نہ کم ہوگا اور نہ ہی اس کی رفتار پر کوئی اثر پڑے گا۔ پانی ایسی رفتار سے نکلتا ہے جیسے کوئی ٹیوب ویل کھول دیا گیا ہو۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ ہر بلڈنگ کے نیچے تہ خانے میں بوائائلر لگے ہیں اور نیچے لائندری کرنے کے لیے بڑی بڑی واشنگ مشین رکھی ہیں اور ڈرائر بھی وہیں رکھے ہیں۔ آپ ایک یا دو ڈالر کا سکہ ڈالیں اور لائندری کر کے کپڑوں کو سکھا کر اوپر لے آئیں۔ مجھے جو چیز سب سے زیادہ متاثر کر رہی تھی وہ یہاں اپارٹمنٹ کو اتنی کڑکتی سردی میں گرم رکھنے کا نظام تھا۔ باہر نشی چالیس کا درجہ حرارت ہے۔ دو منٹ باہر کھڑے رہیں تو آپ کی رگوں میں خون جم سکتا ہے اور آپ اسپتال پہنچ جاتے ہیں مگر اپنے اپارٹمنٹ میں صرف ایک شرٹ میں بیٹھے باہر برف باری دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہ نظام نہ ہو تو یہاں زندگی کا چلنا بھی بہت مشکل ہو جائے۔

میں نے کپڑے تبدیل کیے۔ اپنی طرف سے سردی سے بچاؤ کے لیے لیدر کی جیکٹ پہنی۔ سر پر گرم ٹوپی رکھی۔ مفتی کچن میں کھڑا ناشتا بنا رہا تھا۔ میں بھی پہلی بار کچن میں داخل ہوا۔ کچن کا وہی سائز تھا جو بیڈ روم کا تھا۔ خاصا کشادہ تھا۔ داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ کو ایک بڑا فریج پڑا تھا۔ وہیں سے کچن کے کاؤنٹر شروع ہو جاتے، ایک دیوار کے ساتھ ساتھ جاتے اور پھر گھوم کر سامنے والی دیوار کو بھی گھیرے میں لے لیتے۔ سامنے دیوار کے بائیں کونے میں اوون تھا جس پر چار چولہے بجلی سے چلتے تھے۔ اوون کے دائیں ہاتھ پر سنک تھا جہاں گرم اور سرد پانی آتا اور ہم برتن دھوتے تھے۔ کاؤنٹر کے نیچے الماریاں تھیں۔ پہلے مجھے مفتی نے چولہا آن اور آف کرنا سکھایا۔ پھر سینک پر لگی پانی کی ٹوٹی کو استعمال کرنا سکھایا۔ ایک ہی ٹوٹی سے چھج کر دائیں جانب گھماؤ تو ٹھنڈا اور بائیں جانب گھماؤ تو گرم کھولتا ہوا پانی نکلتا تھا۔ آپ یہ پڑھ کر میرا مذاق نہ اڑائیں کیونکہ میں یہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ پھر بتایا کہ کچرا کیسے پلاسٹک کے تھیلوں میں رکھ کر باہر کہاں پھینکتے ہیں۔ بلڈنگ کے پیچھے ایک دروازہ کھول کر

جاتے ہیں اور لوہے کے دو دس فٹ لمبے کنٹینر رکھے ہیں، جن میں یہ کچرا جاتا ہے۔ ایک ہفتے میں دو دن ایک ٹرک آتا ہے جو ان کو خالی کر کے واپس کرین سے اپنی جگہ رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے آپ کو کسی پارک، سڑک یا فٹ پاتھ پر ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی نہیں ملے گا۔ تھوکنے تک جرم ہے۔ صفائی کا یہ عالم ہے کہ جن جوتوں میں، میں ٹورنٹو پہنچا تھا وہ ایک سال تک پالش نہیں ہوئے تھے۔ نہ تو مٹی اور نہ ہی گرد۔ فضا شیشے کی طرح چمکتی ہوئی جس میں نہ گاڑیوں کا دھواں اور نہ کسی ہارن کی آواز۔ ہارن اگر کسی نے بجا دیا تو لوگ اچھل کر دیکھنے لگتے ہیں کہ کیا ہو گیا ہے؟ جتنی تیز رفتار بارش ہو جائے، مجال ہے کہ تمہیں پانی کھڑا دکھائی دے۔ نہ تو کچھ نظر آتا ہے اور نہ کوئی چھینٹے اڑتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی غیر متوجع طور پر کوئی بڑا طوفان آجائے تو سنبھالنے میں انہیں بھی دقت پیش آتی ہے۔ مفتی نے ڈبل روٹی کے سلائس گرم کیے اور آملیٹ بنایا۔ چائے ٹی بیگ والی بنائی۔ ایک کپ میں ٹی بیگ ڈالا اور پھر اس پر کھولتا پانی ڈال دیا۔ فریج سے دودھ نکال کر اس کپ میں ڈالا اور چینی ڈالنے کے بعد چائے تیار۔ یہ ناشتا میں نے آج تک نہیں کیا تھا۔ میں تو پرائیوٹ، سالن اور تازہ کڑکتی چائے پینے کا عادی تھا اور یہ ناشتا میرے حلق سے کیسے اترتا۔ پر یہاں مجھے یہ سب کرنا تھا۔ خیر یہ روٹی کو بھی ہضم کرنا تھا جو رات میں کھائی تھی۔ مگر میں یہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دو ماہ بعد اسی کچن میں آنے سے تازہ روٹی بننے لگی۔ تورے، پلاؤ، بھنا قیمہ تک بننے لگا۔ پس فرق یہ ہوا کہ چمکتا دمکتا کچن اب کوڑا کھاؤ نظر آنے لگا تھا۔ مصالحوں کی خوشبو پورے اپارٹمنٹ میں پھیلی رہتی تھی۔ مفتی جو بہت صفائی پسند تھا، اس نے بھی حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا مگر ناراض دکھائی دینے لگا تھا۔

ہم ناشتا کر کے اپنے تہہ دور ہوتے گرم اپارٹمنٹ سے باہر آئے تو برفانی جھکڑوں نے میرا استقبال کیا۔ اندر بیٹھے ہوئے محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ باہر قطب شمالی والا ماحول ہے۔ میری لیدر کی جیکٹ، ادنی ٹوپی اور منظر بے فائدہ نظر آنے لگے۔ اب اس کے علاوہ چارہ بھی نہ تھا۔ ہماری اور سامنے والی جڑواں عمارتوں کے بیچ چیرے کے بیڑ جھکڑوں کے زور سے آسمانوں کی جانب اڑنے کو پر تو لتے تھے۔ دونوں عمارتوں کے اختتام پر ایک بڑا پارکنگ لائٹ تھا جہاں کینوں کی گاڑیاں پارک تھیں۔ بیسمنٹ (Basement) بھی دو منزلہ تھا۔ چلی منزل میں بھی پارکنگ تھی جس کے اضافی پیے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



لیتے تھے اور اسی لیے وہ اپنی گاڑیوں پر برف ہٹانے کے بے ہودہ اور سخت کام سے بچے رہتے تھے۔

ہم اپنی بلڈنگ سے باہر نکلے اور دائیں جانب مڑ گئے اور پھر ایک اور موڑ مڑا تو ایک بڑی اور مصروف روڈ پر آ کھڑے ہوئے۔ آنے جانے کے لیے دو لائن تھیں۔ اس روڈ کو مارٹن گروو (Grove Martin) کہتے ہیں اور اس پر ٹورنٹو ٹرانسپورٹ کی آرام وہ بسیں بھی چلتی ہیں۔ ہم کو سڑک کر اس کے دوسری جانب جانا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب شیشے کے کیمین بنے تھے جس میں بسوں پر سفر کرنے والے سردی سے اپنے آپ کو بچا کر بس کا انتظار کرتے تھے۔ مفتی نے کھمبے پر ایک بٹن دیا تو سڑک کے بیچ لگی سرخ لائٹ جل اٹھی۔ آئی جاتی ٹریفک ٹھم گئی اور ہم آرام سے جیکٹوں میں ہاتھ ڈالے سڑک کر اس کر کے دوسری جانب آ کھڑے ہوئے۔ پیدل چلنے والوں کی عزت نفس کا اتنا اہتمام مجھے حیران کر گیا۔ ہم دوسری جانب پہنچے تو ٹریفک پھر رواں ہو گئی۔ مفتی مجھے حیرت میں ڈوبا دیکھ کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ”ابھی آگے دیکھتے جاؤ اور حیرت میں ڈوبتے جاؤ۔“

ہم نے سب دے جانے سے پہلے کچھ گروسی کرنی تھی۔ دس منٹ کی پیدل مسافت پر ایک سپر اسٹور تھا۔ وہاں تک ہمیں پیدل جانا تھا۔ میں ٹورنٹو کو اب پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ پاکستان سے کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں۔ اتنا خوبصورت اور چمکتا و مکتا شہر دیکھ کر میں حیرت کے جھلکے کھا رہا تھا۔ مفتی بتا رہا تھا کہ جب تم سپر اسٹور کے اندر جاؤ گے تو تم کو اللہ کی رحمت اور برکت نظر آئے گی۔

ہم پیدل چلتے جا رہے تھے۔ دونوں جانب چھوٹے چھوٹے خوبصورت سرخ رنگ کے مکانات ایک ترتیب سے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ مفتی بتا رہا تھا کہ ان چھوٹے گھروں کو ٹاؤن ہاؤسز کہا جاتا ہے۔ پھر بڑے بڑے پارک نظر آئے جن کا کوئی کونا بھی گھاس سے خالی نہ تھا۔ موسم کی پہلی برف ابھی نہیں پڑی تھی۔ میں با آسانی ان پارکوں میں جھولے اور بچوں کے کھیلنے کا انتظام دیکھ رہا تھا۔ پھر ہم بڑی بڑی اپارٹمنٹ بلڈنگز کے سامنے پہنچ گئے۔ ہر عمارت بیس بیس منزلہ ہوگی۔ دس بارہ عمارتوں کے بیچ ایک مارکیٹ تھی۔ ایک لائن میں چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ جس میں سپر اسٹور، فارمیسی، بینک، شراب خانے اور بہت کچھ تھا۔ گروسی کا ایک اسٹور تھا جس کا نام گلائی تھا۔ اس کے ساتھ ایک اسٹور تھا جس پر جاز لکھا تھا۔ جاز ایک سکھ کا نام تھا۔ بعد میں یہی جاز

میرا دوست بنا اور وہی چیزیں ہم اس سے خریدتے تھے۔ ایسی مارکیٹ کو یہاں اسٹریٹ مال کہا جاتا ہے۔ ہمیں گلائی سپر مال میں جانا تھا۔ مفتی کہہ رہا تھا کہ تم اندر دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے کہ کتنا بڑا اسٹور ہے اور کتنی اشیاء بھر پڑا ہے۔

میں اندر داخل ہوا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ خاص کر کھانے پینے کی چیزوں سے جس کا تعلق ہو سکتا ہے وہ وہاں بہت صفائی اور قرینے سے سجی سجائی رکھیں تھیں۔ سب سے پہلے سبزیوں کا حصہ تھا جہاں ہر قسم کی سبزی موکی ہو یا غیر موکی انتہائی صاف ستھری، تروتازہ، نہایت مناسب نرخوں پر دستیاب تھیں۔ ان کے نرخ ساتھ لکھے ہوئے تھے۔ آلو پیاز، ٹماٹر، مٹر، شکر قندی، گوبھی، مرچیں، اورک، لہسن۔ یہ سب کچھ ایک قطار میں پڑی تھیں۔ اب تو پاکستان میں بھی یہ نظام آ گیا ہے کہ آپ ٹرائی بھر کر کاؤنٹر پر جاتے ہیں اور ادائیگی کر کے باہر نکل جاتے ہیں۔ ہر اسٹور کا اپنا اشتہاری اخبار ہر ہفتے کو آتا ہے۔ یہ ”فلیر“ ہر ہفتے آپ کے دروازے پر پڑے ہوتے ہیں۔ خاتون خاندان کا بخور جائزہ لیتی ہیں کہ کس چیز کی سیل کہاں لگی ہے۔ جیسے آج گلائی پر۔ انڈوں کی سیل تھی۔ عمومی نرخ دو ڈالر کے درجن تھے اور آج سیل پر ایک ڈالر اور آنتیس سینٹ کے درجن تک رہے تھے۔ مفتی نے ڈیری کے سیکشن میں چار ڈبے انڈوں کے اٹھالیے۔ مختلف قسم کا دہی۔ دودھ کی ہر قسم، پنیر، کریم، مکھن کئی ایک اقسام کا، ہر قسم کے پھل کا تازہ جوس، مختلف اقسام کی ڈبل روٹیاں، غرض ہر چیز جس کا آپ تصور کر سکتے ہیں موجود تھیں۔ پھر گوشت کا شعبہ تھا جہاں خنزیر سے لے کر بکری اور مرغی تک کا گوشت بک رہا تھا۔ یہاں جانور کے ہر حصے کی اپنی قیمت ہے۔ یہ نہیں کہ دو گلو بکرا دے دو۔ یہاں گوشت حلال موجود نہ تھا اور میں نے صرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ میں نے بکرے کے پائے دیکھے تو مفتی سے بولا۔ ”یہ گورے بھی بکرے کے پائے کھاتے ہیں؟“

مفتی بولا ”یہ بکرے کے نہیں خنزیر کے پائے ہیں۔“ اگر پھلوں والے حصے میں آؤ تو اتنے زیادہ اقسام کے پھل تھے کہ میں بھی کئی ایک کے نام تک نہ جانتا تھا۔ مجھے پاکستان میں بتایا گیا تھا کہ وہاں پھل وغیرہ بہت کم اور مہنگے ملتے ہیں۔ مگر یہاں تو ایک بہتات میں اور کم نرخوں پر دستیاب تھے۔ کیلے، انگور، مالٹے، کیوٹو، انار، سیب، ناشائیاں اور ان سب کی مختلف اقسام ڈھیروں کے حساب سے سجی تھیں۔ کوئی نہ

گانی دے مویاساں

فرانس کا مشہور افسانہ نگار، نارمنڈی میں پیدا ہوا۔
روئن کالج سے گریجویشن کر کے پیرس میں سرکاری ملازمت
اختیار کی۔ دس سال تک بحری فوج کے محکمے میں معمولی
کلرک کی حیثیت سے کام کیا لیکن اصل شوق افسانہ نگاری تھا
چنانچہ مشہور فرانسیسی ناول نویس گستاؤ فلا بیر کے ساتھ مسلسل
سات برس کام کیا۔ 1880ء میں اس کا ایک افسانہ **The**
Ball of Fat اس سال کے بہترین افسانوں کے
مجموعے میں شامل کیا گیا۔ اس شاہکار افسانے کی اشاعت
کے ساتھ ہی وہ مشہور ہو گیا۔ اگلے برس اس کے افسانوں کا
پہلا مجموعہ **House of Mrnc Teallier** شائع
ہوا تو نقادوں نے اسے فرانس کا سب سے بڑا افسانہ نگار قرار
دیا۔ اس کا پہلا ناول **"A Woman's Life"**
1883ء میں چھپا۔ آخر عمر میں ذہنی مرض میں مبتلا ہو گیا
اور جنون کی حالت میں اسپتال میں وفات پائی۔
ہانیہ اسماعیل۔ کراچی

تھا۔ میں سوچتا کہ اگر ہمارے بچے نہ رکھیں تو ہم ایک دو لگا
دیتے ہیں یا کم از کم جھاڑ تو ضرور پڑتی ہے مگر یہاں تو باپ کو
کوئی فکر ہی نہ تھی۔ سیاہ فام کی گوری بیوی سے گندی رنگ کے
بچے پیدا ہوئے تھے۔ نقش تو سیاہ فام کے تھے مگر رنگت نکھری
ہوتی تھی۔ ایسی نسل عام دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ میں ہر چیز کو
حیرت سے دیکھتا تھا۔ ایک نئی تہذیب میرے سامنے کھل کر
ظاہر ہو رہی تھی۔ ان کی انگریزی کا لہجہ میرے سر کے اوپر سے
گزر جاتا تھا اور مجھے فکر یہی تھی کہ میں جاب کیسے ڈھونڈوں گا
اور کون مجھے رکھے گا۔ یہی فکر مجھے کھائے جا رہی تھی۔ میں ایک
ایک کا جائزہ لے رہا تھا کہ مفتی فارغ ہو کر آ گیا۔

پھر مجھے وہ بتا رہا تھا کہ ٹرانسپورٹ کا سسٹم کیسے کام کرتا
ہے۔ ٹورنٹو ٹرانسپورٹ (TTC) کا ایک وسیع و عریض نظام
ہے۔ اس کے نیچے بسوں اور سب-وے کا ایک جال بنا ہوا
ہے۔ آپ ایک ٹکٹ لیں اور ایک طرف کسی بھی جگہ آپ پہنچ سکتے
ہیں۔ اسی ایک ٹکٹ میں آپ بس سے سب-وے اور پھر
دوسری بس اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو ایک اور بس کا
سفر آپ کر سکتے ہیں، جب تک آپ منزل کو نہیں پہنچتے۔ ایک
ٹکٹ ان دنوں دو ڈالر میں ملتا تھا۔ ایک ماہ کا پاس اسی ڈالر کا
تھا جس پر آپ پورے مہینے میں لامحدود سفر کر سکتے ہیں۔ بینک
کے ساتھ ایک مشہور فارمیسی کی چین "شاپر ڈرگ مارٹ" کے
نام سے تھی۔ وہاں سے میں نے چار ڈالر کے دو ٹکٹ خریدے

کوئی ملازم ان کو اٹھا کر کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ میں
دلچسپی سے دیکھتا تھا اور مفتی میری دلچسپی دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔
ہم کاوش پر آئے تو سیل گرل نے چار درجن انڈے
دیکھ کر کہا کہ ایک آدی صرف دو درجن لے سکتا ہے۔ مفتی نے
پھر دو درجن میرے نام پر لیے۔ اب تو انٹرنیٹ پر ایسے اسٹور
دیکھے جاسکتے ہیں مگر ان دنوں یہ ایک نئی چیز تھی جو میں پہلی بار
دیکھ رہا تھا۔ اس اسٹور کا سائز اتنا بڑا تھا کہ درجنوں ہمارے
بڑے اسٹور اس میں سما سکتے تھے۔ وہ تو میں نے بعد میں دیکھا
کہ اس سے بھی بڑے بڑے اسٹور موجود ہیں کہ درجنوں
گلابی بھی مل جائیں پھر بھی وہ اسٹور اس سے بھی بڑے ہیں۔
ہر ایک کے ہاتھ میں اسٹور کا فلائر ہوتا ہے اور وہ اپنی
پسند کی چیزیں خرید رہا ہوتا ہے۔ اسٹور کا مستعد عملہ ہر لحاظ مدد کے
لیے تیار ہوتا ہے۔ کسٹمر سروس تو کمال کی ہوتی ہے۔ مجال ہے
کہ ان کے چہروں پر کوئی شکن بھی آجائے۔ یہاں کی خواتین
گوری ہوں یا کالی، سب ہی زرخوں اور سیل پر بہت زیادہ بحث
کرتی ہیں۔ خواتین کے رنگوں اور کپڑوں میں فرق ہو سکتا ہے
مگر شاپنگ کے وقت دنیا کی تمام عورتیں آپس میں بہنیں ہی
ہوتی ہیں۔ میں اور مفتی ٹرائی کھنتے پورے اسٹور میں گھوم رہے
تھے۔ ہماری شاپنگ زیادہ نہ تھی۔

سنیچر کا اخبار یہاں بہت اہمیت رکھتا تھا کیونکہ جاب
کے سبب اشتہار سنیچر کے اخبار میں آتے ہیں۔ ٹورنٹو اشار
یہاں کا سب سے بڑا اخبار ہے اور پھر سن اخبار ہے۔ سن تو گھر
لانے کے قابل بھی نہیں ہوتا اور ہمیشہ ایکینڈل کا سہارا لیتا
ہے۔ ہمارے اپارٹمنٹ کے باہر شیشے کے بکسوں میں یہ اخبار
پچاس سینٹ کا ملتا ہے مگر اسٹور میں مفت مل رہا تھا۔ میں نے
ایک اخبار اٹھایا تو وہ ایک کلوڈزنی تھا۔ پہلے تو یہ سمجھا کہ دو تین
اٹھالے ہیں۔ مفتی ہنس کر بولا کہ نہیں ایک ہی ہے، اٹھالو۔

رائل بینک آف کینیڈا یہاں کا ایک بڑا بینک
ہے۔ گلابی سے چند اسٹور چھوڑ کر اسی مارکیٹ میں ہے۔ مفتی
پھر مجھے بینک لے گیا۔ صاف ستھرا ماحول اور مستعد عملہ۔ لوگ
ایک لائن میں اندر کھڑے تھے اور سب کو باری باری نمٹایا جا رہا
تھا۔ مفتی کا کوئی کام تھا اور وہ لائن میں لگ گیا۔ میں ایک آرام
دہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک سیاہ فام بھی آ بیٹھا۔ اس کی گوری
بیوی لائن میں کھڑی تھی۔ ان کا ایک چھوٹا بچہ صاف ستھرے
کارپٹ پر کھیلتا تھا اور کرسٹل کے جلتے قمقمے اس کو اپنی
جانب متوجہ کر رہے تھے اور وہ ان کی جانب لپک رہا تھا۔ باپ
اسے زبانی روکتا تھا اور وہ اس درخت کا ستیاناس کر رہا

یونکہ اس کے بعد ہمیں سب وے جانا تھا۔

وہاں سے گھر آ کر انڈے رکھے اور واپس اسٹاپ پر بس کا انتظار کرنے لگے۔ سردی میرے لیے بہت تھی مگر منتی کہہ رہا تھا کہ ابھی تو کچھ نہیں دسمبر میں دیکھنا۔ برف باری دسمبر میں عام طور پر شروع ہوتی ہے اور مارچ یا اپریل تک جاری رہتی ہے۔ ہفتہ اور اتوار کو چھٹی کی وجہ سے بسیں کم چلتی ہیں۔ عام دنوں میں ہر چار یا پانچ منٹ کے وقفے سے بس آ جاتی ہے مگر ان دنوں میں دس سے پندرہ منٹ بعد بس آتی ہے۔ ایک اور بڑی سہولت یہ بھی تھی کہ ہر اسٹاپ کا ایک نمبر ہوتا ہے۔ آپ گھر میں بیٹھ کر ایک ٹول فری نمبر ملاتے ہیں اور پھر اپنا اسٹاپ نمبر دیتے ہیں۔ وہاں سے پوچھا جاتا ہے کہ کس سمت میں آپ کو جانا ہے۔ جیسے ہمیں کپلنگ (Kipling) سب وے جانا تھا تو اس کے لیے کہا گیا کہ ایک دباؤ لیں۔ ایک نمبر دیا تو پھر بس کا شیڈول بتا دیا گیا۔ ایک پیغام میں بتایا گیا کہ اگلی بس مثال کے طور پر گیارہ بج کر آٹھ منٹ پر اسٹاپ پر پہنچے گی اور اس کے بعد جو پہنچے گی تو اس کا نام بھی بتا دیا گیا۔ پھر سردی اور برف بڑھ رہی ہے تو آپ ایک منٹ پہلے اسٹاپ پر پہنچ جائیں۔ حیرت انگیز طور پر ہر بس اپنے مقررہ وقت پر پہنچتی ہے کہ آپ اس سے اپنی کھڑی کا نام درست کر سکتے ہیں۔ مفتی نے یہ طریقہ مجھے سمجھایا اور ہم اب اسٹاپ پر کچھ منٹ پہلے ہی آکھڑے ہوئے تھے۔

سب وے مشرق سے مغرب چلتی ہے اور اس کے درمیان والے اسٹیشن سے شمال سے جنوب بھی چلتی ہے۔ مغربی سائڈ کا آخری اسٹیشن کپلنگ پڑتا تھا اور مشرقی سائڈ کا آخری اسٹیشن کنیڈی ہے۔ کنیڈی سے پھر زمین کے اوپر ایک ٹرین چلتی ہے جو آپ کو ٹورنٹو کے مشرقی شہروں سکاربرو اور مارکھم لے جاتی ہے۔ سکاربرو میں دیسی بہت رتے ہیں۔ مارکھم ان دنوں آخری حصہ ہوتا تھا۔ اب تو مارکھم سے بھی کئی میل آگے شہر پھیل گیا ہے۔ یہ سب مغربی حصہ ہے۔ مشرقی حصے میں، سی ساگا، کا مشہور شہر آباد ہے جو قدرے نیا ہے۔ ان دنوں بہت کم پاکستانی تھے اور وہ شہر ابھی پھیل رہا تھا۔ اب جب میں جاتا ہوں تو سی ساگا اپنی حدود سے میلوں دور تک مغربی سمت میں پھیل چکا ہے۔ اتنے زیادہ تارکین وطن آچکے ہیں کہ اب سی ساگا میں پاکستانی، انڈین اور سکھ ہر جانب نظر آتے ہیں۔ میں ان دنوں ٹورنٹو پہنچا تھا جب تارکین وطن نے آنا شروع کیا تھا اور ہمیں خال خال پاکستانی نظر آتے تھے۔ ہمارے علاقے میں قریبی مسجد بھی دس

کلو میٹر دور تھی۔ کوئی ایک حلال ریسٹورنٹ ہو گا۔ دیسی گروسری کی دکان ہوگی۔ اب تو ہر چوک پر کئی دکانیں، ریسٹورنٹ اور مسجدیں آباد ہو چکی ہیں۔ شلوار قمیص میں خواتین و حضرات گھومتے نظر آتے ہیں۔ پہلے پاکستانیوں کے مرکز لندن اور نیو یارک تھے اور اب ٹورنٹو سب سے آگے نکل چکا ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ یاریاں انڈین اور سکھ نظر آتے ہیں تو حیرت کی بات نہیں۔ حالانکہ دونوں انڈین ہیں مگر سکھ اپنا علیحدہ تشخص رکھتے ہیں۔ ان سے پوچھیں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں تو سینہ پھلا کر کہتے ہیں ”پنجاب کے“۔

پہلے تو میں پریشان ہو جاتا تھا کہ پنجاب تو پاکستان میں ہے اور یہ پاکستان میں کہاں رہتے ہیں؟ برسوں پہلے ایک واقعہ پڑھا تھا۔ آصف نامی شخص ایک کنونشن میں شرکت کے لیے دہلی گیا تھا۔ اسے اشوکا ہوٹل میں ٹھہرنا تھا۔ ایئر پورٹ سے ٹیکسی لی۔ سکھ ڈرائیور سے کہا کہ مجھے اشوکا اتار دینا۔ ٹیکسی چلی تو ڈرائیور نے زور زور سے سانس کھینچی شرمع کر دی۔ آصف کو عجیب سا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”سردار جی کوئی طبیعت شہیت تو خراب نہیں ہے۔“ سردار جی نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ ”بھایا کہاں سے آرہے ہو۔“ آصف نے کہا۔ ”لاہور سے۔“ سردار جی نے ٹیکسی سائڈ میں کھڑی کی اور آصف کو زور زور سے سوکھنے لگا۔ آصف نے گھبرا کر کہا۔ ”سردار خیر تو ہے؟“ وہ بولا۔ ”تجھی تو میں کہوں اپنی مٹی کی خوشبو کہاں سے آرہی ہے۔“ پھر اس نے آہیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ہوں۔ اتنے دنوں بعد اپنی مٹی کی خوشبو سونھی ہے۔ بھایا کچھ ساگ سبزی ٹفن میں پڑی ہے تو دے دو۔ واگوروری سون۔ تازنگی دعا دوں گا۔“ آصف کو یاد آ گیا کہ چلتے وقت بیوی نے زبردستی دو پراٹھے اور کباب دے دیئے تھے کہ اگر فلاٹ میں ناشتا ملنے میں دیر ہو تو کھالیا۔ اس نے وہ ٹفن بڑھا دیا۔ سردار جی نے کباب تو ایک طرف کر دیئے اور کئی دن کے فاقہ زدہ شخص کی طرح خالی پراٹھا کھانے لگے۔ پراٹھا ہضم کر کے بولی۔ ”اب ایک ہفتہ بھی کچھ نہ ملے تو غم نہیں۔ اتنے سال بعد اپنے ہاں کا گندم کھایا ہے۔ سواد آ گیا۔ اب جب تک آپ دلی میں رہو، میری گدی حاضر ہے۔“ سکھ پنجاب سے ہجرت کے بعد بھی پنجاب کو بھولے نہیں ہیں۔ اسی لیے ہم خود کو ہندوستانی کبھی نہیں کہتے ہیں۔ سکھ اور ہندو آپس میں زیادہ گل مل کر نہیں رہتے بلکہ پاکستانیوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ بس اپنے مقررہ وقت پر آکھڑی ہوئی۔ اب تو ایسی بسیں لاہور میں بھی چل رہی ہیں۔ ان دنوں میرے لیے نئی

کپلنگ آخری اسٹیشن تھا اور ٹرین پہلے سے موجود تھی۔ ہم اس میں سوار ہو کر نیلی پہلی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ خود کار دروازے تھے جو کچھ دیر میں بند ہوئے پھر یہ ٹرین فرارٹے بھرتی روانہ ہو گئی۔ کسی بھی چیز کا پہلا تجربہ بہت خوشگوار اور حیرت ناک ہوتا ہے اور آج میں بھی اسی سے گزر رہا تھا۔ میری حیرتیں مفتی کو بہت خوش کر رہی تھیں اور وہ مجھ سے کہتا کہ میں بھی تمہیں دیکھ کر خود بھی پہلی بار لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

راستے میں اسٹیشن آتے اور ٹرین ایک منٹ کے لیے رکتی اور پھر روانہ ہو جاتی۔ راستے میں کیل (Kele) اسٹیشن آیا تو مجھے علی سفیان آفاقی کا ایک سفر نامہ یاد آ گیا کہ کیل کے سب وے کے باہر ہائی پارک ہے اور اس کی بڑی تعریف کی تھی۔ مجھے یہ سب دیکھنے کی کوئی جلدی نہ تھی کیونکہ میں مکمل طور پر بسنے کے لیے یہاں آچکا تھا اور یہ مقامات اپنے وقت اور اچھے موسموں میں دیکھ لیتا۔ پہلے مجھے اپنا ذہن یہاں بسانا تھا جو ابھی تک پاکستان سے پی آئی اے اور پھر ٹورنٹو کے بیچ انک گیا تھا۔ کل میں نے اپنے قدم یہاں رکھے تھے اور اگر مفتی نہ ہوتا تو میں کہیں کسی کو نے میں اپنا چہرہ عکسے میں دیے آنسو بہا رہا ہوتا۔ یہ تو مجھے مفتی ساتھ کھینے لیے جا رہا تھا ورنہ میں کہاں اس ذہنی حالت میں تھا کہ دوسرے دن ہی سیر سپانا کے لیے نکل پڑتا۔ میں نئی دنیا دیکھ کر خوش بھی ہوتا مگر دوری کا احساس ہوتا تو بچے یاد آتے، گھر اور گلیاں، اپنی موٹر سائیکل اور دریا سندھ کا چوڑا پاٹ ڈسنے لگتا۔ ٹرین بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ایک دو تین منٹ بعد کوئی اسٹیشن آ جاتا۔ زیادہ تر چڑھنے والے ہوتے۔ ٹرین بھرتی چلی گئی۔ سٹیشن پر ہو گئیں۔ نئے چڑھنے والے خاموشی سے کھڑے ہو جاتے تھے۔

دروازے کے ساتھ دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ پہلے تو ہمیں دیکھ کر مسکرائیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ پھر ایک نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو میں چونکا۔ انہوں نے پھر اشارہ کیا تو میں نے مفتی سے پوچھا "یار مفتی یہ کیا ماجرا ہے؟" وہ میرے کان میں بولا "انہیں اپنا کام کرنے دو۔ ہم نے وہی کرنا ہے جو ہمیں کرنا چاہیے۔ تم نظر انداز کرو۔" اور میں نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ دراصل سفر نامے پڑھنے والوں کو ہمیشہ سے یہی گلہ رہتا ہے کہ لکھنے والے پر ہمیشہ کوئی لڑکی مڑھتی ہے اور مہربانی فرما کر مجھے اس میں شامل نہ کریں مگر ہونی کو کون روکے۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں ٹرین میں سوار ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ مسافر نہ ہونے کے برابر تھے۔ زیادہ تر سیٹیں خالی تھیں۔

چیز تھی۔ ڈرائیور آگے بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک ڈبہ رکھا تھا۔ میں نے ٹکٹ اس میں ڈالا اور مفتی کے ساتھ پیچھے ایک سیٹ پر آ بیٹھا۔ مفتی مجھے ایک دن میں اتنی زیادہ چیزیں سکھلا رہا تھا جو مجھے آئندہ ہمیشہ کام آتی رہی تھیں۔ ہم مارٹن گروو پر رہتے تھے اور کپلنگ تک پندرہ منٹ لگتے تھے۔ ہم بس میں بیٹھے تھے اور مفتی مجھے یہاں رہنے سہنے کے اطوار بتا رہا تھا کہ کس طرح یہاں لوگوں سے بات کی جاتی ہے، کس طرح کسی بات کا رد عمل دیتے ہیں اور کس طرح کسی کی بات کا جواب دیتے ہیں۔ میں نے جو کچھ پہلے ایک مہینے میں سیکھا وہ مجھے ہمیشہ کام آیا۔ اس کے لیے میں مفتی کا ہمیشہ مشکور رہوں گا۔

بس اپنے اسٹاپ پر رکتی۔ کچھ سوار ہوتے اور کچھ اتر جاتے۔ صاف و شفاف سڑکیں، پارک، دیدہ زیب عمارتیں اور درختوں کی بہتات تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر خوبصورت پارک بنے تھے۔ کوئی ایک چیز بھی بے ڈھنگی یا بے ترتیب نہیں لگتی تھی۔

بس سب وے پہنچی۔ جہاں کوئی پیدل نہیں جا سکتا ہے۔ اس میں صرف بس ہی داخل ہوتی ہے کیونکہ بس کے مسافر کو اسی ٹکٹ پر ٹرین کا سفر بھی کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے کوئی پیدل یا کوئی کار اس میں داخل نہیں ہو سکتی ہے۔ مفتی مجھے یہاں ٹریفک کے قانون اور بورڈ بھی سمجھا رہا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو کچھ میٹر حیاں زیر زمین جا رہی تھیں۔ وہیں سے میں نے ٹورنٹو ٹرانسپورٹ کا نقشہ لیا جو بعد میں مہینوں میرے کام آتا رہا اور اسے دیکھ کر میں کہیں اور کسی بھی جگہ سب وے یا بسوں کے ذریعے پہنچ سکتا تھا۔ آپ کہیں بھی جا رہے ہوں تو صرف یہ معلوم کر لیں کہ جگہ کس انٹرنیشنل کے قریب ہے اور سمت کون سی ہے۔ شمال جنوب یا مشرق کہ مغرب؟ مفتی نے مجھے بعد میں نقشے کی مدد سے کہیں بھی پہنچنے کا طریقہ پوری عرق ریزی سے سمجھا دیا تھا۔ ہر سڑک پر جو بس چلتی ہے اس کا نمبر بھی لکھا ہوتا ہے اور ہر بس کا پہلا اور آخری اسٹاپ بھی لکھا ہوتا ہے۔ پھر جو بھی پاکستان سے ٹورنٹو آتا تو میں اس کو سب یہی پائس اور طریقے سیکھاتا جو میں نے مفتی سے اور پھر اپنے تجربے سے سیکھے تھے۔

ٹرین کا اسٹیشن صاف ستھرا اور کسی بھی گندگی اور مٹی اور دھول سے پاک تھا۔ ہر اسٹیشن پر چھوٹے چھوٹے اسٹور تھے اور بیشتر دیکسی یا چینی لوگ چلا رہے تھے۔ یہ سب وے سارے راستے زیر زمین نہیں چلتی بلکہ کئی مقامات پر یہ زمین کے اوپر بھی آ جاتی ہے۔

میں جس طرف بیٹھا تھا ادھر کچھ زیادہ ہی ویرانی تھی۔ میں نے سفر کی بوریت مٹانے کے لیے اپنے سامنے اخبار پھیلا لیا تھا۔ تبھی لمبے بھر کو ٹرین رکی۔ کئی مسافر سوار ہوئے۔ ان میں وہ بھی تھی۔ باقی مسافر تو دہنی طرف والی سیٹوں کی طرف بڑھ گئے مگر وہ میرے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ امریکا میں جرائم کی دنیا کالوں نے آباد کر رکھی ہے۔ یہ ہر وہ جرائم کرتے ہیں جس کا موقع آسانی سے مل جائے۔ چوری چکاری۔ رہزنی تو گویا ان کی کھٹی میں پڑی ہے۔ ان کی عورتیں بھی کم نہیں ہیں۔ مردوں کے شانہ بشانہ جرائم کرتی ہیں۔ وہ بیٹھنے کے بعد میری طرف کھسک آئی۔

اس دن یہی ہوا تھا مگر اس کے بعد آج تک میری بھر پور کوشش کے بعد بھی کچھ ایسا واقعہ نہ ہو سکا کہ راہ چلتے کسی نے مجھے دوست بنانے کی کوشش کی ہو۔ سب۔ وے۔ ہمیشہ سے برائی کے اڈے رہے ہیں۔ نیویارک میں تو یہ مافیا کا گڑھ رہا ہے۔ میں نے صرف سب۔ وے میں نازیبا حرکات دیکھی ہیں۔ باہر شاہزادہ نادر ہی ایسا کچھ دیکھا ہوگا۔ ٹورنٹو تو پھر بھی جرائم سے بہت حد تک پاک ہے۔ یہ بھی نہیں کہ صرف مجرم اور برے لوگ ہی سب۔ وے میں سفر کرتے ہیں۔ کچھ مسلمان خواتین سروں پر اسکارف لیے بیٹھی تھیں۔ یہاں ہر ایک کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت ہے جب تک کوئی دوسرا اس سے متاثر نہ ہو۔ آپ کسی کو گھور کر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بھی جرم ہے۔ کسی کو ہاتھ لگانا ایسے ہے کہ آپ نے اسے خنجر مار دیا ہو۔ یہ تو ناممکن ہے کہ آپ راہ چلتے کسی کو کندھا ہی مار لیں۔ اگر غلطی سے کسی سے ٹکرا جائیں تو معافیوں کا آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ یہ تجربات تو بعد میں مجھے ہوئے۔

مفتی کہہ رہا تھا کہ یہ مختلف النسل لوگوں کا ملک ہے۔ ہر ایک کو اپنے مذہب اور روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہے۔ کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا اور تم بھی خیال رکھنا اور اپنے کام سے کام رکھنا۔ میں نے یہ نصیحت لیے باندھی اور اس سے مجھے اپنے آپ پر قابو پانے میں بڑی مدد ملی۔

چالیس منٹ کے سفر کے بعد ”کینیڈا“ کا مشرقی حد پر آخری اسٹیشن آیا۔ ایک جم غفیر ہمارے ہمراہ اترا۔ وہاں سے اسی ٹکٹ پر سپڈ ٹرین پکڑ کر سکار برو آئے۔ سپڈ ٹرین زیر زمین نہ تھی۔ آس پاس پارک، بلند عمارتیں، صاف و شفاف سڑکیں اور ان پر دوڑتی گاڑیاں تھیں۔ آخری اسٹاپ آیا تو ہم دونوں دوسروں کے ساتھ اتر آئے۔

باہر نکلے تو سامنے ہی ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ یہ ایک بڑا شاپنگ مال تھا۔ ٹرین مال ہی میں آرکتی ہے۔ باہر بہت بڑا پارکنگ لائٹ تھا۔ سینکڑوں گاڑیاں ایک ترتیب سے پارک تھیں۔ مفتی بولا کہ میں تمہیں شاپنگ مال دکھانے آیا ہوں تاکہ تمہیں یہاں کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو سکے اور یہ کہ یہاں کے مال کس طرح کے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مفتی نے یہ بتایا کہ وہ دو ہفتے بعد پاکستان جا رہا ہے اور اگر کچھ بھیجتا ہے تو میں لے جاؤں گا تم یہاں سے بھی خریداری کر سکتے ہو۔

مفتی پشاور میں رہتا تھا اور مجھے قندیل کے لیے کچھ بھیجنا بھی تھا۔ سوچا تھا کہ بیٹی بہت خوش ہوگی جب یہ دیکھے گی کہ اس کے بابا نے تحائف بھیجے ہیں۔

اس مال کے آس پاس اونچی اونچی اپارٹمنٹ بلڈنگ تھیں۔ میں کہہ رہا تھا ”یا مفتی! یہ اپارٹمنٹ تو بہت ہی خوبصورت اور بڑے لگتے ہیں۔ کیا ان کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے؟“

مفتی بھی لطف اندوز ہو رہا تھا کیونکہ اس کو ایک قدر دان قسم کا رنگروٹ ملا تھا جو اس کی ہر بات کو اہمیت دیتا تھا غور سے سنتا اور اس کو اپنے لیے باندھ لیتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”یہ کوئٹہ کہلاتی ہیں۔ یہ کرایے کی بلڈنگ نہیں ہیں بلکہ لوگ خرید کر ان میں رہتے ہیں اور یہ بہت مہنگے ہوتے ہیں۔“

میں مرعوب ہو کر اثبات میں سر ہلا رہا تھا اور مجھے ناگیا پریت والے شاہ جی یاد آ رہے تھے اور میری زبان سے ان کا مشہور فقرہ نکلا۔ ”مارا دے“ اور پھر میں خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس ہنسی میں ایک درد تھا پچھڑنے کا اور دوری کا۔

مجھے یاد آ گیا کہ جب شاہ جی نے سنا کہ میں نے کینیڈا جانے کا حتمی ارادہ کر لیا ہے اور کسی طور بھی ان کا شورہ نہیں مان رہا ہوں کہ کالج سے آکر جو قالتو وقت بچتا ہے اس وقت کو آمدنی کا ذریعہ نہیں بنا رہا ہوں یعنی ان کی شاپ کے باہر چھوٹی سی دکان نہیں کھول رہا ہوں تو وہ بے بسی سے بولے تھے۔ ”اچھا یہ بتاؤ کینیڈا میں دکانیں ہیں؟ کس کس قسم کی ہیں۔“

میں نے اس وقت تک کینیڈا صرف تصویروں میں دیکھا تھا اس لیے کہا۔ ”ہر قسم کی دکانیں ہیں۔“

”میرا دعویٰ ہے ایک قسم کی دکان نہیں ہوگی۔ اگر تم نے وہیں دکان کھول لی تو قسم سے بہت کمائی ہوگی۔“

”کس قسم کی؟“ استفسار کیا تو وہ بولے۔ ”بہت معمولی سا خرچ آئے گا اور آمدنی ٹھیک ٹھاک

ہوگی۔“

”دکان ہوگی کس قسم کی؟“

”پان کا کیمین، قسم سے بہت آمدنی ہے اس کام میں، کراچی لاہور والے پان کھانے آئیں گے باقی لوگ نوسار لینے۔ ہے نا اچھا مشورہ؟“

اور تب ان کی جگہ میں نے نعرہ لگایا تھا۔ ”مارا وئے۔“ وہ سمجھے کہ میں پان کا کیمین کھولنے پر راضی ہو گیا ہوں۔ ”کینیڈا پہنچنے کے بعد کئی سال تک وہ تقاضا ہوتا رہا کہ کب پان کی دکان کھول رہا ہے۔“

خیر میں بتا رہا تھا کہ وہ کیا کمال کا مال تھا کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پاکستان میں بھی خاص کر کراچی میں بڑے مال بن چکے ہیں۔ جب یہ مال کھلا تھا تو کینیڈا کا چھٹے نمبر پر بڑا مال تھا۔ ان چھ میں سے چار تو ٹورنٹو میں ہیں۔ یہ مال 1973 میں کھلا تھا۔ دوسو سے زیادہ شاہیں ہیں اور ہر شاہ میں گھومنے کے لیے بھی گھنٹوں لگ جائیں۔ اس کے علاوہ سینٹا بھی ہیں۔ ڈبل اسٹوری مال میں کھلے کھلے راستے ہیں جن کے بیچ آرام دہ صوفے رکھے تھے۔ رنگ و نور کی پارش بھی، چھت سے لٹکے ہوئے فانوسوں اور روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ برقی زینے اوپر اور نیچے کو آ رہے تھے۔ کرسس کے درخت ہر کونے میں سجے تھے۔ میں پنڈوؤں کی طرح حیرت سے یہ مقامات دیکھ رہا تھا۔ بچوں کے کھیلنے کے لیے مختلف مقامات پر کچھ صاف ستھری جگہیں مخصوص کر دی گئی تھیں۔ ایک رش تھا جو اس مال میں مچا تھا۔ بڑے بڑے فلاور پاٹ پڑے تھے جن میں رنگ برنگے پھول اور چھوٹے چھوٹے درخت آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔

میں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ مفتی پر نظر پڑی۔ اس کی بھی یہی حالت تھی وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ میں بھی پہلی بار لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

کھانے پینے کے لیے ایک بڑا علاقہ مخصوص تھا۔ جہاں فاسٹ فوڈ کی درجنوں دکانیں تھیں۔ پاکستان میں تو فاسٹ فوڈ پیسے والے لوگ کھاتے ہیں اور یہاں یہ غریبوں کی خوراک ہے۔ دوڈالر میں میکڈونلڈ کا برگر مل جاتا ہے جتنا بس کا کرایہ ہے۔ کوئی عام یا سستی چیز ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کی میک ویلیو ہے۔ ہم اپنا سارا زور کے۔ ایف۔ سی یا میکڈونلڈ پر لگاتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ KFC کی چکن ساؤتھ افریقا یا چین سے آئی ہے اور پاکستان میں بھی یہیں سے درآمد ہوتا ہے۔ ہم کینیڈا یا امریکا میں اس لیے نہیں کھاتے کہ کوئی حلال

کی سندان کے پاس نہیں ہے۔ مگر پاکستان میں یہ سب بڑے شوق سے خود بھی کھاتے ہیں اور بچوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ نہ عوام کوئی سوال کرتے ہیں اور نہ حکمران کوئی جواب دیتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی بھی چیز کا اپنے ملک سے موازنہ نہیں کروں گا مگر آج یہ لکھتے ہوئے مجھے سچ بتانا پڑ رہا ہے۔ اگر یہاں کوئی حلال کر کے کوئی چیز بیچتا ہے تو وہ حلال کی شوقیلیٹ بھی دیوار پر لگاتا ہے۔ یہاں بہت سے مسلمان بھی غیر حلال چکن یا بیف کھالیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بسم اللہ پڑھ کر کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جب حلال عام ملتا ہے تو پھر کیوں خطرہ مول لیا جائے۔ آج اس پر بسم اللہ پڑھ لی تو کل ہمارے بچے خدا نخواستہ الکوئل پر بھی پڑھ لیا کریں گے۔ ہم اپنی اور بیچل چیزوں کو چھوڑ کر بھونڈے نقال بن چکے ہیں۔ ویلنٹائن ڈے، مادر اور فادر ڈے منا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ تو سال میں ایک بار ہی اپنے والدین سے ملنے ہیں اور اس لیے اس دن کو مناتے ہیں۔

یہاں اب میرے بچے ہمیں کوئی پھیس نہیں کھانے دیتے جب تک اس کے اجزانہ پڑھ لیں۔ اگر شک ہوتا ہے تو کھنی کوفون کر کے پوچھ لیتے ہیں کہ کسی جانور کے اجزا تو استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔ ہم کو تو پاکستان میں مردار بھی کھلا دیتے ہیں، جس کا قرآن پاک میں صاف لکھا ہے کہ یہ حرام ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے خفا کیوں ہے۔ انگریز جو کچھ بھی بول دے اس کے گرد ہماری توجہ کا ایک مجمع لگ جاتا ہے۔ یہ کسی بھی زوال شدہ قوم کی نشانی ہے۔ میں یورپ گھوما اور انگلینڈ کے علاوہ کسی ایک ملک میں بھی کسی کو انگلش بولتے نہیں سنا۔ میں عمرے پر گیا تو امیگریشن پر کھڑا سعودی میرا پاسپورٹ لے کر چومنے لگا تو میری آنکھیں دھندلا گئیں کہ یا اللہ ہم کیا اتنے گر چکے ہیں کہ پاسپورٹ کو بھی چومنے پر اتر آئے ہیں۔ پچھلے سال میں لاہور گیا تھا۔ بیچوں نے کہا کہ ہم نے سب دے جا کر برگر کھانا ہے۔ میں انہیں لے گیا۔ میں نے وہاں کے نیچر سے پوچھا کہ یہ میٹ کہاں سے آتا ہے تو جواب ملا سعودی عرب سے آتا ہے۔ میں بولا وہاں کون سی انڈسٹری لگی ہے کہ وہ حلال کر کے ہمیں بھیج رہے ہیں۔ میں ذرا سیدھا ہوا تو منیجر نے کہا ”سر! یہ چین سے آتا ہے۔“

شرم سے میرا سر جھک گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا ”پاکستانی تجھے سلام۔“

لگتا ہے کہ میں اپنے ٹریک سے جذباتی ہو کر ہٹ گیا۔ چلیں آپ کو ٹورنٹو دکھاتے ہیں۔ میں سکار بروٹاؤن سینٹر

میں کھڑا تھا اور نظریں ایک چیز پر نہکتی تھیں۔ میرے لیے تو یہ ایک نئی دنیا تھی۔ صاف سحرے لباسوں میں مسکراتے اور زندگی سے بھرپور لوگ۔ کوئی آپس میں خوش گپیوں میں... مصروف ہے تو کوئی دکانوں میں داخل ہو رہا ہے۔ کوئی شاپنگ کے بیگ لیے مطمئن باہر نکل رہا ہے اور کوئی بچوں کو سائنٹا کلاز کے ساتھ کھیلتے خوش ہو رہا ہے۔ اور تو اور سائنٹا کلاز اپنی مصنوعی برف کی طرح سفید داڑھی اور سرخ لباس میں خود بھی خوش ہے۔ شاندار دکانیں جو روشنیوں سے جگمگا رہی ہیں۔ کپڑے، جوتوں، کتابوں کی دکانیں کثیر تعداد میں ہیں۔ مفتی نے بتایا کہ کینیڈا میں پیر کا سب سے بڑا سٹور بھی یہیں ہے۔ میں نے کہا کہ تمہیں کیسے معلوم؟ تو کہنے لگا ”ہر کوئی جانتا ہے۔ یہ بھی کوئی خفیہ بات ہے جس کا کسی اور ایک کو پتا نہیں؟“ پھر میرا بازو پکڑ کر کہا۔

”تمہیں ایک عجیب و غریب ریسٹورنٹ دکھاتا ہوں۔“

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا ”کیا مفت میں کھانا ملتا ہے۔“

مفتی ہنس پڑا ”بہت مہنگا ہے اور اگر مفت میں دیکھنے بھی دیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔“

وہ مجھے کھینچتا ہوارین۔ فورسٹ لے آیا۔ یہ مت سمجھیں کہ جنوبی امریکا کا رین فورسٹ ہے۔ بلکہ یہ نارتھ امریکا میں ریسٹورنٹ کی بہت مشہور چین ہے۔

ایک بھر پور جنگل کا ماحول جس میں مصنوعی سبزہ اور درخت ہیں۔ بہت ہلکی روشنی میں جیسے کسی اصلی جنگل میں آپ آنکے ہوں کہیں آشار ہے اور کہیں درخت پر کوئی بندر جب لگاتا ہے۔ ایک ہانسی کسی کونے میں درختوں کے بیچ کھڑا چنگھاڑ رہا ہے۔ بندر درختوں پر بیٹھے اپنی مخصوص آوازیں نکال رہے ہیں۔ بن مانس تو باقاعدہ سینہ کوئی کر رہا تھا۔ ایک مگر مجھ پانی میں لیٹا تھا۔ میں قریب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بچے ارد گرد جمع تھے۔ اس نے ڈکار لے کر کچھ حرکت کی تو سب ڈر کے پیچھے ہو گئے۔ ایک بچے نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ بھی نقلی لٹکا۔ ستونوں کی جگہ رنگ برنگی تیرتی مچھلیوں کے اکیوریم تھے۔ وقفے وقفے سے بجلی کڑکتی تھی، جانور چلانا شروع کر دیتے تھے۔ چیتا غراتا تھا اور کوئی شیر کسی درخت کی اوٹ سے نکل کر دھاڑتا تھا۔ میں بہت دیر اس ریسٹورنٹ کی نیرنگیاں دیکھتا رہا۔ دل چاہتا تھا کہ اس کے اندر بیٹھ کر کچھ نہ کچھ کھایا جائے۔ مفتی نے جب یہ کہا کہ ایک بندے کے بیس ڈالر سے زیادہ لگتے ہیں تو فوراً میں نے پاکستانی روپے میں اس کا حساب کیا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے وہاں سے چلے آئے۔

اوپر والی منزل پر برقی زینے سے پہنچے۔ ہمیں چار گھنٹے

سے زائد ہو چکے تھے یہاں کی سیر کرتے، مگر تھکاوٹ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اوپر آئے تو وہی نظارے تھے جو نیچے تھے۔ یہاں ڈالر۔ ون کے نام سے ایک بہت بڑی دکان تھی۔ ہر چیز ایک ڈالر کی تھی۔ میں چیزوں کے نام بتانے لگوں تو پوری کئی صفحے درکار ہوں گے۔ میں نے مفتی سے اجازت لے کر قدیل کے لیے اسٹیج بک، رنگدار پینسلز، چاکلیٹس کچھ کھلونے خریدے۔ مفتی نے کہا کہ وہ پشاور میں میرے کزن سعید جان کو دے دے گا۔

جب چھکنے لگے تو ہم نے واپسی کی راہ لی۔ شام ہو رہی تھی۔ ہم سب -وے سے کپلنگ پہنچے اور چھپالیس نمبر بس سے اپنے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے پیچھے مارٹن گرو روڈ پر اتر گئے۔ اب تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ سرد ہوا چل رہی تھی اور ہم باقاعدہ کپکپا رہے تھے اور آسمان ایک دھند میں لپٹا نظر آتا تھا۔

اپارٹمنٹ میں کابینے ہوئے داخل ہوئے تو وہ ماں کی گوڈ کی طرح آرام دہ اور چر سکون تھا۔ سردیاں یہاں اکتوبر سے مئی تک چلتی ہیں اور گرم ہوا کا نظام ان مہینوں میں بلا روک ٹوک اپارٹمنٹس میں جاری رہتا ہے۔ ہمیں بھوک لگی تھی۔ مفتی سیدھا بچن میں جا گھسا اور کچھ تیار کرنے لگا۔ میں نے اپنی جیکٹ کا بوجھ اتارا اور الماری میں لٹکا دیا۔ اتنے میں طارق کا نیویارک سے فون آ گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ خیریت معلوم کی اور بھر پور حوصلہ دیا۔ کافی دیر بات کرنے کے بعد تمنا بھابی نے بات کی۔ میں ابتدائی دنوں میں ڈپریشن میں رہتا تھا اور بھابی ہر روز فون کر کے گھنٹوں باتیں کرتی تھیں۔ تسلی دیتیں اور حالات کا مقابلہ کرنے کا درس دیتیں اور ہر روز میں ان سے دعا کرنے کا کہتا۔ ان دونوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا، ورنہ میں تو ہمت ہار بیٹھا تھا۔

میں نے فون رکھا تو کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کھولا تو واجد سامنے کھڑا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ہنکا بکا رہ گیا۔ واجد آج سے دس سال پہلے جب میں ملتان میں قاریسی میں ماسٹر کر رہا تھا تو وہ مجھ سے ایک کلاس پیچھے تھا۔ نہایت عاجز اور شریف انفس انسان تھا۔ ہمیشہ ایک ہی طرح کے موڈ میں ملتا ہمیشہ مسکرا کر اور پُر خلوص انداز میں بات کرتا تھا۔ اکثر ہاسٹل میں میرے کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ میں ماسٹر کرنے کے بعد ملتان سے ڈیرہ آکر گول یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گیا اور پھر واجد کی کوئی خبر نہ ملی اور مگر جب ملا تو دروازہ کھولنے پر وہ مجھے کینیڈا میں ملا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے شادی کر لی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر منہ کھولے حیرت سے نکلنے لگا۔ کچھ لمحے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت سے گنگ رہے۔ پھر بڑے تپاک سے ملے۔ وہ گھائی سے سامنے والی بلڈنگ میں رہتا تھا اور ایک دو ماہ پہلے سعودی عرب سے سیدھا کینیڈا چلا آیا تھا۔ میں نے سعدیہ بھابی کا پوچھا تو بولا وہ باہر گاڑی میں بیٹھی ہیں۔ وہ مفتی سے بات کر کے مجھے بھابی سے ملانے باہر لے آیا۔ وہ اپنے ایک دوست چودھری قدوس کی گاڑی میں تھے۔ ان سے سلام دعا ہوئی۔ باہر سرد جھکڑ چل رہے تھے۔ ہوا بلڈنگ سے نکل کر شو تھی اور باہر کھڑے ہونے سے باز رکھتی تھی۔ واجد نے اپنا فون نمبر دیا اور دو بارہ ملنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد آج تک واجد اور ان کی فیملی ایک طرح سے ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ میں امریکا چلا آیا اور وہ ٹورنٹو میں رہے۔ آج تک ہم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے ہیں۔ چودھری قدوس پھر میرا دوست بنا اور زندگی کے ایک لمبے سفر کے بعد اب ہم امریکا دونوں ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔

مجھے کینیڈا آ کر اتنے زیادہ تجربات سے گزرنا پڑا کہ ہر دن کوئی نئی بات لیے طلوع ہوتا۔ اپنی زندگی کا ایک واضح یاد آ گیا ہے۔ مجھے کینیڈا میں آئے تین سال ہو گئے تھے۔ میں واجد اور چودھری امریکا کے فارماسٹ کے لائسنس کے لیے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمیں پڑھتے پڑھتے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ میں ان میں سے سب سے پہلے امتحان میں بیٹھ رہا تھا اور امتحان امریکا میں جا کر دینا تھا اور میرا ارادہ ڈیٹرائٹ (Detroit) میں آ کر یہ امتحان دینے کا تھا جو ٹورنٹو سے چار گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ایک سال پہلے امریکا کی سب سے بڑی فارمیسی کی کہیں سی۔ وی۔ ایس۔ والے کینیڈا آئے تھے اور مجھے جاب کی آفر کی تھی اور ساتھ ہی امریکا میں مستقل رہائش کے لیے B-H1 ویزا بھی مجھے بھیج دیا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب تک کینیڈا کا پاسپورٹ نہیں ملتا میں امریکا نہیں جاؤں گا اور اپنا امریکا کا B-H1 ویزا الماری میں رکھ دیا تھا۔ جب امتحان دینے میں ڈیٹرائٹ جانے والا تھا تو چودھری نے مجھے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ ڈیٹرائٹ جائے گا۔ دو دن بعد میرا امتحان تھا اور چھ ماہ کی پڑھائی کے بعد میری تیاری مکمل تھی۔ میری گاڑی پر ہم دونوں ڈیٹرائٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اپنے امریکا کے ویزے کے کاغذات بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ وہ میری گاڑی چلا رہا تھا اور میں ساتھ سیٹ پر بیٹھا اپنے نوٹس

پڑھ رہا تھا۔ گیارہ ستمبر کا واقعہ ہو چکا تھا۔ ہم بارڈر پر پہنچے تو آگے لمبی لائن لگی تھی۔ میں نے دیکھا تو وہ ہر گاڑی کی تلاشی ڈگی کھول کر لے رہے ہیں۔ میں نے چودھری کو بتایا کہ ڈگی کا بیٹن اس کے بائیں ہاتھ پر بیچے ہے۔ وہ ڈھونڈتا رہا مگر اسے نظر نہ آیا۔ میں نے کہا کہ تم اس سیٹ پر آ جاؤ اور میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاتا ہوں۔ بس میں نے سیٹ ہی تبدیل کی تھی اور سامنے سے ایگریگیشن آفیسر نے مجھے سیٹ تبدیل کرتے دیکھ لیا اور معلوم نہیں کون سے شک کا کاغذ اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔ ہمارا نمبر آیا تو مجھے ڈانٹ کر کہا ”گاڑی بند کرو۔“

مجھے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہہ رہی ہے۔ سیاہ فام کی انگریزی ویسے بہت کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں نے پوچھا ”ایسکلیوزی۔“ یہ کہنے پر تو وہ زیادہ بگڑ گئی۔ بہر حال میں اس کی بات سمجھ چکا تھا۔ گاڑی بند کی۔

اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔

میں نے کہا کہ میرا ٹیسٹ ہے۔ بولی ٹیسٹ دینے کے کاغذات کہاں ہیں۔ میں نے ان کی ای میل دکھائی تو کہنے لگی کہ ای میل کو تو ہم نہیں مانتے۔ پھر پوچھا کہ کوئی ڈاک سے لیٹر آیا ہو۔ میں نے نہیں میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ گاڑی کو ایگریگیشن کے آفس کے باہر پارک کر کے آفس میں جاؤ۔ میں حکم بجا لایا اور وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آفس میں آ گئی۔ ہمیں بٹھا دیا گیا۔ پھر سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا جو دو گھنٹے جاری رہا۔ وہ کہتی تھی کہ تم نے سیٹ تبدیل کیوں کی؟ میں اسے سمجھاتا تھا مگر وہ کچھ سمجھنے پر تیار نہ تھی۔ کہنے لگی کہ ای میل کو تو میں نہیں مانتی اور تم واپس جاؤ اور ان سے کہو کہ تمہیں ڈاک سے لیٹر بھیجیں۔ میں گڑ گڑایا کہ ایک دن بعد میرا ٹیسٹ ہے اور لیٹر آنے میں ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے اور اگلے ٹیسٹ چھ ماہ بعد ہوگا تو میری ساری محنت رائیگاں جاے گی۔ اس کے سینے میں کسی انسان کا دل نہ تھا بلکہ کسی ایگریگیشن والے کے سینے میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بات پر اڑ گئی۔ کہنے لگی کہ تم امریکا گئے تو وہیں چھپ جاؤ گے۔ ان دنوں میرا پاسپورٹ بھی پاکستانی تھا اور گیارہ ستمبر ہوئے ایک سال بھی نہ گزرا تھا۔

اس کالی موٹی بھینس کی عقل بھی بھینس جیسی تھی۔ مسلمان اس پر پاکستانی، وہ مجھے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے نو مین ٹاور میں نے ہی گرایا ہے۔ یکا یک وہ جھٹکے سے اٹھی۔ اس کے تیور انتہائی خطرناک تھے۔

(سز کھانی ابھی جاری ہے)

جولائی کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے ساتویں مہینے سے جزی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

☆ فاطمہ جناح

قد، گلابی چہرہ، ستواں ناک، آنکھوں میں بلا کی چمک، ہر چیز کو شگفتگی ہوئی نظر، سفید بال، ماتھے پر جھریوں کی چنٹ، آواز میں جلال و جمال، چال میں کمال، بانی پاکستان کی نشانی، ایک حصار جس کے قرب سے شہت کا احساس ہوتا ہے، جس کی دوری سے عقیدت نشوونما پاتی ہے۔“

محترمہ فاطمہ جناح نے اس ملک کے لیے بے شمار قربانیاں دیں اور تکالیف برداشت کیں۔ یاد رہے، قائد اعظم نے جب آنکھیں بند کیں، ان کے سامنے ایک ایسا پاکستان تھا جو مشکلات اور مصائب کے باوجود پھل پھول رہا تھا مگر فاطمہ جناح کو تو بعد میں کئی کرب ناک مناظر بھی دیکھنے پڑے۔ لیاقت علی خان کا قتل، اس کے بعد بیوروکریسی کی ریشہ دوانیاں، سیاست میں موقع پرستی اور مصلحت پسندی کا رجحان۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد انہیں سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی کہ نئے حاکم ان کے دو ٹوک موقف اور اعتماد سے خوف زدہ تھے۔ قائد کی تیسری برسی کے موقع پر مادرِ ملت کی ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والی تقریر پر سینسر کی فینچی چلائی گئی۔ پھر آمریت آن دھمکی، جس نے طاقت کے نشے میں اخلاقی اصولوں کو روند ڈالا۔ البتہ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

قائد اعظم کی عظمت فقط ان کے ہم و فراست، ان کی قابلیت اور صلاحیت کی دین نہیں تھی، اس کے پیچھے ان کی بے شمار قربانیاں تھیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے انہوں نے اپنا آرام سچ دیا، صحت کی پروا نہیں کی، بیمار یوں کو درخور اعتنا نہیں جانا، اپنی گھریلو زندگی سے زیادہ اہمیت اپنی تحریک کو دی۔ اسی وجہ سے وہ بابائے قوم کہلائے۔ یوں تو تحریک پاکستان کے کئی اور رہنماؤں نے بھی عظیم قربانیاں دیں، مگر قائد اعظم کے نقوش پا کا صحیح معنوں میں تعاقب تو ان کی چھوٹی بہن، محترمہ فاطمہ جناح نے کیا۔ انہوں نے شادی نہیں کی، مگر نہیں بسایا، اپنا نکل جیون اپنے بھائی کی دیکھ رکھ میں صرف کر دیا، اپنی زندگی تحریک پاکستان کے نام کر دی تھی۔ ہر محاذ پر ان کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ تحریک پاکستان میں خواتین کی شمولیت ان کی کرشمہ ساز شخصیت کے طفیل ممکن ہوئی۔ انہوں نے ناخواندہ اور نیم متوسط طبقے کی عورتوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ اسی وجہ سے مادرِ ملت یعنی قوم کی ماں کہلائیں۔ آغا شورش کاشمیری نے ان کی شخصیت کا خاکہ کچھ یوں کھینچا۔ ”وہ اپنے عظیم بھائی کی ہو بہو تصویر تھیں۔ بلند و بالا

فاطمہ جناح 31 جولائی 1893 کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ دو برس کی عمر میں ماں سے جدائی کا کرب سہنا پڑا۔ اب بڑی بہن نے پرورش کی ذمے داری سنبھال لی۔ اس زمانے میں بڑے بھائی محمد علی جناح انگلستان میں زیر تعلیم تھے۔ جب وہ لوٹے، فاطمہ جناح چار برس کی تھیں۔ وہ بمبئی جا کر وکالت کرنے لگے۔ یوں کچھ برس کے لیے یہ پورا خاندان بمبئی جا بسا۔ وہیں گھر پر ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔



1902 میں باندرا کانونٹ اسکول میں داخلہ کروا گیا۔ قابل طالبہ تھیں۔ تمام امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے۔ 1906 میں سینٹ پیٹرک اسکول کا حصہ بن گئیں۔ 1913 میں سینٹر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ پھر احمد ڈینٹل

کالج کلکتہ میں داخلہ لے لیا۔ 1922 میں وہاں سے ڈگری لی۔ 1923 میں ریٹیکس شروع کر دی۔ جب 20 فروری 1929 کو قائد اعظم کی زوجہ رتی جناح کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعے نے فاطمہ جناح کی زندگی بدل دی۔ انہوں نے قائد اعظم کی دیکھ ریکھ کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔ اب وہ بھائی کے شانہ بشانہ کام کرنے لگیں۔ سیاسی نکات پر بحث کرتیں۔ انہیں اپنے مشوروں سے نوازتیں۔ 1934 میں جب قائد اعظم محمد علی جناح لندن میں تھے، تو فاطمہ جناح بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ آگے کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔

انہوں نے نہ صرف قیام پاکستان سے قبل، بلکہ اس کے بعد بھی پاکستانی سماج اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ 1929 تا 1948 وہ قائد اعظم کا سایہ بنی رہیں۔ یہ دو عشروں پر محیط سفر تھا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد لگ بھگ دو عشرے حیات رہیں اور ان برسوں میں ان کی شخصیت اور افکار ابھر کر سامنے آئے۔ انہوں نے قائد اعظم کی شفاف سیاسی اقدار کو از سر نو زندہ کرنے کی ٹھوس اور جامع کوشش کی۔

ایوب خان کے خلاف انتخابی میدان میں اترنا ان کا سب سے بڑا اور اہم فیصلہ تھا، جس سے کمزور پڑتے جمہوری حلقوں میں جان پڑ گئی۔ پوری قوم ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس مقبولیت اور احترام نے ایوب خان اور ان کے حواریوں کو

حواس باختہ کر دیا۔ انہوں نے اس قابل احترام ہستی پر تنقید شروع کر دی۔ کچھڑا چھالی گئی۔ انتخابات میں دھاندلی کا سہارا لیا گیا۔ یہی نہیں، بعد میں کراچی کے باسیوں کو گوہر ایوب نے فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کی سزا بھی دی۔ مشرقی پاکستان میں بھی وہ بہت مقبول تھیں۔ انہیں ”مکتی عینا“ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہاں بھی انہیں خاصے ووٹ بڑے۔ انتخابات کے بعد محترمہ نے متعدد تقاریر میں ان مسائل کی نشاندہی کی، جو مستقبل قریب میں پاکستان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنے والے تھے۔ انہوں نے امریکا کی بڑھتی مداخلت، بیرونی قرضوں کے ناقابل برداشت دباؤ، غربت، مشرقی پاکستان کے بگاڑ اور ناخواندگی کی پیش گوئی کر دی تھی۔ بد قسمتی سے کسی نے ان کی دانش سے استفادے کی کوشش نہیں کی، ورنہ آج پاکستان کا یہ حال نہیں ہوتا۔

ان کی شخصیت بروقا اور متوازن تھی۔ فضول خرچی سے پرہیز کرتی تھیں مگر گھر کی تزئین و آرائش کا ہنر جانتی تھیں۔ انہوں نے قائد اعظم کے لیے طعام و آرام کا، ملاقاتوں کا ایک نظام بنا رکھا تھا۔ کتب بینی اور مطالعے کی شوقین تھیں۔ خواہش مند تھیں کہ پاکستان کی خواتین سیاست سے بے تعلق نہ رہیں، انتخابات میں بھرپور حصہ لیں۔ قرآنی تعلیم کو بے حد اہم جانتی تھیں۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ خواتین خود کو پروقیٹل تعلیم سے آراستہ کریں، خو انحصار ہوں اور قومی آمدن میں اضافے کا ذریعہ بنیں۔ کتنے ہی فلاحی اور رفاہی اداروں کی تشکیل اور سرپرستی کا ذمہ انہوں نے اٹھایا۔ کشمیری مہاجرین کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

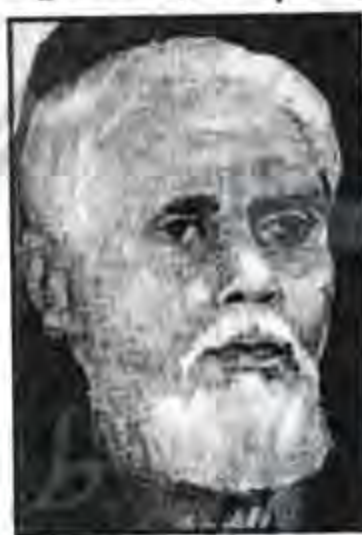
9 جولائی 1967 کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ ایک مجرا سرار واقعہ تھا کہ اس سے ایک روز قبل انہوں نے ایک شادی کی تقریب میں شرکت کی تھی، جہاں وہ ہشاش بشاش تھیں۔ ان کی وفات کے بعد بھی سرکار کا خوف ختم نہیں ہوا۔ مادر ملت نے اپنی زندگی میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ انہیں قائد اعظم کے پاس دفن کیا جائے، مگر حکومت کی کوشش تھی کہ انہیں میوہ شاہ قبرستان میں دفنایا جائے۔ عوامی ردعمل کے باعث یہ منصوبہ ملتوی کرنا پڑا۔ جب قصر فاطمہ سے ان کا جنازہ مزار قائد کی سمت نکلا، تو لاکھوں کا مجمع تھا۔ سہری سر تھے۔ ہر طرف سے پھولوں کی پتیاں نچھاور ہو رہی تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق لوگوں کی تعداد چھ لاکھ کے قریب تھی۔ ایسا منظر فقط قائد اعظم کے جنازے پر دیکھا گیا تھا۔ تدفین کے وقت بد نظمی بھی دیکھنے میں آئی۔ پولیس نے عوام پر لٹھی چارج کیا، جب

کہ بعد میں فسادات بھی پھوٹ پڑے۔

عوام کے ایک طبقے کا خیال یہ تھا کہ مادر ملت کی موت طبعی نہیں، انہیں قتل کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں عدالت میں پیشین بھی دائر ہوئی۔ اخبارات میں ادارے لکھے گئے۔ 1971 میں ایک اخبار میں غسل دینے والوں کے بیانات پر مبنی رپورٹ شائع ہوئی، جس میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ ان کے جسم پر زخموں کے نشان تھے اور کپڑوں پر خون لگا تھا۔ یہ بازگشت بعد کے برسوں میں بھی سنائی دیتی رہی، مگر حیرت انگیز طور پر کسی حکومت نے اس اہم معاملے کی تحقیق کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ کچھ بڑے وکلاء نے چند بیانات تو دیے، مگر پھر وہ بھی خاموش ہو گئے۔ یہ پراسرار اور بجز مانہ خاموشی ہنوز قائم ہے۔

☆ قدرت اللہ شہاب

ان کے گرد اسرار کی دھند ہے۔ وہ کون تھے، فقط ایک



بیورو کریٹ، ایک قلم کار یا ایک ولی؟ ایک باکرامت انسان؟ ایسا انسان جسے پاکستان کو ایک عظیم طاقت بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی؟ اور یہ ذمہ داری سونپی کس نے تھی؟ وہ کن کے احکامات کی پیروی کر رہے تھے؟ اس قدر سوالات

ہیں کہ آدمی چکرا جائے۔ جانے یہ سلسلہ کب شروع ہوا، مگر بلاشبہ یہ ممتاز مفتی تھے، جن کی کتب میں قدرت اللہ شہاب کے طلسم میں رنگے تذکرے نے وہ اینٹ رکھی، جس پر قدرت اللہ شہاب کے روحانی سلسلے کی عمارت کھڑی ہونے والی تھی۔ ان کی کتب میں جہاں جہاں، جب جب قدرت اللہ شہاب کا تذکرہ آیا، اس کے ساتھ بڑے روحانی واقعات بھی بیان کیے گئے۔ ”لبیک“ ممتاز مفتی کا ایک ماسٹر پیس ہے، بے شک ایک قابل مطالعہ کتاب، مگر اس کا کمزور ترین حصہ وہی، جہاں وہ شہاب کی شخصیت کے روحانی پہلو کو، مافوق الفطرت ڈھب پر بیان کرتے ہیں۔ مفتی کے مشہور زمانے ناول ”علی پور کا ایلی“ کے دوسرے حصے میں ”الکھ نگری“ میں شہاب ایک ولی، ایک باکرامت شخص کے طور پر نظر آتے ہیں۔

کچھ یہی معاملہ بناو قدسیہ اور اشفاق احمد کا بھی رہا۔ بانو

قدسیہ کی کتاب ”مردا بریشیم“ میں شہاب کی اس قدر خوبصورت اور متاثر کن تصویر کشی کی گئی ہے کہ پڑھنے والا ان کے عشق میں مبتلا ہو جائے۔ کھل کا دعویٰ تو نہیں کیا کہ وہ ولی تھے، مگر اشارے ضرور ملتے ہیں۔ اشفاق احمد تو ویسے ہی ”باباؤں“ کے گرویدہ تھے ان کا تذکرہ عام کرنا چاہتے تھے۔ شہاب ان کے لیے آئیڈیل ثابت ہوئے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اس میں حصہ ڈالا ہوگا۔ اس حلقے میں ابن انشاء اور جمیل الدین عالی کا بھی نام لیا جاسکتا ہے۔

پھر آخری برسوں میں قدرت اللہ شہاب کی آپ بیتی ”شہاب نامہ“ شائع ہوئی، جو بلاشبہ اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں سے ایک ہے۔ چون کہ وہ شہاب کے اپنے قلم سے نکلی تھی، تو اس میں انہوں نے اپنی شخصیت کا بت نہیں بنایا۔ البتہ حیر العقول واقعات ضرور شامل کیے، جو قاری کے مطالعے کو خوب مہمیز کرتے ہیں اور اُسے گرویدہ بنا لیتے ہیں۔

اس پورے معاملے کو دو زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ پہلا زاویہ یہ کہ شہاب واقعی اللہ کے نیک بندے تھے۔ اور مذکورہ شخصیات یعنی مفتی، اشفاق، بانو نے ان سے فیض اٹھایا، وہ ان کے ممنون بھی تھے اور ان کی روحانی صلاحیتوں سے متحیر بھی۔ اسی تشکر اور حیرت کا ذکر وہ اپنی کتابوں میں کیا کرتے تھے۔

اس کا دوسرا پہلو ذرا تاریک ہے۔ ناقدین الزام لگاتے ہیں کہ شہاب کا بت تراشنے، ان کی مابعد الطبیعیاتی شہیدہ پیش کرنے کا مقصد ذاتی مفادات حاصل کرنا تھا۔ ادبوں کا یہ حلقہ ذکر شہاب یوں کیا کرتا کہ وہ ایک بااثر بیورو کریٹ تھے۔ ان کے منظور نظر کے لیے مواقع کی بہتات تھی۔ سرکاری ملازمت، ریڈیو اور ٹی وی کے کنٹریکٹ، ریالیٹی دینے والے پبلشرز، بیرون ملک دورے۔ یہی نہیں، کبھی تو یوں بھی ہوا کہ ایک پورا ادارہ بنا دیا گیا کہ ان کا ایک مداح سرا بے روزگار تھا۔

سچ جو بھی ہو، اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدرت اللہ شہاب نے نہ صرف پاکستانی بیورو کریسی، بلکہ اردو ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ نہ صرف ان کتابوں اور تحریروں کی مدد سے، جو اوروں نے ان کے بارے میں لکھیں، بلکہ ان تحریروں کے ذریعے بھی، جو ان کے قلم سے نکلیں۔ ”یا خدا“ ان کا شاہکار ناولٹ ہے، جس نے خاصی کھلبلی مچائی۔ ترقی پسند اور رجعت پسند ایک دوسرے کے

سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ ”ماں جی“ بھی ان کا ماسٹر ہیں افسانہ ہے۔ بعد میں جن ادیبوں نے اپنی والدہ پر قلم اٹھایا، ان میں سے کوئی شہاب کے اثر سے نہیں نکل سکا۔ ایک ناقد کے مطابق کوئی اس موضوع میں ان کی گرد کو بھی نہ پاسکا۔ ”شہاب نامہ“ کا تذکرہ تو ہو ہی گیا، جس نے لاکھوں کو گرویدہ بنایا۔

اب کچھ ذکر شہاب ہو جائے۔ وہ 26 فروری 1917 کو گلگت کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ سرسبز ماحول میں پلے بڑھے۔ ابتدائی تعلیم ریاست جموں و کشمیر اور موضع چکور صاحب ضلع انبالہ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگلش کا مرحلہ طے ہوا۔ 1941 میں وہ انڈین سول سروس کا حصہ بن گئے۔ اوائل میں بہار اور اڑیسہ میں خدمات سر انجام دیں۔ 1943 میں بنگال میں ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کہتے ہیں، انہوں نے قحط کے دنوں میں سرکاری ذخیرہ مستحق افراد میں تقسیم کر کے خوب نیکیاں کمائیں۔ شہاب نامہ میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ انہوں نے ایک اہم سرکاری دستاویز، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ تقسیم کے وقت انگریز مسلمانوں کے مفادات کو زک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں، چپکے سے قائد اعظم محمد علی جناح تک پہنچا دی تھی۔

آزادی کے بعد وہ حکومت آزاد کشمیر کے سیکریٹری جنرل ہو گئے۔ بعد ازاں پہلے گورنر جنرل پاکستان غلام محمد، پھر اسکندر مرزا اور بعد ازاں صدر ایوب خان کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ایوب خان کے زمانے میں ان کا شمار پاکستان کے اہم ترین افراد میں ہوتا تھا۔ وہ ایوب خان کے خاصے قریب تھے۔ اگر ان کے چاہنے والوں کے دعوے درست ہیں اور ان کی اپنی کتاب میں درج بیانات پر یقین کر لیا جائے، تو انہوں نے ایسے چند اہم فیصلے میں کلیدی کردار ادا کیا جنہوں نے پاکستان کی قسمت کا رخ بدل دیا۔

جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے پیچھے اختلافات کی کہانی ہے۔ اب وہ اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انہیں مالی طور پر کئی مسائل کا سامنا رہا۔ ایک طرح سے وہ جلاوطن تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے انگلستان کے نواحی علاقوں میں گزارا۔ مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی شراکتیوں کا جائزہ لینے کے لیے ان علاقوں کا خفیہ دورہ کیا اور اسرائیل کی زیادتیوں کا پردہ چاک کیا۔ ان کی اس خدمت کی بدولت مقبوضہ عرب علاقوں میں

یونیسکو کا منظور شدہ نصاب رائج ہوا جو فلسطینی مسلمانوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ اس دورے سے کچھ پراسرار اور مافوق الفطرت واقعات بھی جڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے، ان پر جادو کر دیا گیا تھا اور کئی برس بعد اسی اسرائیلی سحر نے ان کی جان لی۔

جیسے کہ اوپر ذکر آیا، وہ ادیب کی حیثیت سے بھی ایک معروف شخصیت تھے۔ بااثر ہونے کی وجہ سے کچھ قلم کار تو ان کے ارد گرد رہتے، کچھ دور دور۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ایک عرصے تک اس ادارے نے ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا مگر پھر اس کا اثر جاتا رہا۔

شہاب کے گرد جو روحانی ہالات تھے، اس کی وجہ سے چند فوائد ضرور ہوئے ہوں گے مگر سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی ادبی حیثیت دب گئی۔ وہ باکمال فلشن نگار تھے۔ اس صنف پر ان کی بڑی گرفت تھی۔ کتاب ”نفسانے“ اور ”ماں جی“ کے افسانے اس کا ثبوت ہیں۔ مطالعہ بھی اچھا تھا۔ بدقسمتی سے بیوروکریٹ اور روحانی حیثیت فلشن نگار پر چھا گئی۔ ان کی بیگم عفت کا تذکرہ بھی ”شہاب نامہ“ سمیت کئی کتب میں شامل ہے۔ یہی معاملہ ان کے بیٹے ثاقب کا بھی تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے 24 جولائی 1986 کو اسلام آباد میں وفات پائی۔ وہ اسلام آباد کے سیکٹر H-8 کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد اپنے ایک مضمون میں اشفاق احمد نے ان کا خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ ادبی حیرا یے میں کیا جانے والا دعویٰ تھا۔

☆ عالم چننا

شہرت بھی عجب پڑھے ہے... کوئی اس کے لیے ساری زندگی زور مارتا رہے، اپنی کل صلاحیتیں پھونک دے، خزانوں کے دروازے کھول دے مگر شہرت اسے اپنی نظر کرم سے محروم رکھتی ہے۔ اسی طرح کچھ گوہر نایاب گمنامی کی تاریکی میں اتر کر خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے پاس نہ تو کوئی انوکھا ہنر، نہ ہی کوئی خاص صلاحیت، اس پر مستزاد شہرت کی خواہش بھی نہیں رکھتے، مگر ان پر یہ دیوی ہن برسانی ہے۔ اتنا نوازی ہے کہ پوری دنیا میں ان کے نام کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ملک کا صدر بھی شہرت کی دوڑ میں آپ سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

کچھ ایسا ہی عالم چننا کے معاملے میں ہوا۔ نہ تو ان کے

سید حاسادہ عالم چنا اپنی نئی زندگی میں خوش تھا۔ سرکس کے دوران جب وہ رنگ میں انٹر ہوتا، تو لوگوں کے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی۔ وہ رنگ میں موجود کھٹ بونوں کو جھپٹا مار کر پکڑ لیتا اور انہیں ہوا میں اچھلتا، تو لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے۔

1981 کے آس پاس کی بات ہے۔ بیرون ملک مقیم ایک شخص پاکستان لوٹا، تو دل بہلانے کو ساحل کے پاس لگا سرکس دیکھنے پہنچ گیا۔ اس نے اس نوجوان کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ اس کا کیرا حرکت میں آیا۔ اس نے نوجوان کی کئی تصاویر بنائیں۔ جھٹ پٹ ایک خط گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں کو لکھ دیا کہ جناب ذرا ادھر متوجہ ہوں، حیرت آپ کی منتظر ہے۔

تصاویر نے ان لوگوں کو بھی چونکا دیا۔ کچھ ماہ بعد ایک ٹیم کراچی پہنچی۔ سرکس ان دنوں بند تھا۔ وہ اس دراز قد مجھے کو کھوجتے ہوئے سہون آگئے۔ وہاں اس کا قد ناپا۔ وہ 7 فٹ 7 انچ تھا۔ یہ ایک ریکارڈ تھا۔ یعنی دنیا کا سب سے قد آور انسان ایک پاکستانی تھا۔

گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں تو نام آ گیا، مگر شاید اسے سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا، اگر چند بڑے سندھی اخبارات میں یہ خبر شائع نہ ہوتی۔ اردو اور انگریزی اخبارات میں یہ خبر چھپی، اس کے بعد ٹیلی ویژن ان کی جانب متوجہ ہوا۔ خبر نامہ میں ان کا تذکرہ ہونے کی دیر تھی، راتوں رات عالم چنا ایک معروف شخصیت بن گئے۔ اخباری رپورٹروں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ سیدھے سادے عالم چنا خوش تو تھے مگر جیسے جیسے شہرت بڑھنے لگی، وہ تھوڑے پریشان رہنے لگے۔ سرکس سے وہ دور ہو گئے تھے۔ دیہی زندگی میں اطمینان تھا۔ وہ دوبارہ سے مزار کی دیکھ کر دیکھ میں لگ گئے۔

معروف صحافی، ندیم پراچہ کے مطابق اس زمانے میں صدر ضیاء الحق سندھ کے دورے پر آئے، تو سہون بھی گئے۔ اس زمانے میں بھٹو صاحب کی پھانسی کی وجہ سے سندھ میں احتجاج زوروں پر تھا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ دنیا کا طویل القامت شخص یہیں رہتا ہے، سندھی ہے، اس سے ملیے، پبلک میں اچھا تاثر جائے گا۔

کچھ سرکاری اہل کار سہون میں عالم چنا سے ملے۔ انہیں خوش خبری سنائی گئی کہ صدر پاکستان انہیں ایک ایوارڈ دینا چاہتے ہیں، انہیں کراچی چلنا ہوگا۔ عالم چنا کو کوئی اعتراض نہیں تھا مگر کچھ وجوہات کی وجہ سے یہ ٹیل منڈھے نہیں



پاس کوئی انوکھا فن تھا، نہ ہی کوئی خاص قابلیت، شناخت کے بھی وہ آرزو مند نہیں تھے، مگر دیکھ لیجئے، آج گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ان کا نام درج ہے۔ پورا پاکستان ان سے واقف۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ اس سادہ لوح

انسان کے گرویدہ ہیں۔ 1953 میں سندھ کے علاقے سہون میں پیدا ہونے والے عالم چنا کے نصیب میں جو شہرت تھی، اسے دور نوجوانی میں چکانا تھا۔ وہ 1982 تا 1998 دنیا کے سب سے طویل القامت شخص کہلائے جاتے تھے۔ انہوں نے ایک غریب سندھی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جہاں غربت ہو، وہاں تعلیم کا کہاں تصور۔ پیٹ ہی زندگی کا محور۔ اُن کا خاندان معروف صوفی بزرگ لعل شہباز قلندر کے مزار سے وابستہ تھا۔ یہاں وہ چھوٹے موٹے کام کرتے، جس سے معمولی آمدنی ہوتی۔ اسی ماحول میں عالم چنانے آنکھ کھولی۔ کم سنی میں ان کا قد اچانک بڑھنے لگا۔ وہ بچوں میں نمایاں نظر آتے۔ پہلے قد نے ساڑھے چھ فٹ کی حد عبور کی، پھر سات فٹ، پھر ساڑھے سات فٹ۔ مگر وہاں اس ماحول میں بڑھتے قد کی کسے پروا تھی۔ کسے پیمائش کی فکر تھی۔ وہ بھی اپنے بڑوں کے ساتھ مزار کی دیکھ کر دیکھ کر کیا کرتے۔

اس زمانے میں شہر شہر سرکس لگتے تھے۔ سرکس کرنے والے سالانہ عرس کے موقع پر سہون کا بھی رخ کرتے۔ 1978 میں سرکس لگا، تو انتظامیہ کے کسی شخص کی نظر اس نوجوان پر پڑی، جو عام سے کام، عام سے انداز میں انجام دے رہا تھا، اس بات سے سیکرےٹری نے خبر کہ وہ کتنا خاص ہے۔

سرکس والوں کے پاس چھوٹے قد کے فنکار تو تھے ہی، جنہیں وہ بونوں کے طور پر استعمال کرتے مگر کوئی دیونہ نہیں تھا۔ انہوں نے اس دراز قد نوجوان کو ملازمت کی پیشکش کر دی۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق انہیں ماہانہ 160 روپے کی پیشکش کی گئی تھی اور اس وقت مزار پر کام کر کے وہ فقط 15 روپے ماہانہ کمایا کرتے تھے۔ توقع کے عین مطابق انہوں نے فوراً ہاں کر دی۔ کسے خبر تھی کہ یہ عام سا فیصلہ پاکستان کو وہ چہرہ عطا کرے گا جو مستقبل میں اس کی شناخت بن جائے گا۔

قوت رہی، مزار جاتے رہے۔ قریبی لوگ بتاتے ہیں، آخری دنوں میں وہ ماضی میں پہنچ گئے تھے۔ وہ اکثر سرکس کے دن یاد کیا کرتے تھے۔

☆ مولانا اشرف علی تھانوی

انگریز سرکار میں مسلمان معاشی اور تعلیمی طور پر تو دیگر طبقات سے پیچھے رہ گئے تھے مگر دینی تعلیم اور تحقیق کے میدان میں پیش رفت جاری رہی۔ اس کا سبب وہ مخلص علماء و فضلاء تھے جنہوں نے بے لوث ہو کر دین کی خدمت کی۔ اس زمانے میں کیسے کیسے گوہر نایاب گزرے، کوئی حدیث کا عالم، کوئی فقہ کا۔ کسی کی عربی پر گرفت، کسی کی فارسی پر، مگر ایسے علماء کم ہی گزرے ہوں گے جنہوں نے اپنی علمیت اور فکر سے نہ صرف اپنی نسل کو متاثر کیا، بلکہ آنے والے عہد پر بھی اسے اثرات مرتب کیے۔ اور مولانا اشرف علی تھانوی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔

انہوں نے 9 ستمبر 1863 کو گاؤں تھانہ بھون اتر پردیش میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد شیخ عبدالحق ایک باثروت آدمی تھے۔ ان کی علمیت کا بھی شہرہ تھا۔ فارسی پر خوب گرفت۔ بہت اچھے انشاء پرداز۔ الفرض انہیں علمی و ادبی ماحول میسر آیا، جو تربیت میں معاون ثابت ہوا۔



رجحان اوائل سے دین کی جانب تھا۔ باپ نے بیٹے کا ذوق و شوق دیکھا تو تربیت کی کل ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی۔

ان کا شمار کم گو اور خاموش طبع بچوں میں ہوتا

تھا۔ کھیلوں سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ نماز روز کے پابند تھے۔ سوانح خاکوں کے مطابق فرض کے ساتھ ساتھ وہ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے پڑھا کرتے تھے۔ حصول علم کی خواہش میرٹھ لے گئی جہاں فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ادھر حافظ حسین مرحوم دہلوی جیسا استاد میسر آیا۔ ذہین فطین بچوں میں ان کا شمار ہوتا تھا جو پڑھتے، ذہن پر نقش ہو جاتا۔ کلام پاک حفظ کر کے تھانہ بھون آئے۔

ادھر مولانا فتح محمد کی صحبت میسر آئی۔ ان سے عربی اور

چڑھی۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ عالم چنانے سندھی قوم پرستوں کے اصرار پر یہ سفر ملتوی کر دیا۔ البتہ اب انہیں بیرون ملک سے دعوتیں ملنے لگی تھیں۔ کئی غیر ملکی دورے کیے۔ گورے ان سے ملتے، ساتھ تصاویر بنواتے۔ پاکستانی اخبارات میں بھی ان کا چرچا رہا۔ انہوں نے ایک ہیرو کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ البتہ ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

1985 میں حکومت نے انہیں پھر یاد کیا۔ 23 مارچ کو یوم پاکستان کی پریڈ تقریب میں صدر پاکستان نے انہیں ایک ایوارڈ پیش کیا۔ اگلے دن کے تمام اخبارات میں وہ تصویر صفحہ اول پر شائع ہوئی، جس میں سات فٹ، سات انچ کے عالم چنا جھک کر پاکستان کے طاقتور ترین شخصیت سے ہاتھ ملا رہے تھے، جو سر اٹھا کر انہیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اخباری رپورٹس کے مطابق سندھ قوم پرست اخبارات نے جب یہ تصور شائع کیا، تو ضیاء الحق رٹن کرنا بھی ضروری جانا۔

وقت کے ساتھ ان کی شہرت پھیلتی گئی۔ چاہے کوئی تہوار ہو، ٹی وی والے انہیں ضرور مدعو کرتے۔ صدر اور وزیر اعظم جیسی شخصیات کے ساتھ ان کی تصاویر شائع ہوتیں۔ عرب ممالک میں انہیں بہت محبت ملی۔ امریکا میں سپر اسٹار کا درجہ حاصل تھا۔ چھوٹے بڑے، سب ان سے محبت سے پیش آتے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں فلاحی سرگرمیاں بھی شروع کیں۔ اس کے لیے ہیردنی دوروں سے فنڈز اکٹھے کیا کرتے۔ اپنے علاقے میں وہ یونیورسٹی بھی بنانا چاہتے تھے۔ بد قسمتی سے یہ خواب پورا نہیں ہو سکا۔

1989 میں عالم چنا کی شادی ہوئی۔ اگلے برس ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ وہ مسرور تھے۔ یوں لگتا تھا کہ زندگی ٹھیل اور پرسکون ہے، مگر حقیقت تلخ تھی۔ اب وہ بیمار رہنے لگے۔ صحت بگڑنے لگی۔ بیماری ہی کے دنوں میں انہوں نے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ شہر جدہ میں پاکستان اسکول میں طلبا نے ان کا ایسا استقبال کیا جو ماضی میں وہاں عمران خان کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس وقت وہ سہارا سے چلا کرتے تھے۔ کچھ برس بعد ان کی کمر بستر سے لگ گئی۔

1998 میں ان کے گردے ٹھیل ہو گئے۔ حکومت نے علاج کی غرض سے امریکا بھیجا مگر حالات اب سنبھالنے والے نہیں تھے۔ وہ کوما میں چلے گئے۔ 2 جولائی 1998 کو نیویارک میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں سہون میں دفن کیا گیا۔ ان کی عمر 45 برس تھی۔

وہ آخر تک مزار سے وابستہ رہے۔ جب تک جسم میں

دیوبندی اور بریلوی تقسیم واضح تھی۔ انہوں نے علمی و فکری انداز میں اپنا موقف پیش کیا۔ آنے والی نسلوں نے بھی ان کے کتب سے استفادہ کیا۔ ان کی تصانیف آج بھی دینی ذوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

☆ ابن صفی

اصل نام ان کا اسرار احمد تھا، مگر اس نام سے بھلا انہیں جانتا کون ہے۔ اچھے خاصے شاعر تھے، مزاح بھی خوب لکھا مگر ان کے چاہنے والوں میں سے بہت کم کو اس کی خبر ہوگئی۔ وہ سب تو ان کی جاسوسی کہانیوں کے رسیا تھے۔ جنون تھا ان کی کتابیں پڑھنے کا۔ اشال پر پہلے ہی بگنگ ہو جاتی۔ یوں اشاک آیا، یوں ختم ہو گیا۔ جو بے چارے دیر سے پہنچتے انہیں لائبریریوں کی سمت دوڑنا پڑتا۔ وہاں بھی ان ہی کے ہاتھ تازہ



ناول آتا جو خوش قسمت ہوں، ورنہ کچھ اور انتظار کی اذیت اٹھائیں، اپنے من پسند کردار عمران کرتل آفریدی سے کچھ دن اور دور رہیں۔ ان کے فن کو سراہنے والوں میں مولوی عبداللہ، پروفیسر مجنوں گورگھپوری، محمد حسن عسکری، حسن نثار جیسی

شخصیات شامل۔ سنتے ہیں، ایوب خان اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھی انہیں دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنے مقالے ”اردو ادب آزادی کے بعد“ اور ڈاکٹر علی حیدر نے اپنی کتاب ”اردو ناول سمت و رفتار“ میں ان کا ذکر ضروری جانا۔ ان کے ناولوں کی تعداد 245 بتائی جاتی ہے۔ یہ ابن صفی کا تذکرہ ہے، جو سری ادب کے بے تاج بادشاہ اور اردو میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے قلم کار تھے۔ پاپولر ادب لکھنے والے دیگر قلم کاروں کا شہرہ وقت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، مگر ابن صفی کے ہاں نہ جانے کیا کمال تھا، آج بھی ان کے نام کا ڈنکان بج رہا ہے۔ بلکہ اب تو ادب عالیہ تک محدود رہنے والے بھی محبت اور احترام سے ان کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ ان پر اپنی ایچ ڈی تیس لکھے جا رہے ہیں، فقط پاکستانی جامعات میں نہیں، ہندوستان میں بھی ان پر تحقیق ہو رہی ہے۔

وہ 26 جولائی 1928 کو الہ آباد، اتر پردیش کے

فارسی کی تعلیم پائی۔ اب دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا۔ اس وقت عمر پندرہ برس تھی۔ پانچ سال تک وہاں رہے۔ نوجوانی میں بھی اپنی توجہ کو بھٹکنے نہ دیا۔ زیادہ وقت مطالعے میں صرف ہوتا یا اپنے استاد خاص کی خدمت میں جا بیٹھے۔ اگلی منزل کانپور تھی۔ حسب روایت تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ وہاں مدرسہ فیض عام میں پڑھانے لگے۔ کانپور ہی کے زمانے میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اپنے والد کے ساتھ سعودی عرب روانہ ہوئے۔ کتابوں میں درج ہے کہ مکہ معظمہ میں ان کی حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے ملاقات ہوئی۔ اسی پر نور مقام پر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ استاد کی خواہش تھی کہ وہ کچھ ماہ مہر جائیں مگر والد ساتھ تھے۔ والد کی اطاعت مقدم تھی، سولوٹ آئے۔ اگلی بار جب خانہ خدا کا رخ کیا، تو چھ ماہ حاجی صاحب کی خدمت میں رہے۔

اسی دوران انہیں خلافت ملی۔ ساتھ ہی ہدایت کی گئی کہ وہ خدا کے بھروسے، تھانہ بھون پہنچیں۔ اگر حالات سخت ہوں تو انہیں برداشت کریں۔ چودہ سال کانپور میں رہے تھے، وہاں جم گئے تھے مگر جو استاد کا حکم ہوا تو آبائی وطن تھانہ بھون لوٹ آئے۔ مدرسہ اشرفیہ کے نام سے ایک درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ عمر کے آخری حصے تک وہاں پڑھاتے رہے۔ انہوں نے تھانہ بھون اور اس کے گرد نواح پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہندوستان کے طول و عرض سے لوگ ان سے فیض یاب ہونے کے لیے تھانہ بھون آنے لگے۔

وہ زمانہ انہوں نے تحقیق، تصانیف و تالیف میں گزارا۔ ایک اندازہ کے مطابق ان کی کتاب کی تعداد 800 کے لگ بھگ ہے۔ قرآن پاک کا سلیس، با محاورہ ترجمہ بھی کیا۔ اس تفسیر میں روایات صحیحہ اور اکابر کے اقوال کا التزام کیا گیا۔ اعمال قرآنی بھی اہم کتاب ہے، جس میں قرآن مجید کی بعض آیتوں کے خواص بیان کیے گئے ہیں۔ ”حقیقۃ الطریقہ“ سلوک و تصوف کے مسائل پر مشتمل ہے۔ ”احیاء السنن“ فقہی ترتیب پر جمع کی گئی احادیث کا احاطہ کرتی ہے۔ ”الانتباہات المفیدہ“ میں زمانہ جدید کے مذہبی اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ ”بہشتی زیور“ بھی ان کی اہم تصنیف ہے۔

اشرف علی تھانوی کا 83 سال کی عمر میں 20 جولائی 1943 میں انتقال ہوا۔ ان کی نماز جنازہ ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ تھانہ بھون کے قبرستان میں وہ مدفون ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی کے نظریات اور افکار نے دیوبند مکتبہ فکری پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اس زمانے میں سنی مسلک میں

کردار ادا کیا تھا۔ عمران سیریز پر ایک فلم بھی بنی تھی، مگر وہ باکس آفس پر ناکام رہی۔ ”دھمکا“ کے نام سے ایک فلم بھی بنی جو ناکام ثابت ہوئی۔

17 ستمبر 1979 کو انہیں ایک ہوا۔ اس کے بعد ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ تشخیص کے بعد سرطان کا اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ وہ جناح اسپتال میں داخل ہو گئے۔ بلبہ کے کینسر کی تصدیق ہوئی۔ اس بات کو انہوں نے اپنے مداحوں سے چھپائے رکھا۔ 24 جولائی 1980 کو طبیعت بگڑ گئی۔ دو روز بعد، اپنی سالگرہ والے روز ہی وہ جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ تدفین قبرستان پاپوش نگر میں ہوئی۔

ناقدین انہیں اردو کا سب سے بڑا جاسوسی ناول نگار قرار دیتے ہیں، ان کے پچاس برس پرانے ناول آج بھی مزہ دیتے ہیں۔ ان کا کردار عمران سیریز اتنا مقبول ہوا کہ بعد میں کتنے ہی مصنفین نے اسے آگے بڑھایا۔ ان میں سے بیش تر ناول نگار کمزور تھے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشتی نے ابن صفی کو یوں خراج تحسین پیش کیا۔ ”میں نے کبھی ابن صفی کے ناولوں کو (دیگر پاپولر لٹریچر کے مانند) کتابوں کے درمیان چھپا کر نہیں رکھا۔ ہمارے اٹلچھوکل اسے ایک سب اسٹینڈرڈ مواد گردانتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ابن صفی کے تخلیقی ذہن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ ابن صفی کے ناول کیوں پڑھتے ہیں، تو میں جواب دیتا ہوں، کیونکہ ابن صفی ہمارے کئی ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتے ہیں۔“

ابن صفی کے مداح یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں سراپے والوں میں اگا تھا کشتی، اردو زبان کی جرمن اسکالر خاتون کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ اور ناروے جیمین پروفیسر فن ٹھین شامل ہیں۔ کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے ابن صفی کے فن کے بارے میں کہا تھا۔ ”ابن صفی کے ناولوں کی جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے انوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے۔ اسے محض تفریحی ادب نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے۔“

☆ قاتل شقائی

آج تک ہے دل کو اس کے لوٹ آنے کی امید
آج تک ٹھہری ہوئی ہے زندگی اپنی جگہ
وہ اپنے زمانے کے مقبول ترین شاعر تھے۔ سادہ لہجہ، اس میں سچائی کی قوت، عام فہم زبان، یہی عوامل ہیں انہیں ہر دل عزیز بنانے کے قارئین کے دلوں تک ان کے اشعار رسائی!

جولائی 2016ء

111

ماہنامہ سرگزشت

علاقے نار میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام صفی اللہ تھا۔ شاعر نوح ناروی ان کے ماموں تھے۔ انہوں نے الہ آباد سے میٹرک کیا۔ وہیں ایونگ کرپشن کالج سے انٹر کا مرحلہ طے ہوا۔ 1947 میں الہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اسی زمانے میں پاکستان تقسیم ہو گیا جس کی وجہ سے ان کا ایک سال ضائع ہوا۔ تقسیم کے بعد والد تو ادھر آ گئے۔ البتہ باقی گھرانہ کچھ برس ادھر ہی رہا۔ 1949 سے 1952 تک تدریس سے متعلق رہے۔ اگست 1952 میں وہ اپنی والدہ کے ساتھ کراچی آ گئے۔ بغل میں جامعہ آگرہ کی ڈگری تھی، جو کڑی شرائط پوری کرنے پر ملی تھی۔ اگلے کچھ برس لالو کھیت میں گزرے۔

ادبی سفر کا آغاز 1948 میں ہوا۔ ماہنامہ نکمت میں ابتدائی تخلیقات شائع ہوئیں۔ ”فرار“ کو ان کی پہلی کہانی کہا جاتا ہے۔ آنے والے دنوں میں وہ مختلف فلمی ناموں سے جوڑے اچھوتے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں لکھتے رہے۔ ان کے زمانے میں جس ادب میں کتنے والا موضوع تھا۔ وہ اس رجحان کے خلاف تھے۔ اس لیے ایسا ادب لکھنے کا فیصلہ کیا جو قبولیت کی سند حاصل کرے۔ انہوں نے سری ادب کی راہ چلی۔ ابن صفی کا فلمی نام اختیار کیا اور حمید و فریدی سیریز کا پہلا ناول ”دلیر مجرم“ لکھا، جو 1952 میں شائع ہوا۔ اسے حیران کن رد عمل ملا۔

اگست 1955 میں انہوں نے ”خوفناک عمارت“ کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا۔ کردار میں ایسا جادو تھا کہ جس نے وہ کتاب پڑھی، عمران کا دیوانہ ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے میں یہ کردار مقبولیت کی بلندی پر پہنچ گیا۔ اسی زمانے میں ”بھیا تک آدمی“ آیا۔ یہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اکتوبر 1957 میں انہوں نے اسرار پبلیکیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے تحت ناول ”شندھی آگ“ ”منصہ“ ”شہودیر آیا۔“ 1958 میں وہ لالو کھیت سے ناظم آباد کے علاقے میں منتقل ہو گئے۔ 1980 تک وہاں رہیں۔

1960 سے 1963 تک آپ انقسام کے مریض رہے، لیکن یونانی طریقہ علاج سے اس سے جان چھڑالی۔ بیماری کے دنوں میں جب ان کے ناول شائع نہیں ہو رہے تھے، کئی ابن صفی پیدا ہو گئے، مگر شقا کے بعد ”ڈیزہ متوالے“ نامی ناول لکھا، جو بیٹ سکر ثابت ہوا اور ان سب کی چھٹی ہو گئی۔

1977 میں ان کے ایک ناول ڈاکٹر دعا گو کو پاکستان ٹیلی ویژن نے ٹیلی فلم کی شکل دی، مگر کچھ وجوہات کی بناء پر اسے ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جاسکا۔ اس میں قوی خان نے مرکزی کردار نبھایا تھا۔ مشہور اداکار قوی خان نے اس میں عمران کا

نے ہی دیے۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے ڈھائی ہزار کے قریب نغمے لکھے۔ فلم گلنار، انارکلی، نائلہ، نوکر، انتظار اور عشق لیلیٰ کے گیتوں نے دھوم مچادی۔ ”کیوں ہم سے خفا ہو گئے اے جانِ تمنا“، ”صدا ہوں اپنے پیار کی“، ”ہر آدمی الگ سہی مگر سنگ ایک ہے“ اور ”یہ محفل جو آج سچی ہے“ جیسے نغمے بھلا کون بھول سکتا ہے۔

تمام موسیقاروں کے ساتھ کام کیا۔ ماسٹر غلام حیدر، ماسٹر عنایت حسین، جی اے چشتی، رشید عطرے، خواجہ خورشید انور اور صفدر حسین جیسے موسیقاروں کی دھنوں پر ان کے گیت خوب بچتے۔ فلموں میں جدید اردو رومانوی شاعری متعارف کروانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

کتنے ہی اعزازات ان کے حصے میں آئے۔ انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ آدم جی ادبی ایوارڈ، امیر خسرو ایوارڈ، نقوش ایوارڈ ان کے حصے میں آئے۔ بھارت میں بھی بڑی پزیرائی ہوئی۔ جب ادھر جاتے، مشاعرے لوٹ لیتے۔ ان پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ مہاراشٹر کی نصابی کتب میں ان کی نظموں نے جگہ پائی۔ مکھد یونیورسٹی میں ان پر مقالہ لکھا گیا۔

ویسے ادب میں وہ بکے ترقی پسند تھے۔ ان کا ایک شعر: دنیا میں قاتل اس سا منافق نہیں دیکھا جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا ترقی پسندوں میں سلوگن کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ”ادب لطیف“ اور ”سنگ میل“ جیسے پرچوں کے مدیر رہے، جن کے پلیٹ فورم سے انہوں نے متعدد نوجوان شاعر اور افسانہ نگاروں کو متعارف کروایا۔ ان کی دیگر کتب جلت رنگ، روزن، جمہور، گفتگو، چھتھنار، آموختہ، پیرا ہن، ابا نیل کے زیر عنوان شائع ہوئیں۔ فیسل شفقائی کا 11 جولائی 2001 کو انتقال ہوا۔ گو وہ چلے گئے، مگر ان کے لازوال گیت آج بھی سماعتوں میں رس گھول رہے ہیں۔

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے ہیں

☆ سرگنگرام

دہلی اور لکھنؤ کی اہمیت سے انکار نہیں، مگر یہ لاہور تھا جو مشترکہ ہندوستان میں نشر و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ علم و ادب کا گہوارہ۔ فلم نگری بھی ادھر ہی تھی۔ مؤرخین متفق ہیں کہ اگر ہٹوارا نہ ہوتا تو آج ممبئی نہیں، لاہور سب سے بڑی فلم



پاٹے تھے کہ وہ ان کے جذبات کے ترجمان ہوتے۔ یہی سبب تھا کہ ایک عالم ان کا گرویدہ تھا۔ یوں تو مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کا اصل میدان غزل ہے۔ غزلیں، جو گیتوں میں ڈھلیں تو برصغیر میں پھیل گئیں۔

لاکھ چاہا ہے کہ اس کو بھول جاؤں، پر قاتل حوصلے اپنی جگہ ہیں، بے بسی اپنی جگہ یہ تذکرہ ہے قاتل شفقائی کا، جو پاک و ہند میں یکساں مقبول تھے۔ مہدی حسن اور سنجیت سنگھ نے جن شعرا کا کلام زیادہ گایا، ان میں قاتل بھی شامل ہیں۔ ان کے نغمات ”زندگی میں تو کبھی پیار کیا کرتے ہیں“ اور ”اے دل کسی کی یاد میں“ بھلا کسے یاد نہیں۔ آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ ویسے فقط نغمے اور لطافت ان کے گیتوں کی پہچان نہیں جناب۔ ان کی شاعری میں سماجی اور سیاسی شعور بھی تھا۔ کیوں ناں ہو... صف اول کے ترقی پسند شعرا میں کتنی ہوتی تھی۔

قتل شفقائی 24 دسمبر 1919 کو ہری پور ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے۔ اصل نام اورنگ زیب خان تھا۔ شاعری میں وہ حکیم سنجی خان شفا کے شاگرد تھے۔ اسی نسبت سے شفقائی کا لاحقہ نام کے ساتھ لگایا۔ کم سنی میں شعر کہنے لگے تھے۔ 1942 میں ان کا پہلا مجموعہ ”ہریالی“ شائع ہوا۔ تقسیم ہند سے کچھ عرصے قبل گیت نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے بتایا کہ جب وہ اپنی پہلی فلم کے لیے گیت لکھ رہے تھے، برصغیر میں آزادی کے فسادات شروع ہو گئے، جس کی وجہ سے فلم ڈبے میں چلی گئی۔ ہٹوارے کے بعد لاہور میں فلمی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ فلم ”تیری یاد“ کے انہوں نے گیت لکھے، جس کا بڑا چرچا ہوا۔ کچھ لوگ اسے پاکستان کی پہلی فلم بھی کہتے ہیں۔

اب ایک درکھل گیا تھا۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے درجنوں فلموں کو اپنے گیتوں سے سجایا۔ وہ اپنے عہد سے آگے تھے۔ اوروں کے برعکس گیتوں میں آسان اور عام فہم الفاظ استعمال کرنے کے لیے معروف تھے۔ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی فلمی صنعت کو سب سے زیادہ مقبول گیت انہوں

انڈسٹری ہوتا۔ تقسیم کے بعد بھی یہ شہر پنجاب کی عظیم تہذیب کا چہرہ ٹھہرا۔ کہتے ہیں، جس نے لاہور نہیں دیکھا، اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ تذکرہ زندہ دلوں کے شہر لاہور کا ہو، تو لازم ہے کہ ایک ایسے شخص کا تذکرہ بھی آئے گا، جو معروف معنوں میں تو پاکستانی نہیں کہ تقسیم سے پہلے ہی جہان قانی سے کوچ کر گیا تھا مگر اس شہر پر اتنی گہری چھاپ چھوڑی کہ لاہور کا تذکرہ اس کے بغیر اور اس کا تذکرہ لاہور کے بغیر ادھورا لگتا ہے۔

ہم بات کر رہے ہیں گنگا رام جی کی، جنہیں احترام سے سرگنگا رام کہا جاتا تھا۔ بڑے دیالو اور ملن ساز تھے، دل نیک تھے، اسی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان، سب ان کے گرویدہ تھے۔ ان کے فلاحی کاموں کی فہرست طویل اور قابلِ فخر ہے۔ لاہور میں کئی جگہ ان کے اخلاص کی علامات نظر آتی ہیں۔ اس وقت کے گورنر پنجاب سر میکلم ہیلی نے سرگنگا رام کی سماجی شخصیت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ وہ ایک سورما کی مانند جیتتا ہے اور ایک صوفی کی مانند دان کرتا ہے۔“

گنگا رام اگر وال اپریل 1851 کو نکانہ صاحب کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کے ابا قصبے کے پولیس انسپشن میں جو نیر سب انسپکٹر تھے۔ بعد میں وہ امرتسر چلے گئے اور وہاں کورٹ میں منشی ہو گئے۔ البتہ ان کا خاندان ادھر ہی رہا۔ گنگا رام بڑے سمجھ دار اور مہذب نوجوان تھے۔ میٹرک کے بعد



انہوں نے مشہور زمانہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ 1871 میں انہیں اسکالر شپ ملی۔ انہوں نے Roorkee کے تھامسن سول انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے 1873 میں گولڈ میڈل کے ساتھ فارغ التحصیل

ہوئے۔ مقابلے کا امتحان دے کر انگریز سرکار میں اسٹنٹ انجینئر ہو گئے۔ کیریئر کا آغاز لاہور سے کیا، جس سے انہیں عشق تھا۔

سرگنگا رام ہسپتال، جی پی او، لاہور عجائب گھر، انجمن کالج، گورنمنٹ کالج لاہور کا کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ، میوا ہسپتال کا البرٹ وکٹر ونگ، میوا اسکول آف آرٹس (موجودہ این سی اے) ماڈل ٹاؤن اور گلبرگ جیسی اس دور کی جدید عمارتیں آج بھی

سرگنگا رام کی مہارت اور قابلیت کا اعتراف کرتی ہیں۔ ان کا اثر شہر کے چبے چبے پر نظر آتا ہے۔ مٹور نصیحت کے مطابق جس زمانے میں وہ انجمن آف دی ٹی تھے، انہوں نے پنجاب، بالخصوص لاہور کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ پٹھان کوٹ اور امرتسر کے درمیان ریلوے ٹریک بچھانا بھی ان کا ایک کارنامہ۔ یہ سرگنگا رام ہی تھے، جنہوں نے لاہور میں پہلا جدید سینی ٹیشن سسٹم اور واٹر ورکس کا نظام قائم کیا، جو تقریباً سو سال تک کام کرتا رہا۔

ان کا اصل کارنامہ ماڈل ٹاؤن کا قیام تھا۔ 1921 میں لاہور شہر سے باہر ایک بڑا ریکٹر پر مشابہ ہاؤسنگ اسکیم کا منصوبہ بنایا، جسے اپنی نگرانی میں مکمل کیا۔ گوان کی وفات کے بعد اس میں پلانوں کی الاٹمنٹ اور تعمیرات میں غفلتیں ہوئیں، جن کی وجہ سے اس کا حسن متاثر ہوا، مگر آج بھی اس علاقے میں وہ ترتیب نظر آتی ہے، جس کا سنگ بنیاد سرگنگا رام نے رکھا تھا۔ 10 جولائی 1927 کو لاہور کے اس محسن کا انتقال ہوا۔

☆ نصیر الدین شاہ

یوں تو بالی ووڈ میں کتنے ہی ستارے چمکے، کئی باصلاحیت اداکاروں نے یہاں اپنے فن کا لوہا منوایا، پر اشار کا درجہ حاصل، مگر عجیب معاملہ ہے کہ ہندو اکثریتی ملک کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری پر مسلمانوں کا غلبہ رہا۔ ماضی میں یوسف خان (دلیپ کمار) کا سکہ چلتا تھا، تو اب سلمان خان، عامر خان اور شاہ رخ خان راج کر رہے ہیں۔ گیت اور مکالمہ نگاری کے میدان میں بھی مسلمان چھائے رہے۔ اور فقط کمرشل فلموں پر مسلمانوں کا غلبہ نہیں رہا جناب، متوازی سینما، یعنی آرٹ فلموں میں بھی انہوں نے خود کو منوایا۔ کریکٹرا ایکٹر کرنے والے بیش تر بڑے اداکار مسلمان تھے، مگر ان میں کسی کو وہ مقام نہیں ملا جو نصیر الدین شاہ کے حصے میں آیا، جنہیں کچھ حلقے موجودہ انڈسٹری کا سب سے بڑا اداکار بھی کہتے ہیں۔ یہ عام رائے ہے کہ انہوں نے کمرشل اور آرٹ سینما کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔ ایسے رول کیے، جنہوں نے ناظرین کو کبھی گرویدہ بنایا اور ناقدین کو کبھی قائل کیا۔

انہوں نے 20 جولائی 1950 کو اتر پردیش میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے افغان جنگجو جان فشاں خان کی نسل سے ہے۔ معروف افغان مصنف اور نرس شاہ، مشہور پاکستانی اداکار سید کمال اور کرکٹر اولیس شاہ اسی خاندان سے ہیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ اینسلم، اجمیر

ایکسٹرا آرڈنری جینٹلمین“ نمایاں ہے۔ وہ پاکستانی فلموں میں بھی نظر آئے۔ ”خدا کے لیے“ میں انہوں نے خصوصی کردار کیا، جسے بڑی پزیرائی ملی۔ پھر ”زندہ بھاگ“ میں نظر آئے۔ فلموں کے ساتھ ساتھ وہ تھیٹر بھی کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے تھیٹر گروپ کے ساتھ دہلی، بمبئی، بنگلور اور لاہور میں عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے افسانوں پر مشتمل کھیل پیش کیے۔

2006 میں ان کی ڈائریکٹ کردہ ”فلم“ یوں ہوتا تو کیا ہوتا“ ریلیز ہوئی، جو 9/11 کے تناظر میں تھی اور بڑی مہارت سے فلمائی گئی تھی۔

ان کا شمار ایسے فنکاروں میں ہوتا ہے، جو فن کو سرحدوں سے آزاد سمجھتے ہیں اور فلم کو فکری اور ادبی ذائقہ دینے کے حامل ہیں۔ وہ ہندوستان میں بڑھتی ہندو انتہا پسندی کے ناقد ہیں اور امن کے حامی ہیں۔ ان کے ان ہی افکار کی وجہ سے دیگر ممالک میں وہ بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر محبوب الحق

پاکستان نے کیسے کیسے نابینہ روزگار پیدا کیے۔ ایسی کتنی ہی شخصیات گزریں، جن کی علیست اور قابلیت فقط اسنے ملک تک محدود نہیں رہیں، غیروں نے بھی ان سے اکتسابِ علم کیا۔ کچھ تو ایسے تھے، جنہوں نے مغربی علوم میں ایسی گرفت حاصل کر لی کہ بعد میں مغرب ان کی فکر سے استفادہ کرنے لگا۔ ڈاکٹر محبوب الحق بھی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے پاکستانیوں کو ان کے کارناموں کی خبر نہیں۔

24 فروری 1934 کو پنجاب میں پیدا ہونے والے ڈاکٹر محبوب الحق کا شمار جنوبی ایشیا کے معروف ماہرین معیشت میں ہوتا ہے۔ انہیں اطلاقی ریاضیات کے شعبے کی تصوری میں سند تصور کیا جاتا تھا۔ انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ تھیوری پر بھی ان کا وقیع کام تھا۔ وہ گیارہ برس ورلڈ بینک کے ڈائریکٹر برائے پالیسی پلاننگ بھی رہے۔ ان کا ترتیب دیا ہوا ہیومن ڈیولپمنٹ انڈیکس ایک عرصے تک استعمال ہوتا رہا۔ ان کی کتاب Reflections on Human Development نے اس شعبے کو نئی فکر اور نظریات سے لیس کیا۔ ضیا دور میں وہ وزیر معیشت رہے۔ وہ پاکستان کے 13 ویں وزیر معیشت تھے۔ (بہت سے لوگ انہیں فقط اسی حیثیت سے جانتے ہیں) بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستانی ماہرین معیشت کا تذکرہ ان کے بنانا مکمل ہے۔

جب محبوب الحق نے شعور کی آنکھ کھولی، ہندوستان تقسیم

اور سینٹ جوزف کالج، یعنی تال سے حاصل کی۔ رحمان ابتدا ہی سے فنون لطیفہ کی جانب تھا۔ علم فنون میں ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔ 1971ء میں دہلی کے نیشنل اسکول آف ڈراما پہنچ گئے۔ مستقبل میں یہ ادارہ ان کے کیریئر پر گہرے اثرات مرتب کرنے والا تھا۔

فلمی کیریئر کے آغاز میں کئی مشکلات کا سامنا رہا مگر صلاحیت اپنا راستہ بنا ہی لیتی ہے۔ 1975 میں ریلیز ہونے والی ”نشانت“ ان کی پہلی فلم تھی۔ سخت مقابلے کا زمانہ تھا۔ پہچان بنانے کے لیے بہت زور مارنا پڑتا تھا۔ وہ روایتی ہیرو کے سانچے میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے، مکمل ولن بھی نہیں لگتے تھے۔



زیادہ کام انہوں نے آرٹ سینما میں کیا، مگر صلاحیتیں دھیرے دھیرے شناخت عطا کرتی رہیں۔ 1980 میں ان کی نویں فلم ”آکرش“ ریلیز ہوئی، جو ٹریڈ سینٹر ثابت ہوئی۔ اس کا شمار ان فلموں میں ہوتا تھا، جنہوں نے انڈسٹری کا

چہرہ بدل دیا۔ اسی برس ان کی ”ہم پانچ“ ریلیز ہوئی، جو کمرشل فلم تھی اور کامیاب رہی۔

1986 میں انہیں دلپ کمار کے ساتھ فلم ”کرما“ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک بڑے بجٹ کی بھاری بھر کم فلم تھی۔ ستاروں کے درمیان ان کی چمک ماند نہیں پڑی۔ کیریئر سنہلنے لگا۔ پھر اجازت، جلو اور ہیرو ہیرالال میں نظر آئے، جنہیں اچھا سانس ملا۔ پھر تو ہر طرح کا کام کیا۔

ان کی مشہور فلموں میں نشانت، آکرش، اسپرٹ، مرچ سالا، البرٹ پنچو کو غصہ کیوں آتا ہے، تریکال، بھاوانی بھوانی، موہن جوشی حاضر ہو، اردھ ستیا، کتھا اور جانے بھی دو یاروں شامل ہیں۔ ”جانے بھی دو یارو“ کا شمار اپنے وقت کی مقبول ترین فلموں ہوتا تھا۔ اسے مزاحیہ فلموں کی صنف میں ماسٹر پیس قرار دیا گیا۔ 1994 میں انہوں نے فلم ”مہرہ“ میں منٹی کردار کیا، یہ فلم بلاک بسٹر ثابت ہوا۔ ان کی مشہور ترین فلموں میں ”معصوم“ بھی شامل، جو سینٹ جوزف کالج نئی تال میں فلمائی گئی۔ انہوں نے فقط بالی ووڈ میں کام نہیں کیا۔ ہالی ووڈ کا بھی رخ کیا۔ کئی فلموں میں مضبوط کردار نبھائے، جن میں ”لیگ آف

فلسفیوں میں ان کی گفتی بھی ہوتی ہے۔ وزیر معیشت کا عہدہ چھوڑنے کے بعد وہ خاصے مصروف رہے۔ 89ء وہ اقوام متحدہ کے ڈیولپمنٹ نیٹ ورک UNDP کے اسٹیشن ایڈوائزر ہو گئے۔ ان کی نگرانی میں بین الاقوامی اسکالرز کی ایک ٹیم نے Human Development پر پہلی رپورٹ مرتب کی۔

پاکستان لوٹ کروہ پلاننگ کمیشن کا حصہ بن گئے۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے مشیر معیشت کے طور پر بھی کام کیا۔ کہا جاتا ہے، بھٹو صاحب نے محبوب الحق کو اپنی کابینہ میں وزیر معیشت بننے کی پیش کش کی تھی، مگر بھٹو کے سوشل ازم کی جانب جھکاؤ کی وجہ سے انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ نیشنلائزیشن کے بھی خلاف تھے جس کا بھٹو فیصلہ کر چکے تھے۔ بھٹو نے بعد میں بھی ان سے رابطہ کیا مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ البتہ 1982 میں ضیاء الحق انہیں قائل کرنے میں کامیاب رہے اور وہ کابینہ میں شامل ہوئے۔ زندگی کے آخری برسوں تک وہ مصروف رہے۔ پھر بیماریاں آئیں، ان کی صحت گرتی چلی گئی۔ 1996 میں ان کی مشہور زمانہ کتاب شائع ہوئی۔ 16 جولائی 1998 کو نیویارک میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ چوہدری نصیر احمد مہلی

کسی زمانے میں انہیں پاکستانی سیاست کا روشن چہرہ قرار دیا جاتا تھا۔ آج کیسا تاریک دور ہے... ہمیں ان کے کارناموں کی خبر ہی نہیں۔ ہمیں علم ہی نہیں کہ تحریک پاکستان کا ایک ایسا رہنما بھی تھا، جس نے مسلم لیگ کو منظم کرنے کے لیے اپنی جائیدادیں فروخت کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ چوہدری نصیر احمد مہلی کا تذکرہ ہے، جنہیں احترام سے لارڈ مہلی کہا جاتا تھا۔

چوہدری نصیر احمد مہلی 15 اگست 1911 کو بدو مہلی، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری غلام حیدر مہلی کا شمار علاقے کی معزز شخصیات میں ہوتا تھا۔ یہ خاندان پنجاب کی اشرافیہ کا چہرہ تھا۔ انتہائی بااثر اور فعال۔ ان کے پردادا ایک زمانے میں گورنر پنجاب بھی رہے۔

انہوں نے ابتدائی تعلیم جی ایم مسلم ہائی اسکول سے حاصل کی، جو ان کے والد کے نام سے موسوم تھا۔ یہ اسکول مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر 1918 میں شروع کیا گیا تھا۔ اس اسکول میں ذہین طلبا کو وقفہ بھی دیا جاتا۔ اب انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور

کے دہانے پر کھڑا تھا۔ بڑا مڑا شوبہ دور تھا۔ اگست 1947 کے بعد حالات بگڑنے لگے۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ پنجاب کے جس حصے میں ان کا خاندان مقیم تھا، وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی۔ ان کا خاندان خون کا دریا پار کر کے پاکستان پہنچا۔ ان تلخ تجربے نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے، تاہم کمپرسی کے باوجود انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے سوشل سائنسز ڈیپارٹمنٹ کا حصہ بن گئے۔ 1958 میں اکنامکس میں بی ایس کی ڈگری لی۔ انہیں برطانیہ کی اسکالرشپ مل گئی۔ ادھر وہ کمبرج یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ وہیں ان کی سٹراٹریٹا سین سے دوستی ہوئی، جو مستقبل میں ہندوستانی معیشت میں گراں قدر خدمات انجام دینے والے تھے۔ یہ دوستی کئی عشروں تک قائم رہی۔ اب وہ امریکا چلے گئے۔ انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پوسٹ ڈاکٹریٹ ریسرچ کے لیے انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی کا رخ کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے امریکی معیشت کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس نے انہیں اتنا متاثر کیا کہ کیونز م اور کیپٹل ازم کی تقسیم میں وہ ہمیشہ کیپٹل ازم کی حمایت کرتے نظر آئے۔ انہیں امریکا اور برطانیہ میں اچھی ملازمتوں کی پیش کش ہوئی، مگر وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے، سو لوٹ آئے اور بیوروکریسی کا حصہ بن گئے۔ وہ نوجوان اور قابل تھے، نئے نظریات اور خیالات سے لیس تھے۔ جلد انہوں نے شناخت بنا لیا۔ ماہر معیشت کے طور پر شہرت حاصل کرتے چارے تھے۔ ملک بھر میں ہونے والے سیمینارز اور ورکشاپس میں لکچرز دیتے، جہاں وہ ایوب خان کی پالیسیوں کی حمایت کرتے نظر آتے۔ انہیں یقین تھا کہ فری مارکیٹ کے اصولوں کے اطلاق سے پاکستانی معیشت میں واضح بہتری آسکتی ہے۔ 70ء میں بیرون ملک چلے گئے اور بین الاقوامی اداروں میں خدمات انجام دیتے رہے۔



وہ معیشت کی تھیوری انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ میں نظریہ ساز کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس میدان میں Human Development کا تصور متعارف کروانے والے

ملہنامہ سرگزشت

سے ریاضی اور عربی کے مضامین کے ساتھ انہوں نے گریجویشن کیا۔ یونیورسٹی آف پنجاب سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں پنجاب میں سیاسی سرگرمیاں زور پکڑنے لگی تھیں۔ مسلم لیگ دھیرے دھیرے فعال ہو رہی تھی۔ البتہ کانگریس بھی خاصی متحرک تھی۔ ہندو مسلم تقسیم اس طرح واضح نہیں ہوئی تھی۔ چوہدری نصیر احمد نے اداکل میں کانگریس کا چناؤ کیا، مگر دھیرے دھیرے ان پر واضح ہونے لگا کہ اس خطے میں کانگریس کا مستقبل تاریک ہے۔ ایک بڑی تبدیلی جنم لینے والی ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے 1940 میں لاہور کانفرنس منعقد کی، تو اس میں چوہدری نصیر احمد نے بھی شرکت کی، جس کے بعد ان پر واضح ہو گیا کہ یہ پارٹی جلد اس علاقے میں کلیدی کردار ادا کرنے والی ہے۔ وہ مسلم لیگ کا حصہ بن گئے اور سیالکوٹ میں اسے منظم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ جلد اس کے صدر ہو گئے۔



1943 میں ان کی قائد اعظم سے بیہوشی میں جناح ہاؤس میں ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان ہی کے مشورے پر مئی 1944 میں پنجاب مسلم لیگ کنونشن منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں محمد علی جناح، لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین جیسے رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس کنونشن کے بعد خضر حیات ٹوانہ کی حکومت بل گئی۔ مسلم لیگ پنجاب میں تیزی سے ابھری اور وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا محسوس ہونے لگا، جو شاعر مشرق علامہ اقبال نے دیکھا تھا۔ مسلمان ایک پلیٹ فورم پر اکٹھے ہونے لگے۔ جلے جلوسوں کے لیے وہ اپنی جیب سے خرچ کرتے۔ انہیں لارڈ ملسی کہا جانے لگا۔ چوہدری صاحب کی قائدانہ صلاحیت اور قابلیت کے اعتراف میں انہیں پنجاب میں مسلم لیگ کی قیادت سونپ دی گئی۔ یہ بہت بڑا عہدہ تھا، بھاری ذمے داری، مگر انہوں نے اس سے پورا انصاف کیا۔ یہ عہدہ قیام پاکستان کے بعد بھی کئی برس ان کے پاس رہا۔

انہوں نے تحریک آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آیا، تو اس میں کچھ حصہ سیالکوٹ کے اس رینس کا بھی تھا، جو تحریک کے لیے اپنی آدمی چایداد بیچ چکا تھا۔ تقسیم کے بعد ان کی اہمیت دو چند ہو گئی۔

انہوں نے تحریک آزادی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ 14 اگست 1947 کو پاکستان وجود میں آیا، تو اس میں کچھ حصہ سیالکوٹ کے اس رینس کا بھی تھا، جو تحریک کے لیے اپنی آدمی چایداد بیچ چکا تھا۔ تقسیم کے بعد ان کی اہمیت دو چند ہو گئی۔

مؤرخین کے مطابق محمد علی جناح کی خواہش تھی کہ وہ مستقبل میں وزیر اعظم کا منصب سنبھالیں۔ قائد اعظم زندہ رہتے، تو چوہدری نصیر احمد ضرور اس منصب تک پہنچتے، مگر بعد میں پاکستان کے سیاسی حالات تیزی سے بدلے۔ البتہ ان کی اہمیت سے انکار کرنا یا انہیں نظر انداز کرنا اب بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ تعلیم، قانون اور پارلیمانی امور کی وزارتوں پر فائز رہے۔

ان ہی کی تجاویز پر پاکستان کے سرکاری اسکولوں میں یونیفارم رائج ہوا۔ اس وقت انسپکشن کالج کو وفاقی حکومت سے گرانٹ ملتی تھی، جسے انہوں نے یہ کہہ کر بند کر دیا کہ اس طرح کے ادارے حکومتی گرانٹ کے محتاج نہیں۔ یہاں امریکہ کے بیچے پڑھتے ہیں۔ 1955 میں جینوا کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت چوہدری نصیر احمد ہی نے کی۔ اس میں انہوں نے ایفرو ایشین ممالک کے مسائل کی نشان دہی کی۔ انہیں سونے کے تمغے سے نوازا گیا۔ بعد میں وہ پاکستانی وفد لے کر اقوام متحدہ بھی گئے۔ پاک امریکا تعلقات کی بہتری میں بھی انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں امریکی خاتون اول کے اعزاز میں رکھے جانے والے عشائیہ کا ایک عرصے سفارتی حلقوں میں چرچا رہا۔ کہا جاتا ہے، اس کا خرچہ انہوں نے اپنی جیب سے برداشت کیا۔

وہ مارشل لا کے سخت ناقد تھے۔ ایوب خان کے اقدامات پر انہوں نے کھلی تنقید کی۔ اس کی وجہ سے دباؤ کا بھی سامنا کرنا پڑا، مگر وہ ڈٹے رہے۔ 1965 میں انہوں نے قاضی جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ 71 تک انتخابی سیاست میں حصہ لیتے رہے، مگر مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے انہیں دل برداشتہ کر دیا اور وہ عملی سیاست سے دور ہو گئے۔ البتہ سیاسی حلقوں میں ایک عرصے تک ان کا اثر و رسوخ رہا۔

انہیں پہلے مارشل لا میں اہم وزارتوں کی پیشکش ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ سے ان کے گہرے مراسم تھے اور ان ہی کے ذریعے چوہدری صاحب کو پیغام پہنچایا گیا تھا، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ انہیں ضیاء الحق کے دور میں بھی کابینہ کا حصہ بننے کی دعوت دی گئی، مگر ان کا جواب ایک بار پھر نفی میں تھا۔

12 جولائی 1991 کو تحریک پاکستان کے اس رہنما کا انتقال ہوا۔ وہ پاکستان سیاست میں وضع داری، اخلاقیات اور اصول پسندی کی علامت تھے، جنہوں نے ہمیشہ اپنا دامن کرپشن سے پاک رہا۔ بدقسمتی سے ان کے بعد آنے والوں نے ان کی پیروی کرنے سے شعوری اجتناب برتا۔

قابل فخر

شکور پٹھان

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا نام سن کر سر عقیدت سے جھک جاتا ہے اور اگر ان کا تعلق علاقائی یا مذہبی طور پر یکساں ہو، کوئی ربط ہو تو ان سے انسیت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسے ہی لوگوں کا مختصر مختصر سا تذکرہ تاکہ نئی نسل انہیں بھلا نہ دے۔

کچھ اپنوں کا ذکر، کچھ دلچسپ واقعات

اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام (چیزوں کے) نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ تم اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ ان سب نے کہا کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے، ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے سکھایا۔ اور کامل علم و حکمت والا تو تو ہی ہے۔ اللہ نے آدم سے فرمایا تم ان کے نام بتادو۔ اور جب انہوں نے بتا دئے تو فرمایا کہ میں نے تمہیں نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمان کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں تمہارا ظاہر و باطن ہے۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ (البقرہ..... 31-34)

علم، جس نے آدم کو ملائکہ پر فضیلت دی اور اسے مجبور ملائکہ بنایا۔ علم، سب سے پہلا حکم جو اللہ نے اپنے آخری نبی کو دیا، پڑھا اپنے رب کے نام سے۔

علم جو انسانوں کو، قوموں کو رفعت عطا کرتا ہے۔ علم، مومن کی گمشدہ میراث، جس کے لیے حکم ہوا اسے حاصل کرو چاہے جہاں سے ملے، جہاں تک جانا ہو۔ علم، کبھی نہ ختم ہونے والی دولت، وہ دولت جو بانٹنے سے اور بڑھتی ہے۔ علم،

جسے حاصل کرنا بہترین کام قرار دیا گیا۔

اور اس قوم کی بد نصیبی کا کیا کہیے جسے اللہ نے اپنے نور کو پھیلانے کے لیے چنا، نور، روشنی جو علم کا منبج ہے، جو تاریکی کا سینہ چیر کر پوشیدہ کو سامنے لاتا ہے، جس سے عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اور آج وہی قوم علم کے میدان میں سب سے پیچھے اور اغیار کی محتاج ہے۔

ہم سب اور خصوصاً ہمارے اہل علم اور اہل قلم اس جہالت پر کڑھتے اور ہم وطنوں کو جہالت کا طعنہ تو بہت دیتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو آگے بڑھ کر پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ اندھیری راتوں پر تو خوب عالمانہ گفتگو کرتے ہیں لیکن کتنے ہیں جو عمل کا ایک چھوٹا سا دیار روشن کرتے ہیں۔

شکوہ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر تھا اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

لیکن اپنے آپ کو اس جو کھم میں کون ڈالے۔ مغرب کے لیے سونے کی چڑیا، ہندوستان، جہاں فرنگیوں کی آمد سے قبل مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، جنہوں نے اپنی معشوقاؤں کی یاد میں مقبرے تعمیر کیے، طویل و عریض قلعے اور عظیم الشان محل تعمیر کیے۔ طاؤس و رباب، حسن و عشق، کیوتر بازی، شیر بازی، پتنگ بازی، یہ بازی، وہ بازی اور اسی قسم کے مشاغل اور فنون کو ترویج دی۔

فرنگی گومتی کے کنارے پہنچ گئے اور ہم شطرنج کی بازیوں میں جتنے رہے۔ خواص کا یہ حال ہو تو عوام بھلا کس کھیت کی میولی ہیں۔ دنیا سائنس میں ایک سے بڑھ کر ایک ایجاد کر رہی تھی اور ہم دنیا کو مسلمانوں کے سائنس پر احسانات گنوار ہے تھے۔

عوام الناس کی بات تو چھوڑیں، ہمارے اہل علم اس بات سے متشکر تھے کہ کہیں مسلمان نوجوان جدید علم حاصل کر کے الحاد اور پے دینی کا شکار نہ ہو جائیں۔

یوں قتل سے بچوں کے نہ ہوتا بدنام..... افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوتھی، جیسی بھپتیاں عام تھیں۔

شاید فلک کج رفتار کو اس قوم پر رحم آیا۔ آج سے سو سو سال پہلے ایک مردانا کو ہمت اور آگہی دی کہ اگر دنیا میں عزت سے جینا ہے تو علم حاصل کرنا ہے۔ اس اولوالعزم دیوانے کا نام سید احمد خان تھا جس نے محض انٹیکو اور نیشنل کالج کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام پر منبج ہوئی۔

یہ سرسید کا ہی احسان ہے کہ آج ہم اور آپ ایک

دوسرے علم و دانش پر گفتگو کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ میرا شہر ہمیشہ شکر گزار رہے گا سیٹھ دیا رام جیٹھال (ڈی جے) نادر شاہ ایڈولجی ڈنٹا (این ای ڈی) اور ان جیسے دیگر ہندوؤں اور پارسیوں کا اور ان مشنریوں کا جنہوں نے قیام پاکستان سے قبل شہر میں ایسے معیاری تعلیمی ادارے قائم کیے جن کا نعم البدل ہم آج تک نہیں پیش کر سکے۔ پھر سرسید کی اتباع میں حسن علی آفندی نے مسلمانوں کے پہلے تعلیمی ادارے، سندھ مدرستہ الاسلام کی بنیاد رکھی۔

قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت نے اپنے محدود ذرائع سے کچھ تعلیمی ادارے قائم کیے لیکن وہ میرے شہر کی علمی ضرورتوں کے لیے کافی نہیں تھے۔

لیکن ہر دور میں کچھ سر پھرے ایسے گزرے ہیں جو اپنے مقصد اور نصب العین کے لیے۔

”نہ ستائش کی تمنانہ صلے کی پرواہ“ کے مصداق تن من دھن ایک کر دیتے ہیں۔

آج میں اپنے شہر کے ایسے ہی کچھ محسنوں کو سلام پیش کرنا چاہتا ہوں جن کے دم سے میرا شہر علم کی روشنی سے منور ہوا۔

پہلی وی کے مقبول پروگرام ”کسوٹی“ میں جب ماہرین عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف کسی مشکل میں پڑ جاتے تو کن انھیوں سے قریش پور کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کرتے۔ وجہ شہرت اچھی، یا بری؟

یہ ایک عجیب سی تقسیم ہے جس میں ہم نے انسانوں کو



بانٹا ہوا ہے۔ اچھے لوگ اور برے لوگ لیکن اچھائی یا برائی کا پیمانہ ہر ایک کا مختلف ہے۔ میرا اچھا آپ کے نزدیک برا اور آپ کا اچھا میرے لیے برا ہو سکتا ہے پھر ایک اور فارمولہ ہم نے بنا لیا ہے کہ جسے اچھا سمجھ لیا ہے اس کی برائیاں جیسی بھی چھوٹی یا بڑی ہوں، ان سے ہم درگزر کرتے ہیں اور جسے برا سمجھتے ہیں اس کی اچھائیاں چاہے کتنی ہی بڑی ہوں انہیں خاطر میں نہیں لاتے اور صرف برائی کے حوالے سے ہی اس کردار کو یاد رکھتے ہیں۔

یار کوئی نہ کامل فرشتہ ہوتا ہے نہ پورا شیطان۔ انسان، انسان ہوتا ہے، مرکب خطا و نسیاں، اچھائی اور برائی کا مجموعہ۔ کیوں نہ جس انسان سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی ہو اور جس نے ہمیں اور دنیا کو فائدہ پہنچایا ہو اس کی اچھائی کو یاد رکھیں۔ عبدالرحمان محمد قریشی، ایک کامیاب ٹرانسپورٹر لیکن کم تعلیم یافتہ (یا شاید غیر تعلیم یافتہ) اور بعض حوالوں سے متنازعہ شہرت کا حامل لیکن جب اللہ نے کسی سے کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اپنی تائید و نصرت اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہے اور اسے بلند مرتبہ و مقام دیتا ہے۔

اسی ٹرانسپورٹر کے نجانے کیا جی میں آئی کہ اسے ان نوجوانوں کی فکر ہوئی جو دن کو محنت مزدوری میں مشغول ہونے کی وجہ سے علم کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ اس نے ان کے لیے قریشی ٹائٹ کالج قائم کیا اور پھر 1959ء میں میرے شہر کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے اسلامیہ کالج کی بنیاد رکھی۔ آج کراچی کا ہر دوسرا تیسرا تعلیم یافتہ شخص اسلامیہ کالج اور اے ایم قریشی کا احسان مند ہے۔ مجھے اعداد و شمار کا علم نہیں لیکن ایک وقت تھا جب اسلامیہ کالج کے طلباء و طالبات کی تعداد جامعہ کراچی سے زیادہ تھی۔

یہ ایک غریب پرور کالج تھا۔ جسے شہر کے کسی کالج میں داخلہ نہ ملے، اسلامیہ کالج اسے اپنی آغوش میں جگہ دیتا تھا اور نجانے کتنے ایسے ہوں گے جنہیں اپنی کم قابلیت کے باوجود تعلیم مکمل کرنے کا موقع ملا ہوگا۔ کراچی کے اکثر مشاہیر نے یہیں تعلیم حاصل کی۔ میں سب کا نام تو نہیں جانتا لیکن ایک دو سے تو آپ بھی واقف ہوں گے، جیسے ایشین بریڈ مین، ظہیر عباس اور فکسٹار ندیم وغیرہ۔

قریشی کی پوئلگموں شخصیت کا ایک اور عجیب پہلو اس کی علماء سے عقیدت تھی۔ وہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ کے عقیدت مند تھے۔ علامہ کے انتقال کے بعد انہیں اسلامیہ کالج کے احاطہ میں ہی دفن کیا گیا۔ اسلامیہ کالج میں ایک اور نابغہ

روزگار شخصیت یعنی مولانا سید ابوالحسن ندوی بھی مدفون ہیں۔ اے ایم قریشی نے بھی انہی مشائخ کے قدموں تلے جگہ پائی۔

اس سعادت بزور بازو نیست۔
یہ رتبہ بلند جسے مل گیا، مل گیا۔

☆☆☆

کراچی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنی خاص روایات کی حامل ہے۔ میرے کچھ دوست علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہیں۔ فن گفتگو، حاضر جوابی اور بزلہ سنجی، علیکدوں کی خاص پہچان ہیں لیکن سب سے بڑی شناخت ان کی علم و ادب سے محبت ہے۔

اسی محبت نے کراچی کے ایک نمایاں علیگ، گل احمد نظامی کو قائل کیا کہ آپ نے کے ڈی اے کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے 145 اسکیمیں جاری کر کے بلاشک شہر کی بے حد خدمت کی لیکن اب ایسا کچھ کیا جائے کہ آنے والی نسلوں کو بھی فیض پہنچے اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ یعنی ایسا کوئی علمی ادارہ قائم کیا جائے جس سے آنے والی نسلیں بھی فیضیاب ہوتی رہیں۔

زیڈ اے نظامی یا ہم سب کے نظامی صاحب نے اسے علی گڑھ کے ساتھیوں کی مدد سے نئی شعبے میں پاکستان کی پہلی انجینئرنگ یونیورسٹی کی داغ بیل ڈالی۔

سر سید یونیورسٹی نے جہاں میرے شہر میں معیاری



انجینئرنگ کالج اور یونیورسٹیوں اور نشستوں کی کمی کا مسئلہ کم کیا
وہیں اعلیٰ پائے کی تدریسی اور تحقیقی سہولتیں فراہم کرنے کے
علاوہ مستحق اور قابل طلبہ کے لیے اسکالرشپ وغیرہ جاری
کیں۔

کے ڈی اے کی ترقیاتی اسکیمیں اور سرسید یونیورسٹی
میرے شہر والوں کو ہمیشہ نظامی صاحب کی یاد دلاتی رہیں گی۔

دانائے راز

ہم اکثر و بیشتر بات کرتے ہیں کہ ہمارے دین نے
عورت کو بڑا اعلیٰ مقام عطا کیا ہے لیکن عملاً ہمارا طرز عمل اسے
کہیں ثابت نہیں کرتا۔

سرسید کو بھی قوم کی تعلیم کی فکر تھی لیکن شنید یہ ہے کہ وہ
بھی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی نہیں تھے۔ حکیم الامت، علامہ
اشرف علی تھانوی نے بھی خواتین کی علمی ضروریات کو قرآن
پڑھنے اور سرتاج کو خط لکھنے اور دھونی کا حساب رکھنے سے زیادہ
نہیں سمجھا۔ اور تو اور ہمارے شاعر کو بھی لڑکیوں کا جدید تعلیم
حاصل کرنا نہ بھایا اور اس نے یوں طنز کیا۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

حضرت شیخ سلیم الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے

خانوادے کے ایک فرزند نے یہ راز جان لیا کہ دنیا میں آگے
بڑھنا ہے تو عورت کو جو اپنی اولاد کی سب سے بڑی معلم ہوتی
ہے اسے بھی ہر طرح کا علم حاصل کرنا چاہیے۔

الحاج مولوی ریاض الدین احمد شعر اور دانشوروں کے
شہر آگرے میں مسلم لیگ کے ہر اول دستوں میں شامل اور
ایک متحرک کارکن تھے۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل، علم سے
محبت تو لازمی تھی۔ انجمن اسلامیہ ٹرسٹ کے زیر اہتمام کئی
تعلیمی ادارے قائم کیے۔

ایک بار جب قائد اعظم آگرہ تشریف لائے تو مولوی
صاحب نے ان سے اجازت طلب کی کہ وہ جناح کے نام
سے لڑکیوں کا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آگرہ میں تو
مولوی صاحب کا خواب پورا نہ ہوا لیکن تقسیم کے بعد انہوں
نے کراچی میں اپنا مشن جاری رکھا۔ یہاں آگرہ کے مہاجرین
کے چندوں کی مدد سے پاکستان چوک پر پہلا گرلز اسکول قائم
کیا لیکن ان کا خواب اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے زمین عطیہ کی محترمہ
فاطمہ جناح جنہیں خواتین کی فلاح و ترقی بے حد عزیز تھی،
ذاتی دلچسپی لے کر ایک خطیر رقم کی منظوری دلوائی۔ حالات



اتنے سازگار پھر بھی نہ تھے۔ مولوی ریاض الدین صاحب نے
ایک ایک اینٹ جمع کر کے جناح گرلز کالج کی داغ بیل ڈالی
ریاض گرلز کالج سے جناح گرلز کالج اور جناح گرلز
کالج سے جناح پوسٹ گریجویٹ گرلز کالج عزم و ہمت کی
ایک داستان ہے۔

1998 میں سندھ کے علم دوست گورنر، حکیم محمد سعید
شہید نے جناح کالج کو یونیورسٹی کے درجہ پر فائز کیا۔
الحاج مولوی ریاض الدین کی انتھک محنت ٹھکانے لگی۔
لیکن یہ منزل نہیں آغاز سفر ہے۔ کون ہے جو اس شمع کو لے کر
آگے چلے؟

☆☆☆

دلی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ نگر سومرتیہ لوٹا گیا۔ یہ
بار بار اجڑی اور بار بار آباد ہوئی۔ کبھی رائے چھوڑا، تو کبھی
تیور، کبھی لودھی تو کبھی کیتھڈانے اس پر لشکر کشی کی۔ نجانے کیا
تھا اس نگری میں کہ یہ سلسلہ کہیں ٹھہرنا ہی نہ تھا۔ کبھی مغلوں نے
چڑھائی کی تو کبھی مرہٹوں نے قسمت آزمائی کی۔ ایک قیامت
آئی اور ایک جاتی تھی۔ کبھی ابدالی کے سر میں سودا سمایا دلی پر
چڑھائی کرنے کا تو کبھی دلی کی شامت اعمال نادر شاہ درانی کی
صورت نازل ہوئی۔ کبھی تعلق تو کبھی ظلمی اور آخر میں تان
گوروں پر ٹوٹی۔ پھر بھی یہ شہر اچھا رہا کہ جس کسی نے اسے لوٹا
اسے اپنے ڈھب سے آباد کیا۔ کبھی یہ دہلو کہلایا، کبھی اسے
کیلوکھری کا نام دیا گیا، کبھی 'سیری' کے نام سے پکارا گیا۔ کسی

نے اسے جہان آباد بنایا تو کسی نے اسے تعلق آباد کا نام دیا اور آخر اس کی بے قراری کو قرار ہی گیا، گوروں نے مغلوں کو چلنا کیا اور دلی پر قابض ہوئے اور آخر کار اسے ہندوستانوں کے حوالے کر کے خود بھی چلتے نئے اور آج یہ شان سے سراٹھائے، بھارت کا دار الحکومت بنی ہوئی ہے۔

مگر میرا شہر ایسا بد نصیب ہے کہ آزادی کے بعد سے ہی ہر پل، ہر ساعت، ہر آن اسے لوٹا جا رہا ہے اور اس کی بربادی میں، ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میرے ہوئے، سب ہی واسے درے قدمے نختے اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ اس شہر کے قدیم باسی کنارے بیٹھے، بے بسی سے اسے لٹتے دیکھتے ہیں۔ عروس البلاد، شہروں کی دلہن، کا دامن عفت، اپنے پرانے سب ہی تار تار کر رہے ہیں۔ روشنیوں کے اس شہر کو، وہشت، خوف اور نفرت کے اندھیروں میں دفن کر دیا گیا ہے۔

حکومتوں کا تو اس شہر سے کبھی کوئی تعلق ہی نہ رہا۔ ان کے نزدیک یہ بہت اہم شہر ہے، صرف اس کے ذرائع آمدنی کا سارا حصہ بٹورنے کے اس شہر سے انہیں کبھی کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ اس شہر کی ضرورتیں اس کے مسائل ان کا مسئلہ ہی نہیں ہیں۔

ملک کے چپے، چپے سے لوگ قسمت آزمائی کے لیے اسی شہر کا رخ کرتے ہیں اور میرا شہر کسی کو مایوس نہیں کرتا لیکن وائے بد نصیبی، اس شہر سے فیض تو سب اٹھاتے ہیں لیکن اسے اپناتا کوئی نہیں۔ اپنی شناخت صرف اپنے آبائی شہروں کے حوالے سے کرتے ہیں، وہ یوں کہ اس شہر کا شناختی کارڈ بنا کر نوکریوں اور تعلیمی اداروں کے داخلے سے محروم نہیں ہونا چاہتے۔ پھر جب وسائل تقسیم ہوں تو ان کا حصہ ان کے آبائی علاقوں کو ملے۔ اور تو اور وہ جنہوں نے اسے اپنی آخری منزل بنایا، جن کے لیے اس کے بعد صرف بکیرہ عرب ہی ہے وہ بھی کچھ عرصہ تو اس کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے پھر وہ بھی اس لوٹ مار میں جٹ گئے۔ میرے شہر کو ہماری ہوس زر، بد ذوقی اور بد سلیقگی کھا گئی۔ خوب صورت، قدیم اور تاریخی عمارتیں کھنڈر بنتی گئیں اور ہم دیکھتے رہے۔ ان حسین یادگاروں کو ڈھا کر بھدے، بے ہنگم اور بدنما شاپنگ پلازے اور فلیٹ بنا دئے گئے۔ قدیم تعلیمی اداروں، اسپتالوں کا حال، بے حال کر دیا۔

میں نے پچھلے مضمون میں میرے شہر کے ان محسنوں کو یاد کیا تھا جن کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ اور ان سے بہت پہلے ”غاصب“ گوروں نے اس شہر کو اپنا سمجھ کر اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ تعلیمی ادارے، اسپتال، بازار، مارکیٹیں، باغیچے،

انگریز کا دیا، کیا کچھ نہیں تھا میرے منتخب روزگار، عالم میں انتخاب شہر میں، جسے ہم سب نے لوٹ کر ویران کر دیا۔ ناچائز تجاویزات نے عمارتوں کی خوبصورتی ہی ڈھانک دی۔ آج شاید ہی کوئی، میری ویدر ٹاور، کے قریب سے گزرتے ہوئے نظر اٹھا کر اس عمارت کو دیکھتا ہوگا جو کبھی بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ اگر صفائی ستھرائی کا انتظام ہوتا، عمارتوں اور دیگر تعمیرات کی دیکھ بھال کی جاتی تو بعید نہیں کہ یہ شہر بھی روم اور لندن کے ہم پلہ ہوتا۔

یہی حال طب و صحت کے شعبے میں رہا۔ یہاں کبھی لیڈی ڈفرن، سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ اور سو بھراج جیسے خوب صورت اور معیاری اسپتال ہوا کرتے تھے۔ آج انہیں دیکھ کر کوئی ان اسپتالوں میں اپنے مریضوں کو کبھی داخل نہ کرے۔ خیر یہ تو عادت سی بنالی ہے میں نے اور یہ یرونا کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔ آج ایسی دو ہستیاؤں کی بات کرتے ہیں جو کہیں دور دیس سے آئی تھیں لیکن میرے شہر کی ایسی جی جان سے خدمت کی کہ یہاں کے اصلی باسیوں اور وہ جنہوں نے اسے اپنا مسکن بنایا، انہوں نے اس کا عشر عشر بھی نہ کیا ہوگا۔ میرا شہر جن کا ہمیشہ ہمیشہ احسان مند رہے گا۔ دست عیسیٰ..... روح مریم

میرے رب کا کام وہی جانتا ہے۔ مالک کائنات نے اپنی سب سے محبوب تخلیق یعنی انسان کے لیے زمین اور آسمان کی ساری نعمتیں مسخر کر دیں لیکن ساتھ ہی اسے تکالیف اور مصیبتیں بھی دے دیں۔ شاید یہ ہمیں آزمانے کے لیے کہ تکلیفیں اٹھا کر بھی کون ثابت قدم رہتا ہے اور مالک کی بندگی کے تقاضے پورے کرتا ہے۔

انہی مصیبتوں اور کٹھناؤں میں سے ایک بہت ہی مہیب، تکلیف دہ اور خوفناک بیماری، کوڑھ یا جذام کی ہے۔ کوڑھی بد نصیب اپنے جسم کو گلتے، سڑتے دیکھتا تھا۔ جسم کا گوشت لعفن زدہ ہو جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرتا رہتا۔ اپنے بھی اس کے قریب نہیں آتے۔ شہر سے باہر احاطے بنا کر انہیں وہاں سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔

ہر شہر میں کوڑھی احاطے ہوتے۔ ان کی روٹی پانی بھی دور سے ہی ان کے سامنے پھینک دی جاتی۔ اس بیماری کو لاعلاج سمجھ لیا گیا اور گویا قدرت سے شکست مان لی۔ لیکن قدرت ہی نے ایسے انسان بھی پیدا کیے جو اپنی عزیمت اور ریاضت سے تقدیر کو بھی شکست دیتے ہیں۔

نرسنگ کے عملے کی تربیت اور تعلیم کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے پاکستان کے علاوہ جرمنی سے بھی عطیات جمع کیے اور کراچی اور راولپنڈی میں جذام کے اسپتال قائم کیے۔

1988 میں انہیں پاکستانی شہریت دی گئی جو کہ پاکستان کے لیے ایک اعزاز ہے نہ کہ سسر رتھ کے لیے۔ 1989 میں انہیں ہلال پاکستان کے اعزاز سے نوازا گیا۔ 2000 میں ڈاکٹر رتھ نے نیشنل لپروسی کنٹرول پروگرام شروع کیا جس میں جذام کے علاوہ ٹی بی کے مریضوں کا بھی علاج ہوتا ہے۔ 14 اگست 2010ء کو انہیں پاکستان کا سب سے بڑا سول اعزاز ”نشان قائد اعظم“ عطا کیا گیا۔ پاکستان کے علاوہ دنیا جہاں سے انہیں اعزازات سے نوازا گیا مگر دکھی دلوں کی دعا سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا ہے۔

☆☆☆

سسر رتھ فاؤ بہر حال خوش نصیب ہیں کہ ان کی خدمات کا ان کی زندگی میں اعتراف کیا گیا لیکن ایک گورا غریب ایسا بھی ہے جو ہمارے حاکموں کے ساتھ آیا تھا اور میرے شہر سے اس کی محبت کی نشانیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں لیکن اس بے چارے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا نہ یہ پتا کہ وہ کب پیدا ہوا اور کب دنیا سے رخصت ہوا، کہاں سے آیا کدھر گیا وہ۔

این ای ڈی کالج کے سامنے سے گزرتی ہوئی سڑک جو پاکستان چوک سے جالٹی تھی، یہ پہلے اس کے نام پر تھی لیکن اب شاید یہ بھی اس کے نام پر نہیں ہے۔ کہاں گیا شاعر جو کہتا تھا۔

”نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا“

میں تو نہیں جانتا، آپ مجھے بتائیں کہ کیا آپ نے ”جیمز اسٹریکن“ کے نام سے کوئی یادگار دیکھی ہے۔ مجھے تو اس کا ذکر کہیں بھی نہیں ملتا، بہت سراما پر اس کی تصویر تک انٹرنیٹ پر نہ مل سکی اور تو اور جس بلدیہ کراچی کا یہ سٹیوٹل انجینئر اور سیکریٹری تھا ان کی آرکائیوز پر بھی اس کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ انجینئر جو میرے شہر کولنڈن کی طرز برتری دینا چاہتا تھا۔ آپ دانتوں تلے انگلیاں داب لیں گے اگر میں اس کی خدمات کا حال بتانے بیٹھ جاؤں۔

ہم نے تو جو اس کے ساتھ کیا، سو کیا، یہ دیکھیں کہ اس نے میرے شہر کے ساتھ کیا کیا۔

1873ء میں اسے میرے شہر کامیوٹیل انجینئر اور سکرپٹر ”لگایا“ گیا۔ یہ جیمز اسٹریکن سخت قابل منتظم، منصوبہ ساز،

دراصل ایسے جوان ہمتوں کی پشت پر بھی اسی مالک کا ہاتھ ہوتا ہے جو علی کل شئی قدر ہے۔

جرمنی کے شہر لائزنگ کی رہنے والی، طب کے پیشے سے تعلق رکھنے والی رتھ کتھرینا مارٹھا فاؤ (Ruth Pfao Martha Katherina) نے پاکستان میں جذام کے بارے میں ایک فلم دیکھی۔ وہ ایک مسیحی تبلیغی ادارے سے وابستہ تھیں۔ جرمنی جیسے لاجواب ملک کی شہری، زندگی کی ہر سہولت اور تمام خوشیاں تیاگ کر انہوں نے پاکستان جا کر اور جذام کے مریضوں کی خدمت کا تہیہ کیا اور میرے شہر کراچی کا رخ کیا۔ میرے شہر کو سسر رتھ نے اپنا گھر ایسا بنایا کہ پھر لوٹ کر ہی نہیں گئیں۔ سٹی اسٹیشن کے عقب میں میکوڈ روڈ پر ایک چھوٹا سا مرکز بنایا اور کوڑھیوں کا علاج شروع کر دیا۔

جنہیں ان کے اپنے کوڑھی احاطوں میں پھینک آتے تھے ان کوڑھیوں کو یہ نیک دل سسر رتھ فاؤ اپنے ہاتھ سے دوائی دیتی، مرہم پٹی کرتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی۔

ڈاکٹر فاؤ کی نیک نیتی اور محنت کا صلہ مالک نے ایسا دیا اور ان کے ہاتھ میں ایسی شفا دی کہ نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے دیگر حصوں سے بھی جذامی ان کے پاس علاج گرانے آتے رہے۔

ایک اور مہربان ڈاکٹر، آئی کے گل (I.K. Gill) بھی اس مشن میں ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور میری ایڈیلیڈ لپروسی سینٹر کی بنیاد ڈالی۔ اس سینٹر میں نہ صرف علاج معالجہ بلکہ سروے اور تحقیق کا کام بھی ہوتا جس کا دائرہ پورے ملک میں پھیل گیا۔ سسر رتھ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عالمی ادارہ صحت (WHO) نے 1996ء میں پاکستان کو جذام سے پاک ملک قرار دیا جو کہ ایشیا کے چند اولین ممالک میں سے ایک تھا۔

مشرقی جرمنی کے شہر لیزنگ پر جب دوسری جنگ عظیم میں روس نے قبضہ کر لیا تو رتھ فاؤ اپنے خاندان کے ساتھ فرار ہو کر مغربی جرمنی آ گئیں اور طب کا پیشہ اپنایا۔ ڈاکٹر فاؤ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں تھیں اور انسانیت کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ یہ جنونی ہی ہوتے ہیں جو بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ سن ساٹھ میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بقیہ زندگی پاکستانی عوام کے لیے اور جذام کے خلاف جہاد کے لیے وقف کر دیں گی۔ بتدریج انہوں نے اپنے مشن کا دائرہ کار پھیلا یا اور دور دراز علاقوں تک میں بھی

ڈیزائنز اور انجینئر تھا۔ عہدہ سنبھالتے ہی اس نے بے شمار ترقیاتی منصوبے شروع کیے۔

میرا شہر جو اس سے پہلے ماہی گیروں کی ایک بستی اور بنیادی سہولیات سے محروم تھا۔ شہر میں پانی گدھا گاڑیوں اور گدھوں کی پیٹھ پر لدے مشکیزوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا تھا۔ جیمز نے سینٹ اور لوہے کے پائپوں کے ذریعے پانی کی فراہمی کا منصوبہ بنایا۔ حکومت نے جو رقم مختص کی وہ بہت کم تھی۔ جیمز نے احتجاج کیا اور مطلوبہ رقم لے کر ہی رہا۔ پانی کی فراہمی کا ایسا نظام بنایا کہ یومیہ فی شہری 45 گیلن پانی ملنے لگا۔

انہی دنوں میرے شہر میں پیسے کی وبا پھیلی۔ گندے پانی کی نکاس کا کوئی نظام نہ تھا اور یہ اس مرض کا سب سے بڑا سبب تھا۔ جیمز نے میرے شہر کا پہلا سیوریج سسٹم بنایا، حفظان صحت کے حوالے سے میرے شہر پر یہ جیمز کا ایک بہت بڑا احسان ہے۔

جیمز نے بجلی اور ٹیلی فون کی لائنیں بچھانے کا منصوبہ بھی شروع کیا جو اس کے عہد کے بعد جا کر مکمل ہوا۔ جیمز اسٹریٹن نے ٹراموے کا باقاعدہ نظام قائم کیا اور کراچی موٹر ٹراموے کمپنی کا آغاز کیا جسے سڑکی دہائی میں میرے شہر کے کرتا دھرتاؤں نے ختم کر دیا۔

شہر کی مرکزی، ایمپریس مارکیٹ، بھی جیمز کا کارنامہ ہے جسے ہم سب نے مل کر ایک کوڑے خانے میں تبدیل کر دیا۔

میری ویدرٹاور کی خوب صورت اور دیدہ زیب عمارت، ٹاور کا علاقہ جس کے نام سے جانا جاتا ہے، جیمز کی ماہرانہ صلاحیت کا شاہکار ہے جسے ہم نے اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ ہم اسے نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے۔

جیمز اسٹریٹن کو گوٹھک، اطالوی اور راجھستانی طرز تعمیر میں مہارت حاصل تھی۔ سندھ کا مشہور، گذری اسٹون اس کا پسندیدہ تھا اور اکثر عمارتوں میں یہی پتھر نظر آئے گا۔

ڈی جے کالج، جسے اٹالین طرز پر تعمیر کیا گیا، سندھ مدرسۃ الاسلام، اسلامی اور راجھستانی طرز تعمیر پر بنایا گیا، البتہ اس کا ایک مینار گوٹھک طرز پر تعمیر کیا گیا۔ یہ سب جیمز کی تعمیری صلاحیت کے مرہون منت ہیں۔

میری ویدرٹاور سے تحصیل ہر مزاجی، جشید جی، رستم جی، بلڈنگ، ڈینسو ہال، ایڈولجی ڈنشاہ ڈسپنری اور لیڈی ڈفرن ہسپتال اور نجانے کتنی خوبصورت عمارتیں، جیمز کی میرے شہر

سے محبت کا ثبوت ہیں۔

جیمز نے جس انداز میں شہر کا نقشہ بنایا، جس طرز کی عمارتیں تعمیر کیں اور جو منصوبے جاری کیے اگر ان کا تسلسل رہتا اور ان کی مناسب دیکھ بھال کی جاتی تو آج میرا شہر روم اور لندن جیسے شہروں کا ہم پلہ ہوتا لیکن ہم نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ خوبصورتی، سلیقہ اور صفائی ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ آپ حسین سے حسین عمارت تعمیر کر کے دیکھ لیں، سال کے اندر اندر ہم اسے پان کی پچکار یوں، مایوس مریضوں کے لیے خوش خبری کے اشتہاروں، سیاسی نعروں سے مزین کر دیں گے۔

آنجنمانی کاؤس جی ساری عمر کڑھتے رہے، اس شہر کے پرانے نوحہ گر، امر جلیل، اکثر اس کا مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں۔ ایک کمزوری عورت یا کمین لاری نے بچے ہوئے سنگ سیٹ کر دل ریزہ ریزہ کو جوڑنے کی کوشش کی۔ ان کی سہمی کے نتیجے میں کئی عمارتوں کو قومی ورثہ قرار دیا گیا لیکن میرے شہر کی اکثریت یا تو اس کی بربادی میں اپنا حصہ ڈال رہی ہے یا لب بام پتھی ٹھونسا ہے۔

کیا کسی اور جیمز اسٹریٹن کے لیے ہمیں پھر انگریز کا انتظار ہے۔

☆☆☆

ابن مریم ہوا کرے کوئی...

روح افزا پیتے ہوئے بچے نے سوال کیا، تو یہ روح کیا ہوتی ہے؟ میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے سوال میرے لیے آسان بناتے ہوئے کہا کہ یہ جو ہم کہتے ہیں روح کو سکون مل گیا، روح کو خوشی ہوئی اس کے کیا meanings ہیں؟ عزت پر بن آئی تھی۔ مجھے تو اپنے وجود کی meaning اور purpose کا پتا نہیں۔ بہر حال کچھ تو

بات بنانی تھی اپنی اولاد سے اپنی نالائقی چھپانے کے لیے۔ میں نے کہا بیٹا جب تم کسی کے کام آتے ہو اور کسی کو سکھ پتھارتے ہو اور اس میں تمہارا اپنا کوئی فائدہ نہ ہو تو تمہیں ایک خوشی اور سکون کا احساس ہوتا ہے جو کہ physically محسوس نہیں ہوتا لیکن اندر کہیں ایک اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اسی کو روح کی خوشی کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

نہ جانے وہ کیا سمجھا اور کیا نہیں لیکن مجھے اپنے جواب پر سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جس سرخوشی اور طمانیت کی بات کی تھی وہ مجھے اپنی زندگی میں تو کہیں نظر نہ آئی کہ میری ساری زندگی کی تک و دو اور سوچ بچار صرف اور صرف اپنی ذات تک ہی محدود

راستہ اس کے بندوں سے حسن سلوک اور ان کی خدمت ہی کے ذریعے ملے پائے گا۔

آج میں ان میجاؤں اور چارہ گروں کو آپ سے ملا کر یاد کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اپنی ذہانت اور صلاحیت اللہ کے بندوں کی تکالیف اور دکھ درد دور کرنے میں لگا دیں۔

میرے یہ تاثرات ایک عام شہری کے احساسات ہیں جو ان شخصیات کو ان کی عمومی شہرت کے حوالے سے جانتا ہے۔ میں نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں دیگر معاملات پر کوئی تحقیق نہیں کی ہے نہ مجھے ان سے کوئی سروکار ہے۔ بد قسمتی سے مجھے ان کی پیشہ وارانہ زندگی کے بارے میں بہت زیادہ نہیں معلوم اور اکثر کی تصاویر بھی نہیں مل سکیں اگر کوئی دوست ان کی تصاویر مہیا کر دیں تو ممنون رہوں گا۔

تاثر مسیحا کی میری عمر اس وقت دس بارہ سال کی تھی۔ میرے ایک عزیز کا بیٹا جو میرا ہی ہم عمر تھا، ایک حادثے میں شدید زخمی ہو کر جناح اسپتال میں پڑا تھا۔ میں اپنی ماں کے ساتھ اسے دیکھنے گیا تھا۔

میرا مسئلہ ہے کہ میں عبادت اور تجارتی کے لیے تو پہنچ جاتا ہوں لیکن مجھ سے مریض یا مجروح کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جیسے ہی مجھے اس کی تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے میری اپنی حالت بگڑ جاتی ہے اور پھر لوگ باگ مریض کے بجائے مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔

اسپتال کے اس وارڈ میں سارے مریض دماغی چونوں کے مریض تھے اور اکثر کی حالت بہت بری تھی۔ میرے عزیز کا سر بھی پیٹوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور اس پاس دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس ہونے لگا۔ میں ماں کو بتائے بغیر باہر آ گیا۔ مجھے سرد پسینے چھوٹ رہے تھے اور جی بری طرح متلا رہا تھا۔ میں جیسے تیسے وارڈ سے نکل کر ایک کوریڈور میں چلنے لگا تاکہ کہیں ایسی جگہ مل جائے جہاں تے کر سکوں۔ اچانک زور سے پکرایا اور میں سر پکڑ کر ایک دیوار کے سہارے نیچے بیٹھ کر ابکائیاں لینے لگا۔ شاید مجھے تے ہو گئی تھی کہ ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مجھے ایک مرد اور عورت کی آوازیں سنائی دیں۔ مرد شاید مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا ہو گیا ہے تم کو پھر اس نے عورت جو نرس تھی اس سے کہا کہ چھو کرے کو اندر لاؤ۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ مرد ڈاکٹروں والے سفید کوٹ میں تھا اور جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ میں شرمندہ سا چوروں کی طرح نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے نرس سے



رہی۔ یہ احساس طمانیت تو ان کو ملتا ہوگا جو اپنی ذات کی نفی کر کے صرف مخلوق خدا کے لیے سوچتے اور جیتے ہوں گے جیسے انبیائے کرام یا کسی درجے میں اولیا اللہ۔ یا پھر وہ موجدین اور محققین جو انسانیت کے لیے آسانیاں تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یا پھر وہ جو لوگوں کے دکھ درد کا مدد کرتے ہیں جیسے اپنے ایدھی صاحب، جیسے مدرٹریا، جیسے Ruth Florence یا جیسے Madame Pfao Nightingale.

ہمارے وہ معالجین اور جراح بھی اس کیفیت سے گزرتے ہوں گے جب وہ اپنی مسیحا کی کسی کی تکلیف کم کرتے ہیں۔ کسی کے دکھ کا درد ماں کرتے ہیں۔

میرا شہر جہاں ہزار ہا دکھوں کی آماجگاہ ہے وہیں اللہ نے اس شہر کو ایسے چارہ گر بھی بخشے کہ وہ شہر تو کیا تمام عالم میں اپنا نام کر گئے۔

یہ وہ ہیں جو بیزار جان گئے کے خالق کی رضا کے لیے اس کی مخلوق سے پیار کرنا چاہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو لیکن سب سے سادہ اور سب سے بڑی بات میں نے کراچی کی بسوں میں ایک ماگنے والے سے سنی جو کہہ رہا تھا کرو مہربانی تم اہل زمیں پر خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر اگر نصب العین رضائے الہی کا حصول ہے تو پھر اس کا



کچھ کہا اور وہ پلک جھپکتے میں ایک چھوٹا سا تولیہ اور ایک پلاسٹک کی تھیلی میں برف لے آئی۔ نرس نے میرا چہرہ صاف کیا اور ڈاکٹر میرے چہرے پر برف ملتے ہوئے تھلا یا ہوا کچھ انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ کھر در اور آواز میں درشنکی تھی لیکن میرے چہرے پر پھیرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں برف سے بھی زیادہ ٹھنڈک اور روئی جیسی نرمی تھی۔

اس نے جلدی میں مجھ سے کہا کہ باہر بیٹھو اور واپس وارڈ میں مت جانا۔

میں شرمندہ سا باہر آیا اور اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ مجھے جانا کہاں ہے۔ ڈاکٹر اور نرس میرے پیچھے کمرے سے نکلے اور تیزی سے کہیں چلے گئے۔ میں نے یوں ہی نظر اٹھا کر دروازے کے ساتھ گلی نام کی تختی پر نظر ڈالی جہاں لکھا تھا۔

سیخیر ڈاکٹر، سرجن اووی جمعہ

نیچے بہت سارے حروف بھی لکھے ہوئے تھے جو دو سے زیادہ سطروں میں تھے۔

میرا وہ عزیز جانبر نہ ہو سکا۔ میں پھر ماں کے ساتھ اس کے گھر پر سدینے گیا اور جیسا کہ ہماری خواتین کا دستور ہے وہ متونی کے آخری لمحات کی پوری روداد تفصیل سے بتاتی ہیں۔ میں بھی وہیں بیٹھنا رہا تھا۔ ایک جملہ شاید دو بار بولا گیا وہ تھا۔ ”حالانکہ ڈاکٹر جمعہ نے آپریشن کیا تھا، پھر بھی نہ بچ سکا۔“ یہ ”حالانکہ“ اس اعتماد اور شہرت کا ترجمان تھا جو سرجن جمعہ سے منسوب تھی۔

اس کے بعد میں اکثر و بیشتر اخبارات میں پڑھتا رہتا کہ سرجن جمعہ بیرونی دورے سے واپس آگئے یا بیرونی دورے پر جا رہے ہیں۔

میرے شہر والے جانتے ہیں کہ سرجن جمعہ کیا تھے اور کس قدر قابل بھروسا تھے انہیں ایک اساطیری (legendary) حیثیت حاصل تھی۔

ہم جس سے عقیدت رکھتے ہیں اس کے بارے میں ہر اچھی بات پر یقین کر لیتے ہیں اور لوگ بات کچھ بڑھا بھی دیتے ہیں زیروہ داستان کے لیے۔

مجھے علم نہیں اس بات میں کس قدر صداقت ہے کہ سرجن جمعہ کا ایک بیٹا شدید زخمی حالت میں ان کے اسپتال لایا گیا لیکن وہ ایک اور ایمنجینی آپریشن میں مصروف تھے اور اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا اور وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر رشید جمعہ ان کے صاحبزادے اس وقت محکمہ صحت کے بہت بڑے عہدے پر ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ اپنے نامور والد کے مقابلے میں ان کی شہرت کیسی ہے۔ یہ تو مجھے میرے شہر والے ہی بتائیں گے۔

دست عیسیٰ

میرے کالج میں دو بھائی پڑھا کرتے تھے۔ ایک میرا ہم جماعت تھا اور بڑا اگلی کلاس میں تھا۔ دونوں بھائی کھیلوں میں بہت اچھے تھے اور کرکٹ، ہاکی اور ٹیبل ٹینس کی ٹیموں میں شامل تھے۔

دونوں بھائیوں کے چہرے کچھ لمبوترے سے تھے اور کوئی انہیں رنگیلا برادرز اور کوئی کسی اور نام سے انہیں چھیڑتا تھا۔

مجھے کسی نے بتایا کہ ان دونوں بھائیوں اور ان کے سارے اہل خانہ نے اپنی آنکھیں عطیہ کر دی ہیں۔ یقین چاہیے اس دن کے بعد سے مجھے وہ دونوں سب سے زیادہ حسین و جمیل لگنے لگے۔

ان لڑکوں ہی سے پتا چلا کہ اس کی ترغیب انہیں سرجن ایم ایچ رضوی نے دی تھی۔ سرجن، ڈاکٹر رضوی کراچی میں آنکھوں کے مشہور اسپتال اسپنر آئی اسپتال کے بڑے ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے نجانے کتنی آنکھوں کو روشنی بخشی۔

شاید پاکستان کا پہلا آئی بینک بھی انہی کی مساعی سے عمل میں آیا۔ ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں تو ان کے کھپ



لگتے ہی تھے لیکن انہیں اکثر بیرون ملک بھی بلایا جاتا تھا۔
 اسپنسر آئی اسپتال کو انہوں نے ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔
 لیکن اب سننے میں آیا ہے کہ مریض اسپنسر اسپتال کا نام سن کر
 خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔
 ہم نے اپنے مشاہیر کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ
 اس کا غماز ہے کہ

ہم زندہ قوم ہیں!
 یعنی مردوں کی نشانی کو مٹا دیتے ہیں
 تیرے آزار کا چارہ نہیں ہے نشتر کے سوا

☆.....☆

ہماری قوم کا ایک مرغوب مشغلہ ہے ملک کے مسائل کا
 حل تجویز کرنا۔ ہم میں سے ہر کوئی آگینی، پارلیمانی، قانونی،
 سیاسی اور دینی مسائل پر اپنی ایک صائب، رائے رکھتا ہے۔
 ہم چند دوست بھی اپنی منڈلی میں بیٹھے، ایک قومی
 حکومت تشکیل دینے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور ایسے
 ناموں کی تلاش میں تھے جو عوام میں مقبول ہونے کے ساتھ
 ساتھ غیر متنازع بھی ہوں۔ یہ بڑا ہی ٹھن کام تھا کہ پاکستان
 کے آٹھ دس نیک نام لوگوں کے نام تلاش کیے جائیں۔ سب
 سے پہلا نام جو تجویز ہوا وہ بالکل غیر متنازع تھا یعنی عبدالستار
 ایڈمی صاحب کا لیکن چونکہ انہیں رموز مملکت سے شناسائی نہیں
 ہے چنانچہ انہیں بالاتفاق نا اہل قرار دے دیا گیا۔

کچھ نام جو اس وقت معتبر تھے اب متنازع ہو چکے ہیں
 جیسے اپنے فخر و بھائی۔ ایک نام جسٹس مفتی تقی عثمانی صاحب کا
 تھا۔

ایک دوست نے سرجن ادیب رضوی کا نام لیا۔ میں
 تقریباً چالیس سال سے ملک سے باہر ہوں اس لیے یہ نام
 کچھ اجنبی لگا۔ میں نے ادیب سہارنپوری اور میرزا ادیب کے
 نام تو سنے تھے لیکن سرجن ادیب رضوی کے نام سے ناواقف
 تھا۔

بعد میں پتا چلا کہ اس مسیحا صفت شخص نے نجانے کتنوں
 کو دوسری زندگی عطا کی۔ اعضاء کی پیوند کاری اور خاص کر
 گردوں کی پیوند کاری سے کتنے گھروں کے چراغ روشن
 رکھے۔

نہ صرف ایک معالج بلکہ ان کی بے شمار سماجی اور قلمی
 خدمات ہیں اور بجا طور پر حکومت نے نوبل انعام کے لیے ان
 کے نام کی سفارش کی تھی۔

نوبل تو انہیں نمل سکا جس سے ان کی قدر و قیمت میں

کوئی کمی نہیں آئی البتہ نوبل والوں کی قدر ضرور کم ہوئی۔
 شاید نوبل والوں کو پتا چل گیا ہوگا کہ ان کے اپنے شہر
 میں صرف مسلکی وابستگی کی بناء پر ان کے نام کے بورڈ پر رنگ
 پھیر دیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے ایک نوبل پانے والے کو ہم پاکستانی نہیں
 بلکہ اس کے مسلک کی بناء پر مسترد کر چکے ہیں۔ دوسری کو
 امریکی ایجنٹ کہہ کر ہولے ہیں لیکن خود کو کسی شعبہ میں منوانے
 کی کبھی کوشش نہیں کی ہے۔

☆☆☆

میرے ہم عمروں کو یاد ہوگا کہ ریڈیو اور ٹی وی ہماری
 زندگی میں کیا مقام رکھتے تھے۔ کیا کچھ معیار تھا زبان و بیان کا
 اور کیا کچھ ہم سیکھتے تھے اور کس قدر عظیم تھے وہ فنکار جو ہمارے
 ذوق، ہماری تہذیب کی آبیاری کرتے تھے۔

دنیا میں طرح طرح کے فن اور قسم قسم کے فنکار ہیں،
 شو بزنس کا وہ شعبہ ہے جو ہمارے دل و جاں سے قریب تر
 ہے۔ شاید ہی کوئی ہو جو کسی فن اور کسی فنکار سے متاثر نہ ہو۔
 بہت سے اداکار، گلوکار، صداکار ایسے ہیں جنہیں ”لاکھوں
 دلوں کی دھڑکن“ کہا جاتا ہے۔ چکی عمر کے لڑکے، بالیاں
 جنہیں اپنے خوابوں میں دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ عام طور پر
 فلموں اور ڈراموں کے ہیرو ہیروئن ہوتے ہیں لیکن ان کا ایک
 وقت ہوتا ہے۔ ادھر شباب کی ندی اتری ادھر یہ بھی دل سے
 اترتے گئے۔



پیدا ہونے والی منی باجی تاحیات مجرد ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی مقصود۔ جن کا حال ہی میں انتقال ہوا، بھی کوتاہ قد اور بچوں کی سی آواز رکھتے تھے اور آخر عمر تک ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ رہے۔ مقصود کا ایک مقبول پروگرام "ٹائٹنی ٹاٹ" ہوا کرتا تھا جس کا ٹائٹیل ساگ بھی انہی کی آواز میں تھا۔ افسوس کے بہت کوشش کے باوجود بھی منی باجی کی آواز کا کوئی ریکارڈ نہ مل سکا نہ ہی مقصود کے ٹائٹنی ٹاٹ کی کوئی ریکارڈنگ محفوظ ہے۔

تقسیم سے قبل، بہنراؤ لکھنوی کے توسط سے منی باجی دہلی ریڈیو سے وابستہ ہوئیں۔ آزادی کے بعد کے دو سال شہر زندہ دلاں لاہور میں گزارے پھر کراچی چلی آئیں جہاں ان کے گھر والوں نے ریڈیو پاکستان کراچی کے عقب میں، رتن تلاؤ کے علاقے میں رہائش اختیار کی۔ منی باجی کے ابا ریڈیو پاکستان کی کینٹین چلاتے تھے اور جب عمر کی نقدی ختم ہونے آئی تو اپنی بیٹی پروین اختر اور بیٹے مقصود کو یہ کینٹین سونپ دی۔ بابائے نشریات زید اے بخاری کی نظر سے ایسا گویا بھلا کیسے پوشیدہ رہ سکتا تھا، چنانچہ منی پھر ریڈیو پر واپس آئیں اور پینتالیس سال تک ان کی کھلکھلائی ہنسی اور کوئل جیسی آواز ہمارے کانوں میں مٹھاساں اٹھتی رہی۔

منی باجی ساٹھ، ستر کی عمر تک پہنچ کر بھی منی ہی رہیں اور لوگ آخر تک انہیں ایسے ہی چاہتے رہے۔ اب تو کان ترستے ہیں ایسی مٹھی، جلت رنگ کی سی آواز سننے کے لیے۔

لکھنوی بوا

کچھ فنکار ایسے ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنا ہی سمجھتے ہیں۔ یہ ایسے کردار ہیں جو میرے آپ کے گھروں میں ہوتے ہیں اور جب یہ پردے پر نظر آتے ہیں تو لگتا ہے کہ اپنا ہی کوئی ہے۔ ان سے مرعوب نہیں ہوا جاتا بلکہ محبت کی جاتی ہے۔

آج ایسی ہی کچھ ہستیوں کا ذکر ہے جنہیں ہمیشہ ہم نے اپنے دل میں پایا۔ جو ہمیشہ اپنے اپنے سے لگے۔ آج بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو ایک زمانہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

کوئل کی کوک

السلام علیکم بچو! السلام علیکم بھائی جان! اور اس کے ساتھ ہی ایک کھلکھلائی، کھنکھاتی، کلاکاریاں مارتی بچی کی آواز گھر میں ایسے گونجتی جیسے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ جی ہاں یہ ہم سب کی محبوب، منی باجی کی آواز ہوتی تھی اور پروگرام ہوتا تھا، بچوں کی دنیا جس کا نام پہلے بھی نونہال ہوا کرتا تھا۔

بچوں کا یہ پروگرام بڑوں کا بھی پسندیدہ ہوتا تھا۔ پہلے پہل عبدالماجد اور پھر ظفر صدیقی اس کے بھائی جان بنے۔ پروین اختر، یعنی منی باجی البتہ شروع سے آخر تک منی باجی ہی رہیں جو چھوٹے بڑے ہر ایک کی محبوب تھیں۔ چھوٹے انہیں اپنوں میں جانتے تھے اور بڑے انہیں ایک پیاری سی بچی سمجھتے تھے۔

غیر منقسم ہندوستان کے پرفضا پہاڑی مقام، شملہ میں

ہر گھر میں ایک ایسی بوا ہوتی ہیں اور خالہ اسی لیے ہر ایک کو اپنی ہی لگتی تھیں اگر ہم میں سے کسی کو وہ کہیں نظر آجائیں تو کیا ہم انہیں خالہ یا بوا سلام نہیں کہتے۔ ہماری بوا بھی تو ایسی ہی تھیں۔

ٹھسے والی عورت

ٹھسے والی، یہ لفظ بہت پڑھا لیکن معنی سمجھ تب آئے جب اکا بوا کو اسکرین پر دیکھا۔

لکھنؤ کی مسلم تہذیب کا مرقع، شائستگی کا مجموعہ، ایک دور، ایک تہذیب اور ایک طرز زندگی کی نمائندہ، بیگم خورشید مرزا، المعروف اکا بوا کو دیکھ کر بیک وقت، احترام، ادب اور ساتھ ہی محبت کے جذبات ابھر آتے۔ کبھی وہ ایک سخت گیر سربراہ خاندان کے کردار میں نظر آتیں تو کبھی ایک شفیق بزرگ کی سی مسکراہٹ بکھیرتیں۔ جس روپ میں بھی آتیں دلوں پر چھا جاتیں اور پھر اسکرین پر ان کے علاوہ کسی پر نظر ہی نہ ٹھہرتی۔

علیگڑھ مسلم گزٹنگ لاج کے بانی، شیخ عبداللہ کی زمانہ ساز، اپنے دور کے مروجہ رسوم و رواج سے ہٹ کر چلتی والی بیٹیاں، یعنی رشید جہاں، انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانوں میں سے ایک مشہور عالم رسالے انگارے کی شریک مصنفہ اور دوسری خورشید جہاں، جو اس وقت رینوکا دیوی کے نام سے قلموں



میں جلوہ گر ہوئیں جب، تعلیم یافتہ، مسلمان خواتین اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

خالہ عرش منیر البتہ ہمیشہ بزرگ ہی رہیں کہ ہم نے جب بھی سنا اور دیکھا تو ہمیشہ ایک تیز طرار بڑی بی کا ہی تصور ابھرا لیکن خالہ جس روپ میں بھی آئیں ہمیشہ محبوب رہیں۔ ٹی وی اسکرین پر حسین ترین چہروں کے درمیان، سفید چوٹھی اور پان کی سرخی آلود دانتوں والی اس بوا پر سے نظر ہی نہ ہتی کہ جب وہ بولتیں تو لگتا کہ گھر کی دادی یا بوا چوکی پر بیٹھی، چھالیا کترتے ہوئے، چھوٹوں کو ڈانٹ پھٹکار کر رہی ہیں۔

خالہ کی زبان اودھ کے دریاؤں کی دھلی ہوئی، اور ان کے تیز لہجے کے باوجود نشین تھی اور ہوتی کیوں نا؟ لکھنوی بوا اپنے وقت کے صاحب طرز اور عظیم مزاح نگار اور ادیب، شوکت تھانوی کی بیگم جو تھیں۔

عرش منیر اور شوکت تھانوی دونوں نے آل انڈیا ریڈیو سے صداکاری کی۔ پاکستان آنے کے بھی دونوں ریڈیو سے



وابستہ رہے۔ خالہ نے پھر ٹی وی پر بھی کام کیا۔ ریڈیو پر ان کا ڈراما جس میں ان کا مکالمہ ”دعا بے جی آئے تو بتا دیتا“ بہت سوں کو یاد ہوگا۔ کراچی ریڈیو سے طویل ترین عرصہ تک چلنے والے اور مقبول ترین پروگرام ”حامد میاں کی ہاں“ میں عرش منیر اکثر و بیشتر اپنی آواز کی دھنک بکھیرتیں۔

ٹیلی ویژن پر بے تحاشا ڈرامے کیے، جس میں خدا کی بستی، شمع، افشاں اور نجانے کتنے ڈرامے ہیں۔ بہت سوں کو اطہر شاہ خان عرف جیدی کے ”آئی فلا اور باڈی“ یعنی خالہ گلبدن یاد ہوں گی۔

بیگم خورشید مرزا نے کئی ریڈیو پروگراموں کی میزبانی بھی کی لیکن شہرت انہیں ٹی وی ڈراموں سے ملی۔ افشاں، کرن کہانی، زیر زبر پیش، انکل عرفی، پرچھائیاں، انا، ماسی شربتے اور نجانے کتنے ڈراموں میں اداکاری کی لیکن ان کے نام سے کم ہی واقف ہیں البتہ اکابو کو ہر کوئی جانتا ہے۔

علیگڑھ سے کراچی آ کر اودھ کی تہذیب کے رنگ بکھیرے آخر کار شہر زندہ دلان لاہور میں مٹی کی چادر اوڑھ کر سو گئیں اور ایک عہد، ایک زمانہ اپنے اختتام کو پہنچا۔
ڈھونڈ انہیں اب چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

☆☆☆

میرا شہر، عالم میں انتخاب، کبھی ایک بہت پرسکون شہر ہوا کرتا تھا۔ یوں نہیں تھا کہ یہاں آبادی نہ تھی اور لوگوں کی چہل پھل نہ تھی۔ میں نے تو ہمیشہ یہاں رونقیں ہی دیکھیں۔ بڑے سے بڑا سانحہ یا واقعہ ہو، میرے شہر میں زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ ان دنوں بھی جوڑیا بازار، بولٹن مارکیٹ، صدر اور بوہری بازار میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا لیکن ٹریفک اس قدر بے ہنگم نہیں تھا۔ رکشا اور منی بسوں کی ایسی ریل پیل نہیں تھی اور سب سے بڑھ کر ان منحوس گولیوں اور دھماکوں کی آوازیں نہیں تھیں جن سے میرا پورا ملک گونج رہا ہے۔ آدی کو آدی کا ڈرنہ تھا۔ بازار میں چلتے ہوئے جان کا خوف نہیں تھا، دن دہاڑے مال و متاع لٹ جانے کی فکر نہ تھی۔

اس وقت بھی یہ زندگی سے بھرپور، روشنیوں کا شہر تھا جہاں ملک کے کونے کونے سے لوگ آنکھوں میں خواب سجائے آتے اور ان کی تعبیریں پاتے تھے۔ میرے شہر نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔

ہم ہمیشہ شہر کے مضافات میں رہے جہاں زندگی عموماً پرسکون ہوا کرتی تھی۔ پڑوسی ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے محلے کی مائیں سب کی خالہ ہوا کرتی تھیں۔ بزرگ چاہے دوسرے محلے کے ہوں انہیں آتا دیکھ کر ہم کھیل روک دیتے اور انہیں گزرنے دیتے۔ سگریٹ پینے والے اپنی سگریٹ چھپا لیتے۔ بسوں میں نوجوان، عمر رسیدہ لوگوں کے لیے نشست خالی کر دیتے۔

اب سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ کیسے مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف قوموں و مذہب و مسلک کے لوگ باہم شیر و شکر رہتے تھے۔

بہار کالونی میں جہاں ہم سب سے پہلے رہے، ہمارے ہمسایہ ایک عیسائی خاندان تھا۔ ہم کرائے پر رہتے تھے۔ مکان

کے نچلے حصے میں کبھی میمن تو کبھی پنجابی کرایہ دار رہتے۔ سامنے کے گھروں میں ایک گھر کبھی میمن، جن کے پڑوس میں ایک بوہری خاندان رہتا تھا۔ اگلا گھر امر وہے کے سادات کا تھا جہاں مجالس عزا منعقد ہوتیں۔ اس سے جڑے ہوئے مکان میں حیدر آبادی اور آخری مکان ایک پشتون خاندان کا تھا۔

گورنمنٹ اسکول بہار کالونی میں ہمارے ساتھ، اوروں کے علاوہ شیدی، مکرانی، بلوچ اور یہاں تک کہ کبھی ہندو بھی پڑھتے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کی ایک جوڑی بڑی مشہور تھی۔ نام تو جانے ان کا کیا تھا مگر وہ بنگالی اور بہاری ڈاکٹر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

غرض یہ کہ لائڈھی، کورنگی، بہادر آباد سوسائٹی، گلشن اقبال جہاں کہیں ہم رہے پاس پڑوس اور محلے میں، بنگالی، پشتان، پنجابی، راگڑ راجپوت، کاٹھیا واڑی، بوہری، خوہے، بلتی، شیدی، بلوچ یہاں تک کہ سوسائٹی میں ہمارے دوست انڈونیشی بھی تھے۔ کالج میں زنجباری، ایسٹ افریقن، عرب لڑکے ہمارے ساتھ پڑھتے تھے۔ پارسی طلبہ تو ہمارے کالج کی شان تھے اور امتحانوں میں اکثر ہمارے کالج کی پارسی لڑکیاں پوزیشن حاصل کیا کرتیں۔

خیر یہ ایک لمبی کہانی ہے، اس دور کی رواداری اور بھائی چارے کی۔ عرض یہ کرنا تھا کہ مجموعی طور پر راوی چین، ہی چین لکھتا تھا۔ اور ہوا کے دوش پر ایک آواز ایسی تھی جو اس سکوت کو توڑنے کے باوجود خوش کن لگتی تھی اور وہ تھی ریڈیو کی آواز۔

بھلے دنوں میں وقت گزاری کا سب سے بڑا سہارا ریڈیو ہی تھا ریڈیو رکھنا بھی ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں تھا۔ لیکن بقول فرار

”ہوا کسی کی نہیں“

ہوا کی لہروں کے دوش بدوش پاس پڑوس کے لوگ بھی اس سے مستفید ہوتے۔ ہوٹلوں، چائے خانوں اور دکانوں پر سارا دن قلمی گانے اور خبریں وغیرہ با آواز بلند جاری رہتے۔ یادش بخیر، سن ساٹھ کے ابتدائی سالوں کی بات ہے ہمارے محلے کے ایک درزی کی دکان پر کرکٹ کی کنٹری چلتی رہتی۔ محلے کے لڑکے ایک بورڈ پر تازہ ترین اسکور لکھتے رہتے، کوئی راگیٹر رک کر پوچھتا کہ حنیف کی سچری ہوگئی یا فضل کی کتنی وکٹیں ہوئیں۔

ہمارے معمولات بھی ریڈیو پروگرام کے مطابق طے پاتے۔ بارہ بجے کمرشل سرورس کا میوزک سنتے ہی میں اپنا بستہ

سنجھال اسکول کی راہ لیتا کہ لڑکوں کے اسکول دو پہر ساڑھے بارہ بجے شروع ہوتے تھے۔

ریڈیو کے شوقین صرف ایک ہی اسٹیشن پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ ان دنوں اچھے ریڈیو کو جانچنے کا پیمانہ صرف یہ تھا کہ اس پر "سیلون" صاف سنائی دیتا ہو۔

ریڈیو سیلون سے صبح سویرے پرانے گیت اور بدھ کی شام کو بھنا کا گیت مالا کے علاوہ آکاش وانی دلی، ایران زاہدان اور ریڈیو جنوبی ایشیا کے علاوہ خبروں کے لیے بی بی سی بھی بڑے شوق سے سنے جاتے تھے۔

لیکن یہ اسٹیشن خاص پروگراموں کے لیے تھے۔ ہمارا اپنا ریڈیو پاکستان، کراچی اتنے دلچسپ اور متنوع پروگرام پیش کرتا کہ آج بھی کانوں میں وہ آوازیں گونجتی ہیں۔

کراچی ریڈیو کی خوش قسمتی کہ اسے زیڈ اے بخاری جیسا براڈ کاسٹر اور تنظیم ملا۔ اس کے علاوہ ایک سے ایک نادر روزگار صداکار، لکھنے والے، موسیقار، گلوکار اور دیگر فنکار اور ہنرمند میسر آئے۔

آئیے آج چند پروگراموں کو یاد کرتے ہیں۔ ان کا نہ کوئی ریکارڈ میسر ہے نہ ہی مجھے وثوق سے یاد ہے کہ کون سا پروگرام کس دن ہوتا تھا۔ یہ ساری ماضی کی دھندلی سی یادیں ہیں۔

قرآن حکیم اور ہماری زندگی۔ دن کا آغاز علی صبح عام طور پر قاری زاہد قاسمی کی تلاوت قرآن سے ہوتا جس کے بعد مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کا درس قرآن ہوتا۔ پھر اکثر مہدی حسن کی پُرسوز آواز میں ان کی ساتھیوں نسیم شاہین، فریدہ علی اور بدھو الماس کی ہمنوائی میں حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ پیش کی جاتیں جو فضا میں ایک نور بکھیر دیتیں۔ شاید آپ کو بھی یاد ہوں۔

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے زمین کے فرش پر عرش الہی کے مکین آئے شافع روز جزا، اللہ اکبر آگیا وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں اور پھر بھی ناصر جہاں کی منفرد اور پاکیزہ آواز میں۔ "جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں" کانوں میں رس گھولتی۔

اس کے بعد دینی موضوعات پر سید حسن ثنی ندوی، افتخار احمد بلخی اور حمید نسیم جیسے دانشوروں اور علما کی گفتگو ہوتی۔

آٹھ بجے اردو، انگریزی اور بنگلہ میں خبریں ہوتیں۔ بنگلہ خبریں عندل چوہدری اور دلار راہشم پڑھتیں۔ جبکہ انگریزی خبریں انیٹا غلام علی، انور حسین، رضوان واسطی اور ایک بہت ہی مقبول آواز والے ایڈورڈ کی ریڈ پیش کرتے۔ اس سے آپ خبروں کی ادائیگی کے معیار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گیارہ بجے نشریات پھر شروع ہوتیں۔ ساڑھے گیارہ بجے طلبہ کا مقبول پروگرام اسکول براڈ کاسٹ ہوتا۔ یہ ناچیز بھی دو پاراس میں شامل ہو چکا ہے۔ بارہ بجے کمرشل سروس شروع ہوتی جس میں رنگ برنگے اشتہارات کے ساتھ فلمی گانے اور اسپانسرڈ پروگرام پیش کیے جاتے۔ بزم حنی سنز، ایس ایم سلیم پیش کرتے جس میں فلمی ستاروں اور کھلاڑیوں وغیرہ سے بات چیت سنوائی جاتی۔ خواتین کا پروگرام، سنگھی باجی، جسے شاید ڈاڈا والے پیش کرتے تھے، طلعت صدیقی پیش کرتیں۔ شام کو مقامی خبروں کے ساتھ فوجی بھائیوں کا پروگرام ہوتا جسے شمیم اعجاز پیش کرتیں۔ بازار کے بھاؤ ابراہیم نقیس سناتے۔

یہ وہ پروگرام ہیں جو تقریباً ہر روز پیش کئے جاتے جبکہ کچھ پروگراموں کے دن مخصوص تھے۔ جمعہ کی دوپہر نعتیں اور تو الیاں پیش کی جاتیں۔ اسی دن آپ کی خدمت میں زیڈ اے بخاری بھی آتا تھا۔

جمعرات کی شب جب مولانا سلیم الدین شمس اپنی پاٹ دار آواز اور منفرد ترنم کے ساتھ مشنوی مولانا نے روم پیش کرتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔

اور شاید جمعرات کی رات ہی، دیکھتا چلا گیا۔ پیش کیا جاتا، جسے پہلے عبدالماجد اور ان کے انتقال کے بعد ایس ایم سلیم جیسے باکمال صداکار پیش کرتے۔ یہ ہمارے روزمرہ کے رویوں پر تبصرہ ہوتا جس کے آخر میں۔ "سیلانی یہ سب دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور دیکھتا چلا گیا" شاید میرے دوستوں کی سماعتوں میں آج بھی رس گھولتا ہوگا۔

منگل کی رات یا اور مہدی شہر میں ہونے والی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کرتے جسے وراثت مرزا کی خوبصورت آواز میں پیش کیا جاتا۔ منگل ہی کی شب ایک مقبول پروگرام دھنک، جسے بعد میں کہکشاں کا عنوان دیا گیا، پیش کیا جاتا تھا۔ حزاہیہ خاکوں کے اس پروگرام میں، میرے دوستوں کو شاید، فسانہ آزاد کے کردار میاں خوجی کا "نہ ہوئی قرولی ورنہ ہو جاتا کچھ" تو یاد ہوگا۔

پیر کی شب پورا گھر ریڈیو کے پاس بیٹھ جاتا۔ جی ہاں

گھر میں گھنٹیاں بج اٹھتیں۔ جی ہاں یہ سب کی محبوب منی باجی کی آواز ہوتی اور پروگرام ہوتا بچوں کی دنیا جس میں ظفر صدیقی بھائی جان ہوتے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے، گویا کہ کراچی کا قومی ترانہ، یعنی بندر روڈ سے سیماڑی ضرور سنوایا جاتا۔

اتوار کی صبح ایک نہایت شاندار پروگرام ”صبح دم دروازہ خاور کھلا“ آتا جسے محمد فائق کے ساتھ، کونکوں جیسی آواز اور پریوں کی سی صورت والی غزالہ رفیق پیش کرتیں۔ اس میں بڑی نادر اور نایاب چیزیں، مشہور لوگوں کے انٹرویو، بھولے بسرے گیت، دلچسپ باتیں اور نجانے کیا کیا کچھ ہوتا جو آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی ریڈیو کے پاس سے ہٹنے نہ دیتا۔

اسی طرز کا ایک پروگرام طلبہ کے لیے رات کو محمد تقی ”شب کو ہے گنجینہ گوہر کھلا“ کے عنوان سے پیش کرتے لیکن اتوار کی صبح، طلوا پوری یا نہاری کے ناشتے کے ساتھ جو مزہ، صبح دم دروازہ خاور کھلا، میں آتا اس کا عالم ہی نرالا تھا۔

اب سنا ہے کہ سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کے پاس جدید ساز و سامان اور ٹیکنالوجی آگئے ہیں۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے اور ایف ایم اسٹیشن بن گئے ہیں۔

لیکن آپ ایمانداری سے بتائیں ان میں سے کسی کے پاس بخاری صاحب، فکیل احمد، امیر خان، ایس ایم سلیم، عبدالماجد، مہدی ظہیر کا پاسنگ بھی ہے۔

☆☆☆

”تو پھر ویک اینڈ پر کیا کر رہے ہو؟“

یہ وہ سوال ہے جو تو اتار سے ہفتے کے آخری دن میرے دفتر میں دہرایا جاتا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ہفتہ بھر محنت مزدوری صرف چھٹی منانے کے لیے ہی کی جاتی ہے۔ چھٹی کے دن سے زیادہ اس کا تصور چر لطف ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ان ایک یا دو دنوں کے بعد دفتر آنا ہی نہیں ہے۔ کون ہے جو یہ نہ کہے کہ

”جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن“

سکون اور تفریح بھی انسان کی بنیادی ضروریات کا حصہ ہیں۔ ہر کسی کا تفریح اور وقت گزاری کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کوئی کھیل کود، ناچ گانے اور سیر و تفریح کا دل دادہ ہوتا ہے، کسی کو اپنے پیاروں سے ملنے کا اشتیاق ہوتا ہے، کوئی اپنے ہفتہ بھر کے ذاتی کام چھٹی کے دن نمٹاتا ہے۔ کوئی اس فرصت کو غنیمت جانتا ہے اور گھر میں برمت، صفائی وغیرہ میں

اس دن اسٹوڈیو نمبر نو پیش کیا جاتا تھا۔ مجھے اب تک بخاری صاحب اور ایس ایم سلیم کا لائٹ ہاؤس کا محافظ، آواز کے سائے اور کریم کے جوتے اور بہت سے ڈرامے یاد آتے ہیں جو کئی بار پیش کئے گئے۔

پینٹھ کی جنگ کے بعد، شاہ بلخ الدین کا، ہماری کہانی تاریخ کی زبانی ایک بہترین اور سبق آموز پروگرام تھا۔ اسی طرح اکہتر کی جنگ کے دوران طلعت حسین گھن گرج کے ساتھ، جو اب عرض ہے میں دشمن کے پروپیگنڈے کا جواب دیتے۔ اس پروگرام کو چند ایک بار اداکار محمد علی نے بھی پیش کیا لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی۔

ہفتہ طلبا کے لیے نہ صرف طلبا بلکہ شہر کے بہت سے بڑھے لکھے لوگ بھی رات دیر گئے تک جاگتے۔ اس میں مقابلہ حسن قرأت، مشاعرہ، اردو اور انگریزی مباحثے کے علاوہ میرا سب سے پسندیدہ پروگرام، مقابلہ معلومات عامہ جسے میجر آفتاب اور محمد فائق پیش کرتے اور آخری دن ادبی محاکمہ خاصے کی چیز ہوتا۔

کئی، فنبال اور ہاکی کی کنٹری میں ایس ایم تقی اور کرکٹ کی کنٹری میں عمر قریشی اور جمشید مارکر کی جوڑی کا جوڑ آج تک نہیں پیدا ہو سکے۔

موسیقی کے پروگرام، نذر حسین، مہدی ظہیر، لعل محمد اقبال، امراو بندو خان وغیرہ پیش کرتے۔ نجانے کس دن، رات کے وقت گیتوں بھری کہانی پیش کی جاتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے پروگرام میرے دوستوں کی یاد سے محو ہو گئے ہوں لیکن اتوار کے دن کے چند پروگرام ایسے ہیں جنہیں شاید ہی کوئی بھلا پائے۔

اتوار کی صبح پیامی (عبدالکیم) آپ کے خط پیش کرتے۔ اس کے بعد کراچی ریڈیو کی تاریخ کا طویل ترین عرصہ تک چلنے والا اور مقبول ترین پروگرام، حامد میاں کے ہاں، جسے انتصار حسین لکھتے تھے آتا۔ یوں لگتا جیسے ہم حامد میاں کے گھر بیٹھے ہوں۔ حامد میاں (امیر خان) کا یہ دیکھنے گا ان کی بیگم صنیہ معینی کا میں کہہ دیتی ہوں۔ اور ان کے سالے انجم (افضل صدیقی) کے ”جناب والا“ آج بھی کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ اس کے علاوہ، صفدر (جمشید انصاری) اور احسان (محمود علی) اور حامد میاں کے پڑوسی (نام یاد نہیں رہا) ان کی ملازمت اب بھی زندہ محسوس ہوتے ہیں۔

دس بجے، السلام علیکم بچوں اور السلام علیکم بھائی جان کے ساتھ ایک ہنسی بھلکھلائی آواز ابھرتی تو گویا سارے

مصروف ہوتا ہے۔ کوئی یہ دن پڑھنے لکھنے میں گزارتا ہے تو کسی کے لیے یہ دن اپنے رب کی عبادت کا ہوتا ہے۔ اور کچھ بلکہ بہت سے لوگوں کے لیے چھٹی کے دن کا مطلب صرف اور صرف آرام کرنا ہوتا ہے اور وہ جی بھر کے اپنی نیند پوری کرتے ہیں۔

ذاتی طور پر مجھے صرف سوکر تعطیل گزارنا سخت ناپسند ہے۔ صرف آرام کرنے کو میں چھٹی کے دن کو ضائع کرنے کے مترادف سمجھتا ہوں انسان جو بیس گھنٹوں میں اپنی ضرورت کے مطابق آرام کر ہی لیتا ہے۔ چھٹی کے دن کا سب سے بڑا انعام وہ بے فکری ہوتی ہے جو کم از کم اس دن کے لیے میسر آتی ہے۔

آج سے ربیع صدی قبل شاید ہم ان سہولیات اور آسائشوں کا تصور بھی نہ کر پاتے جو آج ہمیں میسر ہیں۔ مثلاً قلم دیکھنا ایک زمانے میں ایک بہت بڑا کام نظر آتا تھا، اہل خانہ کے ساتھ گھر سے تیار ہو کر نکلنا، سواری کا بندوبست کرنا، سنیما ہال پہنچ کر ٹکٹ کے لیے ٹک دو، انٹروں میں بولکوں اور بن کباب یا کافی وغیرہ سے لطف اندوز ہونا۔ اب یہ سب کچھ آپ کی انگلی کی ایک جنبش کی مار ہے۔ اب کوئی بھی فلم، کسی بھی وقت اپنے اسمارٹ فون یا لپ ٹاپ یا آئی پیڈ پر۔

”اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی“

انسان سدا کا ناشکر ہے۔ کیا ہمارے خواب و خیال میں بھی تھا کہ وہ وقت بھی آئے گا جب ہر دوسرے کے پاس اپنی ذاتی سواری ہوگی۔ مزدور کے گھر بھی ریلین ٹیلی ویژن ہوگا، موبائل فون تو اب پرانی چیز ہوئے، اب مجھے اپنے فون پر پیغام ملتا ہے کہ منظور بھی اب واٹس اپ یا آئی ایم او پر ہے۔ اور یہ منظور وہ ہے جو میرے گھر کام کرنے آتا ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ، پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ان دنوں کو یاد کرتے رہتے ہیں جب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ کچھ تو ایسا ضرور رہا ہوگا کہ بیٹے دنوں کی سہانی یادوں سے دل میں گھنٹیاں سی بج اٹھتی ہیں۔

ایک عجیب ہی کیفیت ان دنوں ہوتی تھی چھٹی کے دن کی۔ دو باتیں ایسی تھیں کہ اتوار کا دن عام دنوں سے الگ لگتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ابا جنہیں ہفتے بھر ہم صرف صبح سویرے کام پر جاتے اور رات گئے گھر آتے دیکھتے، وہ سارا دن گھر پر ہوتے اور ہمیں گھر بھر ابھرا اور روشن سا لگتا۔

دوسرے یہ کہ ہفتے بھر لگا بندھا ایک سا ناشتا ہوتا لیکن اتوار کے دن بالکل الگ ناشتا ہوتا اور یہ اس پر منحصر ہوتا کہ یہ

مہینے کا کون سا دن ہے۔ شروع کے اتوار گھر والے صبح ایک برتن یا ڈونگہ ہاتھ میں پکڑا دیتے کہ جاؤ فلاں جگہ سے نہاری لے آؤ۔ رات یا دن کے وقت نہاری کھانا تو آج کے دور کی بدعت ہے۔ ہمارے دنوں میں یہ صرف ناشتے یعنی، نہار منہ کھائی جاتی تھی۔

یا پھر حلوا پوری منگوائی جاتی لیکن یہ کبھی کبھار کے چونچلے ہوتے، ہفتے کی شام دفتر سے آتے ہوئے ابا صدر کی ایپریس بیکری سے، ہرسک یا ٹوسٹ، جسے ہم کراچی والے پیار سے، باپے، کہتے ہیں، لیتے آتے جن کا اپنا ہی سواو تھا۔

پھر کبھی امی میٹھی ڈبل روٹی یا مالپوے بنا تیں، ہم کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کرتے تھے کہ ماں جو کچھ بناتی تھیں لا جواب ہوتا تھا اور مجھے یقین ہے آپ کی امی بھی جو کچھ بناتی ہوں گی ایسا ہی مزیدار ہوتا ہوگا۔

لڑکے بالے ایک دوسرے کے گھر کے ساتھ بے چوہترے یا تھڑوں پر بیٹھے گپ شپ لڑا رہے ہوتے تو کوئی بڑوسی چار پائی یا چوکی گلی میں ڈال دیتا یا کوئی چٹائی یا دوری کسی سا بنان کے نیچے یا چوہترے پر بچھا دیتا اور تاش، کیرم یا شطرنج کی بازیاں بچھتیں اور ساتھ چائے اور سگریٹ کے دور چلتے۔

کوئی اپنی سائیکل کھول کر اس کی مرمت میں لگ جاتا، کوئی نو ہے کی استری میں کوسلے دکھا کر ہفتے بھر کے کپڑوں پر استری کر رہا ہوتا تو کوئی گھر بھر کے جوتے جمع کر کے اسے چیری بلاسم یا کیوی پالش سے چکار رہا ہوتا۔ کوئی ٹوٹی کرسی جوڑ رہا ہوتا تو کوئی چار پائی کے بان کس رہا ہوتا۔

اخبار کسی کسی گھر میں آتا لیکن اتوار کا اخبار اور ان دنوں کے مقبول اخبار، جنگ، انجام اور حریت کے اتوار ایڈیشن، خاص کر جنگ کا نیلے سرورق والا اخبار ہاتھوں میں پھیلے ہوتے۔

یہ سب کچھ تھا اور کسی نہ کسی صورت، کچھ کم یا زیادہ، اب بھی ہے لیکن ایک یاد جو بچپن کے ساتھ ہی چلی گئی لیکن میرے شہر والوں کے دل سے کبھی نہ جاسکے گی وہ ہے کراچی ریڈیو کے مقبول پروگرام ”حامد میاں کے ہاں“ کی۔

حامد میاں کا گھر شہر کے ہر گھر میں تھا اور شہر کا ہر گھر حامد میاں کا گھر تھا۔

اتوار کی صبح پرائیڈوں کی خوشبو میں آنکھ کھلتی اور گھر میں ایک اور گھر کا شور مچا ہوتا اور یہ شور ہوتا حامد میاں کے گھر آنے کا۔

کانوں میں حامد میاں کی پاٹ دار اور بارعب آواز آتی۔ ”اور

مزاج کارنگ لیے ہوئے یہ متنی کردار معاشرے کے لاپرواہ، بے حس اور لاابالی عنصر کی نمائندگی کرتا۔ جس میں بے اصولی، قانون شکنی، سستی، کاہلی ٹوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے آخری دنوں میں ایک اور کردار شاہد کا شامل ہو گیا تھا جو بظاہر تو انجم کا چہلا ہوتا ہے لیکن انجم کے کارناموں کی خبریں حامد میاں اور اپنی خالہ یعنی بیگم صاحبہ تک پہنچاتا۔

نصیر الدین، حامد میاں کے پڑوسی کبھی کبھار اپنی پوربی زبان سمیت آتے اور کسی دن ہم سب کی بوا، ہماری آپ کی عرشی خالہ یعنی عرش منیر بھی اپنی جھلک دکھلا دیتیں جن کی آواز تو گویا ہر گھر کی آواز ہوتی کہ نانی، دادی یا بوا تو ہم سب کے ہاں ہوتی ہی ہیں۔

حامد میاں کا گھر ایک جیتا جاگتا گھرانہ لگتا جس کے کرداروں کی بات چیت میں نام کو بھی تصنع نہیں ہوتا تھا اور یہ ہماری تمہاری طرح کے ہوتے۔ میرے شہر کی حسین یادوں میں، حامد میاں کا یہ دیکھیے گا، بیگم صاحبہ کا، میں کہے دیتی ہوں اور انجم کا جناب والا، یا، ہمارے گھر میں کہہ رہی تھیں، یا ”پھول والی آئیں تو ہم کہہ دیں گے“ جیسے مکالمے، ایک عہد کے انداز گفتگو، ایک زمانے کے چلن اور رنگ ڈھنگ جو اب خواب و خیال ہوئے جن کی بس یاد ہی رہ گئی ہے جو کبھی کبھار دل کے نہال خانے میں روشن ہو کر کسی اور زمانے میں لے جاتی ہے۔

سپنے سہانے لڑکپن کے میرے ننوں میں ڈولیں بہا رہن کے۔
☆☆☆

(ترجمہ) یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا (البلد) سدھارتھ نے جب آنکھ کھولی تو اپنے چاروں اور دکھ، تکلیف، اشنائی اور کٹھنائیں پائیں۔ سارے جگ میں کون تھا جو دکھی نہیں تھا۔ اس کا حساس من اتنے دکھ دیکھ نہیں پایا اور دنیا کو تیاگ کر نروان کی تلاش میں بن میں جا کر بس گیا۔ اس کی تپسیا نے اسے ادھ موا کر دیا یہاں تک کہ پیٹ پیٹھ سے لگ گیا اور اس کا شریر ہڈیوں کا بنجر بن کر رہ گیا۔

گوتم (سدھارتھ) نے تو دنیا سے کچھ موڑ کر اپنے من کو سکھی کرنا چاہا مگر وہ کیا کرتے جو اس دکھ ساگر میں ہاتھ پاؤں مارنے کے لیے رہ گئے تھے۔

دنیا میں ایسا کون ہے جسے کوئی نہ کوئی دکھ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے دوسروں کے سامنے اپنا بھرم رکھنے اور غم کو چھپانے کا سلیقہ سیکھ لیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ جو بیٹھا نس رہا ہے اپنے اندر کیا کیا لیے ہوئے ہے۔

دکھ کا کوئی ایک نام نہیں۔ کوئی بھوک سے بے حال ہے تو

یہ دیکھیے گا۔“ ان کا تکیہ کلام سنائی دیتا۔ پھر باورچی خانے سے ان کی بیگم کی زوردار آواز آتی۔ ”اے ہاں میں کہے دستی ہوں۔“ جو اپنے چھوٹے بھائی انجم کو ڈانٹ رہی ہوتیں اور انجم میاں اپنے لاابالی انداز میں۔ ”ہم سے نہیں ہو سکتا جناب والا۔“ سے اپنے بہنوئی اور بہن کی بات کو ہوا میں اڑا رہے ہوتے۔ یا پھر حامد میاں اپنے برادر خورد احسان کے ساتھ کسی نئے مسئلے یا قانون پر بات کر رہے ہوتے۔ کبھی کبھار حامد میاں کے پڑوسی اپنی پوربی زبان میں کوئی شکایت لیے چلے آتے۔

سارے کردار اور ساری باتیں یوں لگتا کہ جانو ہمارے گھر میں اور ہماری ہی ہو رہی ہیں اور یہ آوازیں میں اپنے ہوش سنبھالتے ہی سنتا آ رہا تھا کہ یہ پروگرام میری پیدائش سے بہت پہلے یعنی 1950ء میں شروع ہوا تھا۔ زیادہ تر اسے انتصار حسین نے تحریر کیا بہت بعد میں دوسرے لکھنے والے بھی آئے جن میں انجم کا کردار ادا کرنے والے، امن اخبار، کے ایڈیٹر، افضل صدیقی بھی شامل تھے۔

گردار اور یارعب آواز کے مالک، امیر خان، حامد میاں کا مرکزی کردار ادا کرتے۔ حامد میاں جو ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم، ایک با اصول انسان، ایک قانون پسند شہری اور ایک خاندان کے ایسے سربراہ تھے جو ہر اچھے اور صحت مند معاشرے کو مطلوب ہیں۔

حامد میاں کی بیگم صاحبہ، صفیہ معنی جیسی کہتے مشق فنکارہ جن کا کردار ادا کرتی تھیں۔ ہمارے گھروں کی وہ خاتون جنہیں روزمرہ کے مسائل کا سامنا رہتا ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو جھیل رہی ہوتی ہیں اور نخیل پسند حامد میاں کے سامنے مہنگائی، ملاوٹ، بے ایمانی کار و نارتیں اور ہمارے معاشرے کی اصل تصویر دکھائیں۔ اور ہماری ضروریات کی ترجمانی کرتیں۔

جمشید انصاری، یعنی حامد میاں کے بیٹے صفدر ایک شریف اور پڑھے لکھے نوجوان، کا کردار ادا کرتے۔

ہمارے ایک اور محبوب فنکار، محمود علی، حامد میاں کے بھائی کا کردار ادا کرتے۔ یہ بھی اپنے برادر بزرگ کی طرح شریف اور اصول پسند انسان تھے لیکن معاشرے کے متنی پہلوؤں سے بھی واقف تھے۔ نخیل پسند حامد میاں ایک مثالی معاشرے کی ترجمانی کرتے جبکہ احسان حالات حاضرہ سے باخبر ایک عملی شخصیت تھے۔

لیکن جس کردار سے اس پروگرام میں رنگینی تھی وہ تھے حامد میاں کے برادر دستی، یعنی سالے صاحب، انجم جن کا نام تھا جسے مشہور صحافی اور اخبار اسن کے مدیر افضل صدیقی پیش کرتے۔

کوئی کسی روگ اور بیماری کے ہاتھوں پریشان ہے اور غربت تو ہے ہی تمام دکھوں کی ماں۔

پھر کوئی اولاد نہ ہونے پر افسردہ ہے تو کوئی اولاد ہی کے ہاتھوں دکھی ہے۔ کوئی مال و دولت کے انبار لیے بیٹھا ہے لیکن تنہا ہے اور کوئی کثیر العیال ہے لیکن کنگال ہے۔ کوئی اپنی ضرورت کے لیے عزت کا سودا کر رہا ہے اور کہیں کوئی سفید پوش غیرت مند اپنی مشکل دوسروں سے کہنے سے پہلے نجانے کس کرب سے گزر رہا ہے۔ کہیں بوڑھے والدین بیٹی کے بالوں میں چاندی کے تار دیکھ کر ہول کھا رہے ہیں اور کہیں کوئی کسی کو یاد کر کے رورہا ہے۔

ایسے میں وہ جوان دکھوں کے چہرے پر مسکان لانے کے جتن کرتے ہیں، یقین کیجئے بہت بڑا کام کرتے ہیں۔ جو دوسروں کو خوش کرتے ہیں، انہیں ہنساتے ہیں اور ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھتے ہیں، انسانیت کے محسن ہیں۔

لیکن کوئی نہیں جانتا کہ جو دوسروں کی زندگیوں میں رنگ بکھیرتے ہیں خود کس عالم میں ہوتے ہیں۔

”خود اندھیرے میں ہیں اوروں کو دکھاتے ہیں چراغ“
ایسے چند لوگوں کو میں نے ذرا قریب سے جھانکا تو ہنسا کہ یہ تو اپنے سوز کو ترم اور اپنی آہ کو تہسم میں ڈھالنے والے فنکار ہیں۔

ہمارے دور کے سب سے عظیم مزاحیہ فنکار معین اختر کے ساتھ مجھے بحرین میں دو دن ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان کے ساتھ ایک فلم بھی دیکھی۔ ان دو دنوں میں، میں نے ایک بار بھی معین کو ہنستے یا مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ وہ پوری سنجیدگی سے اپنے پروگرام اور سماجی فنکاروں تاج ملتان اور نگہت سیما کی ریہرسل پر توجہ دے ہوئے تھے۔

سوسائٹی میں ہمارے محلے (حیدر علی روڈ) کے قریب پہاڑیوں میں فلم نئی بلی نیا جنموں کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اداکار کمال اور اداکارہ نسیم خان تو ایک کار کی چھت سے کہنیاں نکائے باتوں میں مصروف تھے۔ ان سے ہٹ کر ایک طرف کرسی پر لہری صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ یقین کیجئے کہ اگر کوئی مجھ سے لفظ گھمبیرتا کے معنی پوچھے تو میں اسے لہری صاحب کی اس وقت کی تصویر دکھا دوں۔

لیکن جو چہرہ مجھے نہیں بھولتا وہ اداکار تھا کاہے۔ انہیں پروے پر ہمیشہ ہنستے بولتے ہی دیکھا لیکن ایک بار میں کراچی میں میٹرو پول ہوٹل کے سامنے ٹیکسی کی تلاش میں کھڑا تھا کہ ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رکی۔ ایک شخص اتر کر ہوٹل میں غائب ہو گیا۔ میں ڈرائیور سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ کیا ٹیکسی

خالی ہے کہ میری نظر پچھلی سیٹ پر، پولیس کی وردی میں ملبوس ایک گول مٹول سے شخص پر پڑی۔ یہ ننھا تھے اور کسی فلم کی شوٹنگ سے آرہے تھے۔ یقین جانیے ان کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر خوف آ رہا تھا۔ چند سال بعد سنا کہ ننھانے خودکشی کر لی۔ نجانے کیا دکھا سے کھائے جا رہا تھا۔

یہ واقعہ شاید آپ نے سن رکھا ہو۔ مضاقتہ نہیں کہ ایک بار اور سن لیں۔

ایک شخص ڈاکٹر کے پاس گیا کہ ڈاکٹر صاحب میں ہر طرح سے صحت مند ہوں بس ایک بیماری ہے کہ مجھے ہنسی نہیں آتی۔ کئی سال ہو گئے مجھے ہنسنے ہوئے۔ میں ہنسا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر نے کہا تم بڑے صحیح وقت میں آئے ہو۔ تمہارا علاج آسان ہے۔ آج کل شہر میں سرکس آیا ہوا ہے وہاں پیٹر نام کا ایک مسخرہ (کلاؤن) ہے۔ وہ اس قدر مزیدار حرکتیں کرتا ہے کہ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم پیٹر کا تماشا دیکھو گے تو فوراً ہنس پڑو گے۔ اس شخص نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب..... میں ہی تو پیٹر ہوں۔

ایسے ہی کئی پیٹر میرے شہر والوں کو ہنساتے رہے۔

شہر میں ہونے والے دراکٹی پروگراموں اور فنکشنوں نے ہمارے ملک کو فن کی دنیا کے کئی بڑے نام دیے۔ لہری، نرالا، معین اختر، آغا سرور، رگیلا کراچی والا، صلاح الدین طوفانی، افضل و شوکت، صبغت اللہ باری وغیرہ ان پروگراموں کی جان ہوتے تھے۔

آج کے شہنشاہ ظرافت عمر شریف پر تو کبھی تفصیل سے بات ہوگی، میں آج کچھ ایسے فنکاروں کو یاد کر رہا ہوں جن کے نام تو اتنے مشہور نہیں لیکن میرے نزدیک یہ فنکار کسی بھی پر اشارے کم نہیں۔

الف اور نون ایک بے حد مقبول پروگرام تھا اور اس میں معاشرے میں پچھلی بے ایمانی اور منافقت کا کچھ کھولا جاتا تھا لیکن یہ ٹی وی کے بہت ابتدائی دنوں میں پیش ہوا۔ پھر چند سال بعد اسے دوبارہ اور رنگین پیش کیا گیا، پھر اس کے پروگراموں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں تھی۔

فنٹی فنٹی وہ پروگرام تھا جس نے مقبولیت کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس کی ایک وجہ تو اس میں پیش کیے جانے والے چھوٹے چھوٹے خاکے ہوتے تھے جن سے ہر ذوق اور عمر کے ناظرین محظوظ ہوتے تھے، پھر یہ بڑے متنوع ہوتے تھے ان میں قصے، فلموں کی نقلیں، گانے، انٹرویو، خبریں اور حالات حاضرہ پر فوری طنز اور نجانے کیا کچھ ہوتا تھا اس کی

سب سے بڑی خوبی ان خاکوں کا عام فہم ہونا تھا۔

فنشی فنشی کے فنکاروں کی تو خوبیاں کیا بیان کروں۔ گو کہ اس میں اشرف خان، نچی کمال، رؤف عالم، عادل واڈیا، لطیف کیاڈیا، بشری انصاری اور عمر شریف نے بھی کام کیا لیکن جو شہرت اسماعیل تارا، ماجد جہانگیر اور زینا شہناز کے حصے میں آئی اور جس طرح ان تینوں نے اپنے فن کا سکہ بٹھایا وہ آج تک ناظرین کے ذہنوں میں موجود ہے۔

اگر میں اس کے مختلف یادگار خاکوں کی بات کروں تو یہ بات بہت طویل ہو جائے گی۔ میرے سارے احباب ان تینوں کو جانتے ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔

میں تو فقط آپ کو یاد دلانا چاہ رہا تھا کہ فنشی فنشی والے میرے ملک کا فخر ہیں اور یہ میرے شہر میں رہتے تھے۔ پچھوٹے نام کا بہت بڑا فنکار۔

بد قسمتی سے ہمارے ہاں فن کو ناپنے اور جانچنے کے پیمانے صرف مرکزی کرداروں تک محدود ہیں۔ ریڈیو ٹی وی پر بے شمار ایسے فنکار ہیں جن کے نام بھی لوگ نہیں جانتے لیکن وہ صلاحیت میں بڑے بڑے سپر اسٹارز سے کہیں آگے ہیں۔

مثلاً لاہور ٹی وی کے ایک فنکار ایوب خان تھے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اگر وہ کہیں مغرب میں ہوتے تو ان کا درجہ بڑے فنکاروں میں ہوتا جب کہ ہمارے ہاں شاید بہت سے ان کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے۔

ملک انوکھا بھی ایسے ہی ایک فنکار تھے۔ انہیں مزاجیہ اداکاروں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن وہ ایک حقیقی اداکار تھے۔ جو بھی کردار وہ ادا کرتے تھے وہ بالکل اصل معلوم ہوتا۔ مختلف زبانوں اور ان کے مخصوص لہجے پر انہیں ایسی قدرت حاصل تھی کہ میں بہت عرصہ تک ان کی زبان اور قومیت نہیں جان سکا۔

وہ سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، مارواڑی اور نجانے کتنے لہجوں پر قادر تھے اور یہ ساری زبانیں بولنا بھی جانتے تھے۔

دوبئی چلو کا شاطر نورس باز، وارث کا مہنگا، میٹھیوں کا پولیس حوالدار، باادب با ملاحظہ کا شہزادہ اور منڈی کا آڑھتی کا پیشی۔

ان کی بول چال، لباس، چال ڈھال ایسی ہوتی کہ صرف وہ کردار یاد رہ جاتا۔

میرے نزدیک ملک انوکھا ایک بہت قد آور فنکار تھا

اور پھر وہ میرے شہر کا بھی تو تھا۔

اللہ اس کی روح کو سکھی رکھے کہ وہ ہمیں خوش رکھتا تھا۔

☆☆☆

بہت سوچا، سر کھپایا لیکن سمجھ نہ پایا کہ یہ چیز جسے محبت کہتے ہیں، یہ کیونکر ہوتی ہے۔ اس عالم رنگ و بو میں بے شمار دل کو موہ لینے والے، حواس پر چھا جانے والے، ایک سے بڑھ کر ایک حسین، طرح دار، باکمال، شاندار بلکہ عظیم الشان لوگوں سے پالا پڑتا ہے۔ لیکن دل کسی کسی کو ہی اس طرح چاہتا ہے جسے محبت کہا جاتا ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو اس کا باعث بنتی ہے، کسی کو کوئی صورت بھا جاتی ہے، کسی کی کوئی ادا دیوانہ کر دیتی ہے، کسی کا کوئی کارنامہ، کوئی صلاحیت اس طرف مائل کر دیتی ہے۔ کوئی نہ کوئی تعلق کسی نہ کسی صورت ضرور ہوتا ہے۔ بنا کسی تعلق کے پسندیدگی تو ہوتی ہے محبت نہیں ہوتی۔ اور شاید اس طرح بھی محبت ہوتی ہو لیکن کیا ایسا بھی کوئی ہے جس سے سارا عالم بغیر کسی تعلق کے محبت کرتا ہو۔ آپ کہیں گے ایسے بہت سے ہیں جنہیں غیر بھی چاہتے ہیں، جیسے ٹیکس منڈیلا، گوتم بدھ، مذکر ٹریا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ حوالے بہت ہی محدود اور کسی خاص شعبے کے حوالے سے ہیں۔

آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن میرا دعویٰ ہے کہ موجودہ دنیا میں ایک ہی شخص ایسا ہے جس سے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرے ہوئے بلکہ دنیا کے ہر خطے کے لوگ پیار کرتے ہیں، جسے ہر کوئی اپنا جانتا ہے۔ جس کے لیے کبھی ایک عالم دعا گورہتا تھا۔ اور اس سے نہ تو کوئی علاقائی تعلق تھا، نہ وہ ہماری زبان بولتا تھا، کچھ لوگ شاید مذہب کی بات کریں، تو اس کے جاننے والے افریقہ، لاطینی امریکا، مشرق بعید اور دنیا بھر کے وہ لوگ بھی ہیں جن کا مذہب و مسلک بھی مختلف ہے۔ نہ ہی اس شعبے کی وجہ سے وہ محبوب تھا جو اس کی وجہ شہرت ہے، کہ میں نے اپنے گھر کی بڑی بوڑھیوں کو اس کے لیے دعائیں کرتے دیکھا ہے جنہیں یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کرتا کیا ہے۔ پچھلے سو سال میں محبوبیت اور مقبولیت میں کوئی اس کے پاسگ بھی نہیں۔

جی ہاں میں بات کر رہا ہوں اس کی جو اپنے آپ کو عظیم ترین کہتا تھا، جو غلطی کی طرح رقص کرتا تھا لیکن مقابل کے لیے اس کا ڈنک بھڑ سے۔۔۔ بھی زیادہ تند ہوتا تھا۔ جو بڑ بولا مشہور تھا لیکن دنیا اس کی گلفشانوں پر مرتی تھی۔ جو مخالف کو اپنی زبان درازی سے ہی زیر کر لیتا تھا اور سننے والے اس کی بات سے کبھی بے مزہ نہ ہوتے کہ وہ تو اس کی ایک ایک ادا پر مرتے تھے۔

جی، یہ اسی محمد علی کی بات ہے، وہ جو چہرے پر ایک بچے

کی سی مصیبت لئے ہوتا لیکن مسکراہٹ جس کی شرارت سے بھرپور ہوتی اور جب وہ اپنے حریف کے مقابل ہوتا تو بجلی کی سی تیزی سے مخالف پر ٹوٹ پڑتا۔ اس کے مقابل روایتی انداز میں، ایک ہاتھ سے چہرے کا دفاع کرتے اور دوسرے ہاتھ سے اسے ضرب لگانے کی کوشش کرتے لیکن یہ ہمیشہ دونوں ہاتھ نیچے لٹکائے، ایک ایسے خوبصورت انداز میں رخص کرتا ہوا رنگ کے چاروں طرف چکر لگاتا کہ دیکھنے والے جھوم جھوم جاتے۔ جو مخالف کے وار کو ہاتھوں پر روکنے کی بجائے اس پھرتی سے جھٹکائی دیتا کہ حریف اپنی ہی جھوک میں لڑکھڑا جاتا اور اسی دوران یہ اس کے چہرے پر زوردار ضرب لگا چکا ہوتا۔

محمد علی، باکسنگ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ، جس سے پہلے اور جس کے بعد دنیا نے باکسنگ جیسے وحشی کھیل میں دلچسپی نہیں لی سوائے ان کے جو اس کھیل کو پسند کرتے ہیں یا حصہ لیتے ہیں۔ علی کے کیریئر کے دنوں میں تو بچے، بوڑھے، مرد و زن،



امیر غریب، عربی، مجھی اور کافر و مسلم سب اسی کے گن گاتے اور اسی پر مرتے۔ وہ رنگ میں اترتا تو فضا "علی، علی!!" کے نعروں سے گونج رہی ہوتی۔

اور کیوں نہ ہوتی۔ ایسا مبارک نام جس کا ہو وہ ناکام کیونکر ہو۔ ازل سے ابد تک کائنات کی محبوب ترین ہستی اور ان کے محبوب عم زاد کے ناموں کے امتزاج سے زیادہ مبارک نام اور کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے بچپن سے حیرانگی ہوتی تھی کہ اس نام کے لوگوں کو میں نے ہمیشہ نمایاں دیکھا۔

ہوش سنبھالتے ہی اللہ اور اس کے پیارے رسولؐ کے بعد جس نام سے عقیدت ہوئی وہ ہمارے قائد اعظم کا نام تھا۔ لیکن بچپن میں ہم صرف انہیں قائد اعظم ہی کے نام سے جانتے تھے۔ دو تین جماعت پڑھنے کے بعد ان کے پورے نام یعنی 'محمد علی جناح' کا علم ہوا۔ لیکن اس دوران ایک اور محمد علی کا نام جا بجا نظر آتا تھا وہ تھے 'محمد علی چاولہ' جو قسطوں پر لکھے، سلائی مشین اور ریڈیو دیتے تھے اور ان کے نام کے بورڈ اور اخبارات میں اشتہارات نظر آتے۔ پھر تیسری جماعت میں آئے تو ایک دن اسکول پہنچ کر پتا چلا کہ ملک کے وزیر خارجہ 'محمد علی بوگرہ' کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر سے ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ اس دن اسکول ان کے انتقال کے سوگ میں بند رہا۔ پھر دو سال بعد فاطمہ جناح اور ایوب خان کے درمیان الیکشن ہوئے تو ایک اور محمد علی کا نام بہت نمایاں تھا یعنی نظام اسلام پارٹی کے سربراہ چوہدری محمد علی، جو شاید وزیر اعظم بھی رہ چکے تھے۔ انہی دنوں ایک خوب روادا کار کی تصویریں فلموں کے اشتہاروں اور اخبارات کے فلمی صفحات پر چھائی ہوئی تھیں اور یہ تھے اداکار محمد علی۔ اور میرا یہ یقین راسخ ہو گیا تھا کہ اس نام کے لوگ زندگی میں ہمیشہ نمایاں رہتے ہیں کہ یہ دو مبارک ترین ناموں کا امتزاج ہے۔ لیکن اس محمد علی سے ہمارا تعارف محمد علی کے نام سے نہیں بلکہ "کاسیس کلتے" کے نام سے ہوا اور اس کے بعد بھی ہم اسے محمد علی کلتے ہی پکارتے رہے۔

اور یہ کہانی شروع ہوتی ہے 1964 سے جب ایک دن اخبار میں پڑھا کہ روم اولمپک کے ہومی ویٹ باکسنگ چیمپین کاسیس کلتے نے عالمی چیمپین 'سونی لسنٹن' کو شکست دے دی۔ (یہ وہی روم اولمپک تھا جس میں پاکستان نے بھارت کو ہرا کر پہلی مرتبہ اولمپک ہاکی میں سونے کا تمغہ جیتا اور ہاکی کی دنیا میں اپنی آمد کا اعلان با آواز بلند کیا) اور سچ تو یہ ہے کہ یہ خبر ہم نے اس وقت تو پڑھی بھی نہیں تھی کہ باکسنگ کا کھیل کوئی ایسا مقبول عام نہ تھا۔ کرکٹ ہاکی اور فٹبال عوام ایٹاس کی دلچسپی کے مرکز تھے۔ کھیلوں کا ایک انگریزی ماہنامہ اسپورٹس ٹائمز (Sportimes) البتہ دنیا بھر کے کھیلوں کی خبریں دیتا۔ اس جیسا معیاری کھیلوں کا رسالہ پھر کبھی شائع نہ ہوا۔ بہت بعد میں شائع ہونے والے رسالے، دی کرکٹر اور اخبار وطن صرف کرکٹ تک محدود تھے۔

خبر تو اس وقت بنی جب اس کاسیس کلتے نے اعلان کیا کہ اس نے "نیشن آف اسلام" میں شمولیت اختیار کر لی ہے اور اب اسے "محمد علی" کے نام سے پکارا جائے۔ کلتے کا یہ

مودود چشتی

(430ھ - 527ھ)

خاندان چشت کے اکابر میں سے تھے اور ماورزاد ولی اور علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ خواجہ ابو یوسف چشتی کے فرزند تھے۔ طفولیت ہی میں آپ سے کرامات سرزد ہونے لگی تھیں۔ سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور دوسرے علوم کی تحصیل میں لگ گئے۔ تیس برس کی عمر میں والد کی وفات پر مستنشین ہوئے۔ والد سے جب بیعت ہوئے تو تیس برس تک گوشہ نشینی کی زندگی گزار دی۔ تعلیم کے سلسلے میں بخارا بھی تشریف لے گئے۔ جہاں شیخ المشائخ خواجہ نجم الدین عمر سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ شیخ احمد المناقی سے بھی آپ نے فیض پایا تھا، خواجہ مودود کا ہر قول اور فعل شریعت کے عین مطابق ہوا کرتا تھا جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے، سب لوگ دل و جان سے قبول کرتے۔

مرسلہ: ظاہر علی صدیق۔ حیدرآباد

بڑے مبلغ، امریکا کو ایک آنکھ نہ بھائی اور علی کے لیے کیے بعد دیگرے مشکلات کھڑی کی گئیں جس میں سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اسے ویتنام میں جنگ کے لیے فوج میں بھرتی ہونے کا حکم دیا گیا۔ علی نے اولاً اپنے مذہبی خیالات کی وجہ سے فوج میں جانے سے انکار کیا۔ دوسرے وہ اس جنگ کے خلاف تھا، جس کی عالمی رائے عامہ بھی مخالف تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے کمزور سے ملک پر لشکر کشی کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس نے اعلان کیا میرا دیت کا ٹنگ سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس حرف انکار کا صلہ علی کو اپنا پاکنگ لائنس اور عالمی اعزاز گنوا کر ملا۔

علی اب باکسر سے بڑھ کر عالمی خمیر کا استعارہ بن گیا تھا۔ ہمارے وقت کے عظیم فلسفی برٹریڈ رسل نے اسے لکھا کہ دنیا میں جب کوئی ایک بھی تمہارا دوست نہ ہو تو برطانیہ چلے آنا، ایک شخص برٹریڈ رسل نام کا تمہارا دوست ضرور ہوگا۔

امریکی حکام نے جس سے اس کا اعزاز و اکرام چھینا، دنیا نے اسے عزت دی اور اپنی پلکوں پر بٹھایا۔ نہ صرف امریکا کے باخمیر عناصر، بلکہ ایشیا، افریقا، مشرق وسطیٰ، لاطینی امریکا اور یورپ کے ملک اس کی مہمان نوازی کو اپنے لیے اعزاز جانتے اور اس کے راستوں میں دیدہ و دل فرس راہ کے

اعلان کرنا تھا کہ دنیا میں روشن خیالی اور آزادی کے سب سے بڑے ٹھیکیدار امریکا میں گویا کہ تھر تھری سی جی جی (اس نیشن آف اسلام کا اسلام سے کیا تعلق تھا اور بعد میں 1971ء محمد علی نے باقاعدہ اسلام قبول کیا اس کا اس داستان سے کوئی تعلق نہیں، یہ صرف بریکٹیل تذکرہ اور ریکارڈ کی درستگی کے لیے یاد رکھیے)

سونی لسٹن جو ایک خونخوار اور بجرمانہ ماضی کا حامل باکسر تھا اپنی شکست پر شدید تھملا یا ہوا تھا اور اس نے گلے کو جوابی مقابلے کی دعوت دی۔ جوانی مقابلہ اب دو ہیوی ویٹ باکسرز کے درمیان نہیں بلکہ دو نظریات کے درمیان تھا اور ساری دنیا کی نظر اس پر لگی ہوئی تھی۔ علی نے لسٹن کو زوج کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کیا۔ اسے بدبودار پچھ کا خطاب دیا اور ایک دن ایک بڑا سارہ لے کر لسٹن کے کمپ کے سامنے پہنچ گیا کہ مجھے پچھ کا شکار کرنا ہے۔ یہ ابتدا تھی اس کردار کی جس کی ان لن ترانوں اور لاہالی پن پر ایک دنیا واری واری جانے والی تھی۔

دنیا اس مقابلے کے لیے بے تاب تھی لیکن مقابلہ شروع ہوا، بہت سے لوگ ہال میں داخل ہو کر اپنی نشستیں تلاش کر رہے تھے اور بہت سے کرسیوں پر بیٹھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ سونی لسٹن زمین پر چت نظر آیا۔ تین منٹ سے بھی کم وقت میں علی نے اسے دھول چٹا دی تھی۔ بڑی بولے Mouth Big کا پیس گلے جسے اس کی جائے پیدائش کے حوالے سے Louisville Lip بھی کہا جاتا تھا، نے اعلان کر دیا کہ میں عظیم ترین ہوں۔ اور پھر وقت نے

اس کی بات کو سچ ثابت بھی کیا۔ انیس سو اڑسٹھ تک علی نے اپنی مہارت، پھرتی اور طاقت کی دھماک بٹھادی، وہ پیش گوئی کرتا کہ میں فلاں کو اس راؤنڈ میں زیر کروں گا اور اکثر پیشتر اس کی پیشگوئی پوری ہوتی۔ فلائیڈ پیٹرن نے، جسے شکست دے کر سونی لسٹن چھین بنا تھانے علی کو مقابلے کی دعوت دی لیکن مقابلے سے پہلے علی کے مذہبی خیالات کے بارے میں کچھ اشتعال انگیز باتیں کیں۔ علی نے اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا اور مقابلے کے دوران اسے فوراً ناک آؤٹ کرنے کی بجائے بارہویں راؤنڈ تک اس کی پٹائی کرتا رہا۔ آخر ریفری نے مقابلہ روک کر پیٹرن کی جان چھڑوائی۔ یہی حشر برطانوی چیمپین ہنری کوپر کا کیا، جس کی حالت دیکھ کر اس کی بیوی رو پڑی اور ریفری سے کہہ کر مقابلہ روکوا۔

لیکن علی کی یہ عظمت، آزادی اور رواداری کے سب سے

رہے۔

قانوناً تو لازمی فوجی خدمات سے انکار کی سزا قید ہوتی ہے لیکن چونکہ علی نے اپنے خلاف فیصلے کو چیلنج کر رکھا تھا اور مقدمہ عدالت میں زیر سماعت تھا، چنانچہ اسے قید کی سزا نہ دی جا سکی۔ علی کے عزم و ہمت کے سامنے بالآخر حکام کو ہار ماننا ہی پڑی اور 1971 میں اس کا باکسنگ لائسنس بحال کر دیا گیا اور اسے پیشہ ور مقابلوں کی اجازت دے دی گئی۔

اسی 1971ء میں اس کا جو فریزر سے مقابلہ ہوا جو اس کی غیر موجودگی میں اب عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن تھا۔ اس مقابلے کو صدی کا سب سے بڑا مقابلہ Fight of the Century قرار دیا گیا۔

علی نے اپنے آپ کو عظیم ترین قرار دیا لیکن وہ بہر حال انسان ہی تھا اور عظیم ترین ذات صرف خدا کی ہے۔ اس مقابلے میں اسے پوائنٹس پر شکست ہوئی لیکن وہ اپنی ذہن میں لگا رہا اور بالآخر جنوری 1974 کو اس نے نیویارک کے میڈیسن اسکوئر گارڈن میں جو فریزر کو شکست دے کر اپنے آپ کو اس وقت کے چیمپئن ”جورج فورمین“ کے مقابلے کا ال ٹائٹل ثابت کیا۔ فورمین، جو فریزر کو شکست دے کر چیمپئن بنا تھا۔

فورمین اب تک تمام مقابلوں میں ناقابل شکست رہا تھا اور اس نے اپنے تمام حریفوں کو ناک آؤٹ کی ذلت سے دو چار کیا تھا۔ علی سے اس کے مقابلے کو Rumble in the Jungle کا نام دیا گیا کہ یہ افریقا کے ملک زائرے کے شہر ”کناسا“ میں تھا۔

علی جسے اپنے مقابل کی نفسیات سے کھیلنے کا ہنر آتا تھا، نے مقابلے سے پہلے فورمین سے کچھ سرگوشی کی۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی فورمین نے علی پر تباہ توڑ حملے شروع کیے لیکن کوئی کاری ضرب نہیں لگا سکا۔ علی نے آج اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور اپنے عمومی ”اوپن چیٹ“ انداز کے بجائے رنگ کی رسیوں کا سہارا لیے رہا جسے علی نے بعد میں Rope a dope کا نام دیا۔ وہ مستقل کمر سے نیچے اور پیٹھ پر فورمین کے کئے کھاتا رہا۔ ساتویں راؤنڈ تک فورمین بری طرح تھک گیا تھا۔ یہ وہ فورمین تھا جس کے کئے کی طاقت سے دیوار ڈھے سکتی تھی۔ آج وہ سات راؤنڈ تک ایک بھی کاری ضرب اپنے مقابل کو نہ لگا سکا تھا۔ آٹھویں راؤنڈ کے درمیان یکا یک علی نے دفاع کی بجائے دائیں، بائیں اور دائیں سے تین کئے بجلی کی سی تیزی سے لگائے اور فورمین لڑکھڑا کر زمین پر آ رہا۔ فورمین جس نے کبھی

زمین کا منہ نہ دیکھا تھا، اسے یہ بھی تجربہ نہیں تھا کہ ریفری کی گنتی پر کب کھڑا ہو جانا چاہیے۔ ریفری نے علی کا ہاتھ بلند کر کے اس کی فتح کا اعلان کر دیا۔ وہ علی جسے 1967 سے رنگ سے باہر رکھنے کی کوشش کی گئی، آج پھر دوسری مرتبہ عالمی چیمپئن تھا۔

علی نے فورمین کے کان میں کیا سرگوشی کی تھی یہ دلچسپ داستان ہے، اسے پھر بھی سناؤں گا کہ پہلے ہی یہ کہانی بہت طویل ہو گئی ہے۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، علی بھی انسان ہی ہے، اور ہر عروج کو زوال بھی ہے اور یہ کہ تمام تر بزرگی اور عظمت صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے ہے۔ 1978 میں وہ دن آ گیا کہ ایک نوجوان باکس لیون اسپنکس کے ہاتھوں علی شکست کھا گیا۔ دو ماہ بعد جوابی مقابلے میں اسپنکس کو شکست دے کر تیسری مرتبہ عالمی ہیوی ویٹ کا اعزاز اپنے نام کیا اور ساتھ ہی کھیل کو خدا حافظ کہہ دیا۔

پھر مجھے یاد نہیں کس وجہ سے ریٹائرمنٹ سے واپس آ کر اس وقت کے ایک بہت ہی مشاق اور طاقتور چیمپئن لیری ہومز کو مقابلے کی دعوت دے ڈالی۔ علی اب بوڑھا ہو رہا تھا، اس کا وزن بڑھ رہا تھا اور کمر اور پیٹ کے گرد گوشت بڑھتا جا رہا تھا۔ مقابلے سے پہلے طبی معائنے میں ایسی بہت سی باتیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اب علی کے بطور ہیوی ویٹ باکسر دن پورے ہو گئے ہیں اور اتنا بڑا مقابلہ اس کے لیے ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی خدشے کے پیش نظر اس کا مینیجر لیری ہومز سے ملا اور اس سے رنڈمی ہوئی آواز میں درخواست کی کہ لڑتے ہوئے خیال رکھے کہ کوئی ضرب ایسی نہ ہو جو جان لیوا ثابت ہو۔

علی جس سے اس کے اپنے ہی نہیں مخالف بھی محبت کرتے تھے۔ ایک نسل اس دوران اس کی عاشق ہو چکی تھی، سچے اور بڑے کھلاڑی تو اور بھی بڑے دل کے ہوتے ہیں۔ لیری ہومز نے علی کے مینیجر کے دونوں ہاتھ تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ I love the champ۔

علی رعشہ کی بیماری کا شکار ہوا۔ مجھے نہیں یاد کہ میرے اپنے زمانے میں کسی اور کو اتنا مقبول، مشہور اور محبوب دیکھا ہو۔ آپ میری بات سے اتفاق کریں نہ کریں لیکن اس کی نماز جنازہ پھر اسے قبرستان تک پہنچانے کے عمل تک ایک ایک لمحہ پکار پکار کے کہہ رہا تھا۔

But still: Love the champ

وقت کی جست

ابن کبیر

یہ دنیا اسرار سے بھری ہے۔ کب کہاں کون سا تحیر خیز قصہ جنم لے لے، کسے پتا۔ گل پرینز نے بھی کب سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو جائے گا جو اسے تاریخ کے صفحات پر امر کر دے گا۔ صدی کے سب سے تحیر خیز قصے کا مرکزی کردار قرار دے دیا جائے گا۔

دنیا کے حیران کن واقعات میں سے ایک واقعہ



پہاڑوں پر شام اتر رہی تھی۔
ہوا چلتی تو کھیتوں میں سبز لہری اٹھنے لگتی۔ چراگاہ میں
دوڑتیں بھینٹیں اب دھیمی پڑ چکی تھیں۔ ندی بنا آواز کیے بہ
رہی تھی۔

عورت کا سر مرد کے سینے پر تھا۔ اس کے ہر سکون
چہرے پر الوہی روشنی تھی اور اس کا سانس ہموار تھا۔
وہ جنگلی لباس زیب تن کر چکا تھا۔ اس کی تلوار کمر سے
لٹکی تھی۔ گھوڑا اٹھیل میں تیار کھڑا تھا۔ گوشت کے پارچوں کا

تھیلا میز پر دھرا تھا۔ وہ سفر کے لیے تیار تھا مگر جانا نہیں چاہتا تھا کہ جو لمحات اسے میسر تھے، وہ محبت اور مسرت سے لبریز تھے۔ وہ یہاں، اسی وادی میں رہنا چاہتا تھا مگر فرض اسے پکار رہا تھا۔

”مجھے جانا ہی ہوگا۔“ سپاہی نے دھیرے سے کہا۔
”زندگی اسرار کا دوسرا نام ہے۔“ عورت کا سر ہنوز اس کے سینے پر تھا۔ اس کے ہونٹ سیب کی قاش کے مانند تھے وہ لب ہلے اور یوں لگا جیسے مطرب نے ساز کے تار چھیڑ دیے ہوں۔ ”بہتی ہواؤں میں رازوں کا بسرا ہے۔“

”ہاں۔“ مرد دھیرے سے مسکرایا۔ اُسے شادی کے ابتدائی دن یاد آگئے۔ تب اس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام کر اس مکان کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے یہ جملے کہے تھے۔ ”تخیر ہمارے ارد گرد ہے، ہر پل کچھ لو کھا رہا ہوتا ہے۔“

”اور ان میں سب سے حیرت انگیز کیا ہے؟“ اب عورت براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ کھیتوں میں ایک لہرائی۔ سورج پہاڑ کے پیچھے غائب ہو رہا تھا۔

”سب سے حیرت انگیز ہے...“ آدمی کے چہرے پر روشنی تھی۔ ”اپنے محبوب کی دھڑکن سننا۔“
عورت کے ہونٹوں پر ہنس تھا۔ اسے وہ پل یاد تھے، جب سپاہی اسے بیاہ کر اس جنت نظیر وادی میں... اپنے لکڑی کے اس خوبصورت گھر میں لایا تھا، جس کے پہلو سے ندی بہتی تھی۔ اور یہیں انھوں نے یہ جانا تھا کہ اپنے محبوب کی دھڑکن

سننا سب سے پُرسرت اور شیرخیز تجربہ ہے۔
”مجھے جانا ہوگا۔“ آدمی علیحدہ ہو گیا۔ وہ اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔ عورت نے ایک دھاگا اس کے بازو پر باندھ دیا۔ اس نے میز سے تھیلا اور پانی کا مشکیزہ اٹھالیا۔ باہر گھوڑا ہنہنایا، اسے مالک کے آنے کی خبر ہو گئی تھی۔ عورت اسے محبت سے دیکھ رہی تھی۔

وہ گھوڑے پر جست لگا کر سوار ہوا۔ اپنی بیوی کو دیکھا۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ سر پٹ دوڑنے لگا۔ وہ گھوڑا اور اس کا سوار... وادی میں حرکت کرتی اکلوتی شے معلوم ہوتے تھے۔ ہر سوں کا مل سکوت تھا۔

دروازے پر کھڑی عورت انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس پل... وہ دنوں اس بات سے لاعلم تھے کہ کچھ واقعات اپنے محبوب کی دھڑکن سننے سے بھی زیادہ شیرخیز ہوتے ہیں اور ایک ایسا ہی واقعہ رونما ہونے کو تھا...

☆☆☆

یہ میڈرڈ تھا، دنیا کا مرکز۔

گھوڑا شہر کے مضافات میں داخل ہو کر دھیم پڑ گیا۔ سپاہی کے کپڑے دھول سے اٹ چکے تھے۔ اس کے جوتے پر ریت اور سبز رنگ تھا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ سرسبز وادیوں سے آرہا ہے۔ اس کے بال لمبے اور سینہ چوڑا تھا۔ سپہ گری اس کا آبائی پیشہ تھا۔

اب وہ ایک بازار میں داخل ہو رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور ہر سوں روٹی کی سوندھی خوشبو پھیلی تھی۔ وہ تنور کے پاس آ کر گھوڑے سے اترا۔ لگام تھامے نان پائی کی طرف گیا۔

سپاہی نے کچھ سکے اچھالے۔ ایک گرم نان اس کے ہاتھ پر رکھ دی گئی۔ سپاہی نے وہیں ایک پتھر پر بیٹھ کر پیٹ بھرا اور مشکیزے سے پانی پیا۔ نزدیک ایک سرائے تھی۔ وہ اس سمت ہولیا۔ اس نے گھوڑا باندھا۔ اس کے آگے چارا ڈالا اور سرائے کے اندر داخل ہو گیا چلا گیا۔

اندر جس تھا۔ بیشتر میزیں خالی تھیں۔ ایک نوجوان کونے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سپاہی کو دیکھا، تو بوکھلا کر سیدھا ہو گیا۔ سپاہی نے اشارہ کیا، تو لڑکے نے تیزی سے ایک میز صاف کر دی اور کھڑکی کھول دی۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کچھ روشنی ہوئی۔ سرائے اپنے بھید کھولنے لگی۔ اس نے دیکھا... کونے میں بوری پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور تیز تھیں۔ ماتھے پر زخم کا نشان تھا جو شاید کسی جنگ کی دین تھی۔ البتہ اُس کا حلیہ کسی مداری سا تھا۔

سپاہی قبوے سے دل بہلا رہا تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ نظر اٹھا کر دیکھا، تو بوڑھا پہلو میں کھڑا تھا۔

”بہادر نوجوان۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔
سپاہی اس طرح کے تکلفات کا عادی نہیں تھا۔ وہ کاندھے اچکا کر رہ گیا۔ بوڑھا بیٹھ گیا۔ اب وہ سپاہی کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ سپاہی نے اس پر نظر نہیں ڈالی۔ قبوہ ختم کر کے وہ اٹھنے کو تھا کہ بوڑھے نے سوال کیا۔ ”عزیز من، تمہارا نام کیا ہے۔“

”گل پرین۔“ سپاہی کی آواز پاٹ دار تھی۔ وہ ایک دلیر انسان تھا۔

”آہ، گل پرین۔“ بوڑھے نے گہرا سانس لیا۔ ”اس نام سے تو تخیر جزا ہے، یہ نام صدیوں تک بانی رہے گا۔“
گل پرین نے بوڑھے پر اچھتی سے نگاہ ڈالی۔ وہ اسے

میدرد کا ایک شاطر ٹھگ لگا۔ اس نے قبوہ کی قیمت ادا کی اور باہر آ گیا۔ بوڑھے کی نظریں اب تک اس پر لگی تھیں۔

سرائے کے ملازم نے آواز لگائی۔ ”کیا دیکھ رہے ہیں بڑے میاں؟ آپ کی جان پہچان کا تھا۔“

”ذرا سوچ تو لڑکے۔“ بوڑھا بظاہر سڑک کی سمت دیکھ رہا تھا مگر اپنے خیالوں میں گم تھا۔ ”اگر اس سرائے میں بیٹھے بیٹھے تو ایک لمحے کو آنکھیں میچ لے لے۔ اور جب آنکھ کھولے تو خود کو... میلوں دور، کسی پرانے دیس میں پائے... تو بتاؤ، تو کیا کرے گا، حیرت سے مرجائے گا ناں؟“

”قطعاً نہیں۔“ لڑکا جھٹ سے بولا۔ ”میں تو فوراً کوئی سرائے تلاش کروں گا اور ادھر ملازم ہو جاؤں گا۔“

سرائے میں لڑکے کا قبضہ گونج رہا تھا۔ سپاہی اپنا گھوڑا کھول کر جا چکا تھا۔ ایک تھکی کھڑکی سے اندر داخل ہوئی۔

”گل پر یز۔“ بوڑھے نے دھیرے سے سپاہی کا نام لیا۔ میلوں دور... وادی میں درخت سے پھل اتارنی عورت کے کان میں ہوانے سرگوشی کی۔ اسے کسی کی یاد آگئی تھی۔

☆☆☆

یہ سولہویں صدی کا آخری عشرہ تھا۔

نوآبادیاتی نظام اپنے عروج پر تھا۔ طاقت کی جنگ سمندر پر لڑی جا رہی تھی۔ یورپی قوتیں برسرِ پیکار تھیں۔ وہ اجنبی زمینوں پر قبضہ کر لیتے، وہاں ہزاروں سپاہی تعینات کر دیتے، اپنا گورنر لگا دیتے اور ان کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ شروع ہو جاتی۔

نوآبادیاتی قوتوں میں ہسپانیہ بھی شامل تھا، جس کا اثر و رسوخ تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس نے کئی ایشیائی ممالک میں کالونیاں بنالی تھیں۔ ان ملکوں میں فلپائن بھی شامل تھا۔

بارسلونا رجسٹ کا تازہ دم دستہ بندرگاہ پر اکٹھا ہو رہا تھا۔ ان فوجیوں کے رو برو ایک طویل اور پُرخطر سفر تھا، مگر ان کے چہرے اندیشوں سے پاک تھے۔ وہ ایسے ہی خطروں کا سامنا کرنے کے لیے پیدا ہوئے تھے۔

گل پر یز کپتان کے خیمے میں حاضری دے چکا تھا۔ اب وہ فوجی اصطبل کی سمت جا رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کا اندراج کروا دیا۔ بوڑھے نشی نے چاندی کے سکوں کی ایک تھیلی سونپ دی۔

”تمہید ہے، تم جلد لوٹ آؤ گے۔“ آدمی نے اندراج کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے گھوڑے کو کوئی بیماری وغیرہ تو

نہیں۔“

”وہ گل پر یز کا گھوڑا ہے۔“ اس کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔

”مگر گل پر یز تو نہیں ہے۔“ نشی نے بے پروائی سے کہا۔ ”میری دعا ہے کہ تم زندہ لوٹ آؤ۔“

گل پر یز خیمے سے باہر آ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلا سمندر تھا، جس پر سفید جھاگ تیر رہا تھا۔ کنارے سے کشتیاں لگی تھیں۔ بحری بیڑوں کے مستون نظر آرہے تھے۔ سمندری پتھریوں کی پرواز میں اطمینان تھا۔

گل پر یز جانتا تھا کہ یہ اطمینان ایک التباس ہے۔ ان کے سامنے ایک کٹھن سفر تھا۔ فلپائن جانے والے راستے پر جہاں بحری قزاقوں کا خطرہ تھا، وہیں پرنگالی بیڑوں سے لکراؤ کا بھی خدشہ تھا۔ خیر، ان سے تو نمٹا جاسکتا تھا مگر قدرت سے مقابلہ ناممکن تھا۔ موسم بگڑ جائے، جہاز کو ہولناک طوفان آ لے، تو انسان بے بسی سے فقط اُن لمحات کے گزرنے کا انتظار کر سکتا ہے۔

وہ ڈاک خانے کی طرف چل پڑا۔ اس نے تھیلی سے چند سکے نکال کر جیب میں ڈالے اور باقی گن کر جمع کر دیا۔ اس کے گاؤں کا نام سن کر اہل کار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”وہ تو جنت نظیر ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے گرون ہلائی۔ بندرگاہ کی سمت سے شوراٹھا تھا۔ سپاہی کشتیوں میں سوار ہو رہے تھے۔

”وہاں کون تمہارا منتظر ہے۔“ اہل کار نے تھیلی پر مہر لگاتے ہوئے پوچھا۔

”میری بیوی۔“ گل پر یز نے دھیرے سا کہا تھا۔

”جس کی دھڑکن مجھے اب بھی سنائی دے رہی ہے۔“ اس کا آخری جملہ اہل کار سن نہ سکا۔ سپاہی کی آواز باہر اٹھتے شور میں دب گئی تھی۔

☆☆☆

تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

آسمان پر بادل آگئے۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد گرج چمک کے ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی۔ بادبان گرا دیے گئے۔ لہریں اٹھنے لگیں۔ جہاز ڈولنے لگا تھا۔ کپتان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ ملاح دوڑتے پھر رہے تھے۔

سپاہی زیریں کیبن میں تھے۔ بیش تر خاموش۔ کیبن میں مکمل سناٹا تھا۔ اچانک ایک نوجوان سپاہی زور سے چیخا۔ وہ گر پڑا تھا۔ وہ نیانیا تھا اور ان حالات سے گھبرا گیا تھا۔ بجلی

گرجی۔ یوں لگتا تھا، جیسے دھماکا ہوا ہو۔

گل پر یز کے پہلو میں بیٹے آدی نے تے کردی۔ اس کے چہرے پر رنجیدگی تھی۔ گل پر یز نے اس کا کندھا تھپکا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔“

وہ ایک مشکل سفر تھا۔ قزاقوں کا تو انہیں خوف نہیں تھا، نہ ہی پرتگالی بیڑے ادھر سے گزرتے۔ البتہ موسم کا قہر نازل ہو گیا۔ طوفان نے انہیں آلیا تھا۔

رات بھر آسمان بدستار رہا۔ لہریں جہاز کے اوپر سے جاری تھیں۔ کبھی کبھی سمندر عرشے پر آجاتا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ صبح جا کر بارش رکی۔ البتہ بادل چھائے رہے۔ دوپہر کے وقت سورج نکلا۔

ان کی منزل فلپائن کا شہر نیلا تھی۔ منزل پر پہنچنے سے پہلے ایک طوفان اور آیا، مگر اس کی شدت اتنی نہیں تھی۔

نیلا چھوٹا سا شہر تھا۔ اس پر نوآبادیاتی اثرات نمایاں تھے۔ جون 1571 میں ہسپانوی کپتان لوپیز دی لیگا زپی نے یہ شہر فتح کیا تھا۔ تب سے یہ ہسپانیہ کی کالونی تھی۔ یہ شہر فلپائن کا مرکز تھا۔ تاریخی اور ثقافتی ورثے کا امین... مگر اس سے اس پر ہسپانوی اثرات نمایاں تھے۔

گل پر یز کا جلد یہاں دل لگ گیا۔ مقامی باشندے پست قد اور کٹھے ہوئے جسم کے تھے۔ وہ محنتی اور جفاکش تھے۔ بظاہر وہ ہسپانوی سپاہیوں سے بڑی محبت سے پیش آتے، مگر اندر ہی اندر ان میں بغاوت کا لادوا پک رہا تھا۔ وہ آزادی کے خواہش مند تھے۔ گل پر یز کے دستے کی آمد سے قبل ایک مقامی مذہبی پیشوا کی قیادت میں ایک گروہ نے بغاوت کر دی تھی۔ گورنر گومیز پر یز نے اس بغاوت کو بڑی شدت سے کچلا۔ مذہبی پیشوا کو مرکزی چوراہے میں پھانسی دی گئی۔

پہلی نظر میں یوں لگتا تھا کہ اب نیلا میں شانتی ہے۔ اس کی بندرگاہوں سے تجارتی قافلے گزر رہے تھے۔ مقامی وسائل... بڑی سہولت سے لوٹے جا رہے تھے۔ یہاں کے آثار قدیمہ کو کھود ڈالا گیا۔ بیش قیمت نوادرات اور جواہرات ہسپانیہ پہنچا دیے گئے۔ یہ واضح تھا کہ مقامی لوگ ان بٹے کٹے، اجنبی زبان بولنے والے غیر ملکیوں سے نفرت کرتے ہیں، مگر کیا کر سکتے تھے... گورنر بڑا سخت گیر آدمی تھا۔ چہرہ درشت۔ ماتھے پر جنگ کا عطا کردہ نشان، جسے وہ کبھی نہیں چھپاتا۔ کمر سے ہمہ وقت کموار لٹکتی رہتی۔ وہ ایک ظالم اور جاہل شخص کی شہرت رکھتا تھا، جس کا حرم مقامی عورتوں سے بھر رہا تھا۔

گل پر یز کے لیے حالات معمول کے مطابق تھے بس

موسم سے ہم آہنگ ہونے میں اسے کچھ وقت ہوئی۔ وہ سرسبز وادیوں میں پلا بڑھا تھا۔ ساحلی شہروں کی مرطوب اور نمکین فضا سے کچھ اچھٹن ہوتی تھی مگر یہ سب تو سپاہی کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ بس، اپنی محبوبہ میریوز کی یاد اُسے راتوں کو ستاتی۔ صبح بیدار ہوتا تو اس کے دل میں خواہش ہوتی کہ کھڑکی سے اُسے پھول چنتے ہوئے دیکھے، وہ اس کے لیے بھیڑ کا گرم دودھ لے کر آئے اور روغنی روٹی پیش کرے۔ وہ دونوں شکر کریں اور روٹی بانٹ کر کھائیں۔ اور پھر ایک دوسرے کے سینے پر سر رکھ کر محبت سے لبریز دلوں کو دھڑکتا ہوا سنیں۔ بس، یونہی ان کی زندگی گزر جائے۔

شومنی قسمت... یہ ممکن نہیں تھا۔ ان کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ جب وہ بیدار ہوتا، تو خود کو ٹھن زدہ کمرے میں پاتا۔ کھڑکی کے باہر بھرا پرابازار ہوتا، جہاں بھاؤ تاؤ ہو رہا ہوتا۔ وہ اپنے بے ترتیب کمرے میں لباس تلاش کرتا، جسے رات شراب پینے کے بعد اس نے اتار پھینکا تھا۔ چہرے پر پانی مارتا اور گوشت کا ایک ٹکڑا چباتا ہوا پانی گرم کرنے کو چولھا پر چڑھا دیتا۔ اس پانی میں وہ ایک مقامی پودے کی پتیوں کو جوش دے کر کچھ شکر ملا دیتا۔ کچھ ہسپانوی فوجی اس میں دودھ بھی شامل کر دیتے تھے۔ وہ اس مقامی گرم مشروب کے دیوانے تھے، جو جسم کو چست رکھتا تھا۔

نیلا پہنچنے کے چار روز بعد اس نے میریوز کو ایک محبت بھرا خط لکھا، جس میں اس کی زلفوں اور ہونٹوں کی تعریف کی۔ اسے اپنے پہلو میں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ندی اور پہاڑوں کو یاد کیا۔

اس نے خط مکمل کر کے فوراً روانہ کر دیا تھا۔ اس روز ایک تجارتی جہاز نیلا کی بندرگاہ سے روانہ ہوا تھا جو مراکش اور پرتگال سے ہوتا ہوا اسپین جا رہا تھا۔

گل پر یز کی عجیب و غریب، ناقابل یقین کہانی بیان کرنے والے لکھتے ہیں کہ جب یہ خط ہسپانیہ پہنچا، تو ڈاکیا اُسے گاؤں لے جانے سے پہلے میدرد کی ایک سرائے میں گیا تھا، جہاں ایک حواس باختہ سا نوجوان ملازم تھا اور ایک پراسرار سا بوڑھا جو کونے میں ایک بوری پر بیٹھا رہتا تھا۔

ایک محقق لکھتا ہے کہ ڈاکیا سرائے میں بیٹھا قبوہ پی رہا تھا، تب بوڑھے نے اس سے دریافت کیا تھا۔ ”کیا تیرے پاس کوئی ایسا خط ہے، جو تو شمال میں وادیوں کی سمت لے جا رہا ہو؟“

جواب میں ڈاکیا نے بتایا تھا۔ ”ہاں... اس کے پاس

فلپائن سے آیا ہوا گل پرین نامی سپاہی کا ایک خط ہے۔
بوڑھے نے سردار بھری بھی اور کہا تھا۔ ”تخیر!“

☆☆☆☆

ہسپانیہ کی فلپائن میں موجودگی کے باعث سب سے زیادہ خطرہ چین کو تھا۔

شہنشاہ چین اور اس کے حواریوں کی کوششوں کے باوجود یہ علاقہ ایک عرصے سے ہسپانیہ کے زیر تسلط تھا، جس کی بڑی وجہ گورنر گومیز پرین تھا، جس کی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے چند قریبی جزائر پر... جوکل تک چینی سرکار کی کالونی تھے، قبضہ کر لیا تھا۔ یہ جزائر موجودہ ملائیشیا اور انڈونیشیا کے آس پاس تھے۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا، تو اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے چین نے خود کس دستے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان دستوں کی کہانی عجیب ہے۔ کہتے ہیں، یہ تیاری بچے کی پیدائش سے شروع ہو جاتی ہے۔ نوزائیدہ بچے منتخب کر لیے جاتے ہیں۔ تربیت اس انداز میں ہوتی ہے کہ ان کے دل محبت اور ہمدردی جیسے لطیف جذبات سے یکسر عاری ہو جائیں۔ ان پر کالا جادو کیا جاتا اور ذہنوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔ کسی کو میدانی، کسی کو شہری اور کسی کو سمندری علاقوں میں حملے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ چین میں سمندری حملہ آوروں کو ”کالی موت“ کا نام دیا جاتا تھا۔ ان کا سانس بڑا پکا ہوتا۔ یہ سات منٹ تک زیر آب رہ سکتے تھے۔ کمر پر تیل کی مشکلیں باندھ کر تیرتے ہوئے دشمن کے بحری جہازوں تک جا پہنچتے۔ اگلے ہی پل شعلہ بھڑکتا ہے اور وہ دھماکے سے خود کو اڑا لیتے ہیں۔

چین کے خود کش دستوں کا نشانہ گورنر نیلیا تھا۔ خبروں نے اشارہ کیا تھا کہ وہ قریبی جزائر کے دورے کو روانہ ہونے والا ہے۔ دشمن نے تیاری کر رکھی تھی۔ خود کش دستے ایک ویران جزیرے کے پاس ایک گھائی میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ رات میں گورنر کا بحری جہاز ادھر سے گزرا۔ کہتے ہیں، اس جہاز پر کوئی غدار سوار تھا، جس نے مشعل روشن کر کے اشارہ کیا۔ کالی موت کے نام سے مشہور اس دستے کے سات ارکان دھیرے سے پانی میں غائب ہو گئے۔ انھوں نے سانس روک کر ایک طویل فاصلہ طے کیا۔ ایک ایسی رسی سے بحری جہاز پر چڑھے، جس کا پہلے ہی انتظام کیا گیا تھا۔

کچھ لمحوں بعد جہاز کے نچلے حصے میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ پھر کچھ اور دھماکے سنائی دیے۔ نیلیا کے ساحل سے

گل پرین: تاریخ کے آئینے میں

اگر ہم تاریخی حوالے کھنکھالیں، تو گل پرین کا نام پہلی بار 1908 میں دنیا کے سامنے آیا، جب لوک داستانوں پر تحقیق کرنے والے ایک امریکی تھامس ایلی ہون نے Harper میں شائع ہونے والی اپنی تحریر میں ایک ہسپانوی فوجی کا تذکرہ کیا، جو زمان و مکاں کی جست لگا کر فلپائن سے میکسیکو پہنچ گیا تھا۔

یہ مضمون تھامس ایلی ہون کی سیریز ”میکسیکو کی داستانیں“ نامی سیریز کا حصہ تھا، جو 1910 میں کتابی صورت میں چھپی۔ اس نے انیسویں صدی کے امریکی ادیب واشنگٹن ارونگ کی کہانی Tales of the Alhambra کا بھی تذکرہ کیا، جس میں ایک گورنر اور ایک سپاہی کی کہانی شامل ہے، جو گل پرین کی کہانی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ یہی محقق لکھتا ہے کہ اس نوع کے عناصر ہسپانوی لوک داستانوں میں بھی ملتے ہیں۔

1900 میں میکسیکو میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جس میں وہاں کی قدیم لوک داستانوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میں ایک ایسی داستان کا ذکر تھا، جس میں ایک اجنبی اچانک ایک روز... میکسیکو میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی جڑیں سولہویں صدی کے اوائل تک جاتی تھیں۔

بعد کی کتابوں میں بھی یہ تذکرہ آتا رہا۔ 1964 میں شائع ہونے والی فرینک ایڈورڈ کی کتاب Strange World میں اس کا ذکر ہوا، تو یکدم یہ پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں، جنہوں نے اپنے تئیں اس کی توجہ کی کوشش کی۔ اس گروہ کی اکثریت اس واقعے کو خلائی مخلوق سے جوڑتی ہے۔ کچھ اسے نیکی پیمتھی کی انتہائی شکل قرار دیتے ہیں۔

مشرق میں روشنی دیکھی جاسکتی تھی۔ جہاز کا عملہ کشتیوں کے ذریعے فرار ہو گیا۔ جہاز دھڑ دھڑ جلتا رہا اور پھر سمندر میں غرق ہو گیا۔

جب نیلیا یہ خبر پہنچی کہ چینیوں نے گورنر گومیز کو قتل کر دیا ہے تو ہسپانوی دستے پر سکتا طاری ہو گیا۔ کئی تو صدے سے گر پڑے۔ محل کے گرد پہرہ بڑھا دیا گیا تھا۔ گل پرین کو اضافہ ڈیوٹی دینے پڑ رہی تھی۔

ادھر مقامی باشندوں نے رات کو چھپ کر جشن منایا۔
وہ سپانیہ سے نفرت کرتے تھے۔

☆☆☆

وہ قیامت کی رات تھی۔

ٹیلا دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک طرف مقامی تھے، جو آج پرانے منکوں سے شراب نکال کر پی رہے تھے اور کل صبح دیر سے بیدار ہونے والے تھے۔ ادھر ہسپانوی صفوں میں خوف اور اندیشے حرکت کر رہے تھے۔ گورنر کے محل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ آج سے پہلے ہسپانوی عہدے دار اس قسم کی صورت حال سے دوچار نہیں ہوئے تھے۔ وہ قائم مقام مقرر کرنے کے لیے میدرد سے جاری ہونے والے احکامات کا انتظار کرتے، تو بغاوت کا اندیشہ تھا۔ انھیں آپس ہی میں فیصلہ کرنا تھا۔ مگر وقت یہ تھی کہ اعلیٰ عہدے داروں کا کسی ایک نام پر متفق ہونا سہل نہیں تھا۔ ان کے درمیان واضح اختلافات تھے۔

صبح تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ اندر بحث جاری تھی۔ یہ خدشہ بھی تھا کہ جن غداروں نے چینوں کا ساتھ دیا، وہ محل میں موجود ہیں اور کوئی اور سازش رچ سکتے ہیں۔

سخت پہرہ تھا۔ نہ تو کسی کو محل کے اندر آنے کی اجازت تھی، نہ ہی باہر جانے کی۔ فوجی دستوں کے تین حصار تھے۔ ایک اندرونی حصے میں، ایک احاطے میں اور ایک فیصل پر۔

گل پرین کو فیصل پر تعینات کیا گیا تھا۔ وہ رات کا جاگا ہوا تھا، مگر چوکس رہنے کی کوشش میں جٹا تھا۔ صبح سے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دل ڈوب سا جاتا مگر خود کو یہ کہہ کر سنبھال لیتا کہ اس کا سبب ٹھکن ہے اور آج گرمی بھی کچھ زیادہ ہے۔

”دھوپ میں کیسی تپش ہے۔ لگتا ہے، جیسے دماغ پکھیل رہا ہو۔“ وہ بڑبڑاتا۔ جانے کیوں آج اُسے وہ بوڑھیا یاد آ رہا تھا، جس سے میدرد کی ایک سرانے میں ملاقات ہوئی تھی۔

کچھ دیر سستانے کو اس نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ شہر پر نظر ڈالی۔ بندرگاہ پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ دھوپ پانی کی نیکی چادر پر چمک رہی تھی۔ آسمان صاف تھا۔

”اگر میں کچھ پلوں کو آنکھیں بند کر لوں، تو کیا مضائقہ ہے۔“ اس نے خود سے کہا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں میچ لیں۔ جو

آخری شے اس نے دیکھی، وہ صاف آسمان کے نیچے پھیلا سمندر تھا اور چوکور چھتوں والے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو پہاڑ تک چلے گئے تھے۔

وہ انسانی تاریخ کا ایک پراسرار پل تھا... ایک ناقابل یقین پل۔

☆☆☆

آنکھیں بند کرنے کے بعد گل پرین کو اپنی محبوبہ مریوز کا چہرہ دکھائی دیا تھا۔

وہ باورچی خانے میں کھڑی تھی۔ گھر دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اور پھر دھواں بڑھنے لگا۔ منظر دھندلا رہا تھا۔ مریوز اس دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ ایک غنودگی سی تھی جو فلپائن میں گورنر کے محل کا پہرہ دیتے گل پرین پر اترا آئی تھی۔

وہ خواب کی پراسرار سرزمین پر تھا... ایک کھٹکا ہوا۔ اس کا نیزہ ذرا پھسلا تھا۔ وہ زمین سے ٹکرایا تو آواز ہوئی۔ گل پرین چونک کر سیدھا ہو گیا۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

”شاید سو گیا تھا۔“ اس نے انگڑائی لی۔ اور سمندر کی سمت دیکھا۔ وہاں میاں لہریں اٹھ رہی تھیں اور اندھیرا چھارہا تھا۔ آگے کچے مکانات تھے جن کے پیچھے صحرا تھا۔

اس نے آنکھیں ملیں۔ جسم ٹھکن سے چور تھا۔ غور سے منظر کو دیکھا۔ سمندر میں اکا دکا کشتیاں تھیں اور شام اتر چکی تھی۔ افق سرخ ہو گیا تھا۔ آج سے قبل اس نے فلپائن کے آسمان کو یوں سرخ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے کچھ عجیب لگا۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ یہ منظر بدلا ہوا تھا۔

اس نے خود کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ شاید وہ بہت دیر تک سویا رہا ہو اور شام آگئی ہو۔

اس نے خود کو کوسا اور مستعد کھڑا ہو گیا۔ مگر بے چینی برقرار رہی۔ شام ضرور اترا آئی تھی، مگر اندھیرا سمندر کو بدلنے کی تو توت نہیں رکھتا۔ آج پانی ٹیلا اور بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ پھر وہ بحری جہاز بھی نظر نہیں آ رہے تھے جنہیں خطرے کے پیش نظر تعینات کیا گیا تھا۔

اس نے دائیں سمت دیکھا۔ فیصل پر اسے ایک سپاہی کھڑا نظر آیا۔ وہ اسی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس کا نیزہ نسبتاً سبوتا تھا اور لباس کارنگ سرخ تھا۔

”شاید نئے دستے تعینات کر دیے گئے ہیں۔“ اس نے خود سے کہا اور سپاہی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اجنبی سپاہی ساکت کھڑا رہا۔ گل پرین ان مکانات کو دیکھ رہا تھا، جن سے وہ مانوس نہیں تھا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ جس منظر میں کچے مکانات تھے، وہاں اچانک جھونپڑیاں کہاں سے آگئیں۔

پھر پہاڑوں کی جگہ آج اسے صحرا نظر آ رہا تھا۔

وہ واقعی پریشان تھا۔ اس نے پلٹ کر محل کی سمت

دو واقعی پریشان تھا۔ اس نے پلٹ کر محل کی سمت

گا۔

اس نے سر جھکالیا اور اپنا نیزہ گرا دیا۔
”بھائیو، میرے خلاف سازش ہوئی ہے۔“ وہ بوکھلا کر

چلایا۔

کسی نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ زمین پر آ رہا۔
اگلے ہی لمحے سپاہی اس پر پل پڑے۔ وہ چیخ رہا تھا، چیلارہا
تھا۔ ”بھائیو، تمہیں غلط بھی ہوئی ہے... میں شاہ کا وفادار
ہوں... کسی نے سازش کی ہے۔“

مگر کوئی کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سب اجنبی زبان
میں بات کر رہے تھے۔ اسے لاتوں اور مکوں بوکھلایا گیا۔ وہ
گریہ کر رہا تھا، شکوہ کر رہا تھا۔ اچانک کسی نے کھورا کا دستہ اس
کے سر پر دے مارا۔ ضرب کاری تھی۔ اس پر بے ہوشی نے حملہ
کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے کھینٹتے ہوئے ایک کونے میں لے
گئے۔ اسے رسیوں میں جکڑ کر ایک کونے میں ڈال دیا گیا۔
اس نے بے ہوشی سے گل انہیں اجنبی زبان میں بڑبڑاتے
سنا۔ وہ اُس زبان کا لفظ ایک ہی لفظ سمجھ سکا۔ ”دشمن...“
سولہویں صدی کا سب سے پراسرار واقعہ رونما ہو چکا
تھا۔

☆☆☆

خوف اُسے کبھی چھو کر نہیں گزرا، کوئی ہتھیار زخمی نہ
کر سکا، کوئی دشمن شکست نہیں دے سکا، وہ گل پر بڑبڑاتا... اس کی
پرورش وادیوں میں، پہاڑوں کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی
رفتار ہواسی تھی اور اس کے بازوؤں میں منہ زور لہروں کی قوت
تھی مگر اس سے... وہ بے بسی کی اتھاہ گہرائی میں پڑا تھا۔

ماریوں کے سائے گہرے ہو گئے۔ وہ رسیوں سے بندھا
ایک بدبودار اور گھٹن زدہ خیمے میں پڑا تھا۔ رسیاں کسی ہوئی
تھیں۔ پیاس سے گلا جھج رہا تھا۔ بہت دیر سے اس نے کچھ
نہیں کھایا تھا۔ کچھ دیر پہلے ایک شخص آیا۔ وہ اپنے لباس اور
چال سے کوئی اعلیٰ افسر لگتا تھا۔ اس نے اجنبی زبان میں کچھ
پوچھا۔

گل پر بڑبڑا کر چکرار ہا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ یہ لوگ کون
تھے؟ کچھ پلوں پہلے تو وہ فلیپائن میں تھا اور اب... یہاں اجنبی
لوگوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ کہاں آ گیا۔ کیا وہ کوئی خواب دیکھ رہا
ہے؟ کسی سحر کے زیر اثر ہے؟ کسی کی بددعا سے لگ گئی ہے؟

اس افسر کے سوالوں کا وہ کوئی جواب نہیں دے
سکا۔ اس کے اشارے پر دو سپاہی آگے بڑھے اور اس پر لاتوں

دیکھا۔ اسے اچنبھا ہوا۔ یہ جگہ اس دیوار سے یکسر مختلف تھی،
جس پر اس نے ٹیک لگایا تھا۔ وہ متذبذب تھا۔ خود کو تسلی دی
کہ وہ پہلی بار یہاں تعینات ہوا تھا، ممکن ہے، یہ جگہ ایسی ہی
ہو، اور صبح اس نے توجہ نہ دی ہو۔ اس نے دائیں سمت دیکھا تو
چوٹکا۔ سپاہی غائب ہو چکا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا۔ پھر
ٹہنٹنے لگا۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ بے شک یہ جگہ اجنبی تھی۔ یہ
بندرگاہ، مکانات محل... سب کچھ بدل گیا تھا۔

مگر یہ کیسے ممکن تھا... کچھ پلوں قبل، جب اس نے
آنکھیں موندیں تھیں، دیوار سے ٹیک لگایا تھا، وہ فلیپائن کے
شہر نیلا میں تھا... گورنر کے محل کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ اور
اب... اب وہ کہاں تھا؟ کس جگہ پر تھا؟ اگر یہ کوئی اور جگہ تھی، تو
وہ یہاں کیسے آ گیا؟ شام اتنی جلدی کیسے اتر آئی؟

کیا کسی نے اس پر سحر کر دیا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اس نے اپنا
بازو ڈٹولا، جہاں گھر سے رخصتی کے وقت اس کی بیوی نے ایک
حفاظتی دھاگا باندھا تھا... وہ دھاگا غائب تھا۔

اچانک اسے کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ دائیں جانب...
کچھ دور دو سپاہی کھڑے تھے۔ ایک تو وہی، جسے دیکھ کر اس
نے ہاتھ ہلایا۔ ایک کوئی اور تھا۔ وہ دونوں عجیب سی نظروں
سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہو گئے۔ گل
پر بڑبڑانے سوچا، شاید وہ اس بات پر ناراض ہوں کہ اتنے کٹھن
حالات کے باوجود وہ سو گیا۔ اس نے خود کو سزا کے لیے تیار کر
لیا، مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ کچھ انتہائی
شگفتہ رو نما ہو چکا ہے۔

☆☆☆

شام گہری ہو گئی۔

اسے کچھ سپاہی اپنے سمت آتے دکھائی دیے۔ ان کی
چال میں جھلکتی تھی۔ گل پر بڑبڑا کی بے چینی بڑھ گئی۔ جب وہ
قریب آئے، تو وہ چوٹکا۔ ان کے نیزے حملے کی پوزیشن میں
تھے اور ان کے چہروں پر کڑختی تھی۔ انہوں نے اس کو گھیر لیا۔
”کیا ہوا دوستو۔ خیریت؟“ اس نے لہجہ دوستانہ رکھتے
کی کوشش کی، مگر ان کی جارحیت میں کمی نہیں آئی۔

ایک نے چیخ کر کچھ کہا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ گل
پر بڑبڑا کر آگے بڑھا، تو ایک اور سپاہی چلایا۔ اس نے نیزہ
سیدھا کر دیا، اس کی انی چنگی۔ کسی قوت نے آدمی کے پیر پکڑ
لیے۔ وہ جنگ کا خوب تجربہ رکھتا تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ
وہاں موجود سپاہی اسے اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔
اگر وہ ایک قدم بھی آگے بڑھا، تو اس کا سرتن سے جدا ہو جائے

کی بارش کر دی۔ وہ درد اور ذلت کے احساس سے چلا اٹھایا۔
”میں ہسپانیہ کا سپاہی ہوں... میرا تعلق بارسلونا رجمنٹ سے ہے... گورنر کا قتل ہو گیا ہے۔“

افسر نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سپاہی رک گئے۔ آدمی جھکا۔ اس نے چباتے ہوئے کہا۔ ”ہسپانیہ؟“
زخموں سے چور گل پرینے اثبات میں گردن ہلائی۔
”میں فلپائن میں تھا... یہ کون سی جگہ ہے؟“

”فلپائن؟“ اعلیٰ افسر نے حیرت سے سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ سب کچھ دیر بڑبڑاتے رہے۔ افسر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد کسی نے اسے پانی لا کر دیا۔ اس نے گلاتر کیا۔ زندگی بحال ہوتی محسوس کی۔ اس نے دروازے پر تعینات سپاہی کو دیکھ کر منہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ گستاخی سے ہنسا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے خشک روٹی کا ایک ٹکڑا اس کی جانب اچھالا۔

روٹی باقی تھی، مگر اس وقت وہ بھی غنیمت تھی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ چہار سو سنانا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

اچانک شور اٹھا۔ پیروں کی آواز سنائی دی۔ کچھ افراد مشعل لے اندر داخل ہوئے۔ افسر کے ساتھ کچھ سپاہی تھے۔ انہوں نے گل پرین کو کھڑا کر دیا۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، تو اس کے جڑے پر ایک گھونسا رسید کر دیا گیا۔ اس کا منہ خون سے بھر گیا۔

اعلیٰ افسر کے ساتھ ایک خوش لباس آدمی تھا جو اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے چھڑی سے گل پرین کا لباس اٹھا کر دیکھا۔ اس کے بال اور جوتوں کا جائزہ لیا۔ افسر کے کان میں سرگوشی کی۔ افسر نے سر سے اشارہ کیا تو وہ آدمی گل پرین کی جانب متوجہ ہوا۔

”تم کون ہو؟“ گو آواز کرخت تھی، مگر وہ ہسپانوی میں بات کر رہا تھا۔ گل پرین کو لگا جیسے زندگی لوٹ آئی ہو۔
”شکر ہے بھائی تم ہسپانوی جانتے ہو۔ میں گل پرین ہوں۔ میرا تعلق بارسلونا رجمنٹ سے ہے۔“

مترجم متذبذب معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یہ باتیں افسر کو بتائیں۔ کچھ دیر وہ اجنبی زبان میں کچھ کہتا رہا۔
مترجم پھر اس سے مخاطب تھا۔ ”تم محل میں کیسے پہنچے؟“

”میں تو فیلا میں... محل ہی میں تعینات تھا۔ گورنر کو میز کا قتل ہو گیا تھا کل رات۔ یہ کون سی جگہ ہے۔“

مترجم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”غور سے سنو... تم اس وقت میکسیکو میں ہو۔“

”کیا۔“ وہ چلایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ ”کیوں مذاق کرتے ہو۔ میں تو فلپائن میں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے۔ ذرا سی نیند لی... اور تم لوگ کون ہو۔ کہیں تم بد معاشوں نے محل پر قبضہ تو نہیں کر لیا۔“

اس کے چہرے پر ایک اور گھونسا رسید ہوا۔ وہ زمین پر آ رہا۔ مترجم اور اعلیٰ افسر کچھ دیر بعد آپس میں بات کرتے رہے۔ مترجم اس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ذرا مجھے آج کی تاریخ اور سن تو بتاؤ میرے ہسپانوی دوست۔“

”اکتوبر...“ گل پرین ذہن پر زور دے رہا تھا۔ ”24 اکتوبر 1593۔“

”اور تم کہہ رہے ہو کہ کچھ دیر پہلے تم فیلا میں تھے۔“ اس کا لہجہ استہزا تھا۔ ”بکو اس بند کرو اور اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔ تم گورنر کو قتل کرنا چاہتے تھے نا۔“

”گورنر...“ وہ چلایا۔ ”ہاں اس کا قتل ہو گیا ہے۔ گورنر کو میز کو گل پرینوں نے قتل کر دیا۔“

”میں فیلا کے گورنر کی نہیں، میکسیکو کے گورنر کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے دانت پیسے۔

”میکسیکو؟“ وہ ہنسنے لگا۔ ”تم پھر مذاق کرنے لگے۔ سچ بتاؤ، تم لوگوں نے فیلا پر قبضہ کر لیا ہے نا۔ مگر تم چینی تو نہیں کہتے۔“

اس کے سر پر گہری ضرب لگی۔ دنیا تاریکی میں اتر گئی۔

☆☆☆
گل پرین کی کہانی نے میکسیکو کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

شرفاء کی محافل سے نان بانی کی دکانوں تک... ہر کوئی اس کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ سیاہی خود تو جیل میں بڑا سر رہا تھا، مگر اس کی کہانی اعلیٰ ایوان میں گردش کر رہی تھی... گل پرینوں میں سانس لے رہی تھی۔

اس کی گرفتاری کی اگلی صبح پورے میکسیکو میں یہ خبر پھیل گئی کہ فوج نے ایک ہسپانوی کو گرفتار کیا ہے، جو گورنر کو قتل کرنے آیا تھا اور محل کی فیصل تک جا پہنچا۔

اسی دو پہر اُسے قانونی شورٹی کے سامنے پیش کیا گیا، جہاں ایک تیز طرار افسر نے یہ سوال اٹھا کر کھلبلی مچا دی کہ ایک ہسپانوی اپنے جنگی لباس میں ملبوس، ہاتھ میں نیزہ لیے آخر اتنے آرام سے محل تک کیسے پہنچ گیا؟

منطقہ معتدلہ جنوبی

ساڑھے تیس درجے جنوبی عرض بلد سے ساڑھے چھیاسٹھ درجے عرض بلد جنوبی یعنی خط جدی سے دائرہ قطب جنوبی کے درمیان واقع ہے۔ اس کو منطقہ معتدلہ جنوبی یا (South Temperate zone) کہتے ہیں۔ اس منطقہ میں سورج کی شعاعیں کبھی عموداً نہیں پڑتیں پھر بھی یہاں پر گرمیوں میں کافی گرمی پڑتی ہے اور سردیوں میں اچھی خاصی سردی ہوتی ہے مگر اس کے سالانہ درجہ حرارت کی اوسط منطقہ بارودہ کی گرمی کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے اور منطقہ بارودہ کے مقابلے میں اس کی سردی بھی کم ہوتی ہے چونکہ یہ منطقہ حارہ جتنا گرم اور منطقہ بارودہ جیسا سرد نہیں اس لیے اسے منطقہ معتدلہ کہتے ہیں۔

مرسلہ: رعنا تبسم۔ لاہور

لگا کر یہاں پہنچا ہے... آؤ، اس کی پراسرار کہانی سنو۔

☆☆☆

زندگی قید میں تھی۔ کوٹھری میں جس رہتا۔ کڑکی سے نیا لاسندر نظر آیا کرتا تھا۔

قانونی شوری کو اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔ تفتیش کار بھی کوئی سراغ نہ پاسکے، مگر وہ اس کی کہانی پر اعتبار کرنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ اور وہ کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ بھلا کون مان سکتا تھا کہ وہ ایک پل میں نو ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آ گیا۔ کیا اس کے پاس کوئی جادوئی قالین تھا؟ ایسی باتیں تو بس قصے کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت کا ان سے کیا تعلق۔

گل پر یز سخت اذیت میں تھا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا، اس کا سر... جس نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا تھا، تن سے جدا کر دیا جاتا، مگر کسی بد قسمتی ہے... اسے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ وہ ہر صبح اپنی محبوبہ کو یاد کر کے روتا۔ اسے لگتا تھا کہ ساری زندگی اسی کال کوٹھری میں کئے گی۔ کاش کسی طرح وہ اُسے ایک پیغام پہنچا سکتا، یہ خبر دے سکتا کہ وہ زندہ ہے اور آج بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

آخر دو ماہ بعد... اچانک اس کی دعائیں رنگ لے آئیں۔ ایک تجارتی جہاز میکسیکو کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ وہ فلپائن سے آیا تھا۔ مسافر جہاز سے اترے، تو شہر میں یہ خبر پھیل

اس سوال کا محل کی حفاظت پر تعینات میکسیکن دستے اور اس کی کمان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک ماہر تفتیشی افسر نے یہ جاننے کے لیے کہ وہ میکسیکو کے بارے میں کتنا جانتا تھا، شہر کے کلی محلوں کی کتنی خبر رکھتا ہے، اس سے کچھ پُر بیچ سوالات کیے۔

سوالات کے بعد اس نے شورلی کے سامنے اعلان کیا۔ "اس شخص کو میکسیکو کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ یا تو یہ مخبوط الحواس ہے یا بہت بڑا جھوٹا ہے۔"

انہوں نے گل پر یز کو یہ بتا کر حیران کر دیا کہ جس جگہ وہ موجود ہے، وہ فلپائن سے نو ہزار میل دور ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک بے کراں غصیل سمندر یعنی بحر الکاہل ہے۔ یہ سفر تیز رفتار جہازوں کی مدد سے بھی کئی روز میں مکمل ہوگا۔ "بہتر یہ ہے کہ تم یہ لغو کہانی بند کرو اور سچ اگل دو۔" ایک

افسر چلایا۔

"مگر یہی سچ ہے۔" گل پر یز کی آنکھیں بھر آئیں۔ نہ تو وہ خوف زدہ تھا، نہ ہی تشدد اسے توڑ سکا، مگر تحیر نے اس کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ "میں کل دو پہر تک فلپائن میں تھا... اور جانے کیسے میں... ایک پل میں... یہاں اس منحوس جگہ پہنچ گیا۔"

وہ رونے لگا۔ کچھ سپاہی اسے تھمپتے ہوئے لے گئے۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ وہاں ایک مشہور شاعر بھی قید تھا۔ اس نے اپنا دکھ بھرا قصہ اسے سنایا۔ شاعر نے اس پر یقین تو نہیں کیا مگر ایک دلچسپ قصہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے اس واقعے پر ایک نظم لکھی، جو ایک سپاہی کی مٹھی گرم کر کے باہر پہنچا دی گئی۔ اگلے روز یہ نظم بازاروں میں پڑھی جا رہی تھی۔

بات پھلتی گئی۔ تین روز بعد ایک ساحر نے یہ دعویٰ کر دیا کہ گل پر یز سچ بول رہا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ بڑے میاں، تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو، تو اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "میرے قبضے میں جنات ہے، انہوں نے مجھے خبر دی ہے۔"

کچھ دن بعد چند مذہبی مبلغوں نے اپنے وعظ میں کتاب مقدس کے ان حصوں کا تذکرہ کیا، جن میں ایک فرد کے ایک لمحے میں ایک سے دوسری جگہ پہنچنے کا تذکرہ تھا۔ کچھ سائنس دان اور فلسفی بھی اس قسم کے دعوے کرتے نظر آئے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جنہوں نے اسے شیطان کا پجاری قرار دینے کی کوشش کی۔

الغرض گل پر یز کا نام اسرار کے پرندہ سے جڑ گیا تھا اور اب یہ پرندہ میکسیکو کے آسمان میں گردش کر رہا تھا۔ یہ اعلان کر رہا تھا کہ جیل خانے میں ایک عجیب شخص قید ہے، جو زمان و مکان کی جست

گئی کہ دو ماہ قبل گورنر گو میز کو چینوں نے قتل کر دیا تھا۔
جب یہ خبر قانونی شوری کے سربراہ تک پہنچی، تو وہ بھونچکا
رہ گیا۔ اس نے فوراً باقی ارکان کو اکٹھا کیا اور جہاز کے کپتان کو
بلا بھیجا۔ اس نے بھی خبر کی تصدیق کی۔

پہلی بار انھیں لگنے لگا کہ گل پر یز شاید سچ ہی کہہ رہا تھا۔
انھوں نے کپتان سے قتل کی تاریخ دریافت کی۔

”24 اکتوبر 1593۔“ کپتان نے کچھ سوچتے ہوئے
کہا۔

”ناممکن... یہ نہیں ہو سکتا۔“ ایک افسر چلایا۔
”کیا ہوا جناب؟“ کپتان گھبرا گیا۔ ”سب خیریت تو
ہے۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک افسر کے لب وا ہوئے۔
”کیا تم گل پر یز نامی کسی سپاہی کو جانتے ہو؟“

”گل پر یز۔“ کپتان کے چہرے پر حیرت تھی۔ ”آپ
تک اس کی خبر کیسے پہنچی۔ وہ تو... دو ماہ قبل غائب ہوا تھا۔ بڑا
تلاش کیا، مگر کوئی خبر نہیں...“

”وہ یہاں ہے۔ میکسیکو میں۔“ قانونی شوری کے سربراہ
نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

پہلے تو کپتان خوب ہنسا۔ ”حضور، کیوں مذاق کرتے
ہیں۔ درمیان میں طویل سفر۔ ہمارا کوئی جہاز یہاں نہیں آیا۔ کیا
وہ اڑ کر آ گیا تھا؟“

پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ”کہیں وہ... چینوں کے جہاز میں تو
یہاں نہیں پہنچا۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا جناب۔“

”ٹھیک ہے، تم جاسکتے ہو۔“ شوری کے سربراہ نے ہاتھ
سے اشارہ کیا۔

کچھ دیر بعد گل پر یز ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیران تھا
کہ آج اشرافیہ کو اس کی یاد کیسی آگئی۔ وہ تو اسے بھلا بیٹھے تھے۔

”اگر ہم تمہیں آزاد کر دیں... ہال میں آواز گونجی۔“ تو
تم کیا کرو کے گل پر یز؟“

”میں...“ اس نے ہچکی لی۔ ”میں اپنی محبوبہ کے پاس
جاؤں گا، اپنے گھر، اپنے گاؤں۔“

”تو جاؤ، ہم تمہیں آزاد کرتے ہیں۔“ شوری کے سربراہ
نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ہال میں دیر تک اس آواز کی بازگشت
سنائی دیتی رہی۔

”اوہ... مگر... سچ۔ میں آپ کا شکریہ۔“ وہ بوکھلا گیا۔
”جہاز تیار کھڑا ہے گل پر یز۔ تیار ہو جاؤ۔“

انھوں نے سکوں کی وہ سہیلی بھی اسے سوہنے دی، جو

مگر قاری کے وقت انھیں ملی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس بحری جہاز پر
سوار ہو رہا تھا۔ ہر شخص اُسے بھٹی بھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ
ان کے لیے ایک مافوق الفطرت انسان تھا، جس کی جست نے
زمان و مکاں کو پیٹ دیا... جو ایک لمحے میں دنیا کے ایک سے
دوسرے کونے میں پہنچ گیا۔

دو روز تک لوگ اس سے دور دور رہے۔ جب انھیں
یقین ہو گیا کہ وہ بے ضرر ہے، تب قریب آئے۔ اور تب اس
نے انھیں اپنی عجیب و غریب کہانی سنائی، جو ناقابل یقین معلوم
ہوتی تھی، مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا... گل
پر یز ان کے سامنے موجود تھا۔

قلپان جانے کی بجائے وہ مراکش کی بندرگاہ پر اتر
گیا۔ کپتان اس بات کے خلاف تھا، مگر وہ فوجی جہاز نہیں تھا۔
گل پر یز کسی حکم کا تابع نہیں تھا۔ کپتان نے احتیاطاً میدردیہ خبر
پہنچادی کہ نیلا میں لاہا ہونے والا اُن کا سپاہی میکسیکو کی قید میں
تھا، جہاں سے اُسے بنا کسی تاوان یا مطالبے کے رہا کر دیا گیا
ہے۔

گل پر یز کا اندازہ تھا کہ کپتان ایسا ہی کرے گا۔ اس
نے منصوبہ بنا لیا تھا۔ مراکش کی بندرگاہ پر اترنے کے بعد اس
نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ اس نے سمندری اور بحری
راستے تیزی سے طے کیے۔ ایک روز پو پھننے سے قبل وہ اپنا
گھوڑا اپنے میدردیہ کے فوجی اصطلیل پہنچ گیا۔ وہاں آج ایک
نوجوان نشی بیٹھا تھا۔

اس نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور مسلسل کھانس رہا تھا۔
سپاہی نے اپنا نام بتایا۔ نشی نے کہا: ”دیکھا، تو چونکا۔“ ارے،
تمہیں تو قلپان میں ہونا چاہیے تھا۔“

”میں بیمار پڑ گیا تھا۔“ وہ زور سے کھانسا۔ ”انھیں شک
ہے کہ مجھے کوئی معتدی مرض ہے۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“ نشی اس کی کھانسی سے گھبرا گیا
اور قلم چلانے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا
اپنے مالک کو پہچان کر خوشی سے ہنہنایا۔ گھر لوٹتے سے وہ ایک
سرائے کے پاس سے گزرا۔ وہاں بھیڑ تھی۔ وہاں رہنے والے
بوڑھے مستقبل میں کا انتقال ہو گیا تھا۔

وہ رکنا چاہتا تھا، مگر رکنا نہیں۔ چلتا رہا۔ وہ کسی کی دھڑکن
سننے کے لیے بے چین تھا۔ وادی اسے پکار رہی تھی۔ اس کی
آنکھوں کے سامنے اپنی محبوبہ کا چہرہ تھا۔

جان سکے۔

یہ 6 جون 1944ء کا واقعہ ہے جب اتحادی افواج نارمنڈی میں اتریں اور انہوں نے جرمنی کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ یہ جنگ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس کے پس منظر میں جاسوسی کا ایک بڑا گورکھ دھندا (نیٹ ورک) تھا جو بہت ہوشیار جاسوسوں نے انجام دیا تھا۔

اس واقعہ کے تانے بانے 1943ء میں شمالی افریقا (الجزائر) میں اتحادی افواج نے بٹے تھے۔ جنرل آئزن ہاور کے ماتحتوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اتحادی افواج اچانک سسلی میں اتار دی جائیں۔ اس منصوبے کے بارے میں انتہائی خاص افسران کے علاوہ کسی کو علم نہ ہو۔ جن افسران کو اس راز کا علم تھا ان میں ایک امریکی بھی شامل تھا جو بلا کا عیاش اور داد عیش دینے میں طاق تھا۔ ان دنوں ایک ولندیزی حسینہ سے اس کی محبت کی دل فریب کہانیاں سر عام پھیلی ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ حسینہ ولندیزی نہیں تھی، بلکہ جرمن تھی۔ وہ سب کو اپنا نام صوفیہ کیرولین بتاتی تھی۔ بے حد حسین، آنکھوں کے راستے دل میں اتر جانے والی، گفتگو میں شائستگی اور رک رکھاؤ۔ اے اطوار سے وہ اونچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گفتگو کرتی تو دل موہ لیتی تھی۔

جنرل آئزن ہاور کے انتہائی خفیہ آفس میں یہ منصوبہ

ہم نے صرف اردو کے سطحی ناول پڑھ کر ہی جانا ہے کہ جاسوسی کیا ہوتی ہے جب کہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اصلی وہ لوگ، جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے لیے کام کیا تھا۔ درحقیقت انہی کو جاسوس کہا جاسکتا ہے۔ یہ کھیل کو عجیب انداز سے کھیلتے تھے۔ سرحد پار کا کوئی شخص ملک میں آجائے اور اس کے بارے میں شبہ بھی ہو جائے کہ یہ دشمن ملک کا جاسوس ہے تو اسے فوری طور پر نہ تو گرفتار کرتے تھے اور نہ کوئی سزا دیتے تھے۔ اس کے بجائے اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ یہ کیا معلوم کرنے آیا ہے۔ اسے دوست بنا کر اصلیت اگلواد اور غلط سلط معلومات اس کے دماغ میں بھر کر اسے واپس بھیج دو۔ ہنگ لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔

اگر آپ تاریخ کے طالب علم ہیں اور آپ نے بغور اس کا مطالعہ کیا ہے تو آپ ماماہری اور کرشائین گیلر سے ضرور واقف ہوں گے۔ انہوں نے اپنی عیارانہ حرکتوں سے سیکڑوں فوجی راز ادھر سے ادھر کیے۔ ان میں صوفیہ کیرولین بھی شامل ہے۔ اس نے کافی کارنامے انجام دیے، لیکن اس کا نام اخبارات میں نہ آسکا۔ اس لیے کہ سختی سے کوشش کی گئی تھی کہ اس کا نام نہ ابھرے۔ ایک اندازے کے مطابق کوئی دس برس کے بعد یہ قصہ عام ہوا اور عام افراد اس کے بارے میں کچھ

قیامت برپا کر دینے والی دو شیزہ کا تذکرہ

خدا نے اسے حسنِ جہاں سوز کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ اسے دیکھتے ہی جذبات میں مد و جزر کا اٹھنا ضروری تھا۔ اپنی اسی خوبی و خوش شکلی کو اس نے ہتھیار بنایا اور اتحادیوں کو زک پہنچاتی چلی گئی۔

شکیل صدیقی

عیار حسینہ



پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابن صفی،

جاسوسی دنیا از ابن صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بنایا گیا کہ اتحادی فوجیں سسلی پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں۔ یہ منصوبہ صبح گیارہ بجے بنا اور شام پانچ بجے حملہ کیا گیا، لیکن جرمنی کو اس کی اطلاع مل چکی تھی، لہذا اتحادیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ انہیں ایسی شکست ہوئی کہ وہ پڑ مردہ اور افسردہ ہو کر بیٹھ گئے۔ انہیں مایوسی ہوئی کہ اب شاید وہ جرمنی کو کبھی شکست نہ دے پائیں۔ اس لیے کہ اس کی جاسوسی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ فتح انہوں نے منصوبہ تیار کیا اور شام سے پہلے جرمنی کو خبر ہو گئی۔

افسران کو یہ کھوج لگ گئی کہ جرمنی کو اس حملے کی خبر کیسے ہو گئی؟ اس لیے کہ ان کی تعداد سسلی میں بہت کم تھی، مگر اتحادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے بھاری فوج طلب کر لی۔ گویا کوئی گھر کا بھیدی تھا جس نے راز افشا کر دیا تھا اور اتحادیوں کو ہزیمت اور شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

اس شخص کی تلاش میں سب کوشاں تھے اور اپنے اپنے اندازے سے اس جاسوس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک وہ امریکی ایک میز پر بیٹھا نظر آیا جس کا نام رچرڈ تھا۔ کسی نے پوچھا کہ اتنے اداس کیوں ہو؟ اس نے بتایا کہ اس کی محبوبہ صوفیہ کئی دن سے نظر نہیں آ رہی ہے، اس لیے دل اداس ہے۔

استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ صوفیہ اسے چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ جب یہ خبر محکمہ سراغ رسانی تک پہنچی تو انہوں نے میجر رچرڈ کو طلب کر لیا۔ اس سے ٹیڑھے ترچھے اور نوکیلے سوالات کیے گئے تو اس نے قبول کر لیا کہ اس نے صوفیہ کو بتا دیا تھا کہ اتحادی سسلی پر حملہ کرنے والے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں خفیہ محکمے کا انچارج جنرل انوون تھا۔ بے حد مستعد اور پھریتلا۔ سراغ رسانی کا ماہر۔ اس کی ماتحتی میں دو افسران کام کرتے تھے۔ ان تینوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اگر صوفیہ اس ریسٹوران میں دوبارہ نظر آئے تو ہم اس سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے اور ایسا رویہ اختیار کریں گے جیسے ہمیں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ جب اسے یقین ہو جائے گا کہ اس پر کسی کوشش نہیں ہوا ہے تو وہ پھر ہماری ٹوہ میں رہے گی اور کوشش کرے گی کہ کوئی راز لے اڑے۔

ایک ہفتے بعد چند افسران نے ریسٹوران میں لوگوں کو یہ خبر پہنچائی کہ صوفیہ ہالینڈ سے لندن آ چکی ہے۔ ممکن ہے کسی روز اس ریسٹوران میں بھی وارد ہو جائے۔ یہ خبر دے کر وہ چاہتے تھے کہ سب چوکنٹا ہو جائیں۔ صوفیہ لندن آ کر آزادی سے گھومنے پھرنے لگی۔ وہ ریسٹورانوں اور ہوٹلوں میں فوجیوں سے ملاقاتیں کر رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی

نہیں تھا کہ اس کی اصلیت سے اتحادی سراغ رساں واقف ہو چکے ہیں کہ وہ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہے۔ محکمہ سراغ رسانی کے افسران سر جوڑے اس عقدے میں الجھے ہوئے تھے کہ اس سیکرٹ ایجنٹ کو اس بار کون سی ایسی اطلاع دی جائے جو قطعاً غلط ہو، لیکن جرمن اس پر اعتبار کر لیں۔ انہیں شبہ نہ ہو کہ ان تک پہنچنے والی اطلاع جھوٹی ہے۔ وہ اسے سچ سمجھ کر اس پر عمل کر ڈالیں اور منہ کی کھائیں۔

ان دنوں اتحادی نارمنڈی میں اپنی فوجیں اتار رہے تھے اور نئی صف بندی کر رہے تھے۔ جرمنی کو اس بارے میں علم تھا اور وہ جوابی حملے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے۔ اتحادیوں کی طرح سے ان کا محکمہ سراغ رسانی بھی مصروف عمل تھا اور پل پل کی خبر رکھتا تھا۔

اتحادی سیکرٹ سروس نے یہ خبر پھیلانی شروع کر دی کہ وہ نارمنڈی پر حملہ نہیں کریں گے، بلکہ اس بار ان کا ہدف ہالینڈ ہوگا۔ اس لیے کہ جرمنی کو اتحادیوں کا یہ منصوبہ معلوم ہو چکا ہے، لہذا انہوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر دی ہے۔ اب یہ راز کسی معتبر افسر کے ذریعے صوفیہ تک پہنچ جاتا تو دارے نیارے ہو جاتے تھے۔ اس لیے کہ ایک طرح سے تصدیق ہو جاتی کہ اتحادی یہ سب کرنے جا رہے ہیں۔

اب ایک ایسا خوب رو اور حسین افسر تلاش کرنا تھا جو صوفیہ کے ذہن میں یہ سب بٹھا سکے۔ اس کے انداز میں گرم جوشی ہونا چاہیے تھی، تاکہ صوفیہ کو اس پر شبہ نہ ہو سکے۔ صوفیہ ایک سیکرٹ ایجنٹ تھی اور اسی کے لیول کے لحاظ سے کام کرنا تھا۔ اس لیے کہ سیکرٹ ایجنٹ پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔

اب جعلی طور پر ایک ایسا ادارہ قائم کرنا تھا جو ہالینڈ کا نقشہ تیار کرے اور جنگ کی علامات کو اس نقشہ پر ظاہر کرے تاکہ یہ تاثر دیا جاسکے کہ اتحادی خفیہ طور پر جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔

اس کے لیے ایک فلم کمپنی بنائی گئی۔ وارڈو اسٹریٹ لندن میں اس کا باقاعدہ آفس اور اسٹوڈیو بنایا گیا۔ اس کمپنی میں سارے افراد ہالینڈ کے بھرتی کیے گئے، جن پر ہٹلر نے مظالم کیے تھے اور اب وہ لندن میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس فلم کمپنی کا کام یہ تھا کہ وہ ہالینڈ کے لوگوں کے بارے میں فلمیں تیار کرے، پمفلٹ چھپوائے اور ان کو ہالینڈ تک پہنچائے تاکہ وہاں کے لوگوں کا حوصلہ بلند ہو اور وہ یقین کر لیں کہ ایک نہ ایک دن اتحادی انہیں ہٹلر کے چنگل سے چھڑا لیں گے۔

مئے، البتہ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے ٹیکسی کر لی تھی۔ صوفیہ نے اپنے اور گریگ کے لیے ایک ٹیکسی رکوائی تھی۔ صوفیہ کی قیام گاہ کی نگرانی پہلے ہی محکمہ سراغ رسانی کے لوگ کر رہے تھے۔ انہوں نے ہیڈ آفس کو اطلاع دی کہ دونوں وہاں پہنچ چکے ہیں۔

صبح نو بجے کے قریب گریگ وہاں سے نکلا اور محکمہ سراغ رسانی کے آفس کے لیے اس نے ایک ٹیکسی کی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور دل کش لگ رہا تھا۔ اس کے سنہری بال سلیقہ مندی سے کھوپڑی پر جھے ہوئے تھے۔ اس نے وہاں پہنچ کر رپورٹ دی۔ سب اس کی رپورٹ سے مطمئن تھے۔ گریگ کو ہدایت دی گئی کہ وہ دوستی کی پیشکشیں بڑھائے اور صوفیہ کا ہاتھ نہ چھوڑے۔ اسے ہلکے پھلکے خفیہ رازوں سے بھی آگاہ کرتا رہے۔ یہ راز اسے محکمہ سراغ رسانی جاری کرے گا۔

جب محکمے نے دیکھ لیا کہ گریگ اور صوفیہ ایک دوسرے کے بہت نزدیک آگئے ہیں تو انہوں نے گریگ کو خفیہ کانفرنسوں میں بلانا شروع کر دیا۔ ان کانفرنسوں میں سخت پہرہ ہوتا تھا اور باہر خاردار تاریں پڑی ہوتی تھیں۔ وہاں ہالینڈ پر حملے کا تذکرہ ہوتا تھا۔ حملہ کب ہوگا اور کتنی فوج وہاں اتاری جائے گی۔ اس کے بارے میں جعلی اور مصنوعی باتیں کی جاتیں تاکہ... گریگ ان سے متاثر ہو اور انہیں صوفیہ تک پہنچادے۔

اس قسم کی باتیں جاسوسوں کے بند کمرے میں بیٹھ کر ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ وہ کسی طرح سے ہٹلر کی سماعت تک بھی پہنچ جائیں۔

لندن میں ہونے والی کانفرنسوں کی روداد گریگ، اپنی محبوبہ دل نواز صوفیہ کو گوش گزار کر دیتا تو وہ انہیں جرمنی پہنچا دیتی۔ اس کے پاس خفیہ افراد کا ایک گروپ تھا جو یہ کام کرتا تھا۔

لندن سیکرٹ سروس نے صوفیہ کو مزید اپنے جال میں پھانسنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے گریگ کو بلا کر حکم دیا کہ چند خفیہ کاغذات لے کر اسے فرانس جانا ہے۔ ایک خفیہ طیارہ اسے وہاں تک لے جائے گا۔ یہ طیارہ اسے رودبار انگلستان کے پار لے جائے گا اور جرمن افواج کے عقب میں اتارے گا۔ وہاں اس سے ایک جاسوس آکر ملے گا۔ یہ کاغذات اسے دینا ہیں۔ تمہیں کل رات بارہ بجے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہے۔ فلاں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤ۔

وہ سراغ رساں جو صوفیہ کے گھر پر متعین تھے، انہوں نے

اس کہانی میں اتحادیوں نے مظلوم ولندیزیوں کی امداد کے لیے اپنے چند افسر بھی متعین کر دیے۔ ان افسران میں ایک گریگ بھی تھا۔ سنہری بالوں والا ایک حسین امریکی۔ انہیں تنبیہ کی گئی کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہو کہ اتحادی ہالینڈ میں اپنی فوجیں اتارنے والا ہے۔ یہ کہانی چند ہفتوں میں خوب کام کرنے لگی۔ یعنی فلمیں بننے لگیں، پمفلٹ چھپنے لگے اور ہالینڈ تک جانے لگے۔ وہاں بھی ایک خوش و خروش پھیل گیا کہ اتحادی انہیں آزاد کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔ کہانی میں کام کرنے والے بھی ولولے سے کام کر رہے تھے کہ وہ اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے کام کر رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ آزادی حاصل کرنے کا باقاعدہ ایک مشن ہے۔

اب اگلا مرحلہ تھا کہ کسی طرح سے صوفیہ اور گریگ کی ملاقات کرائی جائے۔ وہ ایک سنجیدہ افسر تھا اور ہر اعتبار سے معتبر۔ ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔ اس میں گریگ اور صوفیہ کو بھی بلایا گیا۔ ایک طرف اس کا جھجکاؤ پر چند حسینائیں محور قص تھیں۔ آرکسٹرا جاز کی ایک خوبصورت دھن بجا رہا تھا۔ کچھ جوڑے رقص کر رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح بہ رہی تھی۔

صوفیہ اس محفل میں کسی ٹھیکینے کی طرح دمک رہی تھی۔ اس کی آمد پر ایک افسر ماریونے اسے خوش آمدید کہا اور ایک وسطی میز کی طرف لے گیا۔ جو خاص طور پر اس کے لیے وہاں رکھی گئی تھی، تاکہ وہ مرکز نگاہ رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ افسر اس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ گریگ اپنی میز پر تھا تھا۔ اس لیے اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ کسی لڑکی نے اب تک اسے لگت نہیں کرائی تھی۔

محکمہ سراغ رسانی کا افسر ماریو جو صوفیہ کے ساتھ رقص کر رہا تھا اس نے نہایت عیاری سے کہا کہ اس شخص سے کبھی کوئی سروکار نہ رکھنا۔ وہ سنہری بالوں والا۔ خفیہ کا بڑا افسر ہے، لیکن اسے بہت غرور ہے۔ لڑکیاں بھی اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ یہ جرمنی کے خفیہ ٹھکانوں پر بھی جا کر وہاں کے راز لا چکا ہے۔ اس لیے اس کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

رقص تھوڑی دیر کے لیے ختم ہو گیا۔ سب ادھر ادھر ہو گئے۔ جب رقص دوبارہ شروع ہوا تو خفیہ کا افسر ماریو واپس آیا تو اس نے صوفیہ کو گریگ کے ساتھ رقص کرتے دیکھا۔ سب کچھ ٹھیک اس کے منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔

رقص و سرود کی محفل ڈھائی بجے رات کو ختم ہوئی۔ جن کے پاس اپنی کاریں تھیں وہ ان میں بیٹھ کر واپس چلے

اتحادی یہی کچھ کرنے والے ہیں۔ وہ پورے وثوق سے جرمنی کو یہ اطلاع دے گی اور بتائے گی کہ سیکرٹ سروس میں یہ سب تانے بانے بے جا رہے ہیں۔

ولندیزی نے جو کچھ کہا وہ صوفیہ نے ترجمہ کر کے خود انگریزوں کو بتایا کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں اور ان کی فوجی تیاری بالکل مکمل ہے۔ ہر چند کہ وہ اس وقت مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی، لیکن دل ہی دل میں خوش تھی کہ وہ انتہائی خفیہ رازوں کی امین بن رہی ہے۔ یقیناً قدرت اس پر مہربان تھی کہ اس کی کوشش کے بغیر انمول اور بیش بہا چیزیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔

چند انگریز سیکرٹ ایجنٹ اچھی طرح سے ولندیزی جانتے تھے تاکہ ان سے گفتگو کر سکیں، اس وقت بھی وہ سب کچھ سمجھ رہے تھے مگر بدھو بنے ہوئے تھے، تاکہ صوفیہ کو سچ میں ڈال کر بات جرمنی تک پہنچائی جاسکے۔ مترجم کی حیثیت سے اس کا کام ختم ہو گیا تو اسے چھٹی دے دی گئی۔ صوفیہ نے اپنے ذرائع سے یہ خبر جرمنی تک پہنچا دی کہ اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے میں سنجیدہ ہیں اور اس موضوع پر ہالینڈ کے ایک مقامی سیکرٹ ایجنٹ سے میرے توسط سے گفتگو کر رہے تھے۔

جرمنی نے نارمنڈی سے فوجیں ہٹانے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ اس بات کی تصدیق ان اتحادی سیکرٹ ایجنٹوں نے بھی کی جو نارمنڈی میں کام کر رہے تھے۔ اتحادیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کہ پھمکی نے بالآخر چارہ کھالیا۔ انہوں نے صوفیہ کو اس قلم کمپنی میں کام کرنے کی پیشکش کی جو اس نے منظور کر لی۔ اس کے ذریعے وہ زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈا کرنا چاہتے تھے۔ یہ انتہائی خفیہ کام وہ انہی کے سیکرٹ ایجنٹ سے لے رہے تھے۔

اسٹوڈیو اور قلم کمپنی کا کام چوبیس گھنٹے ہونے لگا۔ اداکاروں کی ریل پیل شروع ہو گئی۔ کیمرے چلنے لگے۔ زیادہ سے زیادہ فلمیں بننے اور ریلیز ہونے لگیں۔ پوسٹر خفیہ طریقوں سے ہالینڈ لے جائے گئے تاکہ جوش و خروش میں اضافہ ہو سکے اور منظر میں سچائی کا رنگ بھرا جاسکے۔

صوفیہ کو انہوں نے چونکہ کھلی چھٹی دے رکھی تھی، چنانچہ وہ قلم کمپنی میں استعمال ہونے والے کاغذات کی کاپیاں کرا کے ہالینڈ بھیج دیتی تھی۔

میجر گرگ اس بات سے لاعلم تھا کہ صوفیہ دشمنوں کی ایجنٹ ہے اور وہ جرمنی کو لندن سے اطلاعات فراہم کر رہی ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا تو وہ سارا بھاٹا اچھوڑ دیتا ایسی

اطلاع دی کہ گرگ جاتے وقت صوفیہ سے بھی ملا تھا۔

اتحادیوں کے جاسوسوں نے جرمنی سے اطلاع دی کہ لندن کے خفیہ محکمے سے ہٹلر کو اطلاع ملی ہے کہ ایک جاسوس انگلستان سے فرانس کے ساحل پر قلاں وقت اترے گا۔ وہ چند کاغذات کسی اور جاسوس کو دے گا۔ جو جاسوس لندن سے آرہا ہے، اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے، اسے گرفتار بھی نہ کیا جائے۔ البتہ اس جاسوس پر کڑی نگاہ رکھی جائے جسے خفیہ کاغذات ملیں گے۔

گرگ حفاظت سے فرانس پہنچ گیا اور اس نے وہ کاغذات جاسوس کے حوالے کر دیے۔ اس جاسوس نے ایسی نشانیاں بتائی تھیں کہ اس نے یقین کر لیا۔ اس کے بعد وہ پھر طیارے میں بیٹھا اور وہاں سے لندن واپس پہنچ گیا۔ البتہ اس جاسوس کو جرمن نے ہلاک کر دیا۔

جرمن سیکرٹ سروس میں صوفیہ کے اس کارنامے کی دھاک بیٹھ گئی۔ وہ معتبر سمجھی جانے لگی۔ مگر خفیہ کے چند جزلوں کو اب بھی شک و شبہ تھا۔ جب ان کے شک و شبہ کی خبریں لندن آفس تک پہنچیں تو انہیں تشویش ہوئی کہ کسی طرح سے ان کا شبہ دور کیا جائے۔ تاکہ جرمن یہ سمجھنے لگیں کہ اتحادی واقعی نارمنڈی پر نہیں بلکہ ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں۔

لندن سیکرٹ سروس نے اس سلسلے میں دو ترکیبیں سوچیں، یہ دونوں کامیاب رہیں۔ ایک یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنی کارروائیاں تیز کرنے کا حکم دیا جائے جو ہالینڈ میں مصروف عمل ہیں۔ ان کے ایک سربراہ کو خفیہ طیارے کے ذریعے لندن بلا یا گیا۔ گفتگو تسلی بخش نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ وہ ولندیزی تھا اور اسے ایک انگریز سے بات کرنا تھی۔ ایک مترجم کی ضرورت پڑی۔ اس کے بغیر کام نہیں چل رہا تھا۔ ایسا کوئی مترجم جس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا جاسکے، ملنا دشوار تھا۔

گرگ نے بتایا کہ صوفیہ نامی ایک لڑکی اس کی دوست ہے اور ہالینڈ کی رہنے والی ہے۔ وہاں کی بولی اچھی طرح سے سمجھ لیتی ہے۔ سیکرٹ سروس نے اس کا نام اور پتہ لے لیا اور کہا کہ ہم اس لڑکی کو یہاں بلا لیتے ہیں۔ اگر وہ قابل اعتماد ہے تو اس کے سامنے ولندیزی سے گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ بھی سیکرٹ سروس کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ولندیزی ایجنٹ کے سامنے ہالینڈ پر حملہ کرنے کا منصوبہ زور و شور سے پیش کیا جائے تاکہ صوفیہ کو سو فی صد یقین آجائے کہ

کیے ہوئے کام کی قدر و قیمت زیادہ تھی۔ ہر شخص اس پر اعتبار کر لیتا۔

سیکرٹ سروس کے سربراہ کوون نے تین بار اپنی چابیاں میز پر یوں رکھ دیں جیسے بھول گیا ہو۔ مگر جب اس نے واپس آ کر دیکھا تو چابیاں ویسے ہی اس جگہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ کسی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ایک بار کوون، گریگ کے گھر پر بھی گیا اور اس کی میز پر چابیاں بھول کر چلا آیا تا کہ وہ صوفیہ تک پہنچ جائیں اور وہ ان کی نقل تیار کرالے۔

ایک دن سیکرٹ ایجنٹ کے سربراہ کوون نے نقشہ اپنی تجوری سے نکالا۔ پھر گریگ اور صوفیہ کی موجودگی میں ان سے مشورہ لیا۔ اس کے بعد اسے پھر تجوری میں رکھ دیا۔ اس نے گریگ سے کہا کہ اس نے بہت دنوں سے کسی اچھے ریسٹوران میں کھانا نہیں کھایا ہے۔ اس لیے وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ صوفیہ تہائی میں اس نقشے کو تجوری سے نکال کر اس کی کاپی کرالے۔

جب صوفیہ کو کھلا موقع مل گیا تو اس نے تجوری کی چابی سے اسے کھولا۔ چابی اس نے پہلے ہی بنوار رکھی تھی۔ اس نے دو چابیاں تیار کر رکھی تھیں۔ تجوری کھل گئی تو اس نے نقشہ نکال کر میز پر پھیلا دیا۔ اس کے پاس نٹھسا سا خفیہ کیمرہ تھا۔ اس نے اپنے وٹنی بیگ سے اسے نکالا اور نقشے کی تصاویر کھینچنا شروع کر دیں۔ اس نے اپنا کام مکمل کرنے کے بعد نقشے کو تجوری میں رکھا اور اسے بند کرنے کے بعد سیکرٹ سروس کے آفس کو بند کیا اور وہاں سے نکل آئی۔ وہ کوئی معمولی جگہ نہیں تھی۔ سیکرٹ سروس کا آفس تھا۔ اس کی ہر حرکت کو نوٹ کیا جا رہا تھا مگر چیف کی ہدایت تھی کہ اسے روکا تو کاناہ جائے۔ اس کی کامیابی حقیقت میں ہماری کامیابی ہے۔

صوفیہ کو معلوم تھا کہ وہ نقشہ اتنا قیمتی ہے کہ جس کسی کے ہاتھ لگے گا وہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے گا۔ چنانچہ اسے خود جرمنی جانا چاہیے۔ اس نے اپنے وسائل استعمال کیے اور جرمنی پہنچ کر ہائی کمان کو وہ نقشہ پیش کیا۔ ہٹلر اور اس کے جرنلوں نے اس پر اعتبار کر لیا کہ نقشہ درست ہے اور اس کے مطابق عمل ہونے جا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ہالینڈ میں فوج جمع کی اور اس کی صف بندی کر ڈالی۔

6 جون 1944ء کا سورج ابھی نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ اتحادی افواج نے نارمنڈی کے ساحل پر اتر کر دھاوا بول دیا۔ یوں ہٹلر کا سورج جو نصف نہار پر پہنچا ہوا تھا غروب ہو گیا۔

صورت میں اسے گرفتار کر کے اس کے انجام تک پہنچانا ضروری ہو جاتا۔ اس طرح سے بنایا کھیل خاک میں مل جاتا اور وہ کسی صورت بھی ہالینڈ تک یہ اطلاعات نہ پہنچ پاتے کہ اتحادی وہاں حملہ کرنے والے ہیں۔

صوفیہ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہے اور ان کے لیے جاسوسی کر رہی ہے، اس کا علم محدود ہے چند افراد کو تھا۔ ایک سیکرٹ سروس کا سربراہ جنرل کوون اور دو اس کے معاونین۔ حد یہ ہے کہ میجر گریگ جو شب و روز اس کی ہانہوں میں وقت گزارتا تھا وہ بھی اس سے ناواقف تھا۔ وہ ایک اچھا سیکرٹ ایجنٹ تھا مگر صوفیہ نے اسے ہوا ہی نہیں لگنے دی تھی۔

اتحادی اپنی جگہوں پر محتاط تھے تاکہ اس بار ان کا وار بالکل نشانے پر بیٹھے اور وہ ہٹلر کو شکست سے دوچار کر سکیں۔ ہٹلر کی خفیہ تنظیم گستاپو کے سیکرٹ ایجنٹوں کو چکمہ دینا آسان کام نہ تھا۔ اتحادیوں کو اس مرحلے سے بہ خیر و خوبی گزارنا تھا۔ اسی پر ان کی کامیابی کا انحصار تھا۔

اسی اثنا میں اتحادیوں کے سیکرٹ ایجنٹوں نے ہیڈ آفس تک یہ خبر پہنچائی کہ ہٹلر کو اس ماسٹر پلان کی تلاش تھی، جس کی رو سے اتحادی ہالینڈ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ وہ کہاں کتنا اسلحہ استعمال کریں گے اور فوجوں کی تعداد کہاں پر کتنی ہوگی۔ حملے کا آغاز کہاں سے اور کس وقت کیا جائے گا۔ اس ماسٹر پلان کو حاصل کرنے کے لیے اس نے گستاپو کے سیکرٹ ایجنٹوں کو لندن بھیجا۔ اس کی ہدایت تھی کہ ہر کام احتیاط سے کیا جائے۔

دوسری طرف اتحادی کسی احتیاط کے حق میں نہیں تھے۔ وہ تو چاہتے ہی تھے کہ کسی طرح سے نقلی اور جعلی نقشہ جرمنی پہنچ جائے تاکہ جرمنی کو یقین ہو جائے کہ اتحادی افواج نارمنڈی پر نہیں بلکہ ہالینڈ پر حملہ کرنے والی ہیں۔

لندن سیکرٹ سروس نے ایک نقشہ پہلے سے تیار کر رکھا تھا تاکہ ہٹلر کی سیکرٹ سروس گستاپو کے جوانوں کو چکمہ دیا جاسکے۔ نقشہ مہارت سے بنایا گیا تھا اور ویسا ہی تھا کہ جیسا کہ جنگ کے زمانے میں بنایا جاتا ہے اور اس کے مطابق فوج کو حرکت دی جاتی ہے۔ اس نقشے کو دیکھ کر ہٹلر کو سو فی صد یقین آ جاتا۔ نقشہ تیار ہونے کے بعد اتحادی سیکرٹ سروس کے ایجنٹوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کسی طرح سے صوفیہ کو اس کی چوری کی ترغیب دی جائے۔ جرمنی کی سیکرٹ ایجنٹ ہونے کی وجہ سے اس کے

بد نصیب

کشمالہ حسن

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا مقدر بد نصیبی ہوتی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کر لیں لیکن قسمت کو ان پر رحم نہیں آتا۔ اچھا کام بھی کریں تو وہ برا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی چند مشہور شخصیت کا ذکر خاص جن کی تلاش میں بد قسمتی رہی ہے۔



ایک حیران کر دینے والی دلچسپ تحریر

خوش نصیبی اور بد نصیبی تو ہر ایک کے ساتھ ہوتی

ہے۔

ہر وقت یہی سننے میں آتا ہے۔ ہائے ہائے، بے چارہ کتنا بد نصیب ہے یا کتنا خوش ہے یا پھر یہ کہ واہ وا قسمت ہو تو ایسی ہو۔ کل تک سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا اور آج کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یہ سب انسان کے ساتھ ہوتا رہتا ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پیٹ بھر کر بد قسمت ہوتے ہیں۔

جولائی 2016ء

155

ماہنامہ سرگزشت

آئیے دنیا کے عظیم الشان بد نصیبوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

1- اسپین میں ہر سال کرسمس کی خوشی میں ایک لائری نکلتی ہے۔ اس کا نام ”ایلی گورڈو“ ہے۔ اس کی مالیت کروڑوں میں ہوتی ہے اور جس کی یہ لائری نکل آئے۔ اس کی قسمت بدل جاتی ہے اس کے پاس بینک بیلنس، شاندار گھر، کاروبار سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے دولت چیز ہی ایسی ہے۔

اسی اسپین میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا نام سوڈیڈو ہے۔ اس قصبے میں صرف ستر اسی گھر ہیں، گھر کیا عالیشان علاقے ہیں۔ کیونکہ اس قصبے کے ہر شخص کی لائری نکل چکی ہے۔ سب کے سب کروڑ پتی ہو چکے ہیں لیکن کسی نے اس علاقے سے کہیں دور جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ سب کے سب وہیں رہے صرف اپنے چھوٹے گھروں کو عالیشان بنوالیا۔

اور ان ہی گھروں کے درمیان ایک گھر بے چارے کاسٹس کا بھی ہے۔ اس نے ہر سال لائری کا ٹکٹ خریدا ہے۔

ایک بار تو اس نے اپنا ٹریکٹریج کر درجنوں ٹکٹ خرید لیے۔ لیکن لائری نہ نکلی تھی نہ نکلی جبکہ اسی سال اس کے پڑوسی کی نکل آئی۔

دوسرے سال اس نے اپنی زمین کا کچھ حصہ فروخت کر کے پھر درجنوں ٹکٹ خرید لیے لیکن نتیجہ وہی رہا۔ یعنی لائری نہیں نکلتی تھی نہیں نکلی۔ اور اتفاق سے ایک اور شخص کی نکل آئی جس کے پاس صرف دو ٹکٹ تھے۔

خوش قسمتی اس قصبے کے ہر شخص کے دروازے پر دستک دے چکی ہے۔ سوائے کاسٹس کے۔ اب ہے کوئی اس کا علاج۔

2- اب آجائیں ایک دوسرے بد نصیب کی طرف۔ اس بے چارے کا نام ہے رے سلوین۔ ورجینیا کے بیٹل پارک کے ٹرانوں میں سے ایک ہے۔ بس یوں ہی سی آمدنی ہے اس کی۔

ایک بار اس کو ایک دوسرے شہر میں ایک بہت اچھی جاب کی آفر ہوئی۔ تنخواہ بھی بہت اچھی تھی اور دیگر مراعات بھی تھیں۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ گھر سے نکلا۔

اس دن موسم بھی خوش گوار تھا اور خود سلوین کا موڈ بھی خوش گوار تھا۔ اس کو بس کے ذریعے جانا تھا۔ گھر سے اسٹاپ

کا فاصلہ بس پانچ منٹ کا تھا۔

ابھی گھر سے نکلا ہی تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے موسم کے تپور بدل گئے۔ کالے کالے بادل اٹھ آئے۔ بارش ہونے لگی۔

خیر یہ سب تو وہاں کے لیے عام سی بات ہے۔ خاص بات یہ ہوئی کہ زور زور سے بجلیاں چمکنے لگیں اور ابھی وہ بے چارہ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا کہ ایک زور کا تڑا کا ہوا۔ پھر اسے ہوش ہی نہیں رہا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اس پر بجلی گر گئی تھی۔

اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے بچالیا گیا، یہ اور بات ہے کہ وہ دو مہینوں تک اسپتال میں رہا تھا۔ اس کے بعد ظاہر ہے وہ نوکری تو اس کے ہاتھ سے چلی ہی گئی۔

اس کی ایک جاننے والی لڑکی تھی۔ پہلے وہ ورجینیا ہی میں رہتی تھی، سلوین۔ وہ اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ پراہلم بس یہی تھی کہ سلوین کی آمدنی ابھی زیادہ نہیں تھی۔

پھر یہ ہوا کہ اس لڑکی کے والدین کیلی فورنیا چلے گئے۔ جہاں لڑکی کے باپ نے کوئی کاروبار شروع کر دیا اور اچھا خاصا بزنس ہو گیا۔

لڑکی نے اپنے باپ سے جب سلوین کا ذکر کیا تو وہ سلوین سے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے نہ صرف تیار ہو گیا بلکہ اس نے یہاں تک آفر کی کہ سلوین چاہے تو اس کی فرم بھی جوائن کر سکتا ہے۔

سلوین کو جب یہ خبر ملی تو وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ اسے اور کیا چاہیے تھا اس نے اپنی پرانی ملازمت چھوڑ دی اور کیلی فورنیا کے لیے روانہ ہو گیا۔

راستے میں اس پر پھر بجلی گر پڑی۔ جی ہاں بجلی دوبارہ گری۔ اس بار پورے ایک سال تک اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

پھر کہاں کی نوکری اور کہاں کی لڑکی۔ دونوں اس کے ہاتھ سے نکل گئیں۔

اس کے بعد بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ جب بھی اس کا کوئی کام بننے والا ہوتا، اس پر بجلی گر پڑتی (معاورہ نہیں بلکہ حقیقتاً) خدا جانے بجلیوں کو اس سے کیا دلچسپی ہو گئی تھی۔

انتہائی ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی قبر پر بھی بجلی گر پڑی تھی۔

2005ء کی۔

اس بار کرائے کا مکان بھی تباہ ہو گیا اور اب لوگ انہیں مشورہ دے رہے تھے کہ خدا کے لیے تم اب کسی پہاڑ پر جا کر رہو۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی طوفان نہ آئے۔

ایک اور صاحب ہیں۔ برطانیہ کے جان کلامٹ۔ ان کی داستان بھی بہت دلچسپ ہے لیکن ان کے بارے میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ موصوف خوش قسمت زیادہ ہیں یا بد قسمت زیادہ ہیں۔

جب وہ صرف چار سال کے تھے تو کھلتے کھلتے گر پڑے۔ ان کے ایک ہاتھ میں فریچر ہو گیا۔ ان کو فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔ یہاں وہ دو مہینے رہے۔ دو مہینے کے بعد جب ٹھیک ہو گئے تو اسپتال والوں نے فارغ کر دیا۔ اسپتال سے گھر جس بس میں آ رہے تھے۔ اس بس کو حادثہ ہو گیا اور اس بار بھی ان کا وہی ہاتھ فریچر ہوا۔ جو پہلے ہو چکا تھا۔ گھر واپس لے جانے کے بجائے انہیں دوبارہ اسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس کے بعد یہ حادثوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد ایک حادثہ۔ اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جہاں بھی ان کے ساتھ کوئی بھلائی ہونے لگتی ہے ان کے ساتھ حادثہ پیش آ جاتا ہے اور ایک بار پھر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔

ان کے بارے میں دونوں باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ یعنی خوش قسمت بھی اور بد قسمت بھی۔ بد قسمت اس لحاظ سے کہ ان کا کوئی کام بن نہیں پاتا اور حادثے ہوتے رہتے ہیں اور خوش قسمت اس لحاظ سے کہ ہر حادثے میں ان کی زندگی بچ جاتی ہے۔

سونو سویا راگاشی۔ ان جاپانی بڑے میاں کے لیے یہ بات یقینی ہے کہ جس کو خدا رکھے اس کو کون چکھے۔ یہ جاپانی شخص دنیا کا واحد انسان ہے جس کا ایٹم بم بھی کچھ نہیں بگاڑ سکا اور اپنی طبعی موت مرا۔

16 اگست 1945ء کو یہ شخص ہیروشیما میں تھا۔ جب اس شہر پر ایٹم بم ایک قیامت بن کر گرا تھا۔ اس کی تباہ کاریوں کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ کیا ہوا تھا۔ بہر حال سونو سویا راگاشی اس ایٹمی حملے میں بھی محفوظ رہا۔ اس کے خاندان کے کچھ لوگ بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔

اب ایک اور خاتون کا حال سن لیں۔

ان کا نام ہے۔ میلانی مارٹینیٹز۔ انہوں نے تو حد ہی کر دی۔ ان کا شوق ہے ساحل کے قریب مکان بنا کر رہنے کا۔

اتنے وسائل تو نہیں تھے۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح ساحل کے قریب ایک مکان بنا ہی لیا۔ اپنے خوب صورت خوابوں کی خوب صورت تعبیر پالی۔

موصوفہ چونکہ آرٹسٹک مزاج کی بھی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے مکان کی ڈیکوریشن بھی اسی انداز سے کی۔ تکمیل کے بعد خاندان والوں اور احباب کو بلا بلا کر مکان دکھانی رہیں۔

سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور ان کی تعریف کرتے رہے۔ لیکن ایسا صرف ایک ہی مہینے ہوا تھا کہ ایک زبردست طوفان آیا۔ 1965ء کے ریکارڈ کے مطابق اس طوفان کا نام بستی (Basti) تھا۔ اس خطرناک طوفان نے ان کے خوب صورت خوابوں کے محل کو اڑا کر رکھ دیا۔

ان کی خوش قسمتی تھی کہ یہ خود بچ گئیں لیکن ان کا مکان کھنڈر ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں رہا۔ بہر حال رونی پینٹی ہوئی دن گزارنے لگیں لیکن ساحل پر رہنے کا شوق ختم نہیں ہوا۔

جیسے تیسے کر کے انہوں نے ساحل پر ایک دوسرا مکان بھی بنوایا۔ یہ مکان بھی بہت خوب صورت تھا اور یہ بات ہے 1985ء کی۔ اور مکان مکمل ہونے کے تین ماہ بعد پھر ایک طوفان آ گیا۔ اس کا نام جران (Juarn) تھا۔ بے چاری ایک بار پھر برباد ہو گئی۔

بہر حال ہمت والی خاتون ہیں ایک بار پھر کوشش کی اور 1985ء کے بعد 1998ء میں پھر ایک مکان بنوایا۔

اور اس بار جو طوفان آیا۔ اس کا نام جارج تھا۔ اور جارج نے بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو پچھلے دو طوفان کر چکے تھے۔ یعنی مکان پورے کا پورا برباد ہو گیا۔

اب کے وہ امریکا کے دوسرے ساحل پر جا کر آباد ہو گئیں۔ یہاں انہوں نے کوئی مکان نہیں بنوایا تھا۔ بلکہ کرائے کا مکان لیا تھا لیکن طوفان کہاں پچھا چھوڑنے والے تھے۔ اس نئے مکان میں آئے ہوئے چھ مہینے ہوئے تھے کہ کترینہ نام کا طوفان آ گیا۔ بات ہے

وہ ان زخمیوں کو لے کر ناگاساکی چلا گیا۔

اور ابھی وہاں پہنچ کر دم ہی لیا تھا کہ دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرا۔ اس نے اپنے ساتھ جو زخمی لائے تھے وہ سب مر گئے۔ اور لطف یہ ہے کہ سوٹویارا گاٹی زندہ رہا۔ بعد میں اس کی موت طبعی ہوئی۔

اب ایک اور دلچسپ واقعہ سن لیں۔

یہ واقعہ ہے رابرٹ لنکن کا۔ یہ شخص تین اہم ترین آدمیوں کی موت کا سبب بن گیا اور وہ تینوں امریکی صدر تھے۔

رابرٹ لنکن مشہور امریکی صدر لنکن کا بیٹا تھا۔

جب لنکن صدر ہوا تو ایک بڑا بڑا صدر ترقی ترقیب ہوئی۔ اس تقریب میں رابرٹ لنکن بھی شریک تھا۔ ظاہر ہے اس کا باپ امریکا کا صدر بننے جا رہا تھا۔

پھر لنکن کا انجام سب جانتے ہیں۔ اس کو قتل کر دیا گیا تھا۔ خیر یہ تو ایک اتفاق یا حادثہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بہت دنوں کے بعد گارفیلڈ صدر بنا۔

صدارتی تقریب میں رابرٹ لنکن کو بھی بلایا گیا کیونکہ وہ ایک معزز شہری تھا اور کچھ عرصے کے بعد بے چارے گارفیلڈ کا بھی قتل ہو گیا۔

خیر یہ بھی ایک اتفاق سمجھا گیا۔

اس کے بعد صدر میکینے کی صدارتی تقریب ہوئی۔ اس میں بھی یہ مدعو تھے اور کچھ عرصے کے بعد میکینے کا بھی قتل ہو گیا۔

اس کے بعد رابرٹ کو پھر کسی صدارتی تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا۔

ہیری ٹیکسن ایک لا اہالی شخص تھا۔ اس کے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ بھی اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے۔

ہیری اپنے دو دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے گیا تھا۔ اس کا وفادار اور تربیت یافتہ کتا بھی اس کے ساتھ تھا۔

ایک جگہ کچھ فاصلے پر ڈائنامیٹ کی ایک اسٹک پڑی ہوئی تھی۔ کتے نے یہ سمجھا کہ اس کے مالک نے یہ اسٹک پھینکی ہے کہ وہ اسے اٹھا کر لے آئے۔

کتا دوڑتا ہوا گیا اور اسٹک کو دانتوں میں دبا کر ہیری کی طرف واپس آنے لگا۔ ہیری نے کتے کو آوازیں دے دے کر منع کرنا شروع کر دیا۔ لیکن کتا کہاں ماننے والا تھا۔

اس نے ہیری کی طرف دوڑ لگا دی اور اب صورت حال یہ تھی کہ ہیری بے چارہ اس اسٹک سے بچنے کے لیے دوڑا

جا رہا تھا اور وہ کتا اس کے پیچھے تھا۔

جبکہ اس کے دونوں دوست بھی اپنی جگہ کھڑے کھڑے شور کیے جا رہے تھے۔ لیکن کتا کہاں ماننے والا تھا۔ اسے تو ہر حال میں وہ اسٹک اپنے مالک تک پہنچانی تھی اور اس نے وہ اسٹک اس طرح پہنچانی کہ خود تو پھٹ ہی گیا اس کے ساتھ بے چارہ ہنری بھی پھٹ گیا۔

بے نہ دلچسپ اور افسوسناک صورت حال۔

یہ بھی ایک کہاوٹ ہے کہ جس طرح دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے اسی طرح ہر گولی پر بھی مرنے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔

ایسا ہی زگ لینڈ کے ساتھ ہوا تھا۔

یہ واقعہ گرچہ بہت پرانا ہے لیکن جب بھی سنیں حیرت ہی ہوتی ہے۔

ہوا یہ کہ زگ لینڈ نے اپنی محبوبہ سے بے وفائی کرتے ہوئے اس سے ناطہ توڑ لیا۔ محبوبہ بے چاری اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اس نے خودکشی کر لی۔

اس لڑکی کا ایک بھائی تھا۔ جس کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ وہ زگ لینڈ کو مارنے کے ارادے سے اس کے گھر پہنچ گیا۔ زگ لینڈ اس وقت اپنے باغ میں تھا۔

محبوبہ کے بھائی نے اسے دیکھتے ہی گولی چلا دی۔ زگ لینڈ ایک شیخ کے ساتھ گر پڑا۔ یہ دیکھ کر محبوبہ کے بھائی نے خود کو بھی گولی مار لی۔

وہ تو خیر مر گیا۔ لیکن زگ لینڈ نہیں مرا تھا۔ گولی اس کے گال پر صرف خراش ڈالتی ہوئی ایک بڑے درخت کے تنے میں پوسٹ ہو گئی تھی۔

کئی برسوں کے بعد زگ لینڈ نے اس درخت کو گرانے کے لیے اس میں ڈائنامیٹ لگا دیا۔ دھماکا ہوتے ہی وہی گولی پوری رفتار سے نکلی اور زگ لینڈ کے دل میں پوسٹ ہو گئی اور وہ اسی وقت مر گیا۔

یعنی اس کے نام کی گولی پر اس کا نام تو لکھا ہوا تھا لیکن وہ وقت اس کی موت کا نہیں تھا۔ اور جب موت کا وقت آیا تو گولی کسی نے نہیں چلائی پھر بھی وہ گولی سے مر گیا۔

تو اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات ہوں گے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا عجائب خانہ ہے بھائی۔ ذرا ارد گرد دیکھ تو سہی۔ واقعات ہی واقعات ہوں گے۔



تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بول لفظ کن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرٹھ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرٹھ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا بارہواں حصہ

راہ ہمواری۔
ڈالٹن شمالی انگلستان کے ایک دیہات میں 1766ء کو پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گیارہ برس کی عمر میں مکمل کی۔ جب کہ اپنی سائنسی تعلیم کا خرچ خود برداشت کیا۔ وہ وقت سے پہلے ہی۔ ایک پختہ آدمی بن گیا تھا۔
چارہ سال کی عمر میں اس نے تدریس کا پیشہ اپنالیا تھا۔ جب وہ چھبیس برس کا تھا تو مائچسٹر میں رہائش اختیار کر لی اور

ہم نے گزشتہ قسط تک دیکھ لیا کہ 1800ء سے 1899ء تک دنیا نے تیز رفتار ترقی کر لی۔ اب ہم 1800ء سے 1899ء تک کی اہم شخصیات پر سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ سب سے پہلے جان ڈالٹن کو دیکھتے ہیں۔
یہ ایک انگریز سائنس دان تھا۔ اس نے سائنس کی دنیا میں ایسی مفروضہ متعارف کروایا۔ اس طور اس نے وہ بنیادی کلیہ فراہم کر دیا جس نے کیمیا میں بے پہاں ترقی کی

جولائی 2016ء

159

ماہنامہ سرگزشت

اپنی موت تک وہیں رہا۔

اس نے گیسوں کی ہیئت سے متعلق دو بنیادی قوانین دریافت کیے۔ اس سے پہلے ایٹمی مفروضہ پر لوگ یقین کر چکے تھے۔ جیسے یونان کا دیمقراطیس لیکن وہ غیر واضح تھے۔ ڈالٹن نے بہت واضح طور پر اس کے جزئیات بیان کیے۔

ان ہی سو برسوں کا ایک اور اہم کردار بیٹھوون تھا۔ دنیا کا عظیم ترین موسیقار لڈوگ وان بیٹھوون 1770ء میں جرمنی کے شہر بون میں پیدا ہوا۔

ابتدائی عمر ہی میں اس نے اپنے جوہر کا لوہا منوالیا تھا۔ اس کی ابتدائی کاوشیں 1783ء میں چھپیں۔ نوجوانی میں وہ ویانا گیا جہاں ملاقات مختصر رہی۔

1792ء میں وہ دوبارہ ویانا گیا اور کچھ مدت کے لیے ہائیڈن سے حصول علم کیا۔ اس کے بعد بیٹھوون تمام عمر ویانا ہی میں رہا۔

پیانو بجانے میں اس کی مہارت نے سب کو حیران کر دیا تھا۔ وہ بطور استاد اور فنکار نہایت کامیاب رہا تھا۔

ایک حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کا یہ عظیم موسیقار نوجوانی ہی میں بہرہ ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی مہارت سے یہ ثابت کر دیا کہ جو شخص کچھ کرنا چاہے اسے اس کی جسمانی معذوری بھی روک نہیں سکتی۔ وہ 57 برس کی عمر میں 1827ء میں ویانا میں فوت ہوا تھا۔

چارلس ڈارون 1809ء سے 1882ء عیسوی۔ فطری انتخاب کے طریقے سے عضویاتی ارتقا کا نظریہ پیش کرنے والا چارلس ڈارون 12 فروری 1809ء کو انگلستان کے شہر شیروزبری میں پیدا ہوا۔ سولہ برس کی عمر میں وہ طب کی تعلیم کے لیے ایڈن برگ یونیورسٹی میں داخل ہوا لیکن اس کی منزل تو کچھ اور تھی۔

اس نے عضویاتی تبدیلیوں پر ریسرچ کے حوالے سے ایک طویل جبری سفر اختیار کیا۔ اگلے پانچ برسوں تک اس نے فوسلز پر تحقیق کی۔ قدیم قبائل سے ملا۔ فطری عجائبات کا مشاہدہ کیا۔ وہ جو کچھ دیکھتا اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔ 1836ء میں وہ گھر لوٹا۔

اگلے بیس برسوں میں اس نے کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جنہوں نے اسے ممتاز ماہرین حیاتیات کی صف میں لاکھڑا کیا۔

انسانی فکر پر ڈارون کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ اس کی کتاب Theory of evaluation نے

پوری دنیا میں تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا اور آج تک اس کی کتاب اور ڈارون کے نظریے پر مباحث ہوتے رہتے ہیں۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا انسان بن گیا۔

اب ایک اور اہم شخص جیمز کلارک میکس ول کا ذکر ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ قارئین میں سے کچھ یہ سوچنے لگیں کہ اس قسم کے کرداروں سے ان کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں اپنی فکر کی نشوونما کرتے ہوئے لوگ ان کے کیا کام آسکتے ہیں۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ علم کی طلب کی جائے۔ اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے یا جو کچھ لکھا جائے گا۔ اس سے ہمارا تعلق اتنا ہے کہ یہ معلومات آپ کے ذہن کے درجے کھول سکے۔

آپ نے ماضی میں جہاں تک کر دیکھ لیا ہوگا۔ ہم یہ معلومات صرف تفریح کے لیے نہیں پیش کر رہے بلکہ اس کا مقصد علم میں ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرنا ہے۔

میرا تو یہ حال ہے کہ میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ موت اس وقت آئے جب میرے ہاتھ میں کوئی کتاب ہو۔ بہر حال آجائیں جیمز کلارک میکس ول کی طرف۔

عظیم برطانوی طبیعات دان جیمز کلارک میکس ول کی شہرت ان چار مساواتوں کی تشکیل بندی ہے جو برقیات اور مقناطیسیت کے بنیادی قوانین کو بیان کرتی ہیں۔

میکس ول 1831ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈن برگ میں پیدا ہوا۔ اس نے غیر معمولی تیزی سے سائنس میں مہارت کی منازل طے کیں۔

صرف پندرہ برس کی عمر میں اس نے اپنا سائنسی مقالہ ایڈن برگ رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا۔

اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ اس نے اپنی جوانی کا بیشتر حصہ پروفیسر کی حیثیت سے بسر کیا۔ اس کی آخری ملازمت کیمبرج میں تھی۔ اس کی شادی ہوئی مگر وہ لا ولد رہا۔ میکس ول کو نیوٹن اور آئن اسٹائن کے بیچ کے وقفے میں عظیم ترین نظریاتی طبیعات داں تصور کیا جاتا ہے۔

1879ء میں وہ اپنی اڑتالیسویں سالگرہ سے کچھ ہی دن پہلے کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو کر وقت سے پہلے ہی چل بسا۔

کارل مارکس۔ ایک اہم انسان جس کے نظریات نے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔

سائنسی اشتراکیت پسندی کا اصل بانی کارل مارکس 1818ء میں جرمنی کے قصبے ٹراڑ میں پیدا ہوا۔ سترہ برس کی

منیلا

جمہوریہ فلپائن کی اہم بندرگاہ اور سابق دارالحکومت۔ دریائے لیون کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کی بنیاد 1571ء میں اہل اسپین نے رکھی تھی۔ اہم تجارتی، صنعتی اور ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں متعدد یونیورسٹیاں ہیں۔

مرسلہ: عنایت مسیح۔ کراچی

من و سلوی

عربی لفظ ہیں من کے معنی ترجمین، شبنم اور سلوی کے معنی شہد، نیز ایک پرندے کا نام بھی ہے جو بئیر کے مشابہ ہوتا ہے اور جسے لوا کہتے ہیں۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکل کر وادی سینا میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے یہی دو چیزیں ان کو بطور غذا مرحمت فرمائی تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ من (Manna) ایک میٹھا گوند ہوتا ہے جو ایک قسم کے جنگلی درخت Ash-Tree سے نکلتا ہے۔ بنی اسرائیل یہی گوند کھاتے تھے۔ سلوی سے وہ پرندے مراد ہیں جنہیں سیلانی پرندے کہا جاتا ہے اور جو موسم سرما میں گرم خطوں اور موسم گرما میں سرد خطوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ پرندے بحر الکاہل کے کنارے کنارے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہیں اور بہت سے تھک کر زمین پر گر پڑتے ہیں۔

مرسلہ: احمد علی زیدی۔ سرگودھا

موحدین

بربر حکمرانوں کا ایک خاندان۔ موحدین نے 1144ء میں مراہطین کو شکست فاش دی اور 1116ء میں مراکش اور 1150ء میں اسپین کا مسلم علاقہ فتح کیا۔ اس کے بعد الجزائر (1152ء) اور تونس (1158ء) پر اپنا جھنڈا لہرایا۔ 16 جولائی 1212ء کو اسپین کے مسیحی بادشاہوں نے موحدین کو حلسہ کے مقام پر فیصلہ کن شکست دی جس کے بعد اسپین میں بربر مسلمانوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا اور صرف چند چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں رہ گئیں جن میں غرناطہ کی ریاست قابل ذکر ہے۔ ریاست غرناطہ کے سقوط (جنوری 1492ء) کے ساتھ ہی ہسپانیہ میں مسلمانوں کے 781 سالہ دور اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ خاندان موحدین کے بانی ایک مصلح بزرگ محمد بن تومرت تھے چونکہ ان کے پیرو توحید پر بہت زور دیتے تھے اس لیے یہ لوگ مدین کہلائے۔

مرسلہ: ارباز شیخ۔ چنیوٹ

عمر میں کارل مارکس یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔ اس کا باپ بھی ایک قانون داں تھا۔

بعد ازاں وہ برلن یونیورسٹی منتقل ہو گیا۔ جینا یونیورسٹی سے اس نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد مارکس نے صحافت کا شعبہ اپنایا۔ کچھ مدت کے لیے وہ ایک اخبار کا مدیر بھی رہا۔ تاہم اپنے کٹریسیائی نقطہ نظر کے سبب مشکلات سے دوچار ہوتا رہا۔ اس لیے وہ پیرس منتقل ہو گیا۔ یہاں اس کی ملاقات فریڈرک کے اینگلز سے ہوئی۔ ان کے بیچ گہری دوستی اور سیاسی ہم آہنگی پیدا ہو گئی جو آخر دم تک رہی۔

دونوں نے ایک ساتھ اور انفرادی طور پر بھی کئی کتابیں تحریر کیں۔

مارکس کو فرانس سے بھی دیس نکالا گیا۔ وہ برسلا چلا گیا۔ 1847ء میں اس کی پہلی اہم کتاب "افلاس فلسفہ" شائع ہوئی۔ اگلے برس اینگلز کی شراکت سے کیونٹ مینی فیسٹو شائع ہوئی جس نے ایک ہلچل مچادی۔ پھر اس کی سب سے اہم کتاب "داس کیپٹل" 1867ء میں شائع ہوئی اور اس کتاب نے پوری دنیا کو چونکا دیا۔

کہا جاتا ہے کہ مذہبی کتابوں کے بعد یہ کتاب سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

لوئس پاچر

ان ہی سو برسوں کی ایک اور ممتاز شخصیت جس نے انسانی صحت کے شعبے میں وہ کارنامہ انجام دیا کہ پوری دنیا کی میڈیکل سائنس اس کی اہمیت سے واقف ہے۔

فرانسیسی کیمیادان اور ماہر حیاتیات لوئس پاچر جس کو تاریخ میں ایک انتہائی ممتاز شخصیت سمجھا جاتا ہے۔

پاچر نے سائنس میں متعدد اضافے کیے لیکن اس کی اصل وچہ شہرت اس کا جراثیموں کے نظریے کی تشکیل اور مدافعتی حربے کے طور پر ٹیکہ لگانے کے طریقہ کار میں اضافے کا باعث ہے۔ 1822ء میں پاچر مشرقی فرانس کے قبضے ڈولی میں پیدا ہوا۔ 1847ء میں اس نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

اس نے پہلی بار نظریہ پیش کیا کہ ضرر رساں بیکٹریا خوراک یا مشروبات کے ذریعے انسانی جسم میں داخل ہو سکتا ہے۔ پاچر نے ایک طریقہ کار وضع کیا جسے پاچر ائزیشن کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے مشروبات میں ان جراثیموں کو تباہ

کیا جاسکتا تھا۔

پاچھر کی سب سے اہم اور معروف ایجاد یہ ہے کہ اس نے کتے کے کانٹے پر جو جنون کی کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے خلاف ایک انتہائی کارآمد ٹیکہ ایجاد کیا جس کا استعمال آج بھی ہو رہا ہے ورنہ پہلے یہی ہوتا تھا کہ اس کا علاج نہ ہونے کے سبب لوگ پاگل ہو کر مر جاتے تھے۔

پاچھر نے غیر معمولی ذہانت سے کام لیتے ہوئے بیمار یوں کے تدارک کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

اس دورانیے کا ایک اور اہم شخص جس کی ایجاد نے فاصلے کم کر دیئے۔ میرا مطلب ہے ٹیلی فون۔ اس سے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ ہم موبائل ہاتھ میں لے کر دنیا کے کسی بھی گوشے میں کسی سے بات کر سکتے ہیں۔

الیکٹریٹڈ گرامو فون 1847ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈن برگ میں پیدا ہوا۔ وہ چند سال ہی باقاعدہ اسکول گیا۔

صوتیات سے تیل کی دلچسپی بالکل فطرت طور پر پیدا ہوئی۔ کیونکہ اس کا باپ زبان کی درستی اور پیروی کی تربیت کا ماہر تھا۔

1871ء میں تیل ہوسٹن منتقل ہو گیا۔ وہاں اس نے ٹیلی فون کی ایجاد سے متعلق دریافتیں کیں۔ فروری 1877ء میں اپنی ایجاد کی سند حاصل کی۔

سند حاصل ہونے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد تیل نے فلاڈلفیا میں صد سالہ نمائش میں اپنی ایجاد ٹیلی فون کا مظاہرہ کیا۔ لوگوں نے اس میں گہری دلچسپی لی، اسے انعام ملا۔

1877ء میں تیل اور اس کے رفقاء نے خود اپنا ادارہ بنالیا۔ یہ موجودہ امریکن ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی کا حصہ تھا۔

ٹیلی فون کی ایجاد نے تیل کو امیر بنا دیا لیکن اس نے اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ وہ دیگر کارآمد آلات ایجاد کرنے میں بھی کامیاب رہا۔

1882ء میں تیل کو امریکا کی شہریت مل گئی۔

1922ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ان ہی سو برسوں کی ایک اور شخصیت جس کی ایک ایجاد نے پوری دنیا کو منور کر دیا تھامس ایلیو ایڈیسن تھا۔

ہمہ گیر موجد تھامس ایلیو ایڈیسن اوہیو کے قصبہ میلان

میں 1847ء میں پیدا ہوا۔ اس نے صرف تین ماہ باقاعدہ تعلیم حاصل کی جس کے بعد اس کے اسکول نے اسے کمزور ذہن قرار دے کر اسکول سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس ”کمزور“ ذہن والے نے ایجادات کے ڈھیر لگا دیئے۔ ایڈیسن کی اولین ایجاد دوٹ شمار کرنے والا برقی آلہ تھا۔ پہلی ایجاد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس نے اشاک مارکیٹ کے لیے ایک بہتر نرخ نما آلہ ایجاد کیا جو چالیس ہزار ڈالر میں بکا۔

اس زمانے میں چالیس ہزار ڈالر بہت بڑی رقم تھی۔ اس کے بعد ایجادات کا تانتا بندھ گیا۔ عام لوگوں کے لیے سب سے زیادہ اہم ایجاد بلب تھا۔ جو 1879ء میں پہلی بار روشن ہوا۔ اس ایجاد نے پوری دنیا میں دھوم مچا دی تھی۔ ایڈیسن نے متحرک فلموں کے کیمروں اور پروجیکٹرز کو بھی بہتر بنانے کے لیے بہت کام کیا۔ اس نے ٹیلی فون میں بھی اہم اضافے کیے۔ ٹائپ رائٹر کی کارکردگی بہتر بنا کی۔

مجموعی طور پر اس نے ایک ہزار سے زائد چھوٹے بڑے ایجادات کیے۔

وہ دنیا کے عظیم ترین موجدوں میں سے ایک تھا۔ اس کا انتقال 1931ء میں نیوجرسی میں ہوا تھا۔ ان سو برسوں میں بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔ اب ہم آتے ہیں اسلامی دنیا کی طرف کہ سن 1800ء سے 1899ء عیسوی میں اسلامی دنیا میں کیا کیا واقعات رونما ہوئے۔

ان سو برسوں میں اسلامی دنیا میں بھی کچھ ہوا۔ حکومتیں آئیں اور گئیں۔ جنگیں ہوئیں۔ واقعات رونما ہوئے۔ ہم ان کا ایک مختصر جائزہ لے لیتے ہیں۔

1800ء میں نپولین مصر پر قبضہ کر لیتا ہے۔

1803ء سے 1813ء عیسوی۔ آل سعود جو مسلکی

اعتبار سے وہابی تھے انہوں نے حجاز کو عثمانی قبضے سے نکال کر اس پر غلبہ پالیا اور حجاز کا نام تبدیل کر کے (اس دوران فرانس میں پہلی جمہوریہ قائم ہو چکی تھی)

1805ء سے 1848ء عیسوی۔ محمد علی مصر کو جدید بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

1808ء سے 1839ء عیسوی۔ سلطان محمد دوم

منظیمات کے عنوان سے عثمانی سلطنت نے جدیدیت پسندانہ اصلاحات کو متعارف کروایا۔

1814ء عیسوی۔ معاہدہ گلستان، کاکیشان علاقہ

روس کے حوالے کر دیا گیا۔

1845 عیسوی۔ عثمانی تسلط کے خلاف سرب

بغاوت۔

1821 عیسوی۔ عثمانیوں کے خلاف یونان میں

جنگ آزادی۔

1830 عیسوی۔ فرانس نے البیخیر پر قبضہ کیا۔

1831 عیسوی۔ محمد علی عثمانی شام پر قبضہ کر لیتا ہے

اور اناطولیہ میں کافی اندر تک آ جاتا ہے۔ وہ عثمانی سلطنت

میں ایک حقیقتاً آزاد ریاست کے اندر ریاست قائم کرتا

ہے۔ یورپی طاقتیں عثمانی سلطنت کے تحفظ کے لیے

مداخلت کرتی ہیں اور محمد علی شام سے واپسی پر مجبور ہو جاتا

ہے۔

1836 عیسوی۔ نئے صوفی مصلح احمد ابن ادریس کی

وفات۔

احمد ابن ادریس مراکش شمالی افریقا اور یمن میں

سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے علما کو نظر انداز کر کے عوام تک

اسلام کی زیادہ جاندار شکل کو براہ راست پہنچانے کی کوشش

کی۔

1839 عیسوی۔ برطانوی عدن پر قبضہ کر لیتے

ہیں۔

1839 سے 1861 عیسوی۔ سلطان عبدالجید عثمانی

سلطنت کے زوال کو روکنے کے لیے زیادہ جدیدیت

پسندانہ اصلاحات کا آغاز کرتا ہے۔

1843 سے 1849 عیسوی۔ برطانوی سندھ

طاس پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

1854 سے 1856 عیسوی۔ کریمیا کی جنگ۔ جو

عثمانی سلطنت میں عیسائی اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے

پیدا ہونے والی یورپی رقابت کی وجہ سے برپا ہے۔

مصر کا گورنر سعید پاشا فرانسیسیوں کو نہر سوئز کی

رعایت دیتا ہے۔ مصر اپنے پہلے غیر ملکی قرض کا معاہدہ کرتا

ہے۔

1857 سے 1858 عیسوی۔ برطانوی حکمرانی کے

خلاف ہندوستان میں جنگ آزادی۔ برطانوی آخری مغل

بادشاہ کو باقاعدہ طور پر معزول کر دیتے ہیں۔

سر سید احمد خان مغربی خطوط پر اسلام میں اصلاح اور

برطانوی ثقافت کو اختیار کرنے کی وکالت کرتے ہیں۔

1860 سے 1861 عیسوی۔ لبنان میں دروز

ہیں۔

باغیوں کے ہاتھوں لوگوں کے قتل عام کے بعد فرانسیسی

مطالبہ کرتے ہیں کہ لبنان کو فرانسیسی گورنر کے ساتھ خود مختار

صوبہ بنا دیا جائے۔

1861 سے 1876 عیسوی۔ سلطان عبدالعزیز

عثمانی سلطنت کی اصلاح کا عمل جاری رکھتا ہے مگر بھاری غیر

ملکی قرضے بھی حاصل کرتا ہے۔ جن کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

سلطنت دیوالیہ ہو جاتی ہے اور عثمانی مالیات پر یورپی

حکومتوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

1863 سے 1879 عیسوی۔ مصر کا گورنر اسماعیل

پاشا وسیع پیمانے پر جدیدیت کو اپناتا ہے مگر غیر ملکی قرضے بھی

حاصل کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ دیوالیہ اور نہر سوئز کی برطانویوں

کے ہاتھوں فروخت (1875ء) اور مصری مالیات پر

یورپی تسلط کی صورت میں نکلتا ہے۔

1871 سے 1879 عیسوی۔ ایرانی ریفاور

الاقصانی مصر میں رہتے ہیں اور محمد عبدہ سمیت مصری ریفاور

کا ایک حلقہ تشکیل دیتے ہیں۔ ان کا مقصد اسلام کے احیاء

جدیدیت پذیری کے ذریعے یورپ کے ثقافتی غلبہ و تسلط کو

روکنا تھا۔

1872 عیسوی۔ ایران میں برطانوی روسی رقابت

شدت پکڑ لیتی ہے۔

1876 عیسوی۔ عثمانی سلطان بن عبدالعزیز کو مملاتی

انقلاب کے ذریعے معزول کر دیا جاتا ہے۔ عبدالحمید ثانی

پہلے عثمانی دستور کو نافذ کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ تاہم وہ

اسے بعد میں معطل کر دیتا ہے۔ تعلیم، ذرائع آمدورفت اور

ذرائع مواصلات میں بھی اصلاحات کرتا ہے۔

1879 عیسوی۔ اسماعیلی پاشا کو معزول کر دیا جاتا

ہے۔

1881 سے 1882 عیسوی۔ آئن پسندوں اور

اصلاح پسندوں کے ساتھ مل کر مقامی مصری افسر بغاوت

کر دیتے ہیں اپنی حکومت نافذ کرتے ہیں تاہم ایک عوامی لہر

مصر پر برطانوی قبضے کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ جس میں لارڈ

کرومر گورنر بنتا ہے۔

1907 سے 1882 عیسوی۔ شام کی آزادی کے

لیے خفیہ انجمنوں کی مہم۔

1889 عیسوی۔ برطانوی سوڈان پر قبضہ کر لیتے

ایزابیلا دوم۔ 1823 سے 1868 عیسوی تک۔
اس کے بعد جمہوریت قائم ہو گئی۔

جرمنی
فرانس دوم۔ 1804 عیسوی تک۔

نپولین۔ 1804 سے 1813 عیسوی تک۔

1813 عیسوی میں فیڈریشن بن گئی جو 1848

تک رہی۔

فریڈرک چہارم۔ 1848 سے 1861 عیسوی

تک۔

ولیم اول۔ دور جمہوریت کا آئینی بادشاہ 1861

سے 1888 عیسوی۔

ولیم دوم۔ 1888 سے 1918 تک۔ اس کا

وزیر اعظم بسمارک تھا۔ اس نے پہلی عالمی جنگ شروع کی
تھی۔

برطانیہ

برطانیہ میں 1820 عیسوی تک پرنس آف ویلیو

ریجنٹ رہا۔

چارچ چہارم۔ 1820 سے 1830 تک۔

ولیم چہارم۔ 1830 سے 1837 عیسوی تک۔

وکتوریہ۔ 1837 سے 1901 عیسوی تک۔

ان جائزوں کے بعد اپنے آبائی خطے کی طرف۔ یعنی

برصغیر پاک و ہند کی جانب۔ انگریزوں نے یہاں اپنے قدم

جمالیے تھے اور اب وہ مسلسل پیش قدمی کر رہے تھے۔

1800 عیسوی میں انگریزوں نے میسور کے اضلاع

نظام دکن سے انعام کے طور پر حاصل کر لیے۔

1801ء میں نواب کرناٹک پر دباؤ ڈال کر اس کا

جاگیر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نیز اوڈھ کے وزیر پر

دباؤ ڈال کر گورکپور اور بریلی کے اضلاع ہتھیار لیے۔

1802 عیسوی میں مرہٹوں کے پیشوا سے جنگ کر

کے بندیل کھنڈ کی سرزمین پر قبضہ جمایا۔ کٹک اور بلاسود

برار کے راجا سے حاصل کیے۔

1803 عیسوی میں گوالیار کے مہاراجا سندھیا سے لڑ

کر دہلی کی سلطنت کو اپنے قبضے میں لیا اور اس طرح دہلی کا

مغل شہنشاہ جو پہلے مہاراجا سندھیا کے زیر حمایت زندگی بسر

کر رہا تھا۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی پناہ میں آ گیا۔

1805 عیسوی میں گانگیو اڑ کے مرہٹے راجا سے

جنگ کی اور اس سے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے کچھ حصے ہتھیار

1892 عیسوی۔ ایران میں تمباکو کا بحران۔ ایک

ممتاز مجتہد کا فتویٰ کہ تمباکو استعمال کرنا بند کیا جائے۔ شاہ کو

برطانویوں کو تمباکو کے سلسلے میں دی گئی رعایت منسوخ

کرنے پر مجبور۔۔۔ کر دیتی ہے۔

1894 عیسوی۔ عثمانی حکومت کے مخالف دس سے

پندرہ ہزار کے درمیان آرمینیائی لوگوں کو مار دیا جاتا ہے۔

1896 عیسوی۔ ایران کے ناصر الدین شاہ کو

الافغان کا ایک شاگرد قتل کر دیتا ہے۔

1897 عیسوی۔ باسل میں پہلی صہیونی کانفرنس

منعقد ہوتی ہے۔ اس کا مقصد عثمانی صوبے فلسطین میں ایک

یہودی ریاست کا قیام ہے۔

الافغان کی وفات

ان سو برسوں کے تذکرے میں کچھ نام سامنے آتے

ہیں ان کے بارے میں بتانا ضروری ہے۔

جیسے سلطان عبدالحمید (61-1839 عیسوی) جس

نے مطلق اقتدار میں بہتری اور حکومت کو عثمانی رعایا کی

رائے کا تابع بنانے کے لیے فرمان جاری کیا۔

الافغان (جلال الدین افغانی) 1837 سے

1897 عیسوی تک۔ ایک مصلح جنہوں نے مسلمانوں کو متحد

ہو جانے کی تلقین کی اور یورپ کے تسلط سے بچنے کے لیے

اسلام کو جدید بنانے کی کوشش کی۔

آقا خان کرمانی (96-1853 عیسوی) ایک

ایرانی مصلح۔

نام محمد امین علی۔ صوفی مصلح جنہوں نے سنوسی تحریک

کی بنیاد رکھی۔ جو اب بھی لیبیا میں موجود ہے۔ اس دوران

اعادہ کے لیے ایک نظر یورپ کے سلاطین کو بھی دیکھ لیں۔

فرانس

نپولین اول۔ 1804 سے 1814 عیسوی۔

لوئس۔ 1814 سے 1824 عیسوی۔

چارلس ولیم۔ 1824 سے 1830 عیسوی۔

لوئس۔ 1830 سے 1848 عیسوی۔

نپولین دوم۔ 1848 سے 1852 عیسوی۔

نپولین سوم۔ 1852 سے 1871 عیسوی۔

اسپین

چارلس چہارم۔ 1808 عیسوی تک۔

نپولین۔ 1808 سے 1812 عیسوی تک۔

فریڈرک ہفتم۔ 1812 سے 1823 عیسوی تک۔

1818 عیسوی میں مرہٹہ راجا ہلکر سے لڑ کر اس نے خاندیس وغیرہ کے علاقے حاصل کیے۔

مہاراجا سندھیا سے پونا اور مہاراشٹر کے علاقے مرہٹہ پیشوا سے لیے۔ بھرت پور کا قلعہ وہاں کے مہاراجا سے، پھر آسام، ارکان اور شناسرم کے علاقے ہتھیائے۔

ایٹ انڈیا کمپنی نے 1839 عیسوی میں افغانستان کی تسخیر کے لیے مہم بھیجی تھی۔ امیران سندھ سے اس بات کا انتقام لیا کہ انہوں نے کانل کی مہم کی راہ میں روڑے اٹکائے تھے۔ سندھ کے اقتدار کا خاتمہ کر کے سندھ کو ہندوستان کی برطانوی مملکت میں شامل کر دیا۔

1846 عیسوی میں انگریزوں نے پنجاب کو نشانہ بنایا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد ہر طرف بد امنی پھیل گئی تھی۔ سکھ طرح طرح کی سازشوں کا شکار ہو رہے تھے۔ 1849 عیسوی میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری جنگ ہوئی۔ اس کے بعد سکھوں نے شکست تسلیم کر لی۔

1857 عیسوی پہلی جنگ آزادی۔ اس کی بے شمار وجوہات تھیں۔ مسلمانوں کو تنگ کرنے اور ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تھا۔ ہندو بھی انگریزوں کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ 1855 عیسوی میں مسلمانوں کے قانون وراثت کے خلاف ایک نیا قانون سامنے لایا گیا تھا۔ 1855 عیسوی میں پادری ایڈمنسٹر نے حکومت کی ایما سے ایک سرکلر جاری کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اب ہندوستان کے ہر شخص کو عیسائی ہو جانا چاہیے۔

انگریز چونکہ تمام ہندو ریاستوں کو اور سکھ ریاستوں کو یکے بعد دیگرے ختم کرتے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ بھی ان سے بدظن ہو گئے۔ اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ 1857 عیسوی میں چرلی والے کارتوس استعمال کرنے کو دینے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے انکار کر دیا۔ میرٹھ چھاؤنی سے آزادی کی لہر اٹھی اور دہلی تک پہنچی۔ انگریزوں نے غداروں کا سہارا لے کر اس لہر کو دبا دیا اور بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1861 عیسوی میں وہ نہایت بے بسی کے عالم میں وفات پا گئے۔

وسط ہند اور بندھیل کھنڈ میں انگریزوں کے خلاف جھانسی کی توجوان رانی لکشمی بائی اور ناتا صاحب کے سپہ

سالار تانیا ٹوپے نے صف آرا ہو کر مقابلہ کیا۔ اس بہادر خاتون نے 17 دنوں تک انگریز فوج کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن غداروں کے ساتھ چھوڑ دینے سے وہ میدان جنگ میں کام آگئی۔ تانیا ٹوپے کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ہندو بہت کم ہی عتاب میں آئے تھے۔

1858 عیسوی میں ایٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ عمل میں لایا گیا اور ہندوستان کو براہ راست تاج برطانیہ کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔

مسلمانوں کو پریشانیوں سے نکالنے کے لیے قدرت نے سرسید احمد خان جیسے مدبر کو پیدا کیا۔ انگریز مسلمانوں کو باغی قرار دے کر سزا میں دے رہے تھے۔ سرسید احمد خان نے اسباب بغاوت لکھ کر مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی۔

1886 عیسوی میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن بھی قائم کی گئی۔ 1859 عیسوی میں آپ نے مراد آباد میں فارسی کا مدرسہ قائم کیا۔ 1863 عیسوی میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا۔ 1876 میں علی گڑھ کالج کی بنیاد۔ 1889 عیسوی میں انگریزی مدرسے کی بنیاد رکھی۔

دراصل علی گڑھ کالج وہ اہم موڑ تھا جس نے قیام پاکستان کی راہ ہموار کی اور سرسید نے محسوس کر لیا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ قومیں ہیں۔

1885 عیسوی کو کانگریس کا پہلا اجلاس ہوا۔ 1893 عیسوی میں پونا کے مقام پر دس دنوں تک چھٹی کا میلہ کانگریس کے تحت منعقد ہوا۔ اس میں جلوس نکالے گئے جس میں مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کی گئی اور مسجد پر حملہ کیا گیا اور اس طرح برصغیر میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور پاکستان کا وجود ناگزیر دکھائی دینے لگا۔

تاریخ کا سفر 1899 عیسوی تک آچکا ہے۔ اس کے بعد 1900 عیسوی ہے جو 1999 عیسوی تک چلے گا۔ آپ نے اب تک یہ دیکھ لیا ہو گا کہ کیسے کیسے کردار زندگی کے سٹیج پر آئے اور اپنا اپنا ایکٹ کر کے رخصت ہو گئے۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں طیور اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے اگلی قسط میں 2015 عیسوی تک کو سینے کی کوشش کی جائے گی۔

(جاری ہے)



سراب

راوی : شہباز ملک



قسط: 111

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کنی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی



میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادری سے نکرا ڈھوا، اور یہ نکرہ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہیے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، عدیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی لڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شاہ کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاش میں پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو اینٹریں آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو کی کوزھی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر بی بی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم ہانہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو کی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو کی ملاوہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پایا۔ ہسپتال کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو اٹھلی چٹیس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوزھی پر آ گئے۔ سفیر کو وہی بھیجنا تھا اسے انٹریٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست دان کی بیٹی نبی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوزھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیز خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاک کی کو بھلا لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے پست گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ ہالوبھی انڈیا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شاہ کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شاہ کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار ادائیگی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سدیہ کو کنور سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے پھر پور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے ششی دل جی کی آواز سنائی دی۔ شاجی شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔ ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مانگ بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی نہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور گل میں پہنچا دیا۔ مجھے ہاتھ ہر جگہ ڈیکھا فون لگا ہوا ہے۔ بھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر جیبر....." مگر جملہ احوال گھبراہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر ششی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وقاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ بھی راج کنور آ گیا۔ اس نے کوئی چلائی جو بیٹو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا ہسپتال راج کنور پر خالی کر دیا بیٹو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک بلی کا پنر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آ گئی اس نے تعقیب کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم پتنگے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شاہ کی قید میں شانیے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہتا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سا مینا ایڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں مرث شانیے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے بیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو کوئی مادی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو لڑکوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے امین سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شانیے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم آگے چلے جا رہے تھے کہ پاس کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھنڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زخمی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے پاس کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک ٹول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے چٹنی دیا کہ بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو

میرے سر پر حیرت کمان سے لیس کچھ سایہ کھڑے تھے۔ وہ مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریٹائٹ کی قید میں پہنچایا۔ وہاں ایک حدود گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریٹائٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زہر لب کہا "اعلان جنگ" میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بیچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روہیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خود غور اسار نے گھیر لیا اور میں روہیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی ڈب بھیر رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ سبھی سومر و چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زور راہ کے علاوہ ایک دہبرہ کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روہیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ریٹک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روہیر کو اٹھالے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ... ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ڈرے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپے مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گوکہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپے مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آکر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد و عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کر دیا پھر ہم خیر راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریٹائٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریٹائٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شاہا سو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کہ رٹل نے ڈسک بچھا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ ابھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ پٹلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھاگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روہیر اندر کے حالات چا کرنے پہلی گئی ہم ابھی معبد پر نظر میں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایڑٹ روہیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرٹل اور ہاسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آرہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک ہاتھ روم میں چھپ گیا۔ کرٹل چا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روہیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روہیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شاہا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شانے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں پکرا کر گر پڑا۔ ہاسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شاہا سے بحث کر رہا تھا کہ شاہین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشیں اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شاہا ہر نکلا تھا کہ شاہین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شاہا کو تو شاہین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے ہاسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے ہاسو پر فائر کیا۔ ہاسو اس کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، اسانے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے، ہم سب کو راجا عمر دراز نے لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریٹائٹ کو بتانے سے جبراً نکالنے کے لیے نکل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روٹن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوفزدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زنی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر اداوہی بن کر آیا۔ اس کے ساتھی نے زنی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدان جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ریٹائٹ کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گئے۔ ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آٹھ کھلی کھلستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔

(اب آگے پڑھیں)

حد نظر برف ہی برف تھی۔ اس برف کے میدان میں چلتے ہوئے پیردھنس رہے تھے۔ ہم سب نے خود کو ایک رسی سے منسلک کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ رسی دراز کرتا ہے تو بندہ بکنے لگتا ہے اور یہاں رسی دراز نہ کی جاتی تو کوئی آٹھے بڑھ

نہ پاتا اس لیے کہ سب ایک ہی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ سب سے آگے میں تھا۔ میرے پیچھے عبداللہ۔ اس کے پیچھے سفیر اور آخر میں وسیم۔ اس طریقہ کار کو تمام کوہ پنا پسند کرتے ہیں کہ ایک سے دوسرے کو سہارا ملتا ہے۔ یہاں تو سہارے

کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس لیے کہ یہ خطہ حد سے زیادہ خطرناک تھا۔ یہاں وہاں ہر طرف کھڑے تھے۔ غارتھے جن کے منہ پر برف جمی ہوئی تھی اور اگر غلطی سے کسی ایسی غار کے دہانے پر پیر پڑ جاتا تو پھر ملک عدم کا ٹکٹ بہ آسانی کٹ جاتا۔ ایسے خطروں کی پہچان میں یہ آسانی کر لیتا تھا اسی لیے میں سب سے آگے تھا۔ بغور زمین کا جائزہ لے کر قدم رکھتا تھا۔ میرا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کے مصداق تھا۔ ابھی میں نے قدم آگے بڑھائے تھے کہ مجھے احساس ہو گیا کہ اس جگہ کی برف کچھ زیادہ ہی نرم ہے۔ اور ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جب نیچے کوئی غار ہو یا گہری کھائی کا سرا ہو۔ اسی لیے میں نے اس جگہ کو چھلانگ لگا کر پار کرتے ہوئے دوسروں کو بھی ہوشیار کیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ عبد اللہ اور سفیر نے تو دیکھا دیکھی چھلانگ لگا کر پار کیا مگر وسیم سنبھل نہ سکا اس کا پیر بھر بھری برف پر پڑا پیر پڑتے ہی پوری برت پھٹی اور وہ گرتا چلا گیا۔ گرتے ہوئے اس نے چیخ ماری تھی گو کہ اس کی چیخ اتنی تیز نہیں تھی پھر بھی سب دل گئے تھے۔ اس پر وسیم یہ کہہ رہی بھی روک نہ سکی تھی کیوں کہ جھٹکا لگنے سے وہ رسی نئی تھی اور بیٹلٹ کا کنڈا نکل گیا تھا۔ شاید اسے صحیح طور پر وسیم نے لگایا نہیں تھا ورنہ بیٹلٹ کی پکڑ بہت مضبوط ہوتی ہے، اسے اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ گرنے والے کو گرنے نہ دے۔

جھٹکے سے ہم تینوں ہی لڑکھڑا گئے تھے۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئے۔ میں نے زوردار آواز میں اسے پکارا ”وسیم... وسیم۔“

جواب بھی فوراً آ گیا ”میں یہاں ہوں محفوظ ہوں، کوئی چوٹ وٹ بھی نہیں لگی ہے... شاید یہ کوئی غار ہے۔“ اس گڑھے میں جھانکنے کے لیے میں نے اوندھے منہ لیٹ جانا مناسب سمجھا اور سینے کے بل ریٹکتا ہوا اس گڑھے کے قریب پہنچا پھر نیچے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ وسیم اس گڑھے میں کھڑا اوپر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”میں رسی پھینک رہا ہوں تم اس کے سہارے اوپر آنے کی کوشش کرنا۔“ کہہ کر میں نے اپنی کمر سے رسی نکال کر دوسروں کو بھی ہک نکالنے کا اشارہ کیا۔ سفیر اور عبد اللہ نے فوراً نیل کی۔ میں نے رسی اندر لٹکائی تھی کہ وسیم نے کہا:

”ایک منٹ مجھے دیکھنے دیں۔ یہ غار سیدھا آگے بڑھ رہا ہے۔ میں ذرا آگے تک کا جائزہ لے لوں۔“ کہہ کر

وہ سیدھے ہاتھ بڑھا۔

میں نے سفیر کی طرف رخ کر کے کہا ”غار کتنا لمبا ہے یہ وہ دیکھنے گیا ہے۔“

”اوپر آسمان کی طرف دیکھیں۔“ سفیر نے میری توجہ مبذول کرائی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شمال کی جانب سے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں چین کی طرف جانے کے لیے نیپال سے چلا تھا تو بیٹو کی محبوبہ نے ایسے ہی بادل دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ایک خطرناک بات ہے۔ ایسے سیاہ بادل آئیں تو سمجھ لینا کہ کوئی غلط بات ہونے والی ہے۔ ایسا طوفان آنے والا ہے جو تباہی پھیلاتا ہے۔ برف کے ذرات ہی نہیں اڑاتا، بڑے بڑے تو دے بھی اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اسی بات نے مجھے فکر میں ڈال دیا تھا کہ اگر طوفان آ گیا تو کیا ہوگا؟ یہاں ایسی کوئی جگہ بھی نظر نہیں آرہی تھی جہاں ہم پناہ کی خاطر بیٹھ سکتے۔ میں فکر کے گرداب میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ سفیر کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا ”وسیم کا کوئی جواب آیا۔ بادل گہرے ہو رہے ہیں۔“

”میں خود پریشان ہو گیا ہوں اس لیے کہ جنہیں تو بادل سمجھ رہا ہے یہ بادل نہیں ہیں۔ یہ برف کے ذرات ہیں اور دور تک اوپر اٹھ رہے ہیں اس لیے پہاڑ کی چوٹیوں پر سایہ سا آ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ سیاہ دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد کوئی پناہ گاہ ڈھونڈنی پڑے گی۔“

”اتنی جلدی کوئی اور پناہ گاہ ملنے سے رہی۔ کیوں تا ایسا کیا جائے کہ ہم بھی اس غار میں اتر جائیں اور جب طوفان گزر جائے تو باہر نکل آئیں۔“ عبد اللہ نے مشورہ دیا۔ اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اتنی جلدی اور کوئی پناہ گاہ ملنے سے رہی۔ وسیم کے بقول یہ غار سرنگ نما ہے اور دور تک جا رہا ہے۔ غار کے دہانے سے زمین تک زیادہ فاصلہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم باہر نکل سکتے تھے۔

میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ طوفان جس رفتار سے بڑھ رہا تھا یہ اب تب میں ہم تک پہنچ جاتا اس لیے کہ اب سیاہی معدوم ہو چکی تھی اور ہوا میں اڑتے ذرات صاف نظر آرہے تھے۔ دیر کرنا مناسب بھی نہیں تھا اس لیے میں نے غار میں چھلانگ لگا دی۔ اندر گرتے ہی میں نے منہ اوپر کر کے کہا ”اب تم دونوں میں سے کوئی ایک کودے۔ پہلے عبد اللہ کو دا پھر سفیر۔ ہم تینوں نے اس جانب بڑھنا شروع کر دیا جس طرف ایک سرنگ نظر آرہی تھی۔ رہ رہ کر میں وسیم کو

آوازیں بھی دیتا جا رہا تھا۔ لیکن ابھی تک جواب سنائی نہیں دیا تھا۔ تین چار بار کے بعد اس کی ہلکی سی آواز آئی جیسے وہ کافی دور ہو۔

”کہاں ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سیدھے سیدھے بڑھتے چلے آئیں۔ راستے تیز سے میڑھے ہیں۔“

ہم تینوں اسی جانب بڑھتے چلے گئے۔ کافی دور آنے کے بعد احساس ہوا کہ دوسری طرف سے بھی راستہ کھلا ہوا ہے جہاں سے صاف ہوا آرہی ہے ورنہ ٹھن کا احساس ہوتا۔ میں نے وسیم کو آواز دی کہ اب وہ کہاں ہے۔ ادھر سے جواب آیا کہ میں نے آپ لوگوں کو دیکھ لیا۔ بس آپ آگے بڑھتے چلے آئیں۔

ہم تینوں آواز کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ چلتے چلتے عبداللہ نے پوچھا ”یہ اتنی لمبی سرنگ بنائی کس نے ہوگی؟“

”شاید تم بھول رہے ہو کہ یہ پورا علاقہ لائم اسٹون یعنی چونے کے پتھر سے بنا ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ جب یہ سخت ہوا اور کپریس کے عمل سے گزرا تو ایسے عار وجود میں آگئے۔ غور سے دیکھو اس میں ذیلی سرنگیں بھی ہیں اور ہوا بھی پاس ہو رہی ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس سرنگ کے کئی چھوٹے بڑے دہانے ہیں۔“

”اوہ..؟“ عبداللہ کے لہجے میں تعجب کا عنصر زیادہ تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں وسیم کھڑا غار کی چھت کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے بھی نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ یہاں سے وہاں تک چھت پر ٹھن پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیلے چپکے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا ”یہ تو قیمتی پتھر ہیں۔ لاکھوں روپے مالیت کے پتھر صرف اس غار میں ہیں۔ یقیناً آس پاس کے غاروں میں بھی ایسے پتھر ہوں گے۔“

”جی ہاں یہ پورا علاقہ قیمتی پتھروں سے بھرا ہوا ہے۔ چین اور انڈیا تو اپنے علاقوں سے پتھر اور دیگر معدنیات نکال کر کام میں لا رہے ہیں۔ ایک ہم ہی ہیں جو اپنی دولت کو نظر انداز کر کے دوسروں سے امداد مانگ رہے ہیں۔ پورا شمالی علاقہ جات، بلوچستان اور پنجتون خواہ قدرتی امداد سے لبالب بھرا ہے لیکن ہمیں فرصت نہیں کہ ہم کھدائی کریں۔ بھلے چوری سے کوئی لے جا رہا ہو تو کوئی بات نہیں۔“

میری بات پر سفیر کھلکھلا اٹھا ”خوب چور کو روکنے کی اجازت نہیں۔ واہ۔“

”بھائی میاں.. ان پتھروں کی فکر چھوڑو یہ دیکھو کہ باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔“ میں نے وسیم کو مشورہ دیا۔

وسیم نے ہنس کر کہا ”یہ ہماری قومی پہچان بن گئی ہے کہ کام کی بات کوئی نہ کرے جو کرے اسے ٹوک دو۔“ پھر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اب ہم سب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ دائیں بائیں بھی سرنگ مڑ رہی تھی لیکن ادھر اس لیے نہیں جا رہا تھا کہ ادھر سے تازہ ہوا اندر نہیں آرہی تھی۔ پھر جب کچھ آگے بڑھے تو سرنگ کا دہانا نظر آیا۔ ہم سب تیزی سے دہانے پر پہنچے۔ باہر جھانکا تو ادھر بھی وہی منظر تھا۔ دور دور تک برف زار۔ کہیں کوئی آبادی نہیں۔ لیکن ایک فرق نظر آیا کافی فاصلے پر پیڑوں کے کچھ جھنڈ نظر آئے۔ درختوں کو دیکھ کر میں نے کہا ”ہو سکتا ہے کہ ادھر آبادی ہو۔“

”لیکن ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہے کہ ہم پاکستانی حدود میں ہیں، تبت میں ہیں یا انڈیا میں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آبادی میں کچھ ہی کوئی نیا فساد کھڑا ہو جائے۔“ عبداللہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اب جو ہو گا وہ دیکھا جائے گا۔ ہمیں آگے تو بڑھنا ہی ہے۔“ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ جس پہاڑ کے سرنگ نما غار میں ہم کھڑے تھے اس کے پیچھے سے برف کے ذرات سیلاب کی صورت میں امنڈ امنڈ کر گرنے لگے۔ وہ طوفان جس کے آثار ہم نے دیکھے تھے وہ آچکا تھا۔ اب ہم شکر ادا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بروقت محفوظ رکھا اگر ہم اس غار میں نہ آتے تو اس طوفان کا شکار ہو چکے ہوتے۔ یعنی زندہ برف میں دفن ہو چکے ہوتے۔ اپنے طوفان کو کولاچ کہتے ہیں اور کولاچ کا مطلب ہے برف میں دفن ہو جانا۔

کافی دیر تک آئس سلائڈنگ ہوتی رہی اور ہم سب اس غار میں بیٹھے قدرت کی کار سازی دیکھتے اور اس آفت سے محفوظ رہ جانے پر شکر خدا کرتے رہے۔ ہوا کے تھپیڑے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو ہوا کے ساتھ برف کا کوئی چھوٹا ٹکڑا بھی اڑ کر اندر آ جاتا جو چہرے سے ایسے ٹکراتا جیسے کنکری، بڑی سی کنکری ٹکرائی ہو۔ جس کے بھی چہرے سے برف کا ٹکڑا ٹکراتا وہ چوٹ والی جگہ کو سہلاتا اور جل انداز میں مسکرا دیتا۔

طوفان تو آدھے گھنٹے میں گزر گیا لیکن ہم اس ڈر سے باہر نہیں نکلے کہ کہیں آئس سلائڈنگ نہ شروع ہو جائے۔ اس لیے کہ طوفان سے چھوٹی چھوٹی چٹانیں اپنی جگہ

سے کھسک جاتی ہیں اور برف کے ذرات کی وجہ سے ڈھلان پر ہی جم جاتی ہیں۔ اگر تیز ہوا چلی تو وہ چٹان پھسل سکتی ہے۔ اتنا موم دینا ضروری تھا کہ اگر ایسی کوئی چٹان ہو تو پھسل جائے۔ اس لیے بھی کہ ایک بھی چٹان پھسلتی تو ساتھ میں دھکے سے دوسری چٹانیں بھی گرتی ہیں اور پھر ایک خطرناک صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب کافی دیر انتظار کر لیا اور کسی چٹان کے پھسلنے کی آواز نہیں آئی اور نہ دکھائی دی تو ہم ڈرتے ڈرتے باہر نکلے۔ ہر طرف ایک گمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تا حد نظر برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ ہم سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھے۔ بڑھنے سے پہلے ہم دوبارہ سے ایک دوسرے سے اسی رسی سے منسلک ہو گئے تھے مگر اس بار سب نے اپنی اپنی بیلٹ کو کھینچ کر چیک کر لیا تھا تاکہ اگر کوئی حادثہ پیش آئے تو دوسرا اس کا سہارا بن جائے۔ پورا میدان بھر بھری ریت جیسا ہو رہا تھا۔ برف کے ذرات میں پھردھنس رہے تھے۔ ہم سب بغیر کسی نشان منزل کے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ تین چوٹیاں جنہیں دیکھ کر کہا گیا تھا کہ وہ تبت میں واقع ہیں اس سے بائیں طرف بڑھ رہے تھے۔ اس طرح ہم پاکستانی علاقے کے قریب ہوتے جاتے۔ کچھ آگے بڑھے تو ہمیں وہی پیڑوں کے جھنڈ نظر آئے جس طرف ہم نے جانے کا سوچا تھا۔ ہم انہی پیڑوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

پہلے ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ جھنڈ دو ڈھائی کیلو میٹر کی دوری پر ہوں گے مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ ہمارا اندازہ غلط ہے۔ اس جھنڈ تک پہنچنے پہنچنے آدھا پہر گزر گیا تھا۔

بالآخر کسی نہ کسی طرح ہم اس جھنڈ تک پہنچ ہی گئے۔ جھنڈ میں داخل ہوتے ہی ایک خوشگوار احساس ہوا۔ اس لیے کہ جھنڈ کے درمیان ایک عارضی جمو نیڑی نظر آئی جو شاید شکاریوں کی تیار کردہ تھی۔ لومڑیوں کے شکاری اپنے ٹھہرنے کے لیے ایسی ہی پناہ گاہیں بنا لیتے ہیں۔ وہ جمو نیڑی بھی کسی شکاری کی بنائی ہوئی ہوگی جو شکار کے موسم میں ان کے کام آتی ہوگی۔ ہم سب اس جمو نیڑی میں داخل ہو گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس جمو نیڑی میں کچھ خوراک بھی موجود تھی۔ ہم نے رات کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ عبد اللہ نے ادھر ادھر تلاش کے بعد چھماق پتھر بھی ڈھونڈ لیے تھے۔ اس نے چھماق کو رگڑ کر آگ جلائی۔ باہر کے سرد ترین موسم کے بعد آگ کی حدت نے بہت مزہ

دیا۔ ایک طرف کچھ سوکھے ہوئے پھل تھے اور اناج کی کچھ مقدار۔ گوشت کے دھوپ میں سکھائے ہوئے کچھ پارچے بھی تھے مگر ہم نے گوشت کو ہاتھ نہ لگایا کہ پتا نہیں کس جانور کے گوشت ہوں۔ چنے کو آگ پر بھون کر ہم سب نے ٹھوڑا ٹھوڑا کھایا اور پھر آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس جمو نیڑی نے خاموش زبان سے بتا دیا تھا کہ انسانی آبادی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے امید بندھ گئی تھی کہ ہم جلد کسی انسانی آبادی میں پہنچ جائیں گے۔

ہم نے کچھ دیر آرام کے بعد پھر سے سفر شروع کر دیا۔ اب ہم ڈھلان پر چل رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سورج اپنا سفر کرتے ہوئے مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا کہ ہمیں دور بہت دور سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً کوئی آبادی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کے بعد کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور ہم چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے آبادی صاف نظر آرہی تھی۔ مگر وہ کافی دور تھی۔ درمیان میں شاید کھائی یا کوئی بڑی وادی تھی اس لیے کہ ہر فیلے میدان کے بعد کچھ نظر نہیں آرہا تھا پھر وہ آبادی تھی۔ اتنی دور ہوتے ہوئے بھی اس آبادی نے ہمارے اندر ایسی خوشی بھروی تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسی خوشی محسوس ہو رہی تھی جیسے ہم اسلام آباد پہنچ گئے ہیں۔ میں نے سب کو مخاطب کر کے کہا ”آبادی میں پہنچ کر ہمیں انتہائی چالاکی سے کام لینا ہوگا۔ باتیں کم سے کم کرنا ہوں گی۔ اس لیے کہ ابھی یہ پتا ہی نہیں ہے کہ یہ علاقہ ہمارا ہے یا دشمن ملک کا۔ یہاں تین ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ پاکستان، چین اور انڈیا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم انڈیا کے حدود میں ہوں اور یہ تمہارے علم میں بھی ہے کہ انڈین رامیرے پیچھے ہے۔ ان کو میں نے کئی بار شکست دی ہے اس لیے وہ مجھے کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایسے میں اگر میں ان کی حدود میں پایا گیا تو وہ خوشی سے نہال ہوا ٹھیس گے۔“

”لیکن جب تک ہم آبادی میں پہنچیں گے نہیں تو پتا کیسے چلے گا کہ ہم کس ملک میں کھڑے ہیں۔“

”سیدھے آبادی میں گھسنے سے اچھا ہے کہ ہم پہلے کہیں پناہ گاہ ڈھونڈ لیں پھر کوئی ایک جا کر پتا کرے۔ ایک ساتھ جانے کا مطلب ہے کہ سب ایک ساتھ چھنیں۔“

”شہباز کی بات میں دم ہے۔“ سفیر نے کہا ”اس طرف اونچے نیچے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں عار بھی ہوں۔ ہم پہلے ان ٹیلوں کی طرف چلتے ہیں۔“

ہے۔“

ان کو ہدایت دے کر میں نکل کھڑا ہوا۔ میں اس آبادی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر یہ انڈیا کا حصہ ہوا تو میں چین کی طرف رخ کر لوں گا پھر وہاں سے پاکستان پہنچنا کم خطرے کی بات ہے۔

ابھی میں برف کے میدان سے اتر کر پتھر لے راستے پر آیا ہی تھا کہ سامنے سے دو آدمیوں کو آتے دیکھا۔ وہ دونوں کسی بات پر بحث کر رہے تھے اس لیے کہ مسلسل دونوں کے ہونٹ اُل رہے تھے۔ آواز مجھ تک پہنچ نہیں پا رہی تھی اسی لیے ان کو بخوردیکھتے ہوئے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دراصل میں ان کے چہرے سے علاقے کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس علاقے کے لوگوں کے چہرے عام طور سے چھپے ہوتے ہیں۔ تپتی نقش و نگار والے لیکن ان کے چہرے واضح ہوئے تو میں خوش ہو گیا کیونکہ ان کے چہرے کی ساخت پختونوں سے مل رہی تھی۔ لباس بھی پختونوں والا تھا۔ بڑی سے گھیردار شلوار۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میں پاکستانی علاقے میں پہنچ چکا ہوں۔ میں خوشی سے سرشار انداز میں ان کی طرف بڑھا۔ اب ان لوگوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور حیرت بھری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ دونوں رک گئے تھے مگر میں رکا نہیں تھا اور ان کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نزدیک پہنچنے کے بعد میں نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے میرے اندازے کی تائید کر دی۔ سلام کا جواب دیتے ہی پشتو لب و لہجے میں پوچھا گیا ”تم کون ہو؟ کہاں سے آرہے ہو؟“

میں نے جواب دینے کی بجائے پوچھا ”اس علاقے کا کیا نام ہے؟“

”یہ بلتر گلہ شہر کے نزدیک کا علاقہ ہے؟ کیا تم ہیٹنگ کے لیے آئے ہو؟ تمہاری پارٹی کہاں ہے؟“

”تم ہمارے لیے خوراک کا انتظام کر سکتے ہو؟“ اس پار پھر میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ ہماری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

”آپ ایسا کرو کہ ہمارے ساتھ ہمارے ڈیرا پر چلو۔ وہاں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”کیا تم یہاں کے مقامی نہیں ہو؟“

”نہیں جناب ہم ایک ضروری کام سے یہاں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ اور بھی لوگ ہیں۔ ہم سب اس طرف ایک بڑے سے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

سفر کا مشورہ میں نے مان لیا اور اس طرف بڑھنے لگا۔ پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور و نزدیک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جسے ہم پناہ گاہ کے طور پر استعمال کر سکتے۔ ہم چاروں نے پھیل کر پہاڑی کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وسیم آہستہ آہستہ اس پہاڑی کے اوپر چڑھتا چلا گیا تھا۔ پھر اس نے آواز دی ”شہباز اوپر آجائیں۔“

میں سمجھ گیا کہ اس نے کوئی غار یا چھجھا ڈھونڈ لیا ہے اور اس خوشی میں مجھے بلا رہا ہے۔ میں تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔

اب تک ہم میدان میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن اس پہاڑی پر چڑھتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس لیے کہ اب تک ہم غلط سمت میں بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی کی دوسری طرف بھی میدان تھا۔ برف سے بھرا میدان اور اس میدان کے پار ایک ندی بہ رہی تھی۔ اس ندی کے کنارے بہت سارے مکان نظر آرہے تھے۔ جس آبادی کی طرف ہم بڑھ رہے تھے یہ آبادی اس سے چھوٹی تھی۔ مکانات کچے تھے۔ ان مکانوں کی بناوٹ بالکل ایسی تھی جیسی بلتستان کے علاقوں میں دیکھ چکا تھا۔ میرے اندر خوشی کی ایک تیز لہری اٹھی کہ ہم اپنے ہی علاقے میں ہیں لیکن فوراً ہی خیال آ گیا کہ بلتستان ہو یا چین یا انڈیا ان تمام علاقوں کے مکانات کی تعمیر میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔

”یہ آبادی نزدیک تو ہے لیکن ہم فوراً ادھر نہیں جائیں گے۔ پہلے یہاں کوئی پناہ گاہ ڈھونڈیں گے۔“ میں نے کہا تھا کہ ہوا کے دوش پر سوار سفر کی آواز آئی:

”لو بھائی میں نے ایک ائر کنڈیشنڈ غار ڈھونڈ لیا۔“

سفر کی آواز پر ہم دوبارہ نیچے آ گئے۔ سفر نے واقعی ایک غار ڈھونڈ لیا تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ غار قدرتی ضرور ہے لیکن اس میں انسانی کاریگری بھی شامل ہے۔ پہاڑی کو کھود کر غار کو آگے تک بڑھایا گیا تھا۔ اس کا ایک دہانہ ادھر سے تھا اور دوسرا دہانہ دوسری طرف تھا۔ ادھر سے آنے والی ہوا ادھر سے نکل رہی ہوگی اسی لیے سفر نے اسے ائر کنڈیشنڈ کہا تھا۔ میں بھی اس طنز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر میں نے کہا ”ایسا کرو تم تینوں یہاں بیٹھو میں اس آبادی کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ اگر میں ایک گھنٹے میں نہ لوٹوں تب تم میں سے کوئی ایک جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لے گا۔ اندھی چال کوئی نہ چلے۔ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا

میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چشمی حس کہہ رہی تھی کہ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ کیونکہ بلتستان کے لوگ امن پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہوتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی سے گوسوں دور رہتے ہیں۔ جب کہ ان میں سے ایک کی کمر میں اڑے ہوئے پستول کے ابھار کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ پستول ساتھ رکھنا پختون پھر کا حصہ ہے۔ لیکن اس علاقے کے لوگ معیوب سمجھتے ہیں۔ پھر یہاں غربت بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہاں والے جتنے پیسوں میں یہ پستول خریدیں گے اس میں کچھ اور ملا کر یا ک خرید لیتا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یاک ان کی زندگی کا جز لا ینفک ہے۔ اس سے کھیت جوت لیتے ہیں۔ اس پر سواری کرتے ہیں۔ اس کے دودھ سے بھوک مٹاتے ہیں، گویا یاک ہی ان کی پہلی ترجیح ہے۔ ایسے پر امن علاقے کا کوئی باشندہ پستول رکھ ہی نہیں سکتا۔ یقیناً یہ کوئی اسمگلر یا غیر قانونی کام کرنے والا ہے۔ میں ہوشیار ہو چکا تھا پھر بھی ان پر آشکار نہیں کیا تھا کہ میں ان کی اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ بس ان کی تقلید میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ دونوں ایک مکان کے سامنے جا کر رک گئے۔ وہ مکان کچا تھا لیکن اچھا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ان میں سے ایک نے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازے کی دوسری جانب کسی کی چاپ ابھری۔ شاید اندر سے کسی نے جھانک کر دیکھا تھا پھر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے حیرت بھری نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر پوچھا ”یہ کون ہے؟“

”سامنے سے ہٹ۔ اندر تو جانے دے۔“ کہہ کر اس نے ہاتھ سے اسے ہٹایا اور مجھے لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ان دونوں نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا پھر استغفار یہ انداز میں میرے ساتھ آنے والے سے پوچھا ”یہ کون ہے؟“

بولنے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سندھ کے علاقے کا ہے۔ اب مجھے سو فیصد یقین آچکا تھا کہ میں وطن کی سرزمین پر ہوں اور مجھے ساتھیوں کو بھی بلا لینا چاہیے۔

”اللہ ڈینیو یہ صاحب ٹریک کرنے آیا ہے۔“ مجھے لانے والے نے ہنستے ہوئے عجیب انداز میں کہا۔

”ریاست خان۔ تم اسے ادھر کیوں لے کر آیا؟“ سوال کرنے والا ڈانٹنے کے انداز میں بولا۔

”اس سے پوچھو اس کا پارٹی کہاں ہے؟“ مجھے لانے والے کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ زبردستی

کرنا چاہ رہا ہے۔ لیکن اسے میری پارٹی سے کیا لینا دینا، یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب جاننا ضروری تھا۔

”اس کی پارٹی سے کیا کرنا ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے جس کام کے لیے آئے ہیں اسے کرو اور واپس چلو۔ مجھ سے اب اس سرد جہنم میں رہنا نہیں چاہا۔“ پہلے سے موجود شخص نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے سے بے زاری عیاں تھی۔ شاید وہ یہاں کی سردی سے گھبرایا ہوا تھا۔

”تم سمجھا نہیں۔ یہ اسی طرف سے آرہا ہے، جہاں سے وہ آئے گا۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔ اس کا انداز مجھے حد درجہ مشکوک لگا۔

ریاست خان کی بات سنتے ہی اللہ ڈینیو کے تیور بدل گئے۔ اس نے میرا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا ”تم نے سن لیا خان کیا بولا۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھی کہاں ہیں اور تم ادھر کیا کرنے گئے تھے۔ اس لیے کہ اس طرف کوئی ٹریک نہیں ہے۔“

”ہم راستہ بھٹک گئے ہیں۔“ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اس لیے کہ اب مجھے تجسس ہو گیا تھا کہ یہ کس سمت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں اور ان سے ملنے کون آنے والا ہے۔

”جھوٹ مت بولو... ہم لوگ جھوٹ برداشت نہیں کرتے۔ اگر تم نے سچ نہیں بولا تو انجام بہت برا ہوگا۔“ اس نے کڑے تیور سے کہا۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں۔ میں جس ٹیم کے ساتھ تھا وہ لوگ طوفان میں پھنس کر پتا نہیں کدھر چلے گئے۔ میں طوفان سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں دوڑا تھا۔ دوڑتے دوڑتے پتا نہیں ان لوگوں کو کہاں چھوڑ آیا۔ طوفان رکا تو میں سامنے والی پہاڑی پر تھا۔ آبادی دیکھ کر ادھر چلا آیا۔“

”بالکل جھوٹ اس لیے کہ ہم یہاں ایک ہفتے سے ہیں اور ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ادھر کوئی ٹریک... پارٹی آئی ہے۔ سچ بتاؤ تم کون ہو اور تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ اس طرف کیا کرنے گئے تھے۔“

”میں نے کہا نا کہ میں اکیلا ہوں میرے ساتھی چھوڑ گئے ہیں۔“ میں نے کمال الطیمان سے جواب دیا۔

”تمہارے ساتھی کس ملک کے ہیں اور تم کس شہر کے ہو؟“

”میں پنڈی کا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

آئے ہوں۔ غربت زدہ علاقے میں کوئی اتنی دور سے واردات کرنے نہیں آسکتا یقیناً یہ لوگ کسی اہم کام سے آئے ہیں۔ وہ کام کیا ہے یہ جاننا ضروری تھا۔ اور مجھے موقع مل نہیں رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر پرانی کہانی کو آزمانا چاہا: ”بھائی بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دے دو۔“

”اللہ ڈینو اسے کھانے کو دے۔“ کراچی والے بندے نے کہا۔

”یار صغیر تو بھی نا... خود ہی اٹھ کر دے دے۔“ اللہ ڈینو نے منہ بنا کر کہا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان میں کوئی بھی اہم بندہ نہیں ہے۔ پانچوں برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ ڈینو خود اٹھا اور دوسرے کمرے سے بھنا ہوا مرغ اور روٹی لے آیا۔

”لے بھائی صرف دو روٹی بچی ہوئی ہے، اس سے کام چلا۔ دوپہر کا کھانا پک جائے تو پیٹ بھر کر کھا لینا۔“ اللہ ڈینو نے پلیٹ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

واقعی بھوک تھی پھر ان کو دکھانا بھی تھا کہ میں بھوکا ہوں اس لیے میں نے کئی روز کے فاقہ زدہ انداز میں کھانا شروع کر دیا۔ وہ سب مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کھانا کھا کر میں نے ڈکار لی اور کہا ”اچھا بھائی اب مجھے اجازت دو میں اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ ہاں نہیں وہ سب طوفان سے بچے بھی یا نہیں۔ اس لیے کہ میں اسی طرف بھاگا تھا۔ اگر وہ لوگ بھی ادھر گئے ہوں گے تو فوج جائیں گے ورنہ آکس سلائیڈ ٹیک میں دب دبا گئے ہوں گے۔“

”اب تم ادھر سے جا نہیں سکتا۔ جب ہم لوگ چلا جائے گا تو شوق سے باہر نکل جانا۔“ ریاست خان نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ”اب تم ادھر ہی رہے گا۔“

”لیکن میرے ساتھی۔“

”ہم ان کو ڈھونڈے گا اگر وہ لوگ مل گیا تو ان کو بھی یہیں لائے گا۔ ادھر باہر کا کوئی آدمی نہیں آتا تم کیسے آگیا۔“ ریاست خان کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ اس نے اللہ ڈینو سے کہا ”منہ کیا دیکھتا ہے اس کا ہاتھ پیر باندھ کر ایک طرف ڈال دے۔“

وہ چار تھے اور میں اکیلا پھر میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی کمر میں پستول بھی ہے۔ معاملہ نازک تھا۔ اگر میں اپنی قوت آزمانا تو معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا۔ میں نے آرام سے اپنے ہاتھ پیر بندھوا لیے۔ انہوں نے مجھے ہاندھتے وقت عام انداز سے باندھا تھا جسے کھولنا میرے لیے کوئی مشکل کام

”پنڈی کے کس علاقے کے ہو... اس لیے کہ میں بھی راولپنڈی کا ہوں۔“ اللہ ڈینو کے ساتھ بیٹھے شخص نے پوچھا۔

اس کے لہجے نے چنٹی کھادی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس لیے کہ پنڈی والے بھی راولپنڈی نہیں کہتے ہمیشہ پنڈی کہتے ہیں۔ اس کے بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کراچی کا ہے۔ کراچی کے اولڈ ایریا کے لوگ اس انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ گویا یہاں پورا پاکستان جمع تھا لیکن یہ سب مسخ ذہن والے تھے۔ اچھے برے ہر ملک میں ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی اچھوں کے ساتھ کچھ برے لوگ بھی ہیں۔ اور ان سب کا تعلق برے لوگوں سے تھا۔ اس کا مجھے اندازہ ہی نہیں سو فیصد یقین ہو چکا تھا۔

”میں ڈھوک چراغ دین کا ہوں۔ نالائقی کے قریب میرا گھر ہے۔ آپ کسی کو بھی فون کر کے میرے گھر سے تصدیق کرا سکتے ہیں۔“ میں نے جواب دینے کے ساتھ اس بات کا اندازہ بھی لگانا چاہا تھا کہ ان کے پاس فون ہے۔ اگر فون ہے تو یہاں سگنل آتا ہے یا نہیں۔ اگر سگنل آتا ہوگا تو میرا فون بھی کام کرے گا۔ جو ابھی تک بیک کے اندر پڑا اپنی قسمت پر رو رہا ہے۔

”ریاست خان اپنا فون دینا ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ ریاست خان نے قمیص کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اللہ ڈینو بولا:

”تمہارا نام کیا ہے۔ اپنا اور اپنے باپ کا نام بتاؤ ہم ابھی چیک کرتے ہیں۔“

”میرا نام شاہد بٹ ہے۔ باپ کا نام ارباب بٹ۔“ میں نے جھوٹ کا ریکارڈ قائم کرنا شروع کر دیا۔

”ہاں مجھے یاد آ گیا۔ ارباب بٹ وہی ناجن کی بڑی سی داڑھی ہے۔“

”جی ہاں۔ میرے والد کی داڑھی ہے لیکن بڑی سی نہیں، عام سی۔“

”تب تو تم میرے گرائیں ہوئے۔ اب یہ بھی بتا دو تمہارے ساتھی کہاں ہیں۔“ وہ اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے جواب اگلوانے کے لیے نیا طریقہ اپنایا تھا مگر اسے خبر نہ تھی کہ ایسے چوہے جیسے لوگ میرے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اگر میں چاہوں تو ان سب کو دھنک کر رکھ دوں لیکن میں خاموشی سے حقیقت جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔ اس لیے کہ یہ ایسی جگہ بھی نہیں ہے کہ لوگ لوٹ مار کے ارادے سے

ہونے والی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی اٹھا غفل ہو گیا۔ اس کا جسم جمبول گیا۔

ان دونوں پر میں نے اتنی آسانی سے قابو پالیا تھا جیسے وہ دونوں ننھے بچے ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ لوگ سڑک چھاپ تھے۔ معمولی درجے کے بدمعاش اگر ٹریڈ ہوتے تو شاید معرکہ سر کرنے میں دیر لگتی۔

ان سے نمٹ کر میں نے اپنا بیگ اٹھایا۔ اس میں میرا موبائل تھا۔ مجھے یہ علم نہیں تھا لیکن اندازہ تھا کہ وسیم اور سفیر کے پاس بھی موبائل ہے۔ میں نے اپنا موبائل نکالا۔ اسے آن کیا لیکن یہ دیکھ کر آہ بھرنے پر مجبور ہو گیا۔ سگنل نہیں تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کاش میرے پاس سیٹ لائیٹ فون ہوتا۔ موبائل کو واپس بیگ میں رکھ کر میں نے بیگ کو دوبارہ کندھے پر لٹکایا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا۔ دور بہت دور۔ اسی برف کے میدان میں دو نقطے سے نظر آنے والے بندے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس مسئلے کو ابھی چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں اس غار کی طرف چل پڑا جس میں سفیر وغیرہ ٹھہر گئے تھے۔ چلتے وقت میرے ذہن میں ایک بات بار بار آرہی تھی۔ میری قسمت بھی عجب ہے۔ زندگی نے مجھے ٹینس کی گیند بنا دیا ہے کہ اچھا لیتی ہے۔ ٹپا کھاتا ہوں پھر اچھا لیتی ہے۔ کتنی عام سی زندگی تھی۔ ایک سویرا کی خاطر گھر چھوڑا تو زندگی کیسی اچھل کود سے بھر گئی۔ پورے پاکستان کی خاک چھنوا دی۔ نیپال انڈیا اور چین تک پہنچا دیا۔ ابھی ابھی جس سرزمین سے آیا ہوں اس کا ذکر کسی سے کروں تو کون یقین کرے گا؟ لوگ اسے من گھڑت کہانی قرار دیں گے۔ یکا یک میرے ذہن میں ایک بات ابھری، کہیں یہ سب کچھ ایلیو ایشن تو نہیں تھا۔ میں نفسیاتی بیمار تو نہیں ہو گیا تھا؟ کہ خواب مسلسل دیکھتا رہا۔ سچی دماغ نے انتباہ دیا۔ ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ وسیم، سفیر اور عبداللہ بھی تو اس عجیب و غریب سرزمین سے آرہے ہیں۔ کیا وہ بھی خواب دیکھتے رہے ہیں؟ میں اپنے ہی خیال پر مسکرا اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس غار کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

میری نظریں بار بار ادھر بھی اٹھ رہی تھیں۔ اس جانب جہاں دور دور تک پھیلا برفیلا میدان تھا اور اس میدان میں کسی نقطے کی طرح نظر آنے والے وہ دونوں بندے۔ انہوں نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا یا اگر دیکھا تھا تو توجہ نہیں دی تھی بس وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے

نہیں تھا۔ انہوں نے مشکلیں کس کے مجھے فرش پر ڈال دیا تھا۔ میں اگر چاہتا تو اپنا ہاتھ دکھا سکتا تھا پھر بھی میں لچار سا ایک جانب پڑا رہا۔ ریاست خان میری طرف سے مطمئن ہو کر باہر نکل گیا۔ جاتے وقت وہ اپنے ساتھ جیدے کو لے گیا تھا۔ پتا نہیں کس چکر میں وہ برفیلے میدان کی طرف گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اللہ ڈینو دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں صرف ایک بندہ رہ گیا تھا صغیر جو مجھے ہیروئن چھی سالگا تھا اس لیے کہ وہ جاتے میں بھی سوتا ہوا لگ رہا تھا۔ اب میں نے اپنی کار سازی دکھانے کی سوچی اور ہاتھ کو اوپر اٹھانے لگا۔ انہوں نے میرے دونوں ہاتھوں کو باندھا ضرور تھا لیکن پشت کی طرف نہ باندھ کر سامنے کی طرف باندھا تھا جسے کھولنا آسان تھا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور بیٹھے ہوئے بندے کی طرف پیٹھ کر لی۔ اب ہاتھ کو اٹھا کر منہ تک لانا آسان ہو گیا تھا۔ میں نے دانتوں کی مدد سے رسی کی گانٹھ کھولنا شروع کر دیا۔ دو منٹ میں مجھے کامیابی مل گئی۔ بندھن کھلتے ہی میں نے آواز دی ”اللہ ڈینو بھائی بات سنیں۔“

”اوائے شور نہ کر اللہ ڈینو آرام کر رہا ہے۔“ ہیرو چچی جیسے شخص صغیر نے جواب دیا۔

”تو بھائی تم ہی ادھر آ جاؤ۔“ میں نے اسے ہی پھانسنے کا سوچا۔

”کیا ہے۔“ وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا اور اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔ میں یہی تو چاہتا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی اور منہ پر بائیاں ہاتھ رکھ کر کہا ”اگر آواز نکلی تو گردن ٹوٹ جائے گی۔“

مجھے اس کی گردن پر دباؤ ڈالنے کی بھی ضرورت نہ پڑی، وہ ہلکے سے دباؤ سے ہی اٹھا غفل ہو گیا۔ اسے دھکا دے کر میں نے اس کمرے کا رخ کیا جدھر اللہ ڈینو گیا تھا۔ اس کمرے میں بستر بچھا ہوا تھا اور اللہ ڈینو لیٹا ہوا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ دن کے وقت سونے کی کیا تک ہے لیکن وجہ بھی نظر آ گئی۔ اس کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بو میرے لیے نئی نہیں تھی۔ جسے میں ہیرو چچی سمجھ رہا تھا وہ ہیرو چچی نہیں تھا۔ ہیرو چچی اللہ ڈینو تھا جو ہیروئن کا مزہ لے کر سویا تھا۔ میں نے قریب پہنچتے ہی اس کے گلے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور زور ڈالنے لگا۔ وہ نشے میں چور تھا لیکن گلے پر دباؤ پڑا تو پھڑ پھڑانے لگا۔ چھٹیٹانے لگا۔ جکڑ سے نکلنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اس کی کوشش کہاں کامیاب

ماہنامہ سرگزشت

جاری تھے۔
غار کے نزدیک پہنچ کر دیکھا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ ان کے موجود رہنے ایسی خاموشی چہ معنی دارد۔ واقف حال ہونے کے لیے اندر داخل ہوا تو اطمینان کی سانس نصیب ہوئی۔ سامنے پتھر لیے فرش پر وہ سب بے خبر سو رہے تھے۔ شاید یہ تھکن کا نتیجہ تھا۔

میں پوچھا۔
”میں خود بھی سمجھ نہیں پایا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ میں یہاں سے نکلا تو دو آدمی نظر آئے....“ میں نے اسے بھی پورا احوال سنایا۔ سب کچھ سننے کے بعد عبداللہ بولا:
”یہ علاقہ اسمگلنگ کے لیے بھی استعمال نہیں ہوتا کہ کہا جائے کہ وہ لوگ اسمگلر ہیں۔ ان دشوار گزار پہاڑیوں، برف زاروں میں عام طور پر صرف ٹریلنگ کے شوقین آتے ہیں۔ کھمبے آتے ہیں ورنہ یہ علاقہ تو غربت کی کوکھ میں پلٹے والا ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی غیر معمولی بات ہے جس کی پردہ داری ہے۔“

”ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یہاں سے چین بھی نزدیک ہے اور انڈیا بھی، ادھر اس طرف وہ جو پہاڑ نظر آ رہا ہے۔ پانچویں پہاڑی کے پیچھے ایک ہیولا سا اس طرف سیاچن ہے۔ کہیں کوئی سازش تو نہیں ہو رہی؟ انڈیا والوں کی سازش۔“ سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”وہ لوگ ایسی کیا سازش کر سکتے ہیں؟ ان پہاڑوں پر قبضہ کریں گے؟ اگر ایسا ہوا تو ہمارے فوجی ابھی آکر ایسا سبق سکھائیں گے کہ وہ انیس سو پینسٹھ کی بھولی مار کو یاد کرتے ہوئے بھاگیں گے۔“ عبداللہ بولا۔

”شاید تم بھول رہے ہو۔ سیاچن میں بھی وہ لوگ چوروں کی طرح گھس کر چوکی بنا رہے تھے کہ ایک چرواہے نے دیکھ لیا اور اس نے دوڑ کر دس سے بارہ میل کا فاصلہ طے کیا اور فوج کو خبر دی۔ فوجیوں نے آکر انہیں پیچھے دھکیلا ورنہ وہ قبضہ کیے بیٹھے رہتے۔ کہیں ویسا ہی کوئی ڈراما یہاں بھی نہ کھیل رہے ہوں۔“ عبداللہ نے سمجھایا۔

”بات سو فیصد سوچنے کی ہے۔ پانگانا ضروری ہے کہ وہ لوگ اتنی دور سے کیا کرنے آئے ہیں۔ کسی مقامی آدمی سے پتا نہیں کیا کہ یہ لوگ کب سے یہاں مقیم ہیں؟“ وسیم کی آواز میں فکر کا عنصر درآتا تھا۔

”کوئی مقامی ملا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری بستی خالی پڑی ہے۔ ورنہ ان میں سے ایک آدمی مار کھا کر پوری قوت سے پتھا تھا۔ اس کی چیخ دور تک سنی گئی ہوگی لیکن جب میں باہر آیا تو کوئی بھی نظر نہیں آیا۔“

”کیا مطلب؟“ وسیم بھی بیدار ہو گیا تھا۔ ”یہ کیسی یہیلیاں بچھو رہے ہیں؟“

میں نے بغور اس کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا ”مطلب یہ کہ یہاں سے نکلنے ہی اجنبی دشمنوں سے سامنا ہو گیا اور وہ میری خاطر داری پر اتر آئے۔ زبردستی ایک گھر میں لے جا کر قید کر دیا۔“

”کیا... تم قید میں تھے؟“ سفیر کے لہجے میں حیرت تھی ”ایسا کون سو رہا تھا؟“

”یہی تو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کون لوگ تھے.. بڑی محبت سے لے گئے اور لے جا کر قید کر دیا۔ میں ابھی قید سے چھوٹ کر آ رہا ہوں۔ پتا نہیں وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔“

”بغیر کسی وجہ کے انہوں نے آپ کو قید کر لیا تھا؟“ وسیم نے اٹھ کر انگڑائی لی اور پیر کے انگوٹے کو عبداللہ کی پیٹھ میں چھاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کہاں کی شرافت ہے۔ اگر میں نے نیند میں ہاتھ چلا دیا نا۔“ عبداللہ نے کسمسا کر روٹ بدلتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے جملہ پورا کیا:

”یہی تو حیران کن بات ہے۔ پتا نہیں کیا چکر ہے۔ وہ لوگ کسی کے انتظار میں ہیں اور آنے والے کو سب کی نظروں سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں اسی لیے مجھے قید کر لیا تھا کہ میں اسی طرف سے آیا ہوں جدھر سے اسے آنا تھا۔“

”میری آنکھ دیر سے کھلی۔ آپ کیا کہہ رہے تھے۔“ عبداللہ اٹھ کر بیٹھے ہوئے بولا۔

”اجی جناب یہ فرما رہے تھے کہ ہمارے لیے کام

”ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے مقامی باشندوں کو بھگا دیا ہو۔“

”ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کوئی کھیل کھیلا ہے تو سمجھ لو کوئی بڑی سازش ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”مجھے یاد آرہا ہے کہ ان پہاڑوں کے باشندے موسم کے حساب سے اپنا علاقہ بدلتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس موسم میں نیچے کہیں چلے گئے ہوں۔“ سفیر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ایسا ممکن ہے۔ پھر بھی ہمیں سراغ لگانا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اگر یہ متروکہ علاقہ ہے تو وہ یہاں کیوں ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں۔ مقامی لوگ اس ڈر سے علاقہ تیاگ دیتے ہوں گے کہ یہاں آکس سلائیڈنگ کا خطرہ ہے۔ ایسے خطرناک علاقے میں کوئی یوں ہی نہیں چلا آتا۔ ضرور کوئی بڑی بات ہے، ایسا کرتے ہیں ہم سب اسی گاؤں میں چلتے ہیں۔ تم سب دوسرے جھونپڑوں میں چھپے رہنا۔ میں واپس اسی گھر میں جا رہا ہوں تاکہ ان سے اگلا سکوں کہ وہ کیا کرنے آئے ہیں۔“

”ہاں چلو۔“ کہہ کر سفیر کھڑا ہو گیا۔

”تم سب ایک ایسی جھونپڑی تلاش کرو گے جس میں انہیں لے جا کر ہم تفتیش کر سکیں۔“

”اتنی مشقت ضروری ہے کیا؟ وہیں ڈرائی کلین کر لیتے ہیں۔ کافی دنوں سے کسی کو دھوبی پاٹ دیا نہیں ہے۔ وہاں لڑے بھی تو تیر کموار سے ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔“ وسیم بولا۔

”ہمارا بھی یہی خیال ہے۔ ہم سب چلتے ہیں۔ پھر توڑ کر ہاتھ میں دیں گے تو ان کی زبان خود ہی چلنے لگے گی۔“ وسیم نے پھر گل افشانی کی۔

”نہیں، ٹھنڈا کر کے کھانا اچھا ہے۔ صرف ایک بندے کو اٹھاتے ہیں۔ اس سے سوالات کرتے ہیں۔ باقی سب کو اندھیرے میں رہنے دو۔“ میں نے مشورہ دیا۔

”ہاں یہ مشورہ بھی برا نہیں ہے اس طرح یہ بات آسانی سے سامنے آجائے گی کہ وہ لوگ کس لیے یہاں آئے ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ کسی ملک دشمن سرگرمی میں ملوث ہوں۔“ وسیم نے کسی بزرگ خاتون کے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے پر مجھے بھی ہنسی آگئی تھی۔

وسیم کی یہی بات مجھے اچھی لگتی تھی کہ وہ ہر حال میں خوش رہنے اور پریشان نہ ہونے والا بندہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہر بات کو مزاح میں اڑا دینے والا تھا۔

”تو پھر دیر کس بات کی۔ چلو ہم سب چلے جاتے ہیں۔“ سفیر نے کہا اور اپنا بیگ اٹھا لیا۔ عبداللہ نے بھی نیچی کیا۔ وسیم نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے پھر سوال داغا ”لڑائی بھڑائی کا موقع ملے گا نا۔ ہاتھ پیرا بیٹھنے لگے ہیں۔“

”چلو اسی بہانے تمہارے ہاتھ پیروں کا زنگ دور کر دیتے ہیں۔ سوالات میں کروں گا اور مرمت تم کرنا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔

باہر نکل کر میں نے برقرار کی جانب نظر ڈالی، ادھر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ادھر جانے والے اب تک لوٹے نہیں تھے۔ شاید کہیں دور گئے تھے۔ میں نے اپنے قدم اس گھر کی جانب بڑھا دیئے جہاں ان لوگوں نے مجھے قید کیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس گھر کا دروازہ کھلا اور اللہ ڈینو باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر میں نے سفیر سے کہا ”یہ ان کا ساتھی ہے۔ اسے چھاپ لو اور سامنے والے گھر میں کھینچ لے جاؤ۔ ہم اس گھر کو تار چروم بنائیں گے۔ تفتیش کے لیے وہ گھر برا نہیں ہے۔“

”باہر ہی سے کافی بڑا نظر آ رہا ہے۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔

اللہ ڈینو نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور واپس اندر جانا چاہتا تھا کہ میں نے دوڑ لگا دی۔ مجھے خطرہ تھا کہ وہ اندر گھس کر کہیں دروازہ نہ لگا دے۔ اگر ایک لمحہ کی دیر ہو جاتی تو مجھے دروازہ توڑنا پڑتا۔ میں نے بند ہوتے دروازے کے درمیان پیر اڑا دیا تھا۔ میری کوشش کامیاب ٹھہری۔ وہ دروازہ بند نہ ہو پایا اور میں نے اسے زور لگا کر پیچھے دھکیل دیا۔ پھر اسے باہر کی جانب کھینچ لیا۔ اس افتاد پر وہ چیخا تھا۔ شاید وہ مدد کے لیے اسے ساتھی کو بلانا چاہتا ہو۔ اس کی چیخ سن کر اندر سے دوسرا بندہ بھی باہر آ گیا۔ جیسے ہی اس نے سر باہر نکالا باہر کا منظر دیکھنے کو لیکن دیکھ نہ پایا۔ اسے عبداللہ نے گریبان سے پکڑ کر کھینچ لیا تھا اور اسے مضبوط بازو کی جکڑ میں اسے جکڑ لیا تھا۔ اس کی گردن گویا شکنجے میں آگئی تھی۔ دونوں ہی بے بس ہو چکے تھے اس لیے ہم بہ آسانی ان دونوں کو کھینچتے ہوئے دوسرے والے گھر میں لے آئے۔

اندر لاتے ہی وسیم نے اللہ ڈینو کے پیٹ میں گھونسا مارتے ہوئے کہا ”یہ ابتدا ہے۔ ابھی میرا ہاتھ کھلنے دو پھر آرام سے خاطر داری کروں گا۔“

وسیم کا کئی یا ڈنڈ وزنی گھونسا اس کے پیٹ پر پڑا تو وہ اوغ کی آواز نکال کر دوہرا ہو گیا تھا۔ وسیم نے اسی پر بس نہ کیا۔ اس کے ٹخنے پر بوٹ سے ٹھوکر بھی ماری۔ ”یہ بھی“

ابتدا ہے۔ ابھی ہم تم سے کچھ سوالات کریں گے اگر صحیح جواب نہیں ملا تو پھر بہت معمولی سا کام کریں گے۔ جانتے ہو کیا؟“ اس نے جملے کے اختتام پر اپنا رخ دوسرے بندے کی طرف کر لیا تھا۔ دوسرا بندہ خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بغیر بٹے فر فر بولنے لگے گا۔ اسے دھمکانے کے لیے اللہ ڈینو پر تشدد ضروری تھا۔ میں نے وسیم کو آنکھوں سے اشارہ دیا۔ وہ تو گویا منتظر تھا۔ اس نے الٹا ہاتھ گھما کر اس کے گال پر جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز سے کمر اگوج اٹھا۔ وہ اپنا گال سہلا ہی رہا تھا کہ وسیم نے دوسرے ہاتھ سے مکا رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اسے عبد اللہ نے جکڑ رکھا تھا ورنہ وہ چمک کر دور جا گرتا۔ تیسرا گھونسا کھا کر وہ بولا ”آخر تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟“

”یہ ہوئی نا بات... زبان کو کام میں لاؤ اور بتانا شروع کر دو کہ یہاں تشریف لانے کا مقصد کیا ہے؟“ کہتے ہوئے وسیم نے اس کے پیٹ میں ایک اور گھونسا مارا۔ وہ منہ سے آواز نکالتے ہوئے دوہرا ہو گیا۔

”جج مجھے... کچھ... کچھ پتا نہیں ہے۔“ وہ گراہے ہوئے بولا۔

”ہاں اور تمہیں۔“ وسیم خونخوار نظروں سے دوسرے بندے کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ وہ وسیم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر ہی کاپٹنے لگا تھا۔

”ہاں بھئی شروع ہو جاؤ۔“ وسیم نے اس کی گردن پکڑ کر کہا تھا کہ وہ رو دینے والے انداز میں بولا ”مجھے کچھ بھی پتا نہیں۔ یہ لوگ مجھے کھانا بنانے کے لیے لے کر آئے ہیں۔“

”نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”صغیر۔“ وہ سچ سچ کانپ رہا تھا۔

”اور تم کیا کہتے ہو... تمہیں کس لیے لایا گیا؟“ سفیر نے اللہ ڈینو کے سر پر انگلی تیز مڑی کر کے الٹی طرف سے مارتے ہوئے پوچھا۔

”یقین کریں مجھے بھی نہیں پتا کہ ریاست خان کیا کرنے آیا ہے۔ میں کراچی میں انٹرا سٹیٹ بس اسٹینڈ پر بٹنگ کرتا ہوں۔ اس سے میری گہری دوستی ہے۔ ایک دن اس نے کہا کہ چلو ہم لوگ پاکستان ٹور پر چلتے ہیں۔ میں نے بھی سوچا کہ عرصہ ہو گیا ہے کہیں باہر نہیں نکلا۔ اس بہانے آڈینگ ہو جائے گی۔ اس سے پوچھا کہ کہاں کہاں جانا ہے تو وہ بولا کہ گلگت بلتستان کا فرستان۔ یہ سن کر میں خوش ہو گیا کہ وہ شمالی علاقہ جات جانے والا ہے۔ برف باری دیکھنے کا

اپنا مزہ ہے اسی لیے ہم اس کے ساتھ آگئے۔“ اللہ ڈینو نے جواب میں پوری کہانی بیان کر دی۔ شاید یہ خوف کا اثر تھا کہ وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بچنے لگا تھا۔

”یعنی تمہیں بھی پتا نہیں ہے کہ ریاست خان کیا کرنے آیا ہے؟“ میں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔

”جی ہاں... مجھے کچھ بھی پتا نہیں ہے۔ میں تو صرف اس لالچ میں یہاں آیا ہوں کہ برف باری دیکھوں گا۔“ اس نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔ وہ جس انداز میں بتا رہا تھا اس سے صداقت جھلک رہی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا اس لیے مجھے وسیم کی طرف دیکھنا پڑا۔ اس کی طرف سڑک میں نے کہا ”بھائی وسیم ذرا اپنی مہارت دکھانا کہ تم کس طرح بیروں کے جوڑ کھولتے ہو۔ اس کا پیر حاضر ہے۔ کوشش کر کے دکھاؤ نا۔“

وسیم نے جھک کر اس کے ٹخنے کو چھوا اور پھر کہا ”خاصہ مضبوط ہے پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔“ وسیم نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی جیسے واقعی وہ اس کام میں ماہر ہو۔ وہ اس کے پیر کو مختلف انداز سے محاذیہ کرتا رہا پھر اس نے اس کے ٹخنے پر اٹنے گھونے کو آزما کر کہا۔ ”ہاں میں نے اس کے تمام جوڑ کو سمجھ لیا ہے، اس لیے اب میں اسے یہ آسانی کھول لوں گا۔“ اس نے ایک گھونے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ نہایت تیزی سے مختلف جوڑ پر گھونسا مارتے ہوئے بولا تھا۔

درد کی تیز لہر اللہ ڈینو کے چہرے پر تیرتی نظر آئی۔ اس نے درد سہنے کے لیے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا پھر پھنسی پھنسی آواز میں کہا:

”آپ یقین کیوں نہیں کرتے کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔“

”بغیر وجہ کے کوئی گھر سے قدم باہر نہیں نکالتا، میں کیسے یقین کر لوں۔ ویسے اب کچھ ہی دیر ہے جب وسیم تمہارے ٹخنے کی ہڈی کو نکال کر فخر یہ کہے گا یہ لیجئے اسے ٹخنے کی ہڈی کہتے ہیں۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔“

اللہ ڈینو نے خوفزدہ نگاہوں سے وسیم کو دیکھا پھر منسایا ”مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ یہاں اس کا کوئی قریبی دوست آئے گا اور وہ اسے کچھ دے گا۔ جسے ہمیں پیٹھ پر لاد کر کہیں لے جانا ہے۔“

”وہ کیا چیز ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ کوئی بھاری بھرم چیز ہے جسے ریاست خان اکیلے اٹھانے نہیں سکتا، اسے ہم سب کو مل کر اٹھانا ہے اسی لیے وہ ہمیں ساتھ لے کر آیا ہے تاکہ ہم اس کی مدد کریں۔ بدلے

ضرورت پڑے گی۔ میں نے ہی اللہ ڈینو کو ساتھ ملایا اور یہاں آ گیا۔“ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے بندے کی طرف اشارہ کیا۔

”ریاست خان کب تک لوٹے گا؟“
 ”کہہ کر نکلا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جائے گا۔ درمیان میں آپ آگئے اس لیے اسے واپس آنا پڑا۔“
 ”اسے گئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اب تو اسے آ جانا چاہیے؟“
 ”ہو سکتا ہے آ گیا ہو اور ہمیں اس والے گھر میں تلاش کر رہا ہو۔“

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا ”باہر دیکھنا لیکن احتیاط کے ساتھ۔“
 عبد اللہ اٹھ کر دروازے تک گیا اور تھوڑا سا اسے کھول کر باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کا اندازہ صحیح ہے۔ وہ دونوں آچکے ہیں اور ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں۔ شاید انہیں ان دونوں کی تلاش ہے۔“
 ”گویا آپریشن کی شروعات کر دینا چاہیے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ایسا کرتے ہیں ان دونوں کو باندھ کر ڈال دیتے ہیں پھر باہر نکلیں گے۔“ وسیم بولا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر اللہ ڈینو کی گدی پر کھڑی تھیلی کا وار کیا۔ وہ چکرا کر نیچے گرا تھا کہ سفیر نے برابر میں کھڑے اس کے ساتھی کی گردن ناپی۔
 دونوں نیچے گر چکے تھے۔ انہیں بے ہوش دیکھ کر سفیر کے ہوتوں پر مسکراہٹ تھیل گئی۔ عبد اللہ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے کہ ہم پوری طرح سے مطمئن رہیں گے کہ یہ باہر نکل کر شور نہیں کر پائے گا۔“

ان دونوں کو ہوش سے بیگانا کر کے ہم باہر آئیں لیکن اس احتیاط سے کہ فوراً ہی کسی کی نظر میں نہ آجائیں۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت باہر کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ شاید وہ دونوں اندر تھے۔ ہم چاروں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے اس مکان تک پہنچے اور دروازے سے اندر جھانکا۔ ریاست خان اور جیدے دونوں فرش پر بیٹھے تھے۔ ریاست خان لکرمند لہجے میں کہہ رہا تھا ”یہ ایک خطرناک بات ہے کہ وہ قیدی غائب ہے، اللہ ڈینو اور سفیر بھی نظر نہیں آرہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ قیدی کسی طرح اپنے بندھن کھول کر بھاگا ہو گا۔ اللہ ڈینو اور سفیر اس کے پیچھے گئے ہیں۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔“ جیدے نے اپنا خیال پیش کیا۔

میں وہ ہمیں ٹھیک ٹھاک پیسے دے گا۔ اتنے پیسے جو ہم ایک ماہ میں کما نہیں سکتے۔“

”ہاں یہ ہوئی نا بات۔“ وسیم بولا ”اب باقی باتیں بھی بتاتے جاؤ۔ وہ چیز کیا ہو گی اور کتنی وزن والی ہو گی۔“ اس نے اللہ ڈینو کو چھوڑ کر سفیر کو کندھے سے پکڑ لیا تھا۔ اس نے اتنی مضبوطی سے اس کا کندھا جکڑا تھا کہ سفیر کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”اس کا علم ہم میں سے کسی کو نہیں۔ جیدے کو بھی نہیں جو اس کے ساتھ گیا ہے۔“ سفیر نے منمننا کر جواب دیا۔

”تم لوگ کتنے دن سے یہاں ہو؟“ میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں سچ تلاش کر رہی تھیں کیونکہ انسان جب جھوٹ بولتا ہے تو آنکھیں اس کا ساتھ نہیں دیتیں اور جھوٹ عیاں ہو جاتا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اسی لیے مزید کی تمنا میں مسلسل اس پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔

”ہم لوگ پرسوں پہنچے ہیں۔ یہ پورا علاقہ ریاست خان کا دیکھا ہوا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اکثر یہاں آتا رہا ہے۔“

”اس سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ کب سے دوستی ہے؟“ میں نے ایک اور سوال داغا۔

”یقین کریں میں بس اسٹینڈ پر ٹائم کیپر ہوں۔ وہ اکثر اپنی بس لے کر کراچی آتا رہتا ہے۔ وہیں اس سے دوستی ہوئی تھی۔ ایک سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بس کے نیچے غیر قانونی اشیاء لے کر آتا ہے اس لیے اس کی آمدنی خوب ہوتی ہے اور وہ ہاتھ کا بھی کھلا ہے۔ دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔“

”یہاں آنے سے پہلے اس نے ایسا کیا کہا تھا کہ تم لوگ آنے پر راضی ہو گئے تھے؟“

”اس نے کہا تھا کہ اس کے ایک دوست نے اسے ایک کام دیا ہے۔ اس کام کے اچھے پیسے دے گا۔ گلگت

بلتستان کی سیر مفت میں ہو جائے گی اور لوٹتے وقت جیب میں اچھی خاصی رقم بھی ہو گی۔ کام بہت معمولی ہے۔“

”ایک کی بجائے تین بندوں کو کیوں لے کر آیا یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”اس نے کہا تھا کہ میرا دوست جو دے گا اسے وہیں ایک دوسرے بندے تک پہنچا دینا ہے۔ جو کچھ دے گا وہ

وزنی ہے اس لیے اسے مدد کے لیے دو تین آدمیوں کی

”ہمیں اب دیر نہیں کرنا چاہیے۔“ سفیر نے سرگوشی

میں کہا۔

میں نے لات مار کر دروازہ کھولا۔ آواز سے وہ دونوں چونک گئے۔ میں نے اندر جاتے ہی کہا ”ریاست خان تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔“

ریاست خان نے کمر میں اڑے پستول کو نکالنے کی کوشش کی تھی کہ سفیر نے اچھل کر اس کے سینے پر نگر ماری۔ وہ فرش پر چت گرا تھا کہ وسیم نے اپنا پیر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پستول کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ اگر وہ ٹرگر دباتا تو گولی دیوار میں لگتی۔ ریاست خان کے دوسرے ساتھی کو عبداللہ نے سنبھال لیا تھا۔ سفیر نے اس کی گردن پر اپنا پیر رکھ کر کہا ”جتنی جلدی بکے گا تیرے حق میں اتنا ہی اچھا ہے۔ توتے کی طرح ٹرٹر شروع کر دے۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ اس نے کراہتے ہوئے

جواب دیا۔

”تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟“

”نور پر آیا ہوں.... ہر سال آتا ہوں۔ اس موسم میں یہاں کوئی رہتا نہیں ہے۔ ہم آرام سے ان کی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں اور دس بارہ دن میں لوٹ جاتے ہیں۔“

”جھوٹ بولنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ میں نے اس کی پسلی پر ٹھوک مارتے ہوئے کہا۔

”اگر سچ نہیں بولنا ہے تو پھر موت کے فرشتے کو کہہ دو کہ وہ جلدی آجائے اس لیے کہ اب تم میرے قبضہ میں ہو۔“ وسیم نے پیر سے اس کی کلائی کو مسلتے ہوئے کہا۔ اس کا دباؤ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا کیونکہ ریاست خان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

”ریاست خان ایک بات یاد رکھنا۔ میں اگر ضد پر اتر آؤں تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ میں ہاتھ پیر توڑ کر تمہیں سامنے والے بریلے میدان میں ڈال آؤں گا۔ باقی کام ہوائیں اور برف کے ذرات خود کر دیں گے کیونکہ یہاں کے مین ایک ڈیڑھ ماہ سے پہلے واپس آنے سے رہے۔“

”آپ کو کیسے میں یقین دلاؤں کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔“

”وسیم ایسا کرو کہ اس کی ایک ایک انگلیاں توڑنا شروع کر دو۔ جب یہ لولا ہو جائے گا تو میں اس کے پیروں

چارلی چپلن

چارلی چپلن برطانوی مزاحیہ اداکار اور فلم ہدایت کار تھا۔ امریکی سینما کے کلاسیکی ہالی ووڈ کے ابتدائی سے درمیانی دور میں بطور فلم ساز اور موسیقار بہت شہرت پائی۔ چارلی چپلن نے خاموش فلموں کے دور میں اپنی فلموں میں نہ صرف اداکاری کی بلکہ ان کا مصنف، خالق، ہدایت کار اور بعد ازاں موسیقار بھی خود ہی تھا اس دور کے سب سے بااثر فلمی شخصیات سے تھا۔ چارلی چپلن فرانس کی خاموش فلموں کے مزاحیہ اداکار میکس لئڈر سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنی ایک فلم بھی میکس لئڈر کے نام کی۔ چپلن کا تخلیقی کام 75 برس پر محیط ہے جو اس کے بچپن میں ملکہ وکٹوریہ دور میں برطانوی اسٹیج اور موسیقی کے ہالوں سے شروع اور 88 برس کی عمر میں اس کی موت تک جاری رہا۔

مرسلہ: فیض محسن۔ کوٹ اڈو

محمد منظور نعمانی

(1904ء-1996ء)

برصغیر پاک و ہند کے نامور اسلامی دانشور اور محدث، وہ مدتوں ندوۃ العلماء میں تفسیر قرآن، حدیث علم کلام اور فرقہ معرّفہ و متحرفہ پر درس دیتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس منتظرہ کے رکن اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے بنیادی آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے متحرک و فعال سرپرست۔ تبلیغی جماعت کے سرگرم عمل رکن اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مولانا کا شمار راہنہ فی العلم میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں انتقال کیا۔

مرسلہ: جیلدا حسن۔ کوئٹہ

منو بسمرتی

منو کا دھرم شاستر۔ ہندوؤں کے قانون کی کتاب جس پر عام طور پر ہندو عمل کرتے ہیں۔ اسے منو کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔

مرسلہ: زویا احمد۔ کراچی

ریاست خان بڑی عقیدت سے مرشد کا نام لے رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ پوری طرح مرشد کے ٹرانس میں ہے۔
”گلتا ہے دنیا گول ہے، بالکل گول ہے۔ مرحوم فتح خان سے بھی سلسلہ مل گیا۔“ سفیر ہنستے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے ریاست خان سے پوچھا ”مرشد کا وہ مرید کب سے اس آدمی کے لیے کام کر رہا ہے؟“

”میں سائیں سرکار کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ آفاق نامی وہ مرید مجھے لے کر باہر چلا آیا۔ اس نے مجھ سے کہا ”ریاست خان تم کو ہم ایک کام دینا چاہتا ہے، کرو گے؟“ میں نے پوچھا ”کیسا کام؟“ وہ بولا ”ایک چھوٹا سا کام ہے جو آپ کسی سے بھی کرا سکتے ہو۔ کام کے بارے میں معلومات اس فون نمبر سے ملے گی۔ سائیں سرکار نئی خانقاہ کی تعمیر کے لیے فنڈ جمع کر رہے ہیں اور اگر کوئی ایسا دیا کام آجاتا ہے تو یہ سوچ کر لے لیتے ہیں کہ ایک اچھے مقصد کے لیے بظاہر برا نظر آنے والا کام کرنا چاہئے کیونکہ خانقاہ بن گئی تو لاکھوں افراد کی ہدایت کا سامان ہو جائے گا۔ میں خود بھی خانقاہ کی تعمیر کے لیے کچھ دینا چاہتا تھا اس لیے فوراً راضی ہو گیا۔ میں نے اس کو ہاں کر دیا۔ یہ بات تین مہینے پہلے کی ہے۔ اس نے جو کام دیا تھا وہ ایک آدمی تک ایک سوٹ کیس پہنچانا تھا۔ وہ سوٹ کیس یہاں آ کر لینا تھا۔ میں نے وہ کام کر دیا۔ اس کا معاوضہ اتنا ملا کہ ایک بڑی رقم میں نے خانقاہ کے لیے دے دی جسے لے کر سرکار خوش ہو گئے۔ اس کے بعد اس بندے سے پھر بات نہ ہوئی۔ میں اسے بھلا بیٹھا تھا کہ ایک ہفتہ قبل فون آ گیا۔ اس نے اس پار جو کام بتایا اور ایڈوائس میں پچاس ہزار روپے اسی مرید سے بھجوائے تو میں بھاگتا ہوا کراچی پہنچا اور وہاں سے ان تینوں کو لے کر یہاں آ گیا۔“

میں برسر مطلب آ گیا۔ ”جس کی تلاش میں گئے تھے وہ کیوں نہیں آیا؟“

”گزشتہ بار جس دن کا بولا تھا وہ اس کے دو دن بعد آیا۔ ہو سکتا ہے اس بار تین روز بعد آئے۔“ ریاست خان نے اپنے زخمی ہاتھ کو ہلانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ وسیم نے ہیر کا داؤ کم کر دیا تھا۔

”گزشتہ بار وہ کیا دینے آیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”رقم دینے آیا تھا جو میں دو سوٹ کیس میں بھر کر یہاں سے لے گیا تھا۔“

کی انگلیاں توڑوں گا۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے ہوئے کہا۔ اس نے پستول چھوڑنے کی بجائے ٹریگر دبا دیا تھا۔ دھماکا ہوتے ہی وسیم جیسے پاگل ہو گیا۔ وہ اس کے ہاتھ پر داپنا پاؤں پہلے ہی رکھے ہوئے تھا۔ اب وہ بائیں پاؤں کو مستثنیٰ انداز میں اس ہاتھ پر مارنے لگا بھاری بوٹ کی ضرب نے ہاتھ کو تقریباً ناکارہ کر دیا۔

”جلدی زبان کھول ورنہ اب میں انگلیاں توڑنے ہی والا ہوں۔“ کہہ کر اس نے ایڑی اٹھا کر سارا زور پٹخے پر ڈالا۔ بوٹ کی ٹونے انگلی کا بھرتا بنانے میں کسر نہ چھوڑی تھی۔ ریاست خان کا چہرہ تکلیف کی شدت سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس کے ناخنوں سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

”ریاست خان اب بھی وقت ہے زبان کھول دو۔ تم کس سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ وہ کون ہے جو آرہا ہے۔ اگر سچ بول دو گے تو میں وعدہ کرتا ہوں جان بخش دوں گا ورنہ ایک ایک کر کے میں تمہاری تمام انگلیاں توڑنے کا حتمی حکم دے دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”یقین کرو کون آرہا ہے مجھے خود پتا نہیں ہے۔ بس مجھے حکم ملا ہے کہ اس علاقے میں پہنچوں اور ان سے ملوں۔ وہ جیسا کہیں اسی مطابق کام کروں۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔

”جھمپیں یہ حکم کس نے دیا ہے؟“ وسیم نے ایک بار پھر اپنے پاؤں پر زور ڈالا۔

”میں نے اسے دیکھا نہیں ہے۔“
”اس سے کبھی ملے نہیں؟“

”نہیں۔ اس سے میرا رابطہ فون پر ہوتا ہے۔ اس کا فون نمبر مجھے سرکار کے ایک مرید نے دیا تھا۔“
”یہ سرکار کون ہے؟“

”مرشد سائیں.... حضرت مرشد علی سائیں سرکار۔“ اس کا اتنا کہنا تھا کہ وسیم نے کہا ”شکر الحمد للہ... ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم.. ہمیں ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ مرشد نے خود ہی رسی دراز کر دی کہ اسے پکڑ کر چلے آؤ۔“

”بکو اس بند کرو۔“ میں نے وسیم کو خاموش کیا پھر ریاست خان سے بولا ”تم مرشد کو کب سے جانتے ہو؟“
”بہت پہلے سے۔ کئی سال قبل میرے جگری یار فتح خان سے سائیں نے کوئی کام لیا تھا۔ اس سلسلہ میں ملنے میں بھی سائیں سرکار کے پاس آیا تھا اور میری دنیا بدل گئی۔“

”اچھا یہ بتاؤ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔ چینی پاکستانی یا امریکی؟“

انگریز ہے؟“

کہ اسے استعمال کیا گیا ہے ورنہ یہ آدی غدار وطن نہیں ہے۔ میں نے گرم لوہے پر چوٹ ماری ”لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ وطن سے غداری ہے۔ تمہیں نہیں پتا کہ جس سے تم ملنے آئے ہو وہ ہمارے ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے سازش رچ رہا ہے اور اس کام میں تم ان کے مددگار بن گئے ہو۔“

میری بات پر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ”جی نہیں ہم وطن کے خلاف ہونے والا کسی سازش کا شکار بن نہیں سکتا۔“

”مجھے یقین ہے تم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے لیکن انجانے میں کچھ لوگ آلٹا کار بن جاتے ہیں۔ جیسے تم بن گئے ہو۔“

”اگر یہ بات ثابت ہو گیا تو ہم اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرے گا۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اس لیے تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ آنے والے کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم اس کی اصلیت جان چکے ہو۔ اس سے حقیقت اگلوانے کی کوشش کرو کہ وہ چاہتا گیا ہے۔ پھر ہم کوئی لائحہ عمل تیار کریں گے۔“ میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”آپ کو یقین ہے یہ سچ بول رہا ہے؟“ سفیر نے انگلیں پوچھا۔ اس کا انداز استہیناس تھا کہ اگر ریاست خان انگلیں جانتا بھی ہو تو مفہوم آسانی سے سمجھ نہ آئے۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے اسی لہجے میں کہا:

”انسان کتنا ہی بڑا شاطر کیوں نہ ہو مگر اس کی آنکھیں سچ بولتی ہیں۔ میں پوری گفتگو کے درمیان اس کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات ہی دیکھتا رہا۔ وہ سو فیصد سچ بول رہا ہے۔ باتوں سے تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ یہ مذہب پرست ہے۔ انتہائی معصوم۔ ایسے لوگ مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے بے وقوف بنا دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ یہ مرشد کی وجہ سے بے وقوف بن گیا ہے۔“

”کیا یہ اب ہمارا ساتھ دے گا؟“

”ایسے لوگ وطن کے لیے جذباتی ہوتے ہیں۔ بھول گئے۔ 1947 میں یہ پختون ہی تھے جو ایک آواز پر کشمیر کے برادران ایمانی کو ڈوگر ظلم سے آزاد کرانے کے لیے خود ہی اپنے علاقوں سے نکل کر کشمیر پہنچ کر سری نگر تک گھس گئے تھے۔ ان غیور بہادروں کے بارے میں میرا خیال غلط نہیں ہو سکتا۔ اب یہ اپنے ہاتھوں سے اس بندے کو شوٹ کرے

”شکل تو بالکل پاکستانوں جیسی ہے لیکن اردو بہت خراب ہے۔ شین نہیں بولتا اور نہ قاف یا نئے بول سکتا ہے۔“ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ انڈین ہے اس لیے کہ انڈین قاف اور خ بول نہیں پاتے۔ خبر کو کھم کہیں گے۔ لگتا ہے خانقاہ کی بربادی کے بعد مرشد مزید نیچے گر گیا ہے۔ انڈین مذہبی رہنماؤں کی تاک میں رہتے ہیں تاکہ ان کو استعمال کر سکیں۔ اسی لیے ان کے ایجنٹ ایسے لوگوں سے دوستی بڑھا کر اپنا کام نکالتے ہیں گویا وہ انڈین کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا ہے اور یہ بات میرے لیے قابل نفرت تھی۔ میں اسے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کر سکتا۔ ملک دشمنوں کو معاف کرنا میری سرشت میں شامل ہی نہیں۔ اب میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔ میں اپنی سوچ میں غلطاں تھا کہ وسیم کی آواز سماعت سے ٹکرائی:

”یاد رکھنا اگر ایک بات بھی غلط ثابت ہوئی تو اپنی تمام انگلیوں سے ہاتھ دھو لو گے۔“ وسیم کی آواز میں ایسی سفاکیت تھی کہ سننے والے کے جسم میں سرد لہر دوڑ جائے۔

”میں جھوٹ نہیں بولتا ماں کی قسم۔“ پختون کتنا بھی غلط کام کر لے لیکن ماں کی قسم نہیں کھاتا۔ وہ واقعی سچ بول رہا تھا اس کا مجھے یقین آ گیا تھا اس لیے میں نے کہا ”وسیم اسے چھوڑ دو۔“

وسیم نے اس کے ہاتھ پر سے پیر اٹھالیا۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس کے چہرے سے کرب کے آثار مٹ گئے۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے زخمی ہاتھ کو اٹھایا اور بغور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ تب میں نے سفیر سے کہا ”اپنے بیگ کو ٹولو اگر فرسٹ ایڈ کا سامان ہے تو اس کی مرجم پٹی کر دو۔“

ریاست خان نے ترحم نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ سفیر نے بیگ سے فرسٹ ایڈ کٹ نکالی اور اس کے ہاتھ پر دوا لگا کر پٹی باندھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے لیکن سوچ کر دیکھو۔ وطن ہماری ماں ہے۔ اس ماں کی عزت سے کوئی کھیلے تو کیا تم برداشت کر لو گے؟“

اس نے نظر اٹھا کر کہا ”میرا وطن میری جان ہے۔ ہم چور ہے بد معاش ہے۔ غلط کام بھی کرتا ہے لیکن بھی وطن دشمنی نہیں کر سکتا۔“

ریاست خان کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا

گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

طرف بڑھا دیا۔“ اسے اپنے اوپر والی جیب میں رکھو۔ ہم سے رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم صرف تمہاری باتیں سنیں گے۔ اس لیے اسے نکالنے کی بھی ضرورت نہیں۔“

ریاست خان اپنا زخمی ہاتھ سنبھالے ہوئے کسی سوچ میں گم تھا۔ اس کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بریلے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اندھیرا پھیل گیا تھا۔ سرد ہوا میں مزاج پوچھنے لگی تھی۔ میں نے اتاری ہوئی جیکٹ کو دوبارہ سے پہن لیا۔ زپ لگا رہا تھا کہ ریاست خان نے کہا ”وہ آگیا؟“

ریاست خان نے اسے قیص کے گریبان میں رکھا اور پھر بولا ”اس طرح کوئی دیکھ بھی نہیں پائے گا اور رابطہ بھی رہے گا۔“

”اس اندھیرے میں بریلے میدان کو پار کر کے وہ آ رہا ہے۔ تعجب کی بات ہے۔“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”گزشتہ بار بھی وہ رات کے وقت آیا تھا۔ یہ بات یاد آیا تو میں کھڑکی پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور واقعی وہ آ گیا۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔ وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھی جیدے نے ٹارچ ساتھ لے لی تھی جسے وہ جلا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ شاید یہ بھی اسے انٹریکشن دیا گیا تھا۔ وہ دونوں آگے بڑھتے چلے گئے۔

ٹارچ سے اشارہ کر رہا ہے۔“ ریاست خان کے کہنے پر میں نے اندھیر دیکھا۔ سامنے بریلے میدان میں بار بار ٹارچ جل بچھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا:

ان کے جانے کے بعد میں نے سفیر سے کہا کہ وہ وسم اور عبداللہ سے کنکٹ کر دے۔ وسم پہلے ہی کنکٹ ہو چکا تھا۔ اس نے ریسور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے کان میں لگا لیا۔ سفیر نے بھی عبداللہ والا سیٹ لے لیا۔

”اس اشارے کا جواب کیسے دو گے؟“

”سفیر اور ہم ان کی طرف جا رہے ہیں۔“ کہہ کر میں نے سفیر کو مخاطب کیا ”جھک کر آگے بڑھنا ہے۔ جب فاصلہ بہت کم رہ جائے تو لیٹ کر کرو لنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔“

”اسی طرح ٹارچ کے ذریعہ۔“ اس نے جواب دیا۔

”او کے بوس۔“ سفیر نے ہنس کر کہا اور باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ہم دونوں آگے پیچھے باہر نکلے اور جھک کر چلنے لگے۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ دور سے اگر کوئی دیکھے بھی تو جانور سمجھ کر نظر انداز کر دے۔ میرا پورا دھیان کان میں لگے مائیک پر تھا۔ اب تک صرف سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی جو اس بات کی تشریح تھی کہ وہ دونوں ابھی آنے والے سے دور ہیں۔ باتیں ہوئیں تو آواز آتی تا۔

”تو پھر اشارہ دو۔“ میرے کہنے پر اس نے کمرے کے ریک پر رکھے ٹارچ کو بائیں ہاتھ سے اٹھایا اور کھڑکی پر آ کر جلانے بجانے لگا۔ ادھر سے تین بار ایک ساتھ جلایا بچھایا گیا اور پھر ٹارچ بند ہو گئی۔

”وہ مجھے بلارہا ہے۔“ ریاست خان نے کہا۔

”چلے جاؤ مگر احتیاط سے۔ ہم تمہارے قریب ہی ہوں گے مگر کچھ دیر سے نکلیں گے اور ضرورت پڑی تو مدد بھی کریں گے۔“ میرا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ وہ بولا:

”ہم آگے بڑھتے ہوئے اب اس مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی اور پھر بریلے میدان تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہڈی میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیکٹ بھی اس سرد لہر کو روکنے میں ناکام تھی، سینے کے سامنے کا حصہ پوری طرح بھیگ چکا تھا اور برف کی ٹھنڈک سینے کو چسید رہی تھی۔ سامنے سے اڑ کر آتے برف کے ذرات سینے پر جمع ہو رہے تھے اور اس کی ٹھنڈک اندر تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن ہم نہ سیدھے ہو سکتے تھے اور نہ رک سکتے تھے۔ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ابھی ہم نے دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ کانوں میں آواز گونجی:

”واقعی یہ بات اہم ہے۔“ میں نے کہا پھر سفیر کی طرف مڑ کر بولا ”راجا صاحب بغیر تیاری کے تم لوگوں کو لے کر نکلے نہیں ہوں گے۔ یقیناً تمہارے پاس واکی ٹاکی ہو گی؟“

”آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ابھی ہم نے دو تین قدم ہی بڑھائے تھے کہ کانوں میں آواز گونجی:

”واقعی یہ بات اہم ہے۔“ میں نے کہا پھر سفیر کی طرف مڑ کر بولا ”راجا صاحب بغیر تیاری کے تم لوگوں کو لے کر نکلے نہیں ہوں گے۔ یقیناً تمہارے پاس واکی ٹاکی ہو گی؟“

نہیں جاسکے گا۔ اس کے پلان کو ناکام بھی کرنا تھا اور اسے انجام تک پہنچانا بھی تھا۔ اس نے میرے وطن کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے اسے سبق دینا ضروری تھا۔ میں نے سرکنے کی رفتار بڑھا دی تھی۔ سانپ کی طرح تیزی سے آگے کی سمت بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میری تیز رفتاری کا مقابلہ سفیر بھی کرنے سکا تھا اس لیے ابھی وہ کافی پیچھے تھا۔ وہ اپنے سامھی کے ساتھ واپس مڑا تھا کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجھے کھڑے ہوتے ہوئے وہ دیکھ نہ سکا لیکن جب میں دوڑا تو وہ سرعت سے پلٹا تھا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اسے بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا اسی لیے وہ دوڑا تھا لیکن میرے ساتھ میرا جذبہ بھی تھا اس لیے وہ ناکام رہا۔ میں نے ہوا میں اچھل کر سر سے اس کی پیٹھ پر لکر ماری تھی۔ وہ لکر لکتے ہی گرا تھا کہ میں اس پر سوار ہو گیا۔ اب وہ نیچے اور میں اوپر تھا۔ میں نے اس کی گردن پکڑنے کی کوشش تھی کہ وہ بام پھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اٹھ کر کھڑا بھی ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی جیکٹ پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ اپنے جیکٹ کو چھڑانے کے لیے جھٹکا مارنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے سامنے کی جانب کھینچ لیا۔ اس کا سر آگے میرے سینے سے لکرایا تھا کہ میں نے گھٹنے سے اس کی ٹانگوں کے بیچ ضرب لگائی۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا دوہرا ہو گیا۔

اس کا سامھی بھاگنے کی کوشش کرتا کہ اس پر سفیر آ پڑا۔ وہ دونوں بھی کھم کھم ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے مد مقابل کی ناک پر سر سے لکر ماری اور ساتھ ہی ساتھ اپنا پسندیدہ داؤ چلا دیا۔ جو ڈوکا یہ داؤ خطرناک تو تھا ہی لیکن اگر مد مقابل بھی اس داؤ کو جانتا ہو اس کے توڑ میں وہی جانب جھک جائے تو داؤ چلانے والے کے لیے مشکل پڑ جاتی ہے۔ لیکن یہ وقت ان باتوں پر غور کرنے کا نہ تھا۔ میں نے اسے کمر پر لا کر زمین پر دے پٹا تھا۔ اس دھوبی پاٹ نے رہی صحیح کسر نکال دی۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کے منہ پر لکر ماری۔ وہ سنبھلا کہ اوپر سے میں نے ایک اور بوٹ کی ٹھوک ماری اور پھر مارتا چلا گیا۔ پتا نہیں وہ کیسا اجبٹ تھا جسے اپنے بچاؤ کا بھی علم نہ تھا اور پٹنا چلا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے سر گرا دیا، اسے بے ہوش دیکھ کر میں نے خود کو روک لیا۔ لیکن سفیر اپنے شکار کی مسلسل پیٹائی کیے جا رہا تھا۔ اس نے شکار کی بری حالت کر دی تھی۔ کہیں وہ مرنے جائے اس ڈر سے میں نے کہا ”سفیر اب بس کر دو۔“

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیٹھ پر گرز بڑا ہو۔ میں جھٹکا چلا گیا۔ اسی وقت میری کمر پر بوٹ کی ٹھوک لگی اور میں آگے کی سمت اونڈھے منہ گرا تھا لیکن میں گرتے ہی آگے کی سمت پھسلتا چلا گیا تھا۔ برف کی وجہ سے یہ کام آسان ہوا تھا کیونکہ میں نے خود آگے کی سمت جھکوا لیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرے بے در پے وار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے دھوکا دینے کے لیے بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی اور میں اس کے جھانے میں آ گیا جس کی وجہ سے میرے پٹنے کی باری آگئی مگر میں حلوا نہیں تھا کہ کوئی بھی کھالے۔ اسی وقت میں نے آگے پھسل کر خود کو سنبھالا اور جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ کھڑے ہوتے ہی ایک اور جست بھری۔ اس جست نے اس سے دور کر دیا۔ اب میں کھڑا ہو چکا تھا۔ پوری طرح سنبھل چکا تھا کہ اس نے فلائنگ گگ چلائی۔ اس کا نشانہ میرا سینا تھا۔ میں پیٹھ گیا۔ اس کی لات میرے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے جھکی ہوئی حالت میں ہی فیٹ چلا یا تھا جو سپدھا اس کے پیٹ میں لگا۔ اس کی گراہ سنتے ہی میں نے پھرتی سے پیراؤ پر کی سمت گھمائی تھی جو نشانے پر لگی۔ شاید اس نے مجھے عام سا فائٹر سمجھا تھا۔ میں جس طرح برف پر قدم جمائے ہوئے اسے ٹھوکروں سے اڑا رہا تھا یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی اسی لیے وہ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا مگر سنبھلنے سے پہلے ہی اس پر میری ٹھوک پڑ جاتی۔ اگر وہ اسی طرح بے ہوش بنا پڑا رہتا تو شاید اس کی بچت ہو جاتی مگر اس نے اٹھ کر غلطی کی تھی۔ یہی نہیں اس نے دوسری غلطی یہ کی تھی کہ اس نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ اب یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلسل پٹ رہا تھا۔ اگر وہ ایسی غلطی نہ کرتا تو شاید اس کی حالت یہ نہ ہوتی جو اب ہو رہی تھی اندھیرا تھا پھر بھی مجھے یقین تھا کہ اس کے سامنے کے ایک بھی دانت سلامت نہیں ہوں گے کیونکہ میرے پیروں میں برف پر چلنے والے بوٹ تھے جس کے تلے میں اور ٹو میں لوہے کی کیلیں تھیں تاکہ برف پر قدم جم سکے۔ اس بھاری بوٹ کی ٹھوک نے اس کے منہ کا بھرتا بنا دیا ہوگا۔ آخری پار میں نے وہی ایڑی پر زور ڈال کر بائیں پیر کو اٹھا کر پوری قوت سے چکر پھیری کھائی تھی۔ میری گھومتی ہوئی لات اس کی وہی پسلی پر پڑی تھی اور وہ برف کی وجہ سے پھسل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اچھال بھری تھی اور اس کے جسم پر کودا تھا۔ یہ وار اس کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوا اور اس کی چیخ دور تک گونجی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے میں پوری طرح دیکھ نہیں پایا کہ اس کی حالت کیا ہے۔ میں نے ا

ریاست خان کو آواز دی۔ "نارج جلاؤ۔"

کرنے آیا تھا۔"

"سرکار ہماری ڈیوٹی سنگھ صاحب کے ساتھ لگائی تھی۔ ہم کو ان کی سہا ہتا کرنا تھا۔"

"لجھاوہ سنگھ تھا۔ اس کا پورا نام کیا تھا؟"

"اٹھیلیشو ر سنگھ نام تھا ان کا۔ بہت بہادر مہنتی تھے۔ ہمیشہ بچے ہوتے رہے ہیں۔ پتا نہیں کیسے وہ آپ سے مار کھا گئے۔"

"تمہارے بوس کا نام کیا ہے؟" سفیر نے پوچھا۔

"جی ہم نہیں جانتے سنگھ صاحب ہمیں حکم لا کر دیتے ہیں۔"

"ابے تم سب نام تو خوب رکھتے ہو۔ سنگھ یعنی شیر اور دل چو ہے جیسا، ہماری قوم کا معمولی آدمی بھی کبھی ایسے روتا نہیں ہے۔"

"ہم کو پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کا آئی ایس آئی جس کو پکڑ لیتا ہے اس کا بھرتا بنانا ہے۔"

"فکر نہ کرو ہم تمہارا بھرتا نہیں بنائیں گے اگر تم نے صحیح جواب نہیں دیا تو چھٹی ضرور بنائیں گے۔" وسیم نے پاس ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہ سرکار نہ۔ ہم پر دیا کرو ہمارے بچے جندگی بھر تم کو دعا دیں گے۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم لوگوں کا پروگرام کیا تھا؟"

"سرکار ہم کو پوری بات معلوم نہیں صرف اتنا جانے ہیں کہ یہاں ٹائم بم فیٹ کرنا ہے تاکہ بسفوت ہو اور برف کا سیلاب پورے علاقے کو تباہ کر دے۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔ "اور راستہ بن جائے۔"

"یہ علاقہ کون سا ہے؟" روانی میں نے ایک احمقانہ سوال کر دیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شک میں پڑ گیا ہے کہ میں آئی ایس آئی کا ہو کر بھی علاقہ نہیں پہنچا سکتا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا اب! ات سنبھالنا ضروری تھا۔ میں نے جلدی سے کہا:

"میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو تاکہ تمہیں جانچ سکوں۔"

"او اچھا اچھا.... یہ بلتر گلیمشر کا علاقہ ہے.... آگے ہو پر ہے۔"

"اچھا... تو تم اس پورے علاقے کو جانتے ہو پھر کہتے ہو کہ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔"

"سر بات یہ ہے کہ میں کسی ایسے کام کے لیے پہلی بار اتنا ادھر آیا ہوں ورنہ گلیمشر سے نزدیک بھی ایک چھوٹی سی

اب تک وہ خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا۔ میری آواز پر وہ ایسے چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو۔ اس نے پھرتی سے نارج روشن کر دی۔ نارج کی روشنی اس پر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ دشمن وطن کا سر ڈھلکا ہوا تھا اور منہ سے خون جاری تھا۔ برف پر دور تک پھیل رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر کو ہلایا لیکن اس کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی تو میں نے اس کی ناک پر انگلی لگا کر سانس کی آمد و رفت محسوس کرنے کی کوشش کی پھر دل کی دھڑکن محسوس کی لیکن تمام علامات نفی کر رہے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر سفیر سے کہا "یہ تو کیا کام ہے۔"

"خس کم جہاں پاک.... اچھا ہوا ایک دشمن تو کم ہوا۔" پھر اس نے اپنے شکار کو ٹھوکر مار کر کہا "اس کا انجام دیکھ لیا تا اب تیری پارٹی ہے۔"

"ہم آپ کے پیر پڑتے ہیں ہمیں جانیں دیں۔"

"ضرور جانے دیں گے لیکن پہلے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"یہاں نہیں اسے کھینچ کر اپنے جھونپڑی نما ہیڈ کوارٹر لے چلو وہاں عبداللہ زیادہ آسانی سے معلومات اگلو لے گا۔" میں نے کہا تو ریاست اور جیدے نے پھرتی دکھائی اور اسے ڈنڈا ڈولی کے انداز میں اٹھایا اور پھر ہم سب واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اس بار راستہ تیزی سے طے ہوا اور ہم سب جلد اپنے مرکز پر پہنچ گئے۔ عبداللہ نے قیدی کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ہم اسے کیوں لے کر آئے ہیں۔ اس نے ریاست خان سے کہا "اسے وہاں لٹا دو اور میرے بیک سے پاس نکال کر لاؤ تاکہ میں اس کے ایک ایک دانت نکال کر دیکھوں۔ کہیں کسی طرف جھوٹ تو چھپا نہیں رہ گیا ہے۔" اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ اچھے اچھے کی ہوا سرد ہو جائے۔ وہ جلا دکی نظر سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ سفیر کی مارنے سے پہلے ہی ادھ موا کر دیا تھا رہی سہی کس اس کے ساتھی کی موت نے پوری کر دی تھی۔ اب جو اس نے سنا کہ عبداللہ اس کے دانت نکالے گا۔ وہ باضابطہ رونے لگا۔ وہ کسی بیوہ عورت کی طرح بین کر رہا تھا۔ "میرے چھوٹے چھوٹے تین بچے ہیں۔ بوڑھی ماں ہے، مجھے جانیں دیں اب ہم کبھی پاکستان نہیں آئے گا۔"

"ابے چپ ورنہ تیری بوڑھی ماں پر بھی ہمیں رحم نہیں آئے گا۔" وسیم نے جھلا کر کہا "پہلے یہ بتا کہ تو یہاں کیا

بستی ہے جہاں گاہک بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔ وہاں میں کئی بار آچکا ہوں۔“

”سامان خریدتے خریدتے پورے علاقے کو تباہ کرنے پر اتر آئے۔“ میں نے غصیلے لہجے میں جواب دیا کیونکہ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ کوئی معمولی بات نہ تھی میں اہل کر رہ گیا تھا۔ شاید یہ اس صدی کی سب سے بڑی تخریب کاری ہوئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے بروقت مجھے بھیج دیا اور میں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ گوکہ یہ اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے والی بات تھی لیکن کام تو ہو گیا۔ میں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے کہا ”اس تخریب کاری کا پروگرام کس نے بنایا تھا؟ ایک ایک کا نام بتا؟“

”مجھے آج صبح ہی حکم دیا گیا شاید اوپر سے آرڈر آیا ہو۔ مجھے زیادہ معلوم نہیں۔ ہم پر کرپا کر دیں جیون بھردعا دوں گا۔“ اس نے گڑگڑاتے ہوئے میرے پیر پکڑ لیے۔

”تجھے چھوڑ دوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔ لیکن تجھے ایک کام کرنا ہوگا؟“

”جی بولیں...“ وہ اسی طرح روئے جا رہا تھا۔

”جتنے بھی ٹائم بم ہیں ان کو تم واپس لے جاؤ گے اور اپنے علاقہ میں جا کر فٹ کر دو گے۔“

”جی کر دوں گا۔“ اس نے نہایت آسانی سے وعدہ کر لیا۔

”اور اگر نہیں کیا تو؟“

”آپ خود سوچیں... کوئی آئی ایس آئی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ آئی ایس آئی والوں کی مدد کرنے کے لیے مسلمان پیر فقیر جا پ کرتے رہتے ہیں۔“

اس بے وقوف کی باتیں سن کر مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن میں خاموش رہا۔ یہ تو کمال ہے کہ ہمارے سرفروشوں کے ڈر سے دشمن کا پتا پانی ہے اور وہ اپنے تئیں کہانیاں بنا بنا کر خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا ”یہ تم سے کس نے کہا کہ پیر فقیر چلہ کرتے ہیں؟“

”ہمارے ایک جنرل صاحب تھے۔ وہ 1965ء کی جنگ میں شریک تھے۔ وہ اخبار میں لکھے تھے کہ ہم گولہ باری کرتے اور کچھ لوگ سبز کپڑے والے ہوا میں اڑتے ہوئے آتے اور گولہ لے کر اڑ جاتے۔ سب کا کہنا ہے کہ پاکستانی جا پ بہت کرتے ہیں اس لیے بھگوان کے دوت ان کی مدد کرتے ہیں۔“

”اچھا اچھا... یہ بات یاد رہے کہ اگر تم نے میرے کہے پر عمل نہیں کیا تو میں تمہارے گھر کے ہر آدمی کے لیے

سوشل عمل کروں گا اور کوئی بھی نہیں بچے گا۔ اس لیے جو بیک تم لے کر آئے ہو اسے اٹھا کر لے جاؤ اور اپنے علاقے میں اسے لے جا کر فیکس کر دو۔“

”جی میں ایسا ہی کروں گا۔ بس آپ مجھے چھوڑ دیں۔“ اس کے بین سن کر مجھے غصہ بھی آرہا تھا اور حیران بھی تھا کہ انڈین لوگ ایسے بزدل ہوتے ہیں۔ میں نے کہا۔

”اب ایسا کرو کہ سو جاؤ صبح بیک لے کر نکل جانا۔“

”نہیں حکم... اگر میں صبح گیا تو کام نہیں ہو پائے گا۔ سب جاگ رہے ہوں گے۔ رات کے اندھیرے میں کوئی دیکھ نہیں پائے گا کہ میں بیک لے کر واپس آ گیا ہوں۔“

پتا نہیں وہ رہائی کے لیے جلدی کر رہا تھا کہ وعدہ نبھانے کی جلدی تھی اس کی بے تابی دیکھ کر میں نے کہا ”ٹھیک ہے تمہیں میں چھوڑ دے رہا ہوں لیکن یاد رکھنا جو وعدہ کر کے جا رہے ہو اسے پورا کرنا ہے۔“

”میں بھگوان کی سوگند کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔“

”کیوں، ریٹائرمنٹ کیوں لو گے؟“

”اس لیے کہ میں ماتری بھومی کو پیار کرتا ہوں۔ اس سے غداری کروں گا تو اس کا پراپتیت تو ہونا چاہیے نا۔“

اس کی باتیں بھی عجیب تھیں مجھے کیا لینا دینا تھا میں نے اس سے کہا ”جو کچھ کرنا ہے کرتے رہنا لیکن مجھ سے جو کہا ہے اسے پورا ضرور کرنا ورنہ گھر میں گھس کے ماروں گا۔ یہ فلمی ڈانکوں نہیں ہے۔ جیسے کھیم کرن میں گھس کر مارا تھا ویسے ہی وہی میں گھس کر ماروں گا۔“

”مجھے یقین ہے آپ ایسا ہی کریں گے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ میں وعدہ نبھاؤں گا۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں سے بارڈر کتنی دور ہے؟“

”بارڈر تو بہت دور ہے اگر پیدل چلا جائے تو ایک دن لگ جاتا ہے لیکن یہاں سے ایک ایسا گاؤں ہے جہاں ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔ پہلے ہم راجستھان سے آتے جاتے تھے اب ہم ادھر سے راستہ بنا رہے ہیں کیونکہ ادھر چائنا بھی نزدیک ہے اور خطرہ بھی کم ہے چائنا کا مال آسانی سے لا کر بھلی کا پٹر سے لے جا سکیں گے۔ راستہ بن جائے تو اور آسانی ہو جائے گی۔ یہاں سسٹل جاتا ہے اس لیے ہم مہینے میں ایک بار آدھا راستہ بھلی کا پٹر پر اور باقی راستہ برف گاڑی پر پھر پیدل چل کر آتے ہیں۔ ہم میٹ لینے ہی آئے تھے کہ پیچھے سے اکھلیشور سٹک آ گیا۔ اس نے

اور وسیم بھی اٹھ چکے تھے۔ ان کی باتوں نے ہی مجھے بیدار کیا تھا۔ عبداللہ بھی کپڑے تبدیل کر کے کھڑا تھا اور وسیم سے کسی بات پر بحث کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا ”کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ کیا۔ بس نکل چلتے ہیں۔ پتا نہیں کون کون کس کس کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اب تو ایک ایک پل گزارنا سفیر کے لیے مشکل ہو رہا ہے۔“ وسیم نے کہا تو سفیر غرا کر پلٹا: ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ سادی کی یاد دہلا رہی ہے کہ جاتے ساتھ وہ مزاج برسی کرے گی۔“

”خدا کا خوف کھاؤ۔“ وسیم چکا ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ مونا کا خوف سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ جاتے ہی وہ پوچھے گی۔ کر آئے آوارہ گردی۔“

”اور تب میں مونا باجی سے کہوں گا کہ آپ انہیں کچھ نہ کہیں، یہ تو سویرا بھابی کی دعا کو اثر دینے گئے ہوئے تھے۔ تا کہ جلد سے جلد ملاپ کا منظر سب دیکھ سکیں۔ ہجر کی غزودہ شب کو سحر نصیب ہو اور وصال کا موسم قریب آجائے۔“ عبداللہ نے ہستے ہوئے کہا۔

”یہ تو سو فیصد صحیح ہے کہ شہباز کا نام آتے ہی سب عورتوں کا غصہ کا فور ہو جائے گا۔ سوائے مونا کے۔“ سفیر نے کہا ”اس لیے کہ مونا بڑی شدد سے کہہ رہی ہے کہ کسی بھی طرح شہباز کو دہنی لے کر چلو۔ وہ جب تک پاکستان میں رہیں گے سب پھر کی بنے گھومتے رہیں گے۔“ سفیر نے بیگ کندھے سے لٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

”اللہ کے بندوں بھوکے پیٹ کیسے پیدل چلو گے۔ کچھ کھانے پینے کا سامان ہو جاتا تو اچھا تھا۔“ میں نے کہا۔

”حضور کے گوش گزار کردوں کہ صرف چاول بڑے ہیں۔ ان کو پکاتا تو کھاتا کون اس لیے سوچا ہے کہ اب نکل لیا جائے تاکہ جلد از جلد کسی آبادی تک پہنچا جاسکے۔“ سفیر نے کہا۔

”آبادی ہے کتنی دور اس کا پتا نہ تمہیں ہے اور نہ مجھے۔ اور اس آبادی کا بھی حال یہی نکلا تو؟“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”یہ علاقہ گلیدشت سے متصل ہے اس لیے لوگ گاؤں خالی کر گئے ہیں لیکن نچلے حصے کے لوگ اس خطرے سے مبرا ہوں گے اس لیے قوی امید ہے کہ وہاں کھانے پینے کا سامان وافر مل جائے گا۔“

”اور اگر نہیں ملا تو؟“

کہا کہ اسے کوئی سامان کسی کو دینا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی ہم غریب لوگوں کو کچھ نہ کچھ دے کر چھوٹا موٹا کام کراتے رہے ہیں اس لیے میں راضی ہو گیا۔“

”تم نے ابھی کہا تھا کہ رات میں حکم آیا تھا۔“

”ہم جب ادھر آتے ہیں تو وائز لیس پر یوس سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اکھلیشو رسنگھ کے آتے ہی ہمارے یوس کا بھی حکم آ گیا۔“

میں نے وسیم کی طرف مڑ کر کہا ”اس کی مریم پٹی کر دینا۔“

”نہیں نہیں... اگر مریم پٹی کر کر گیا تو میرے لوگوں کو شک ہو جائے گا۔ بس مجھے ایسے ہی جانیں دیں۔“ وہ گڑگڑایا۔

”ٹھیک ہے جاسکتے ہو۔“ میں نے کہا اور اپنے بیگ کی طرف جھک گیا۔ میں اس میں ڈیکلا فون دیکھ رہا تھا لیکن ملا نہیں اتنے میں اس کی آواز سنائی دی ”میں جاؤں؟“

”ہاں جاؤ۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اصل میں اب وہ میرے کسی کام کا نہیں تھا جو پوچھنا تھا پوچھ لیا تھا۔ اب اسے رکھنا بیکار تھا پھر مجھے کوفت بھی ہو رہی تھی کہ ڈیکلا فون آتے وقت رکھا تھا لیکن اس وقت ملا نہیں اگر مل جاتا تو میں اس کے لباس میں چھپا دیتا۔ وہاں جتنی باتیں ہوتی وہ میں بہ آسانی سن لیتا مگر اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے کہ وہ ننھا سا فون ملا نہیں اور قیدی بھی جا چکا تھا، میں نے زب بند کی اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہ ایک نقطہ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ جو وعدہ کر کے گیا ہے وہ پورا کرے گا مگر بارود تو ہمارے یہاں سے چلا گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ شہر پہنچ کر کسی طرح یہ خیر فوج تک پہنچا دوں گا کہ دشمن اب ایسی سازش کرنے پر اتر آیا ہے جو عام نظر میں قدرتی آفت لگے۔ اب تک وہ دریاؤں میں پانی چھوڑ کر سیلابی ریلے کی صورت میں تباہی پھیلا رہا ہے اب اس نے یہ راہ اختیار کی ہے۔ اس پر نظر رکھی جائے۔

”بھائی میاں اب سو بھی جاؤ۔ ہمیں صبح ہی یہاں سے نکلنا ہے۔“ سفیر نے آواز دی تو میں ہوش کی دنیا میں آ گیا۔ اور بستر کی طرف بڑھ گیا۔ تھکن اور پھر اطمینان، اس لیے لیٹتے ہی نیند کی رانی نے ہاتھوں میں بھر لیا اور میں بے خبر ہو گیا۔

کتنی دیر سو یا اس کی خبر نہیں۔ جاگا تو رات نے صبح کا چولہ اوڑھ لیا تھا۔ باہر سورج اپنی تابناکی پھیلا رہا تھا۔ سفیر

”ہم پانی پی کر گزارا کر لیں گے۔“ اس نے ہنس کر کہا اور قدم بڑھا دیئے۔

ریاست خان جیدے اللہ ڈینو اور اس کا چوتھا ساتھی صغیر بھی ساتھ تھا۔ وہ سب ایک رات میں ہمارے معتقد ہو گئے تھے۔ انہوں نے وعدہ کر لیا تھا کہ اب وہ غلط کام کبھی نہیں کریں گے کیونکہ غلط کام کرنے والے ہی ملک دشمن قوتوں کے شکار بنتے ہیں۔ ریاست خان فطرتاً شریف آدمی تھا۔ وہ کسی مجبوری میں ہی غلط لوگوں کے ساتھ شامل ہوا ہوگا اسی لیے اتنی جلدی مان گیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی خوف سے یا عقیدت سے ہماری تعظیم کر رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

ہم نے صبح کے وقت سفر شروع کیا تھا اور اس وقت سورج سر پر پہنچ گیا تھا لیکن کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آیا تھا۔ ہر طرف پتھریلی چٹانیں اور بے آب و گیا میدان مل رہے تھے۔ سورج کی گرمی دباغ کو پھلار رہی تھی۔ پیاس کی شدت اب پریشان کرنے لگی تھی۔ گو کہ صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں تھا لیکن پانی کی طلب زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ ہم رک بھی نہیں سکتے تھے کہ کہیں بیٹھ جاتے اور کوئی ایک جا کر پانی کی تلاش کرتا۔ ریاست خان کے لیے یہ علاقہ نیا نہیں تھا۔ وہ برابر آتا جاتا رہا تھا اس لیے وہ جدھر کہتا ہم ادھر مڑ جاتے تھے۔

”اب اور کتنا چلنا پڑے گا؟“ عبداللہ کی کراہتی آواز ابھری۔

”مرکیوں رہے ہو۔ انشا اللہ ہم موت کو پیچھے دھکیلنا جانتے ہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا تو ہم شادی کس کی کرائیں گے؟“ وسیم نے اس کی پیٹھ پر دھب جما کر کہا۔

”اگر اب ہاتھ چلایا تو میں جواب میں کرائے کا ہاتھ چلا دوں گا۔ مجھے کیا کمزور سمجھ رکھا ہے؟“ اس بار عبداللہ کی آواز زندگی سے بھر پور تھی میں سمجھ گیا کہ وہ ڈراما کر رہا تھا۔

”فضول کی بک بک سے انرجی برباد ہوتی ہے۔ انرجی بچاؤ، اپنے لیے قوم کے لیے۔“ سفیر نے اونچی آواز میں کہا۔ اور اپنے قدم مزید تیز کر دیئے۔

”واقعی یہ راستہ تو شیطان کی آنت بن گیا ہے۔ ختم ہو کر نہیں دیتا اور نہ کوئی بستی نظر آرہی ہے۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا تا کہ ریاست خان بھی سن لے۔ ہم نے اس پر اعتماد تو کر لیا تھا لیکن وہ قابل بھروسا ہے بھی یا نہیں ابھی اس بارے میں میری حسی رائے قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس کے لہجے سے تو سچائی جھلک رہی تھی مگر وہ ڈرامے باز بھی تو ہو سکتا

تھا۔ ہماری طاقت سے مرعوب ہو گیا اور اس نے ہمیں شکست دینے کے لیے بھٹکا دیا تو ہم بے موت مارے جائیں گے۔ کیونکہ ابھی تک اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ نزدیکی آبادی کتنی دور ہے۔ ہر بار یہی کہتا تھا کہ بس اب ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی آبادی نظر نہیں آئی تھی۔ اور پیاس جان مارے دے رہی تھی۔

”اس علاقے کا یہی ایک خرابی ہے۔ بے آباد زمین زیادہ ہے۔ آبادی دور دور ہے۔“ ریاست خان نے میری بات کا جواب دیا۔

”احتمول کی جنت میں رہنے والو۔ کبھی سوچ کر دیکھنا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ تھوڑا سا غور کر لو تو وہ سامنے ہر یالی نظر آجائے گی۔ کھیت وہیں ہوتا ہے جہاں نزدیک میں آبادی ہوتی ہے۔ ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں۔“ وسیم کی چچکار سنائی دی تو میں نے بھی اس طرف دیکھا جدھر اس نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ واقعی پہاڑیوں سے پرے دور دور تک کھیت نظر آرہے تھے۔ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اور کھیتوں سے کافی دور چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما گھر۔ میں خوش ہوا تھا اس لیے کہ اب سفر تمام ہونے والا تھا۔ سورج بھی تو اپنا سفر تمام کر چکا تھا۔ صبح سے ہم مسلسل چل رہے تھے۔ اب جا کر آبادی نظر آئی تھی۔ ہمارے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ اس آبادی میں پہنچتے ہی ان لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ ہی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ سب مہمان نواز بھی ہیں۔ انہوں نے یہ تک نہیں پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو۔ کون ہو... اترا ہوا چہرہ دیکھا اور کھانے کا سامان لے آئے۔ بھوک کے عالم میں میٹھی روٹی اور شہد و مکھن نے بہت مزہ دیا۔ ہم سب نے سیر ہو کر کھایا اور دل بھر کر پانی پیا۔ ذرا ہوش آیا تو پوچھا ”یہ کون سا علاقہ ہے۔ یہاں سے نزدیک کوئی شہر ہے؟“

”مگر ہے نا۔ بس کچھ دور ہے۔ ابھی آرام کریں۔ کل صبح آپ کے لیے مگر جانے کا انتظام ہو جائے گا۔“ جس گھر میں مہمانداری ہو رہی تھی اس کے مالک نے کہا۔

مگر پہنچنے کا مطلب تھا کہ ہم گلگت پہنچ گئے اور گلگت سے چنڈی کے لیے سواری کی کمی نہیں تھی۔ میزبان نے آرام کا پورا بندوبست کر دیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ریاست خان کو کئی بار مہمان ٹھہرا چکا ہے۔ بدلے میں ریاست خان اس کو کچھ رقم دے جاتا تھا۔

آیا۔ اس نے پہلے مقامی انداز میں جھک کر سلام کیا پھر مجھ سے بولا ”اندر آجائیں۔ مہمانوں کے لیے عارف شاہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔“

ہم اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کو فرشی نشست سے سجایا گیا تھا۔ کئی گاؤں کیے لگے ہوئے تھے۔ اندر دو آدمی بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کے بعد بولے ”تشریف رکھیں۔“

ہم ان کے نزدیک ہی بیٹھ گئے تب وہ بولا ”آپ لوگ شاید اس علاقے میں پہلی بار آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں سے آرہے ہیں؟“ اس کا لہجہ بھی پختونوں جیسا تھا۔

میزبان ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ جب دشمن کا کوئی واقف کار آرام کا کہے تو اسے شک سے دیکھنا ضروری تھا۔ میں بستر پر لیٹ تو گیا تھا لیکن ہوشیار تھا۔ ریاست خان والی پستول اب میرے پاس تھی۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوتی تو میں مقابلہ کر سکتا تھا۔ محکم کا اثر سب پر تھا۔ خود میری آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں۔ باقی سب کے سب سو چکے تھے۔ لیکن میں چاہ کر بھی سو نہیں پارہا تھا۔ پتا نہیں کیوں میری چمٹی حس اشارہ کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ رہ رہ کر میرا دل زور سے دھڑک اٹھتا تھا۔ اب یہاں آگے بڑھنے کی بھی کمی نہیں تھی۔ اوپر یہ مسئلہ ہوتا ہے لیکن اب ہم جس علاقے میں تھے وہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے دل کی دھڑکن بے ترتیب کیوں ہو رہی تھی یہ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ میزبان آگیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا ”ایک بندے کی ہائی روف ہے۔ وہ اپنے ایک رشتے دار کو لے کر گلگت اسپتال جا رہا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اس سے بات کروں۔ وہ آپ کو ٹکڑے پہنچا دے گا۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”چار مریض۔“

”اور ہم سات لوگ ہیں اس ہائی روف میں اتنے لوگ کیسے آئیں گے؟“

”آدمے لوگ آسانی سے جا سکتے ہیں۔ مریض کے علاوہ اس کے تمام لوگ پائیلن پر کھڑے ہو جائیں گے۔ آپ کے آدمی بیٹھ جائیں گے۔“

”آدمے لوگ جا کر کیا کریں گے؟“

”مگر سے کسی سواری کا انتظام کر لائیں گے۔“

بات اس کی معقول تھی۔ میں نے سفیر عبداللہ اور وسیم سے کہا کہ وہ چلے جائیں۔

وہ لوگ اس ہائی روف میں چلے گئے۔ ابھی انہیں گئے ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ میزبان پھر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک سوزو کی گلگت سے آئی ہے۔ وہ واپس جا رہی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس سے بات کر لیں۔ اسے واپس تو جانا ہی ہے۔

”چلو بات کر لیتا ہوں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ باہر آیا، میرے ساتھ ریاست خان بھی باہر آ گیا۔ ہم تینوں سامنے والے اس گھر کی طرف بڑھنے لگے جہاں ایک سوزو کی کھڑی تھی۔ بالکل نئی، چمچاتی ہوئی۔ ہم ایسے ہی اس گھر کے دروازے پر پہنچے ایک شخص باہر نکل کر

کراچی

پاکیزہ

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ”باتیں بہار و خزاں کی...“

پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی جولائی کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کروالیں

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Message

Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

میں اسے ایک دو دن مہمان ضرور ٹھہراتا ہوں۔“
 ”آپ کب تک واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جس کام سے آیا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب واپسی کا سوچ رہا ہوں۔“

”کتنی دیر میں چلیں گے؟“
 ”بس یہ سمجھ لیں کہ آپ آئے کہ ہم نکلے۔“ اس کا انداز گفتگو پختون تھا لیکن وہ الفاظ کا ذخیرہ رکھتا تھا۔ خوب لہجے دار باتیں کرتا تھا۔ شاید یہ کراچی میں وقت گزارنے کا نتیجہ تھا۔

”ٹھیک ہے میں اپنا بیگ لے آؤں پھر نکل لیتے ہیں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر میزبان بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ پھر وہاں سے سیدھا اس کے گھر پہنچے۔ جیدے وغیرہ کو ساتھ لیا اور واپس اسی گھر میں آ گیا۔ امداد شاہ جیسے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی گھر سے باہر نکل آیا۔ اس نے فوراً ہی گاڑی اشارت کر دی اور ہم نئے سفر پر نکل پڑے۔ وہی پتھر لیے راستے۔ سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک۔ میرے ساتھ ریاست خان بیٹھا تھا۔ پیچھے والی سیٹ پر جیدے اللہ ڈینو اور چرسی جیسی شکل والا صغیر تھا۔ اس کے پیچھے خالی جگہ پر امداد شاہ کا بندہ اکڑوں بیٹھا تھا جیسے وہ اس قسم کے سفر کا عادی ہو۔ وہ بھی بالکل خاموش تھا۔ جیدے ریاست وغیرہ تو ایسے ہی مجھ سے مرعوب تھے۔

اب مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ ایک ساتھ عبداللہ وسیم اور سفیر کو بھیجنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ لوگ ساتھ رہتے تو سفر مزید خوشگوار ہو جاتا۔ راستے بھر وہ سب پھل پھڑیاں چھوڑتے، ایک دوسرے سے الجھتے رہتے جس کا ایک اپنا مزہ ہے۔ میں ونڈا سکرین سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ کافی۔۔۔ دیر بعد گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ادھر کم کم ہی گاڑیاں آتی ہیں۔ میں نے امداد شاہ سے پوچھا۔ ”نگراب کتنی دور ہے؟“

”بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
 ”اس گاؤں سے نگر کا اتنا تو فاصلہ نہیں ہوگا۔ ہمیں سڑک کرتے ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا ہے۔ اتنی دیر میں تو ہم گلگت پہنچ جاتے۔“

”ہم گلگت ہی تو جا رہے ہیں۔“ امداد شاہ نے جواب دیا۔
 ”لیکن مجھے تو نگر جانا ہے۔“
 ”نگر جا کر کیا کریں گے؟“ امداد شاہ نے عجیب سے

منطقہ

خط استواء پر سورج کی شعاعیں سارا سال عموداً پڑتی ہیں اور قطبین کے قریب ہمیشہ تر چھی اس لیے قطبین کے قریب سردی اور خط استواء کے قریب گرمی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دنیا میں کہیں گرمی اور کہیں سردی پڑتی ہے۔ کرۂ ارض کو حرارت کی اس کی بیشی کے اعتبار سے پانچ بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر حصے کو منطقہ کہتے ہیں۔

مرسلہ: احمد فاروقی۔ سیالکوٹ

۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴ ۱۴

”پنڈی سے آئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”میرا نام امداد شاہ ہے۔ باہر جو سوزو کی کھڑی ہے، وہ میری ہے۔ میں عرصہ دو سال سے گلگت میں ہی رہ رہا ہوں۔“ اس نے اپنا مکمل تعارف کرایا۔ ”پہلے میں کراچی میں چکی چلاتا تھا پھر یہاں آ گیا اور اب گلگت میں رہ کر کرایہ پر سوزو کی چلاتا ہوں۔“

میں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ کن اکھیوں سے ریاست خان کو دیکھ رہا ہے۔ گو کہ ابھی تک اس نے ریاست خان کو مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے پہچانتا ہے۔ یہ ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ عرصہ دو سال سے گلگت میں ڈرائیوری کر رہا ہے تو یقیناً کبھی نہ کبھی ریاست خان اس کی دیکھن یا سوزو کی میں بیٹھا ہوگا۔

”اور ہاں یہ بھی بتا دوں۔“ امداد شاہ نے ریاست خان پر ایک نظر ڈال کر کہا ”میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اگر آپ مجھ سے رابطے میں رہیں گے تو فائدے میں ہی رہیں گے۔“

”لیکن ہم تو یہاں سے گلگت جائیں گے اور گلگت پہنچنے ہی پنڈی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔“

”آپ کو ہم جائیں دیں گے تب ہی تو آپ جائیں گے۔ گلگت میں ہم ایک دو روز تو مہمان رکھیں گے ہی۔“ اس نے چستے ہوئے کہا۔ اس کے انداز پر میں چونک پڑا تھا لیکن فوراً ہی اس نے تشریح کر دی تھی ورنہ میں اس کی بات کا کچھ اور مطلب لیتا۔ ”پنڈی، لاہور یا کراچی سے جب کوئی آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کوئی میرے گھر سے آیا ہے

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلپھری

قابل علاج مرض ہے

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

کیلورنیا کیمیکل کمپنی کے مستقل پروگرام

اجمل زیدی

ملٹی ایوارڈ ہولڈر



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

اسلام آباد

9- اپریل تا 30 مئی
9- اگست تا 30 ستمبر
9- دسمبر تا 30 جنوری

مان نمبر 62، سرحد نمبر 20، ٹیکر G-8/1
سرگرمی (تعمیراتی) سوسائٹی
فون: 2255880 - 2654595 (061)
موبائل: 0300-8566188
ٹیکس: 2261636



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

لاہور

پشاور

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ، نزد سٹیٹ بینک
نورڈ مشینری (ٹرانزیکشنز)
موبائل: 0300-8566188

11- فروری تا 14 فروری
11- جون تا 14 جون
11- اکتوبر تا 14 اکتوبر

ہوشیاری سوسائٹی
نی فی روڈ نزد، پشوری چوک پشاور شہر
فون: 2218215-9 (0521)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

کراچی

28- مارچ تا 6- اپریل
28- جولائی تا 6- اگست
28- نومبر تا 7- دسمبر

ہوشیاری سوسائٹی
ریٹو سروس نزد چوک مزاج ہوشیاری
فون: 4518061-62 (061)
4582803 (0300-8566188)

13- مارچ تا 27 مارچ
13- جولائی تا 27 جولائی
13- نومبر تا 27 نومبر

گولڈن سوسائٹی
آفس 706، گلبرگ شاہراہ فیصل
زمری اسٹاپ پلاٹاں K.F.C کراچی
فون: 021-7012068-9
موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

لجے میں کہا۔

”میرے کچھ ساتھی وہاں سواری کا انتظام کرنے گئے ہیں۔“
”اچھا اچھا۔ تب تو ہمیں نگر کی طرف مڑ جانا چاہیے تھا اور ہم کافی آگے آگئے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اگلے موڑ سے اس طرف مڑ جاؤں گا۔“ پھر اس نے ریاست خان کی طرف دیکھ کر کہا ”ریاست خان مجھے جانتے ہو؟“
”نہیں۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔

”اب جان لو گے۔“ پھر امداد شاہ نے سرگھا کر پیچھے دیکھا اور اپنے ساتھی سے بولا ”صاحب جی کا کچھ خیال ہی کر لو۔“

”میں ابھی دیتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے تھرموس اٹھا لیا۔ ”تم گاڑی روک لو بھی تو میں ادھر آؤں گا۔“

امداد شاہ نے گاڑی روک دی۔ وہ تھرموس لے کر پیچھے سے اتر اور میری طرف والی کھڑکی پر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ کوئی مشروب دینا چاہ رہا ہے۔ میں نے اپنی سائڈ والی کھڑکی سے سر باہر نکالا ہی تھا کہ اس مردود نے اس گلاس میں بھرا مشروب میرے چہرے پر بھینکا۔ پتا نہیں اس میں کیا چیز تھی کہ میرے چہرے پر جلن ہونے لگی۔ آنکھوں میں تیز مریچیں سی لگیں۔ ابھی ریاست خان کی آواز سنائی دی ”اوائے یہ کیا کیا؟“

”ابھی تجھے بھی اس کا مزہ چکھنا ہے۔“ امداد شاہ کی آواز سنائی دی۔ یہی وہ آخری آواز تھی جو میں نے سنی کیونکہ میں ہوش سے بیگانا ہوتا چلا گیا تھا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ اس لیے کہ جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اندھیرے کمرے کے فرش پر پایا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کچھ بھی بھائی نہیں دے رہا تھا۔ پہلا خیال جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ میں کہیں اندھا تو نہیں ہو گیا ہوں۔ مگر نہیں ہلکا ہلکا سا منظر نظر آیا۔ شاید رات ہو چکی تھی اور کمرے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تب احساس ہوا کہ میں بندھا ہوا ہوں۔ مضبوط رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ میں نے گردن گھمانی چاہی تو برابر میں کوئی اور بھی تھا۔ اب میں نے بغور دیکھا تو سمجھ آئی کہ وہ ریاست خان ہے جو اب تک ہوش سے بے گانا ہے۔ میں نے کسما کر رسی کی مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہا تو پتا چلا کہ پلاسٹک کی ڈوری سے باندھا گیا ہے۔ ہاتھ کو دھیرے دھیرے منہ تک لانے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ دانتوں کی مدد سے رسی کھول لوں گا۔ لیکن یہ کوشش رائگاں گئی۔ ابھی ہاتھ سینے تک ہی پہنچا

تھا کہ دروازہ کھلا اور باہر کی روشنی اندر آئی۔ باہر لائٹ جل رہی تھی۔ ساتھ ہی چٹ کی آواز ابھری اور کمر روشنی سے جگمگا اٹھا۔ سامنے امداد شاہ کھڑا تھا اس کے ساتھ دو اور بندے تھے۔ ان میں سے ایک خاصا مضبوط بندہ تھا۔ جسم کسرتی۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئیں۔ وہ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھنے لگا تھا کہ امداد شاہ کی آواز سنائی دی ”اچھا تو تم جاگ گئے؟ اب جو پوچھا جائے تو تے کی طرح ٹرٹر شروع کر دینا۔“ اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک نظر ان سب پر دو بارہ ڈالی۔ سب کے چہرے درشت تھے۔ وہ سب ہی چہروں سے جرائم پیشہ لگ رہے تھے، میں نے جواب میں نیا سوال کر دیا ”آپ پہلے یہ بتائیں کہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟“
”اس بات کی سزا کہ تم ریاست خان کے ساتھ پائے گئے ہو۔ اور ریاست خان کا جرم بہت بڑا ہے۔“
”وہ مجرم ہے تو ہمیں کیوں سزا دے رہے ہو۔“

”اس لیے کہ اسے جو کام سونپا گیا تھا اس نے وہ پورا نہیں کیا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا۔ جو وعدہ کرتا اسے پورا ضرور کرتا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اس نے غداری کی اور ایسا اس لیے ہوا کہ تم نے اسے بہکایا۔ ہمیں صغیر نے پوری کہانی سنا دی ہے۔ اس لیے ہمارا فیصلہ ہے کہ اس کی سزا دی جائے۔“
”کسی نے کہا اور تم نے یقین کر لیا۔“ صغیر تو خود چرمی ہے۔ اس نے چرس کی طلب میں جھوٹ بک دیا اور تم نے یقین کر لیا۔ میں تو اس علاقے میں بالکل نیا ہوں۔ میں تو سیر کے لیے آیا تھا۔ راستہ بھٹک گیا تھا کہ ریاست نے مدد کا وعدہ کر لیا۔“ اور میں اس کے ساتھ ہولیا۔

”جھوٹ بولتا ہے۔“ کہہ کر اس نے ایک زنانے دار تھپڑ میری گال پر جڑ دیا۔ تھپڑ اتنا سخت تھا کہ منہ کے اندر دانت تک ہل گئے۔ میں پہلے سے تیار نہیں تھا۔ اس نے یکا یک حملہ کیا تھا اسی لیے چوٹ زبردست لگی تھی۔ شاید زبان دانتوں تلے آگئی تھی۔ منہ میں کڑواہٹ کھل گئی۔ شاید خون رسنے لگا تھا۔ میں نے کڑواہٹ کم کرنے کے لیے فرش پر تھوکا۔ لالی صاف نظر آئی تھی۔

”صاف صاف بتا دے ورنہ یہ چڑی ایسی ہو جائے گی کہ اس پر پوند بھی نہیں لگے گی۔“ اس نے جملہ ختم کر کے نہایت پھرتی سے جوتے کی نوک سے میرے سینے پر تھوک ماری۔ تھوک اتنی شدید تھی کہ میں الٹ گیا۔ بستر سے پیٹھے جا گرا تھا۔ امداد شاہ نے اپنے ساتھی سے کہا ”اسے سیدھا کر ورنہ میں اس کے سینے پر کھڑے ہو کر ڈاس شروع کر دوں

گا۔ بڑا سوراہا بن کر آیا ہے نا۔ ابھی ایک ایک ریشہ لگ کرنا ہوں۔“

امداد شاہ کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اچھے اچھوں کو پیدنا آجائے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہ بندہ ہے جو مجھے گاؤں میں ملا تھا۔ اس وقت وہ درندے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔
”میں نے سچ بولا ہے۔ اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اؤے اسے اٹھا۔“ امداد شاہ نے اپنے پاؤں بلڈر ساتھی سے کہا۔

وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے کپڑوں سے پکڑ کر کھینچا اور اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے پاؤں پر زور ڈالا تاکہ آسانی سے اٹھ جاؤں۔ اس نے کھینچ کر مجھے ہٹا دیا۔
”سیدھے سیدھے بول تو کس ایجنسی کا بندہ ہے ورنہ مار مار کر کھال میں بھس بھر دوں گا۔“ وہ اپنے زعم میں بولے جا رہا تھا۔

”دیکھ بھائی سیدھے سیدھے سب کچھ بول دے۔ استاد کا دماغ پھر گیا نا تو کچھ لے تو ہمیشہ کے لیے معذور ہو جائے گا۔“ پاؤں بلڈر نے مشورہ دیا۔

”میں اب تک سمجھ ہی نہیں پایا ہوں کہ یہ پوچھنا کیا چاہتے ہیں تو میں کیا بتاؤں؟“

امداد شاہ نے اسے ڈانٹا ”اپنے کام سے کام رکھ۔ ایسا کر ریاست خان نے ابھی تک سبق نہیں لیا۔ اسے اٹھا۔ وہ ایسے آنکھیں بند کیے پڑا ہے جیسے میں اندھا ہوں۔ دیکھ نہیں رہا کہ وہ اٹھ چکا ہے۔“

پاؤں بلڈر نے ریاست خان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر فرمایا ”سیدھی طرح سے بیٹھ جا۔ اب تیرا نمبر ہے۔“

”مجھے جو کام دیا گیا تھا وہ میں نے پورا کر دیا ہے۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔

”بکو اس بند کر۔ رات صاحب جی کا پیغام آیا ہے کہ جس بندے کو بھیجا گیا تھا اسے ایجنسی والوں نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے نکل پایا ہے۔ ایجنسی والوں کو کیسے خبر ہوئی یہ تو بتائے گا۔“

”یہ غلط خبر ہے۔ کوئی بندہ آیا ہی نہیں۔“ ریاست خان نے جواب دیا۔ میں اس کی ہمت کی داد دے رہا تھا۔ وہ جو صلے سے کام لے رہا تھا۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو اسے بزدل یا ٹوٹ جانے والا ثابت کرتا۔

”اگر تو سچا ہے تو پھر صغیر کی بات کو کس خانے میں فٹ کروں۔“ امداد شاہ نے کہا۔

”صغیر جھوٹ بول رہا ہے۔“

”جھوٹ تو بول رہا ہے اور یہ شخص جو تیرے ساتھ ہے یہی ایجنسی کا بندہ ہے۔ اس کی تو میں بونی بونی الگ کروں گا اور ہر بونی ایک ایک بات بتائے گی۔ اگر مجھے نہیں جانتا تو جان لے گا۔ میں ایجنسی والوں کا سب سے بڑا دشمن ہوں۔“

”میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ کوئی آیا ہی نہیں تھا۔ ایک بار صاحب جی سے میری بات کراؤ۔ میں خود ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”صاحب جی اب تجھ سے بات نہیں کریں گے۔“

”تو ٹھیک ہے میری بات مرشد جی سے کراؤ۔“ ریاست خان نے جھنجھلا کر کہا۔

”وہ بھی تم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔“
”انہیں خبر تو دو کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی میں تمہاری وہ خبر لوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔“ امداد شاہ نے ہنس کر کہا۔

”تمہیں آج تک میں نے حضرت جی کے پاس دیکھا نہیں اور تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے تم ان کے خاص مرید ہو۔ لاؤ فون مجھے دو میں خود ان سے بات کر لیتا ہوں۔“

”فون بھی دوں گا۔ رہا سوال تم نے مجھے ان کے پاس دیکھا نہیں تو میں کوئی عام بندہ نہیں ہوں۔ مرشد جیسے کئی بندے میرے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ مرشد جیسے لوگوں سے ہم کام لیتے ہیں۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ ایک معمولی بندہ مرشد جیسے شخص کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ جو خود میں ایک دنیا تھا۔ سیاست کا بازی گر۔ قوت کا خزانہ۔ شیطانیت میں سب سے آگے.... تو کیا مرشد خانقاہ کی تباہی کے بعد بالکل صفر بن گیا ہے۔ یا پھر یہ گیم کھیل رہا ہے۔ بات ابھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ خود ایجنٹ ہے اور مرشد کو فنڈ دے کر کام لے رہا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو اس کے معنی یہ ہے کہ دشمن نے اندر تک اپنا جال پھیلا رکھا ہے اور اس جال کو توڑنا بہت ضروری ہے۔ کام بہت بڑھ گیا ہے۔

”استاد پہلے اس کو ٹولیں... یہ مجھے زیادہ اہم لگتا ہے۔“ پاؤں بلڈر نے امداد شاہ کو مشورہ دیا تو وہ پھر میری

جانب متوجہ ہو گیا۔ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا ”مجھے اندازہ ہے تو بہت اہم بندہ ہے۔ اب جلدی سے شروع ہو جا۔“

”میں کیا بتاؤں... جو سچ ہے وہ بتا دیا۔“ میں نے جواب دیا تھا کہ اس نے میری ناک پر بیچ مارا۔ گو کہ بیچ ہلکا تھا پھر بھی تکلیف کا شدید احساس میرے اندر درد کی لہر سا اٹھا گیا۔ ابھی میں اس درد کو سہہ بھی نہ پایا تھا کہ اس کی مکروہ آواز سماعت سے نکرانی ”ریاست کو لے جا کر الٹا لٹکا دے ایک دو گھنٹے میں اس کا مزاج خود سچ ہو جائے گا۔“

باڈی بلڈرنے اسے کسی بچے کی طرح گود میں اٹھالیا پھر وہ باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد امداد شاہ نے کہا ”ہاں بھئی سورما، اب تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

”میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں اور کیا بتاؤں۔“

”سمجھ گیا۔ ایسے بتاتے ہوئے تمہیں شرم آ رہی ہے۔ ابھی علاج کرتا ہوں۔“ کہہ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارے سے بلایا۔ ”اسے جہنم کا دروازہ دکھانا پڑے گا... شاباش شروع ہو جاؤ۔“

ان دونوں نے مجھے بستر سے اتارا پھر دیوار تک لے گئے اور اس سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ میرے دونوں ہاتھ اسی طرح جکڑے رہے۔ ان میں سے ایک نے میرے ہاتھوں کی بندش کو ڈھیلا کیا۔ میرے لیے یہ ایک نادر موقع تھا، میں نے بندھے ہوئے پیر کی پرواہ کیے بغیر ہاتھ چلا دیا۔ مجھے امداد شاہ سے اس پھرتی کی امید نہ تھی۔ اس نے ہوا میں اچھل کر میرے چہرے پر بوٹ کا بھر پور وار کیا۔ یقیناً میری ناک کا بھرتا بن گیا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے اسی تیزی سے میری دونوں کلائیوں میں بندھی رسی کو پکڑا اور کھینچ کر چھت سے لٹکتی رسی سے باندھ دیا جیسے یہ ان کا معمول ہو۔

”ابے رسی کو کھینچ۔“ امداد شاہ نے جھڑکا۔

ان دونوں نے چھت کی رسی کو کھینچتا شروع کر دیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے تھے۔

”ابھی اور اوپر کھینچتا ہے۔ اس کا قد بھی تو دیکھ۔“ امداد شاہ چیخا۔

ان دونوں نے رسی کو مزید اوپر کھینچا۔ اب میرے ہاتھ اتنے بلند ہو چکے تھے کہ بغلوں میں کھنچاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں پوری طرح رسی کے سہارے کھنچا ہوا تھا۔

”پہلے داہنے پیر کو احتیاط سے۔“ امداد شاہ نے ہدایت دی ”یہ پیر چلانے میں ایکسپرٹ لگتا ہے۔“

ایک بندے نے رسی کا پھندا پھینک کر میرے داہنے

پیر کو باندھا پھر پہلے سے بندھی رسی کو کھول دیا۔ اب میرے دونوں پاؤں الگ الگ ہو گئے تھے۔ اس بندے نے داہنے پیر سے بندھی رسی کو لے جا کر بیڈ کے پائے سے باندھ دی۔ اتنے میں دوسرا بندہ جو باہر نکل گیا تھا وہ ایک کنستریٹر کے ساتھ واپس آیا۔ اس کنستریٹر میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس نے کنستریٹر کو میرے بائیں جانب رکھ دیا پھر بائیں پیر کی رسی کو اس کنستریٹر سے باندھ دیا۔ اور اسے کھینچ کر فاصلے پر رکھ دیا۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا کہ جس کی اذیت کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔ میرے دونوں پیر دوست میں کھینچ گئے تھے۔ ٹانگیں ایسی چری ہوئی تھیں کہ پورا وزن کلائیوں پر پڑ رہا تھا۔ پیر پر وزن ہی نہیں تھا۔ میری حالت دیکھ کر امداد شاہ نے کہا ”ابھی نو بیج رہے ہیں۔ ہم باہر بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ جب تمہارا دل کرے کہ بیچ بتانا ہے تو مجھے آواز دے لیتا۔“ وہ گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی باہر نکل گئے تھے۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اس دوران قیادہ علاقے کا یہ شخص ایذا رسانی کا طریقہ تو خوب جانتا ہے۔ ایسا شخص معمولی نہیں ہو سکتا۔ میرے دونوں پیر سخت تکلیف میں تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ درمیان سے پیر الگ ہو جائیں گے۔ میں نے تکلیف پر قابو پانے کے لیے پیروں کو قریب کرنا چاہا۔ اس کے لیے جھٹکا دینا ضروری تھا مگر پہلی ہی کوشش میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور میرا سارا وزن کلائی پر آ گیا۔ رسی کی جکڑ کلائی پر مزید سخت ہو گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے رسی گوشت میں اترنے لگی ہو۔ تکلیف کی شدت سے میں دوبارہ پہلی پوزیشن میں آنا چاہا لیکن اب یہ ناممکن ہو چکا تھا۔ میں عجیب انداز میں جمبول گیا تھا۔ اس تکلیف سے گزرتے ہوئے بھی میں سوچے جا رہا تھا کہ امداد شاہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ ٹرینڈ بندہ لگ رہا ہے۔ کاش میں اپنے ساتھیوں کو ایک ساتھ نہ بھیجتا تو وہ لوگ اپنی کوشش کر لیتے۔ اذیت سے بچنے کے لیے میں مسلسل ادھر ادھر کی سوچ رہا تھا لیکن تکلیف کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس تکلیف سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں نے آخری کوشش کی ٹھان لی اور پھر میں نے اسے آواز دی۔ ”امداد شاہ!“

آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ سب ایک ساتھ اندر آئے۔

”کیا بات ہے۔ عقل ٹھکانے آگئی؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(فدا حسین طوری پارا چنار کا جواب دیا)

نیلو فر شاہین..... اسلام آباد
اپنے حصے میں بھی آئی آخر چاہت کی سوغات
چھیں نہ آئے سارا دن نیند نہ آئے ساری رات
انیس احمد..... چنیوٹ

اک تیری دید چمن مہنی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی
اشرف الدین..... ساہیوال

امیدوں کی راہ گزر پر آگے آگے بڑھتے جانا
کانٹے جن چن کر پھول بچھانا نور کی شمع جلائے رکھنا
احمد ذیشان..... کراچی

الفاظ ضروری نہیں اظہار کے لیے
روپے کافی ہیں یہاں پیار کے لیے
عمیر احمد..... ڈیرہ اسماعیل خان

اگر ہوتا ہے اتفاق تو یہ کیوں نہیں ہوتا
وہ راستہ بھولے اور مجھ تک چلا آئے
اشفاق فرحت..... رحیم یار خان

اجالا بن کے آجاؤ میرے تاریک لمحوں میں کہ
ترے بن سبھی خوشیاں مجھے غمگین لگتی ہیں
اسد عمران..... بہاولپور

اس کے سوا تو میں دو پل کسی کو نہ دوں
دل تو بہت دور کی بات ہے
(زوبیہ الماس کا جواب)

ماہین فاطمہ شاہین..... لیہ
خلوق خدا جب کسی مشکل میں پھنسی ہو
جدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی
امتیاز اسد..... پاک پتن

لمتی ہے برسوں میں بلندی
گرنے میں پل بھر لگتا ہے

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

عجمی رحمن..... بریٹ لیٹ یو ایس اے
وہ فراق ہو کہ وصال ہو تیری آگ مہکے گی ایک دن
وہ گلاب بن کے کھلے گا کیا جو چراغ بن کے جلا نہ ہو
حیات مرزا..... حیدرآباد

وہ عشق تجھ سے کیا ہے کہ بیشتر اوقات
ہمیں تو بار گزرتی ہے مہربانی تک
ندیم یامین..... کراچی

واقف عزمت کردار نہیں ہے کوئی
لوگ شعبہ باز ہیں فنکار نہیں ہے کوئی
انجم شاہین..... جھنگ

وحشت کا عنوان ہماری ان میں سے جو نارٹھری
دیکھیں گے لوگ تو کہیں گے انشائی دیوانے تھے

(قائم علی رضوی کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی
آج ایک برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان کا جواب)

ضیاء الرحمن..... فورٹ عباس
نگاروں کے میلے ستاروں کے جھرمٹ
بہت دلنشین ہیں بہاروں کے جھرمٹ
داؤد اللہ نیازی..... اوکاڑہ

نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تور کے ہوئے ہیں
(ساجد فاروق سرگودھا کا جواب)

عتات مسیح..... کراچی
وہ جو طرم تھا ہر اک عشق میں سچا نکلا
اس پہ الزام لگا حسن سے غداری کا

عذرا علی.....خانوال

باویسیوں نے چھین لیے دل کو ولولے
وہ بھی نشاط روح کے سامان نہ کر سکے
رضیہ شاہین.....حسن ابدال

منزلیں کسی کے گھر حاضری نہیں دیتیں
راستوں پر چلنے سے راستے نکلتے ہیں
کلفر مجیب.....نورپور

میں بہت جلد بھنور میں یاد آؤں گا تجھے
اتنا خوش باش نہ رہ مجھ سے کنارہ کر کے
یوسف علی.....کراچی

میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
وہ سمجھتا ہے مجھے اس سے گلہ کچھ بھی نہیں
حجی رحمن.....برڈ لیٹ یو ایس اے

میں طوفان میں ڈوبا چلا جا رہا تھا کہ نزدیک آ کر کسی نے پکارا
اگر تو رسول خدا کو پکارے تو موجوں میں آجائے بہتا کنارا
زرین مجید بیٹ.....لاہور

مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا
میں پختہ شہر کا کچا مکان ہوں
فرحین جاوید.....ملتان

میرے لفظ کی وحشت میں ہے اک عمر کا عشق
یہ کوئی کھیل تماشا نہیں لکھا میں نے
(مہوش صدیقی بھمبر کشمیر کا جواب)

نامہ کریم.....بلیر کراچی
وہ تو صدیوں کا سفر کر کے یہاں پہنچا تھا
تو نے منہ پھیر کے جس شخص کو دیکھا بھی نہیں

ہما اختر.....منظر گڑھ
وہ زلفیں ہونا بھی چاہیں پریشاں
تو اپنے پاس شانے کون سے ہیں

اسرار احمد.....لاہور
وہ ولولے کہ جن سے عبارت تھی زندگی
غم ہائے روزگار کے سانچے میں ڈھل گئے

(آغا عنایت کوئٹہ کا جواب)
فرحت ندیم.....کراچی
نہ مروت نہ محبت نہ خلوص ہے اقبال
میں تو شرمندہ ہوں اس دور کا انسان ہو کر

(محمد احمد رضا انصاری کوٹ اڈو کا جواب)

فرخندہ لودھی.....کراچی
اس کے لہجے میں شرارت ہے نہ ہونٹوں پہ ہنسی
وہ لڑکی اب دگی سی رہتی ہے

اشفاق احمد.....سکھر
اسے دیکھ لوں تو بھوک مٹ جاتی ہے یارو
میری آنکھوں کا رزق ہے میرے یار کا چہرہ

نازین ناز.....کوٹ اڈو
اس بادشاہ وقت سے کیسی توقعات
پیشا ہے تخت پر وہ عنایات بیچ کے

علیم الدین بیٹ.....شادی پور
امرت کی مہک تھی باتوں میں نفرت کے شور تھے پلکوں پر
وہ ہونٹ نہایت میٹھے تھے وہ آنکھ بہت زہریلی تھی

ابرار مجیب.....ملتان
اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انساں کی حفاظت نہیں ہوتی

انور زئی.....کوئٹہ
اخلاص کی جاگیر کو ہم اہل محبت
تقسیم تو کر دیتے ہیں بیچا نہیں کرتے

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)
ناصر خان.....کوئٹہ
یہ آئینہ کسی پتھر پہ توڑنا ہو گا
خندوں سمیت کبھی دل کو چھوڑنا ہو گا

(عبدالکیم شمر کراچی کا جواب)
ساجد فاروق.....سرگودھا
یارب ہر ایک درد کو درماں نصیب ہو
سکھ کی گھڑی کا پتین کا ساماں نصیب ہو

نوشین اختر.....سیالکوٹ
یہ حقیقت بھی تمہاری خوب ہے
دوسروں سے بھی ملا کرتے ہو تم

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ
سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سپنس □ پاکیزہ □ سرگزشت □ بھجوا یا جائے کسی ایک پر کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جولائی 2016، تک علمی آزمائش 127 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینجر 35804200-35386783-35802552

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹریڈنگ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

جولائی 2016ء

199

ماہنامہ سرگزشت

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے) **87**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش - 127

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا مندرجہ اہتمامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس مفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہانہ سسر گزشت، سسپینس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہانہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صفحہ سرگزشت“ کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جولائی 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

والد کا نام شہزادہ علی تھا۔ 1957ء میں ملکہ الزبتھ، 1952ء میں شہنشاہ ایران نے خطاب عطا کیے۔ حکومت پاکستان نے 1970ء میں نشان امتیاز سے نوازا۔ 1967ء میں پشاور یونیورسٹی اور 1970ء میں سندھ یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔ 1969ء میں ایک برطانوی دوشیزہ سے شادی کی۔ ان کے مرید تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

علمی آزمائش 125 کا جواب

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، ریحانہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر رائل ملٹری کالج سینٹ ہرسٹ انگلینڈ سے ڈگری حاصل کی اور رائل آرمی میں شامل ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر ایک بیٹالین کی کمان کی۔ 1951ء میں افواج پاکستان کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوئے۔

انعام یافتگان

- 1- محمد طفیل نیازی۔ ملتان
- 2- زاہد شیخ۔ جھنگ
- 3- فاخرہ بتول نقوی۔ سیالکوٹ
- 4- عباس علی سید۔ لاہور
- 5- عنایت اللہ جمالی۔ سکھر

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عطاء الرحمن شاہد، اثنا و جاہت وکیل، عثمان خان، محمد خواجہ، سعید احمد چاند، سید عزیز الدین، فہد مصطفیٰ جان، ناصر بیگ، خاقان علی سید، ارباب خان، ناصر الحسن زیدی، تنظیم عباس زیدی، خادم خان، غالب علی، محمد اسلم، مشفق احمد، خادم حسین، کمال وارثی، عثمان خان، سندس حیات، ارباب حسن، خادم حسین، ایم ناصر، اکبر حیات، سید عباس، صالحہ

جولائی 2016ء

200

ماہنامہ سرگزشت

محمود، منیبہ حبیب، سید فرح محمود، عباس خان، اشفاق محمد، فیض محمد، محمد یاسین، خالدہ یوسف، شجاع رضوی، دانش قریشی، مرزا
 سلیم اودھ، توقیر ناصر، طیب خان، محمد اختر، علیم ذکائی، یاسین خان، دانش قریشی، سلطان خان، طیب احسن، راغب احسن،
 ناصر بیگ، منیر احسن، توقیر عباس اچکزئی، فرحین سلطان۔ لاہور سے عبدالبجبار رومی انصاری، افتخار احمد تارا، ارسلان شاہد،
 ماڈل ٹاؤن۔ عبدالحق، عباس علی، یمنین بھٹ، شیخ محمد سرور جاوید، ناصر علی، نوید اصغر، فہد اللہ، زرینہ ایوب، نواب احسن،
 یاسین محمد، انیس قائم خانی، ظفر چنیوٹی، آصف خان، چودھری فضل اللہ، محمد اکرام، فرحت مصطفیٰ، برکات اللہ، ظفر قاسم،
 قاضی اختر، خادم علی، ذیشان علی، کائنات علی، فرحت بٹ۔ ملتان سے خواجہ محمد حسین، محمد منیب، نازش فاروقی، خضر حیات
 بھٹی، اقبال انصاری، توقیر عباس، بابر سعید، لبنی ارشاد، اویس سلمان، سلطان فتح علی، شیر علی سید، نوید اصغر بخاری، محمد
 آصف، اقبال حسن خان، انعام حسن خان، امام بخش ملک، محمد معین، ناصر گواچہ، حنیف محمد، برکات اللہ بخش، اسماعیل آفاق،
 شیخ نہال احمد، ارشاد حسن کاظمی۔ پشاور سے مظہر حسین (یونیورسٹی کیمپس)، شاہ نواز گل، وحیدہ خان، شاہ زرولی، غلام عباس
 طوری۔ سرگودھا سے محمد امیر ماجد (چکیاں اڈہ)، خدیجہ دلاور، ماریہ چودھری، قدرت خان، اشفاق حسن، داؤد عثمانی،
 فرحت اللہ، رمضان حسن، ظفر میٹگل، ہاشم رضا، عمیر علی۔ اسلام آباد سے فریدہ افتخار، محمد ریاض راجیل، عبدالاحد، نیلو فر
 شاہین، انور یوسف زئی، ادریس پاشا، یوسف حمید گل خان، ڈاکٹر فرخندہ لودھی، خرم علی، شیخ فتح یاب، جنید ملک، جہانزیب
 خان، ملائکہ احسن۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز۔ میرپور خاص سے معین علی خان، غلام شبیر، حافظ محمد حسن، عابد علی شیخ،
 تاشیہ عطاری، رخسانہ اکمل، لبنی اکرام، فرحت اعجاز بھٹو، شیخ یاسین، ذوقشاں قاطمہ، محمد منیب، محمد بخش، زویا اعجاز بھٹو، فرحین
 شمرہ۔ جملہ گنگ سے ملک طارق رشید، عباس علی۔ بدین سے سید ایس ڈی ساغر۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ، پشاور سے سردار
 سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوری بخش،
 ناہید سلطانی، انور حسن خان، انعم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، داروغہ خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال
 الدین، ضیاء الاسلام۔ میرپور سے اے کے کاظم علی بھٹو۔ قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بٹ، عبدالحق، نیاز حسین سید۔
 خان پبلہ سے عنایت علی، یاسین فراز۔ سید محمد عرفان جعفری، شگفتہ، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید۔ راولپنڈی سے ظفر
 اسماعیل، احمد شیراز، ظفر خانزادہ، سرفراز بٹ، وسیم الدین ہدانی، احمد نیاز، معیوب الدین، عابد الدین، گل فراز مسکن، ناہید
 اید، فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالوحید، نوشاد کجمر، محمد حسین، سلمان نازی، مسرت بٹ، نصیر نقوی، نعمان کلیم، عاجز ضیا
 عابدی، یاسین خان، اشرف اللہ، سبطین ظفر، بدر کھٹی، خاقان اچکزئی، ظہیر باری، عنبرین پلیجو، ضیا پلیجو، آفتاب بٹ،
 عنایت جعفری سید، مرزا دلدار حسین، کائنات سید، قیام حسین، گل بدین، نذر حسین عابدی، طفیل آفاق، اشرف علی، عثمان
 عثمانی، بدر علی ادریس، حسن ہارون، باسط علی۔ اسلام آباد سے نیلو شاہین۔ لاہور سے خاقان صدیقی، عباس بٹ عرف چھوٹا
 پہلوان، ظفر احسین، فیضان بٹ، اسرار علی خان، انعام افضل، وسیم انصاری، نیاز فیضانی، جس فرید پراچہ، زاہد علی سید، نعمان
 خان، معیوب الدین، ارباب افضل رسول بخش، احمد پہلوان، اشرف علی ترمذی، نذر نیازی، ماہا خان، انیس احمد گل، رحمت
 اللہ خان، نوید شہباز، اشرف خان، محمد فیض بخش صدیقی، جنول زیدی۔ ڈسکہ سے طاہر سلیم۔ صوبی کے پی کے سے کوثر
 اسلام، نسیم الاسلام (رزڈ)۔ انک سے رضوان ارشد، سید محمد حسین شاہ، حیا علی۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان شنگ۔
 میانوالی سے ملک رفاقت مسکین (پکی شاہ مردان)، کمال حسن، شاہ مراد۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ (خادم علی رود)
 اقرار حسن، دین محمد، تاشیر زیدی۔ خوشاب سے ملک نوید اصغر۔ حیدرآباد سے ماہ رخ، ساجد فاروق، حکیم اللہ جان، سلطان
 علی، سید کاظم علی، نصیر بوتراپی، راغب احسن، رونی انصاری، طیب علی، حسن کاظمی، اختر ہاشمی، نعمان فاروق، منیر حسین، فرحت
 عثمان، عزیز شیخ، فرخ مرزا بیگ، دانش فتح محمد، اشفاق شیخ، کاظم علی کاظمی۔ لیہ سے ماہین انور، نوید حسن خان، لطیف اللہ۔
 حسن ابدال سے خرم حسن۔ ہری پور ہزارہ سے کاظم علی کاظمی، اشرف الماس۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے باسط، سلمان نیازی،
 ملک دین محمد، ڈیرہ غازی خان سے عباس خان، اشرف حسن، زرین مجید، قبلائی خان۔ خوشاب سے ممتاز حسن۔ بہاولنگر
 میں ناصر عباس۔ جہلم سے فتح یاب خان، زعمیم شریف، انصر عباسی۔ جونیوں سے ملک شاہین۔ کمالیہ سے فرحت خان۔
 بیرون ملک سے: صالحہ عبدالسلام، عمان سعودیہ۔ ذیشان علی سید، اصین یو اے اے۔ حمزہ عباس شانی، مانچسٹر یو
 کے۔ نعیم اختر، ٹورنٹو کینیڈا۔ انا کاظمی، دہلی یو اے اے۔

فلرٹ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام مسنون!

عورت کی عظمت کو ہمارے معاشرے میں کس طرح سے گرا دیا گیا ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے ارد گرد بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی معاشرے کا حصہ میں بھی ہوں اس لیے میں نے یہ کھیل کھیلا۔ گوکہ یہ سو فیصد غلط تھا، اس میں سراسر نقصان میرا ہی ہوا لیکن اس سے بہت سی لڑکیاں سبق حاصل کرسکتی ہیں اسی لیے اپنی آپ بیتی لکھ رہی ہوں۔

مہناز
(کراچی)

کرتے ہوئے کسی چھان بین کے بغیر ہی یہ رشتہ قبول کر لیا۔ اس وقت میں ماسٹرز کر چکی تھی اور مجھے ایک بڑی فرم میں مارکیٹنگ کی جاب مل گئی تھی لیکن امی کو میری شادی کی فکر اس وقت سے لاحق ہو گئی تھی جب میں نے انٹری پاس کیا۔ دراصل وہ ڈرگٹی تھیں کیونکہ میری ایک تایا زاد بہن کی شادی خاصی تاخیر سے ہوئی تھی جبکہ اس کی تینوں بڑی بہنیں مناسب عمر میں بیاہ کر چلی گئی تھیں لیکن اس کی عمر اٹھائیس برس ہو گئی تھی اور اس کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا تھا جس کی وجہ سے تائی ہی نہیں خاندان کے دوسرے لوگ بھی پریشان تھے اور سب ہی اپنے طور پر اس کی شادی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ شادی دفتروں، رشتہ کرانے والی عورتوں، پیروں، فقیروں اور عالموں سبھی سے رابطہ کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بہر حال تیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی اور سب لوگوں نے سکھ کا سانس لیا لیکن اس کے بعد خاندان کے سبھی لوگوں کے دل میں ڈر بیٹھ گیا اور وہ لڑکیوں کی شادی میں عجلت کرنے لگے۔ تائی سب کی بزرگ تھیں اور یہ انہی کی نصیحت تھی کہ لڑکیوں کی شادی میں غیر ضروری تاخیر نہ کی جائے اور مناسب رشتہ ملتے ہی ان کی شادی کر دی جائے۔ اس کے بعد ہمارے خاندان میں کم عمری میں ہی لڑکیوں کی شادیاں ہونے لگیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو تو میٹرک یا انٹر کے بعد ہی رخصت کر دیا گیا۔ مجھ

میں نے ڈرتے ڈرتے دفتر میں قدم رکھا۔ کوریڈور بالکل سنسان پڑا ہوا تھا۔ گویا مجھ سے پہلے سب لوگ دفتر پہنچ چکے تھے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ صرف میں ہی تاخیر سے آئی تھی۔ اگر پانچ دس منٹ کی بات ہوتی تو کوئی فکر نہیں تھی لیکن میں مقررہ وقت سے پورے ایک گھنٹا بعد دفتر پہنچی تھی اور اب میرا سانس سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ آج تو رازی صاحب مجھے کچا ہی چبا جائیں گے۔ وہ ویسے ہی بہت سخت گیر انسان تھے۔ اور ڈسپلن کی خلاف ورزی بالکل برداشت نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر دیر سے آنے والوں کو سزائیں کرنا ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ ان کی اس سختی کا ہی نتیجہ تھا کہ دفتر میں کام کرنے والا ہر شخص وقت سے پانچ دس منٹ پہلے ہی آجاتا تھا کیونکہ کسی کو بھی اپنی بے عزتی پسند نہیں تھی۔ صرف میں ہی وہ واحد فرد تھی جو کوشش کے باوجود وقت پر نہ پہنچ پاتی اور مجھے تقریباً روزانہ ہی رازی صاحب سے کچھ نہ کچھ سننے کو مل جاتا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی مجبوریوں کے اسیر تھے۔ انہیں دفتر میں نظم و ضبط برقرار رکھنا تھا اور میں اپنے شوہر کی زیادتیوں کا شکار تھی۔

جی ہاں، میری شادی کو ابھی ایک سال ہوا تھا لیکن ابتدائی چند ماہ بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میرے شوہر وہ نہیں تھے جیسا کہ ان کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ یہ شادی ہماری ایک دور پرے کی رشتہ دار خاتون نے کروائی تھی اور میرے گھر والوں نے ان پر اعتبار



پر بھی ایسا ہی دباؤ تھا لیکن میں بھرپور مزاحمت کر رہی تھی اس کے علاوہ مجھے ابو کی بھی حمایت حاصل تھی، لہذا میں نے امی کی شدید مخالفت کے باوجود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب کم از کم چار سال تک مجھ سے شادی کے لیے نہیں کہا جائے گا اور میں اطمینان سے ماسٹرز کر لوں گی۔

یونیورسٹی میں دن بہت اچھے گزر رہے تھے اور میں دل لگا کر پڑھ رہی تھی۔ مجھ پر دو طرح کا دباؤ تھا۔ ایک تو یہ کہ اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہ تمام کزنز جو شادی کے بندھن میں جکڑ جانے کے سبب میٹرک اور انٹر سے آگے نہ پڑھ سکیں، وہ بھی مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھا کرتیں۔ خاندان کی تقریب میں لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔ اس طرح مجھ میں احساسِ تقاضا پیدا ہو گیا اور میں اپنے آپ کو خاندان کی دوسری لڑکیوں سے برتر سمجھنے لگی۔ مجھ پر دوسرا دباؤ یہ تھا کہ اگر خدا خواستہ کسی امتحان میں نکل ہو گئی تو امی

کو بہانہ مل جائے گا اور وہ میرا یونیورسٹی جانا بند کر دیں گی۔ ویسے بھی وہ کئی مرتبہ یہ کہہ چکی تھیں کہ ٹھیک ہے۔ تم نے اپنی ضد پوری کر لی لیکن اس دوران کوئی اچھا رشتہ آ گیا تو فوراً ہی شادی کر دی جائے گی اور تعلیم ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

چار سال حیرت سے گزر گئے اور میں نے ماسٹرز مکمل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ امی نے ایک بار پھر مخالفت کی لیکن اس مرتبہ بھی ابو نے میرا ساتھ دیا اور مجھے ملازمت کرنے کی اجازت مل گئی لیکن نوکری ملنا آسان نہیں تھا۔ ہم نے یونیورسٹی کے دنوں میں جو خواب دیکھے تھے وہ بکھرتے دکھائی دیے لیکن میں بھی ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ ہر نئے اخبار میں اشتہار دیکھ کر درخواستیں بھیجتی رہی۔ کئی جگہ انٹرویوز بھی دیے لیکن بات نہیں بنی۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔ میری ہمت جواب دینے لگی۔ امی بھی یہی کہتی تھیں کہ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہو۔ ملازمت کر کے تمہیں کیا ملے گا۔ شادی کے بعد دہری ذمے داری آ جائے گی۔ نوکری بھی کرو اور گھر بھی

سنجالو۔ اوپر سے شوہر کی ناز برداریاں الگ۔ اس معاشرے میں عورت چاہے کتنا ہی پڑھ لکھ جائے بڑے بڑے عہدے پر فائز ہو جائے۔ وہ گھر بیٹو ذمے داریوں سے بچھا نہیں چھڑا سکتی۔ میری مانو تو نوکری کا خیال دل سے نکال دو اور گھرداری میں دل لگاؤ۔ ویسے بھی کمانا مرد کی ذمے داری ہے، عورت کی نہیں۔

میں یہ باتیں ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی۔ وہ پرانے زمانے کی عورت تھیں۔ اس لیے ان کی باتیں بھی مجھے دقیانوسی لگتیں۔ یہ تو شادی کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں کتنی سچائی اور گہرائی تھی۔ بہر حال میری کوشش جاری رہی اور بالآخر مجھے ایک کمپنی میں مارکیٹنگ آفیسر کی ملازمت مل گئی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں باہر جانا ہو گا لیکن ایسا نہیں تھا بلکہ دفتر میں ہی بیٹھ کر منصوبہ بندی، حکمت عملی اور اشاف کے کام کی نگرانی کرنا تھی۔ مارکیٹنگ منیجر رازی صاحب بہت سخت گیر تھے اور کام یا ڈسپن کے سلسلے میں کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ان

کا کہنا تھا کہ کام میں کوئی غلطی ہو جائے تو اسے برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن ڈسپلن پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ وہ میرے کام سے خوش تھے اور مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتے لیکن اگر کبھی دفتر پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلا دیتے۔ اسی لیے میری کوشش ہوتی کہ انہیں شکایت کا موقع نہ دوں، دفتر نو بجے شروع ہوتا تھا اور میرے گھر سے زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کا فاصلہ تھا لیکن میں آٹھ بجے گھر سے نکل جاتی کیونکہ کبھی بس دیر سے ملتی تو کبھی ٹریفک جام کی وجہ سے زیادہ وقت لگتا۔

میری شادی تک سب ٹھیک چلتا رہا لیکن اس کے بعد مشکلات پیش آنے لگیں۔ یہ شادی جن حالات میں ہوئی ان کے بارے میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور امی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو ابو بھی فکر مند رہنے لگے تھے۔ رشتے تو کئی آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے ہم پلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اب ہمارا معیار بدل گیا تھا۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ ایک معقول ملازمت بھی کر رہی تھی۔ شکل و صورت میں کئی ایک سے اچھی تھی اور پہننے اور بھرنے کا سلیقہ بھی تھا۔ دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلتی تو بے شمار ٹکا ہیں میرے چہرے اور جسم میں سوئی کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوتی۔ لہذا ان سب عوامل کے پیش نظر میں اپنے آپ کو بہت اہم محسوس کرنے لگی اور گھر والوں کی طرح میرے ذہن میں بھی یہ سوچ پروان چڑھنے لگی کہ میرا ہونے والا شوہر تعلیم و مرچہ کے لحاظ سے مجھ سے برتر نہیں تو کم تر بھی نہ ہو۔

انہی دنوں خالہ صغریٰ میرے لیے ایک رشتہ لے کر آئیں۔ وہ ہماری دور کی رشتے دار تھیں اور لائسنز ایریا میں رہتی تھیں۔ شہزاد کی ماں سے ان کی پرانی جان پہچان تھی۔ وہ لوگ بفرزون میں رہتے تھے لیکن خالہ صغریٰ نے نارتھ ٹاؤن آباد بنا لیا لیکن میرے گھر والوں کی سادہ لوحی دیکھیے کہ وہ شہزاد کے گھر والوں سے مل کر آگے لیکن انہوں نے خالہ کی غلط بیانی پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بہر حال شہزاد کے بارے میں جو کچھ خالہ نے بتایا۔ اس کے مطابق وہ انجینئر تھے اور کسی کمپنی میں اچھی ملازمت کر رہے تھے۔ دو بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ بظاہر ان میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن وہ عمر میں مجھ سے کم از کم دس سال بڑے تھے۔ چھوٹا قد، گہرا سونو لارنگ، موٹے ہونٹ، پھیلی ہوئی ناک اور جسم قدرے فریبی مائل۔ لیکن میرے گھر

والوں کو ان میں کوئی خامی نظر نہیں آئی بلکہ امی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مرد کی شکل نہیں بلکہ کمائی دیکھی جاتی ہے۔ مجھ سے رائے پوچھی گئی تو میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ سچ تو یہ ہے کہ خود بھی لوگوں کی باتیں سن کر تنگ آ چکی تھی۔ لگتا تھا کہ پورے شہر کو میری شادی کی فکر ستائے جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز رازی صاحب جیسے سنجیدہ شخص نے بھی باتوں باتوں میں کہہ دیا۔ ”مس مہناز! آپ نے کیریئر تو بنا لیا۔ اب گھر بسانے کے بارے میں بھی سوچیں۔“

اسی لیے میں نے شہزاد کے رشتے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ مجھے خوش نہیں تھی کہ تعلیم اور ملازمت نے مجھے اتنا شعور و اعتماد دے دیا ہے کہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہوں لیکن گھر والے میری شادی کے لیے اتنے بے چین تھے کہ انہوں نے شہزاد کے بارے میں رسمی طور پر بھی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور جیسا ہے جہاں ہے کی بنیاد پر انہیں قبول کر لیا گیا۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ لڑکے کے بارے میں دفتر اور محلے والوں سے معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے محلے میں دو گھر چھوڑ کر ایک لڑکی کے رشتے کی بات چل رہی تھی تو لڑکے کی بہنیں ہمارے گھر اس لڑکی کے بارے میں معلومات کرنے آئی تھیں، ایک اور بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ شادی سے پہلے جتنی مرتبہ شہزاد کی ماں ہمارے گھر آئیں تو ان کے ساتھ صرف شادی شدہ بیٹیاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ بھی انہوں نے اپنے دامادوں یا دوسرے کسی رشتے دار مثلاً شہزاد کے ماموں یا چچا کو ساتھ لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن ہمارے گھر والوں نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ انہیں تو بس مجھے گھر سے نکالنے کی جلدی تھی۔

شادی کی پہلی رات ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ شہزاد کا تعلق بھی مردوں کے اس قبیلے سے ہے جو عورت کو انتہائی حقیر اور کم درجے کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ہر لڑکی کے ذہن میں سہاگ رات کا مخصوص تصور ہوتا ہے اور وہ توقع کرتی ہے کہ شوہر اس کے حسن کی تعریف کرنے کے علاوہ اسے مستقبل کے سہانے سننے دکھائے گا اور ہر دکھ سکھ میں اس کا ساتھ نبھانے کا عہد کرے گا لیکن وہ انتہائی غیر رومانٹک ثابت ہوئے۔ انہوں نے میرا گھونگھٹ اٹھانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور میرے قریب آ کر بہت ہی سپاٹ لہجے میں بولے۔

”بہتر ہوگا کہ تم لباس تبدیل کر لو۔ اس کے بعد ہم سکون سے باتیں کر سکیں گے۔“

میرے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ شاید ہی کسی دلہن نے شادی کی پہلی رات اپنے شوہر کی زبان سے ایسا مکالمہ سنا ہو لیکن میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کر لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ زیورات اتار کر ڈبوں میں رکھے اور میک اپ صاف کر کے واپس اپنے بستر پر آگئی۔ اس کے بعد انہوں نے لیکچر دینا شروع کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مجھے اس گھر میں ان کی مرضی اور فیصلوں کا پابند بن کر رہنا ہوگا۔ ان کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں ہوگی اور مجھے ان کا پورا خیال رکھنا ہوگا۔ انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتے۔ ان سے آئے دن میسجے جانے کی فرمائش نہیں کروں گی بلکہ مہینے میں ایک مرتبہ والدین سے مل سکوں گی۔ اگر ان کے پاس وقت ہو تو وہ میرے ساتھ چلے جائیں گے ورنہ مجھے اکیلے ہی جانا ہوگا۔ واپس چھوڑنے کی ذمہ داری میرے گھر والوں کی ہوگی۔ کھانا میں بناؤں گی کیونکہ انہیں نوکروں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا پسند نہیں۔ ماسی صرف کپڑے، برتن دھونے اور جھاڑ پونچھ کے لیے ہوگی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے گھر کے خرچ میں انتہائی کفایت شعاری سے کام لینا ہوگا کیونکہ ان کی آمدنی اتنی نہیں کہ وہ کسی قسم کی فضول خرچی برداشت کر سکیں۔ حیرت انگیز طور پر انہوں نے میری ملازمت کے بارے میں کچھ نہیں کہا ورنہ میں سمجھ رہی تھی کہ اس پر بھی انہیں اعتراض ہوگا۔

شہزاد کا لیکچر سن کر میری طبیعت صاف ہو گئی اور مجھے اپنی آئندہ زندگی کا منظر نامہ واضح طور پر نظر آنے لگا۔ جی میں آیا کہ امی کو فون کر کے اس لیکچر کی کیسٹ انہیں سناؤں اور کہوں کہ یہ ہے شادی کا وہ لڈو جسے کھلانے کے لیے آپ گزشتہ سات آٹھ سال سے بے چین تھیں لیکن یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ ہمارے ملک میں تو تے فیصد عورتیں اسی طرح مردوں کے استحصال کا نشانہ بنتی ہیں۔ مجھے بھی صبر اور سکون کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصے بعد معاملات میرے حق میں بہتر ہو جائیں۔

صبح ناشتے کی میز پر ساس صاحبہ نے تلقین فرمائی۔ ”شہزاد غصے کا تیز ہے۔ اس لیے کوشش کرنا کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہونے پائے ورنہ میں بھی کچھ نہیں کر سکوں

گی۔“

ساس کی بات سن کر میں سمجھ گئی کہ دونوں ماں بیٹا ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں اور مجھے شوہر کے غصے کے ساتھ ساتھ ساس کی منافقت کو بھی برداشت کرنا ہوگا۔ دس بجے کے قریب رواج کے مطابق میسجے والے مجھے لینے آگئے۔ انہیں دیکھ کر شہزاد کا منہ بن گیا لیکن مصلحتاً وہ میری بہنوں اور کزنز سے ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ میں تیار ہونے کمرے میں آئی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آگئے اور غراتے ہوئے بولے۔ ”میں پانچ بجے لینے آؤں گا، تیار رہنا۔ پانچ کا مطلب پانچ ہوتا ہے۔ تم سمجھ رہی ہوتی۔“

میں حیرانی سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی ساتھ جائیں گے لیکن انہوں نے پہلے روز ہی جھنڈی دکھا دی پھر بھی میں نے پوچھ لیا۔ ”آپ ساتھ نہیں جائیں گے؟“

”پاکل ہو گئی ہو۔“ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں کیسے جا سکتا ہوں۔ شام کو ولیمہ ہے اور مجھے ہی سب کچھ دیکھنا ہے۔“

میں نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید ہم بھی نو بیابتا جوڑوں کی طرح شمالی علاقوں کی سیر کے لیے جائیں گے لیکن شہزاد نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ انہیں بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے اور دیے بھی یہ اسراف ہے۔ خواہ تو وہ ہی اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جائیں گے۔

میں دل سوس کر رہ گئی اور تہیہ کر لیا کہ آئندہ اس شخص سے کوئی فرمائش نہیں کروں گی۔ ایک ہفتے بعد ہی ساس صاحبہ نے مجھے گھر کے کاموں میں لگا دیا اور بولیں۔ ”مجھے معلوم ہے کہ پڑھائی اور نوکری کی وجہ سے تمہیں کچھ سیکھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں میں تمہیں سب سکھا دوں گی۔“

میں نے ان پر غلا نہیں کیا کہ مجھے ہر طرح کا کھانا بنانا آتا ہے۔ میں نے اس گھر میں ایک خاموش سامع کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شہزاد اور اس کی ماں کچھ بھی کہتے رہیں لیکن میں کوئی جواب نہیں دوں گی اور نہ ہی اپنی طرف سے کوئی بات کروں گی اور یوں میں نے اس گھر میں ایک باورچن، خادمہ اور شوہر کی ڈانٹ سننے والی بیوی کا روپ دھار لیا۔ میں کام کرنے سے نہیں گھبراتی تھی لیکن شہزاد کی ہر وقت کی لعن طعن نے پریشان کر رکھا تھا۔ غصہ تو

مجھے ناشتا بنانے اور اماں کے لیے روٹیاں پکانے میں کافی وقت لگ جاتا۔ اس طرح مجھے دفتر کے لیے نکلنے میں دیر ہو جاتی جس کی وجہ سے آئے دن رازی صاحب کی جھاڑ سننا پڑتی تھی۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ میں ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچی اور اپنی سیٹ پر بیٹھی دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ بس اب چند منٹ بعد ہی رازی صاحب کا بلاوا آجائے گا اور وہ لفظوں کی بمباری شروع کر دیں گے لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی انٹرکام کی گھنٹی نہیں بجی تو مجھے حیرت ہونے لگی۔ رازی صاحب معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خود ہی دفتر نہ آئے ہوں اور یہ ایک انہونی بات ہوتی کیونکہ میں نے اپنی دو سالہ ملازمت کے دوران انہیں کبھی چھٹی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اونہہ مجھے کیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ میرے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ مجھے دن میں دس مرتبہ رازی صاحب کے پاس جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس روز بھی دس بجے کے قریب میں نے ایک فائل اٹھائی اور ان کے کیمین کی طرف چل دی لیکن دروازہ کھولتے ہی مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ رازی صاحب کی کرسی پر ایک اسپارٹ اور پنڈسم بندہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی تیس بتیس کے قریب ہوگی۔ اس نے سفید شرٹ اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی اور وہ لیپ ٹاپ پر نظر میں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں دروازے پر ہی رک گئی اور سوچنے لگی کہ کہیں میں غلط کیمین میں تو نہیں آگئی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ کیمین میرے لیے اجنبی نہیں تھا اور میں دن میں کئی بار وہاں کا چکر لگاتی تھی۔ پھر میں نے اس بندے کو پہلے کبھی دفتر میں نہیں دیکھا تھا۔ میری آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”پلیز، آجائیے۔“

میں جھپکتے ہوئے آگے بڑھی تو اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”میں تھوڑی دیر بعد آپ لوگوں کو چائے پر بلانے ہی والا تھا۔ اچھا ہوا، آپ خود ہی آئیں۔ باقی لوگوں سے بعد میں مل لوں گا۔“

میں پھر بھی کچھ نہیں سمجھی تو وہ بولا۔ ”پہلے میں اپنا تعارف کروا دوں۔ رازی صاحب کا ٹرانسفر لاہور براچ میں ہو گیا ہے اور ان کی جگہ مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ بات آپ کے علم میں ہوگی۔“

ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اور میرے ہر کام میں کپڑے نکالنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جتنی دیر گھر میں رہے، مسلسل احکامات جاری ہوتے رہتے۔ حالانکہ ان کا دفتر بھی نو بجے شروع ہوتا تھا لیکن انہیں ساڑھے سات بجے ناشتا چاہیے ہوتا۔ میں صبح چھ بجے سے ہی کام میں مصروف ہو جاتی۔ ان کے کپڑے استری کرنا، جوتوں پر پالش کرنا، ناشتا بنانا۔ اس دوران بھی مجھے آوازیں پڑتیں، فلاں ٹائی نہیں مل رہی۔ موزے کہاں رکھ دیے۔ دھلا ہوا رومال دے دو وہ خود ہی اپنی چیزیں ادھر ادھر رکھ دیتے اور ڈھونڈنا مجھے پڑتی تھیں۔ یہاں تک کہ گاڑی کی چابی اور والٹ بھی میں ہی تلاش کر کے دیتی۔ اس بھاگ دوڑ میں چائے ٹھنڈی ہو جاتی تو فرمان جاری ہوتا کہ دوسری چائے بناؤ۔

جب تک وہ گھر میں ہوتے۔ میں گھن چکر بنی رہتی۔ ان کے جانے کے بعد بھی سکون نہ ملتا پھر ساس صاحبہ کا چکر شروع ہو جاتا۔ انہیں ناشتے میں انڈے پراٹھے چاہیے ہوتے تھے۔ دس بجے تک تھوڑی سی فراغت ہوتی تو ساس صاحبہ دوپہر کے کھانے کا مینیو بتا دیتیں۔ چھ بجے کے قریب شہزاد کی واپسی ہوتی تو ان کے لیے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کا اہتمام کرنا ہوتا۔ کبھی سموسے، کبھی پکوڑے تو کبھی سوچی کا حلوا۔ اس کے بعد رات کے کھانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا، ان کا حکم تھا کہ رات نو بجے کھانا لگ جائے۔ اس کے بعد وہ ٹی وی دیکھنے بیٹھ جاتے اور میں برتن سمیٹنے اور کچن صاف کرنے میں لگ جاتی۔ ان سب کاموں سے فراغت ہوتی تو ساس صاحبہ کے کرائے کی آوازیں آنے لگتیں۔ کبھی ناگوں میں درد ہونے لگتا تو کبھی کندھوں میں۔ ان کی خدمت کرنے کے بعد گیارہ بجے کمرے میں آتی تو شہزاد یوں گھورتے جیسے میں کہیں سے تفریح کر کے آرہی ہوں۔ اس کے بعد وہ کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیتے اور میں سوچتی رہ جاتی کہ کیا یہی ہے وہ لڈو جسے کھانے کے لیے ہر لڑکی بے چین رہتی ہے۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں تو میں نے ایک بار پھر دفتر جانا شروع کر دیا۔ اب شہزاد نے ایک نیا حکم جاری کر دیا کہ میں دفتر جانے سے پہلے ان کی اماں کے لیے ناشتا اور دوپہر کا کھانا بنا کر جاؤں۔ اتنے کم وقت میں یہ ممکن نہیں تھا پھر مجھے اپنی تیاری بھی کرنا ہوتی تھی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ میں ساکن رات کو بنا لیتی۔ اس طرح اپنے اور شہزاد کے کپڑے اور جوتوں پر پالش بھی رات کو ہی کر لیتی۔ پھر بھی

”نہیں۔“ میں نے منہ بنا تے ہوئے کہا۔ ”وہ بڑے ریزروڈ آدمی ہیں۔ اپنے معاملات کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔“

”خیر چھوڑیں اس بات کو۔ ہر شخص کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ بہر حال میرا نام شاہد ہے اور مجھے اس پہنی میں کام کرتے ہوئے تقریباً سات سال ہو گئے ہیں۔“ پھر وہ آگے کی طرف تھوڑا سا جھکتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں آپ کا نام اور ڈتے داریوں کے بارے میں جان سکتا ہوں۔“

”مجھے مہناز کہتے ہیں اور اس دفتر میں گزشتہ دو سال سے بطور مارکیٹنگ آفیسر کام کر رہی ہوں۔“

”بہت خوب۔ امید ہے کہ آپ مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دیں گی اور نہ ہی مجھ سے کوئی شکایت ہوگی۔ ہماری کارکردگی اسی وقت بہتر ہو سکتی ہے اگر ایک دوسرے کا احترام کریں۔“

”میں آپ کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔“ یہ کہہ کر میں نے فائل اس کے آگے کر دی۔ اس نے گھنٹی بجا کر چہرہ اسی کو بلایا اور چائے لانے کے لیے کہا۔ یہ ملازمت کے دوران پہلا موقع تھا کہ میں اپنے پاس کے ساتھ چائے لی رہی تھی۔ ورنہ رازی صاحب نے تو کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا۔ وہ صرف کام لینا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا جانتے تھے۔

اس نے فائل کا بغور جائزہ لیا اور بولا۔ ”سارا کام تو آپ نے کر ہی لیا ہے مجھے اس پر پوزل میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔“ یہ کہہ کر اس نے فائل واپس کر دی اور بولا۔ ”گواہیڈ۔“

جب میں واپس جانے کے لیے اٹھنے لگی تو اس نے ایک بار مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مس مہناز!“

”مس نہیں سزا!“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ادہ سوری، مجھے پہلے ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔“ وہ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بہتر ہوگا کہ آپ مسلسل مجھ سے رابطے میں رہیں تاکہ کام میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ جب چاہیں اور جتنی بار چاہیں، میرے پاس آ سکتی ہیں۔“

میں اس کا شکر یہ ادا کر کے اپنی سیٹ پر آگئی اور سوچنے لگی کہ میں ایک گھنٹا تاخیر سے آئی اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔ ایسا بے خبر آدمی اس دفتر میں نہیں چل سکتا کیونکہ یہاں

کام کرنے والے ڈنڈے کے یار تھے اور انہیں رازی صاحب جیسا شخص ہی ٹھیک کر سکتا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے معلوم ہو لیکن اس نے پہلے روز باز پرس کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ خیر مجھے اس سے کیا۔ وہ دن تو حیرت سے گزر گیا بعد میں جو گا دیکھا جائے گا۔

لنچ ٹائم میں معلوم ہوا کہ وہ اتنا سیدھا اور شریف نہیں تھا جیسا کہ میں سمجھ رہی تھی۔ اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو اس نے اپنے کمرے میں بلا کر فرداً فرداً انٹرویو کیے اور ان سے کام کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کیے۔ میرے ایک کولیک ارشد کا موڈ بہت آف تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”یہ بندہ تو رازی صاحب سے بھی دو ہاتھ آگے معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ بھی ڈرا دھمکا کر کام لینے کا عادی ہے۔“

ان لوگوں کی باتیں سن کر میں سوچ میں پڑ گئی اور مجھے اس کے کہے ہوئے الفاظ میں دھمکی کا عنصر نظر آنے لگا۔ ”امید ہے کہ آپ مجھے شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔“ مجھے کام کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی البتہ دیر سے دفتر پہنچنا میری کمزوری تھی اور یہی اس کی شکایت کا سبب بن سکتی تھی۔ پہلے دن تو اس نے کچھ نہیں کہا لیکن شاید آئندہ وہ درگزر نہ کرے۔ اس کا واحد حل یہی تھا کہ میں صبح اور جلدی بستر چھوڑ دوں تاکہ مجھے اپنے کام نمٹانے کے لیے مزید وقت مل جائے۔ چنانچہ میں نے گھڑی میں ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگایا اور سو گئی۔

الارم کی آواز نے مجھے ہی نہیں بلکہ شہزاد کو بھی جگا دیا۔ وہ وقت سے پہلے آنکھ کھلنے پر آگ بگولا ہو گئے اور جھلاتے ہوئے بولے۔ ”اتنی جلدی کیوں اٹھ گئیں؟ ایسی کیا قیامت پڑ گئی؟“

مجھے جواب دینے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے خاموشی سے الارم آف کیا اور ہاتھ روم میں کھس گئی۔ اس روز کام وقت پر ختم ہو گیا اور میں بھی چند منٹ پہلے ہی دفتر پہنچ گئی۔ لیکن اس روز سارا دن میری طبیعت ہی کسلندی رہی۔ کام میں بھی دل نہیں لگا اور بے چینی سے چھٹی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ گھر جا کر بھی آرام نہیں ملے گا۔ سب کاموں سے فارغ ہوتے ہوتے گیارہ بج جائیں گے۔ اس کے بعد سونا نصیب ہوگا اب مجھے امی کی بات یاد آرہی تھی کہ ملازمت کرنے والی عورت برڈ ہری ڈتے داری آ جاتی ہے۔ وہ کام بھی کرے اور گھر بھی

سنجالے۔ اوپر سے سب کی نظریں اس کے پیسوں پر رہتی ہیں۔

جی ہاں، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شادی کے بعد پہلی گرمیاں آئیں تو میں اپنے لیے کچھ لون کے سوٹ خریدنے گئی۔ شہزاد بھی میرے ساتھ تھے۔ میرا ہاتھ ہمیشہ سے کھلا ہوا ہے میں کبھی قیمت کی پروا نہیں کرتی۔ ہمیشہ اچھی اور معیاری چیزیں خریدتی ہوں۔ اس روز بھی میں نے دل کھول کر شاپنگ کی۔ اپنے لیے چار سوٹ، دو جوڑی سینڈل، کچھ میک اپ کا سامان، شہزاد کے لیے ایک برانڈڈ شلوار سوٹ اور ساس صاحبہ کے لیے بھی دو جوڑے خریدے۔ اس طرح میں نے کوئی پندرہ بیس ہزار کی شاپنگ کر ڈالی۔ شہزاد حیرت سے مجھے خرچ کرتا ہوا دیکھتے رہے۔ گھر آ کر بولے۔ ”تم کچھ بچاتی بھی ہو یا ساری تنخواہ یونہی اڑا دیتی ہو؟“

میں نے معصوم صورت بناتے ہوئے کہا۔ ”اتنی مہنگائی ہے۔ کچھ نہیں بچتا۔“

”یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں مستقبل کے لیے کچھ بچت کرنا چاہیے۔ کسی وقت بھی کوئی ایمر جنسی ہو سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، آج میں نے تمہیں جس طرح خرچ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے بعد مجھے یقین نہیں کہ تم کچھ بچا سکو۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اپنی چیک بک اور اے ٹی ایم کارڈ میرے حوالے کر دو، تمہیں اپنی ضرورت کے لیے جتنے پیسوں کی ضرورت ہو۔ وہ نکال لینا۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس طرح تو میں آپ کی محتاج ہو کر رہ جاؤں گی۔“

”اگر تمہاری ملازمت نہ ہوتی تب بھی میری محتاج ہی ہوتیں۔ اسے میری مہربانی سمجھو کہ تمہیں ملازمت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ورنہ یہ اللے تلے نہ ہوتے۔ ویسے بھی میان بیوی کا پیسا الگ نہیں ہوتا۔ میرے پاس ہوں گے تو کل کو تمہارے ہی کام آئیں گے۔“

میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسی صورت میں مجھے گھر کا راستہ دکھا دیں گے۔ میری ساس ہر وقت ڈراتی رہتی تھیں کہ شہزاد غصے کے بہت تیز ہیں اور اگر میں نے ان کی نافرمانی یا حکم عدولی کی تو وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ میں طلاق کا ٹیکہ ماتھے پر سجائے

والدین کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس معاشرہ میں طلاق یافتہ عورت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے مجھے اپنا گھر بچانے کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔ اور میں نے وہ دونوں چیزیں شہزاد کے حوالے کر دیں۔ اس طرح مجھ میں اور میرے گھر کام کرنے والی ماسی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ وہ چار گھروں میں کام کر کے جو کمائی۔ اس کا ٹکٹو شوہر سب چھین لیتا اور وہ غریب مانگ تا نگ کر مہینا پورا کرتی۔ اب مجھے شہزاد کی چالاکی سمجھ میں آئی۔ ان کی نظر پہلے دن سے ہی میری تنخواہ پر تھی۔ اسی لیے انہوں نے میرے مچکے جانے پر پابندی لگائی۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ میں اپنی آمدنی میں سے گھر والوں کو کچھ نہ دے دوں جبکہ انہیں میرے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پھر انہیں میرا خرچ کرنا بھی برا لگنے لگا اور انہوں نے بڑی ہوشیاری سے بچت کا بہانہ کر کے میرے اکاؤنٹ پر قبضہ کر لیا۔

میرے حالات دن بہ دن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ شہزاد نے ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس لیے مجھے دفتر پہنچنے میں دوبارہ دیر ہونے لگی اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس روز میں حسب معمول آدھ گھنٹا تاخیر سے دفتر پہنچی۔ دس بجے شاہد نے بلا لیا۔ اس روز وہ کچھ اکڑا اکڑا دکھائی دیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں خود ہی کرسی تھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ایک قائل دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے قائل بند کی اور گنہگار لہجے میں بولا۔

”مسز مہناز، میں نے بہت کوشش کی کہ اس تکلیف دہ موضوع پر گفتگو کرنے کی نوبت نہ آئے لیکن آپ کے طرز عمل نے مجھے اس کا نوٹس لینے پر مجبور کر دیا ہے۔“

”میں کچھ بھی نہیں سر۔“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

”حالانکہ آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”مجھے کام کے سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن آپ کے دیر سے آنے کی عادت نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شادی شدہ عورتوں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں اب تک نظر انداز کرتا رہا۔ لیکن اس سے دفتر کے ڈسپلن پر اثر پڑ رہا ہے۔ اگر آپ کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی دیر سے آنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا؟“

میں شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا کروں سر!“

کوشش تو کرتی ہوں لیکن دیر ہی ہو جاتی ہے۔“

”مجھے آپ کی مشکلات کا اندازہ ہے۔“ وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ کام رات میں ہی کر لیا کریں۔ مثلاً کپڑوں پر استری وغیرہ۔“

”وہ تو میں رات میں ہی کر لیتی ہوں۔ اس کے بعد بھی صبح میں بہت سے کام ہوتے ہیں۔ پہلے شوہر کو ناشتا دیتی ہوں پھر ساس کے لیے ناشتا اور دوپہر کی روٹیاں پکاتی ہوں۔ اس کے بعد اگر کچھ وقت بچ جائے تو خود ناشتا کرتی ہوں۔ ورنہ کبھی کبھی تو چائے کی پیالی بھی نصیب نہیں ہوتی۔“ میں روانی میں کہتی چلی گئی جبکہ مجھے ایک اجنبی کے سامنے اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا۔

اس کا بھی حوصلہ بڑھ گیا اور وہ کریدنے کی خاطر بولا۔ ”کیا آپ کی ساس خدا نخواستہ معذور یا بیمار ہیں کہ وہ اپنے لیے دو روٹیاں بھی نہیں ڈال سکتیں۔“

”سوری سر، اس سے زیادہ کھل کر بات نہیں کر سکتی۔ کوشش کروں گی کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔“

”آپ کچھ نہ کہیں تب بھی میں سب سمجھ چکا ہوں۔ بہر حال یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں مزید تفصیل جاننے پر اصرار نہیں کروں گا۔“ وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

اسی وقت میرے پیروں پر چیونٹی ریگتی محسوس ہوئی۔ میں ذرا سا جھکی تو دوپٹے کا پلو کندھے سے ڈھلک گیا۔ اس روز میں نے کھلے کھلے کی قمیص پہن رکھی تھی۔ جب تک میں دوبارہ پلو سر پر ڈالتی۔ بہت کچھ عیاں ہو گیا۔ وہ وارنٹی کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں مجھے اسے جسم میں گڑنی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں جانے کے لیے اٹھنے لگی تو وہ بولا۔ ”ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آرام سے بیٹھیں۔ ابھی ہم نے کام کی بات تو کوئی نہیں کی۔ میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔“

اسے ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ بہر حال وہ میرا پاس تھا۔ اسے خوش رکھنا ضروری تھا بلکہ اسے خوش رکھنے میں ہی میرا فائدہ تھا۔ چائے پینے کے دوران مجھے اس کی نظریں بدلی بدلی محسوس ہوئیں۔ عورت کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے اور وہ مرد کی نظروں کا مفہوم سمجھنے میں دیر نہیں لگاتی۔ پانچ منٹ میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری ذات میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس نے مجھے کام کے بہانے روکا تھا لیکن ایک گھنٹے تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا تو مجھے پکا

یقین ہو گیا کہ وہ محض مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھنا چاہ رہا تھا یہی وہ وقت تھا کہ میں پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی نگاہ التفات کے جواب میں بے رخی اختیار کر لیتی۔ لیکن میں نے اس کی کمزوری کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس روز شاہد نے مجھے کام کے بہانے کئی مرتبہ بلا یا، کام تو کیا ہونا تھا۔ مجھے پاس بٹھانے کا بہانہ تھا۔ میں نے کوئی حیل و حجت نہیں کی اور اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ میں نے اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس کا بار بار بلانا مجھے ناگوار گزر رہا ہے۔ بلکہ ہر بار اٹھلاتی مسکراتی اس کے کمرے میں گئی اور خوش گوار موڈ میں اس سے باتیں کرتی رہی۔ اس دوران کئی بار میرا پلو ڈھلکا۔ کئی بار میں آگے کی طرف جھکی اور اسے پورا موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے ذوق نظر کی تسکین کرے۔ دراصل میں جانتا چاہ رہی تھی کہ جو کچھ سمجھ رہی ہوں۔ کیا واقعی ایسا ہے اور شام تک اس شبہ کی تصدیق ہوگئی کہ وہ مجھ پر مر مٹا ہے یا فلٹ کر نا چاہ رہا ہے گو کہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی بے باک نگاہوں نے بہت کچھ بتا دیا چنانچہ میں نے اس کھیل کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور سوچ لیا کہ اگر اس نے پیش قدمی کی تو مزاحمت نہیں کروں گی۔

اس فیصلے کے پیش نظر دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ کہ میں اس کی منظور نظر بن کر زیادہ سے زیادہ رعایتیں حاصل کر سکتی تھی۔ پھر میرے دیر سے آنے پر بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کام کے سلسلے میں چھوٹی موٹی غلطیاں نظر انداز کر دی جاتیں اور پر دوشن کا امکان بڑھ جاتا۔ پاس اگر ٹھنسی میں ہو تو نوکری حلوا ہو جاتی ہے اور جب قدرت مجھے ایک موقع فراہم کر رہی تھی تو میں اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھاتی۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ جس والہانہ انداز میں میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے امید ہو چلی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ خوشگوار وقت گزار سکوں گی۔ اب تک میری ٹھن زودہ زندگی محرومی میں گزر رہی تھی۔ میں نے شادی کے بعد کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی اور ایک ایسی مزدور عورت کی طرح زندگی کے دن گزار رہی تھی جس سے ڈہری مشقت لی جا رہی ہو اور ستم یہ کہ میری کمائی پر بھی شوہر نے قبضہ کر رکھا تھا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ میرے پاس موبائل میں کارڈ ڈلوانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ایک دو مرتبہ شہزاد سے پیسے مانگے تو انہوں نے فضول خرچ ہونے کا طعنہ دے دیا۔

ایک دو مرتبہ خیال آیا کہ اس طرح میں شہزاد سے بے

وفائی کی مرکب ہو رہی ہوں لیکن میرے خیال میں کسی مرد سے ہنس بول کر باتیں کر لینا کوئی جرم نہیں تھا۔ مرد بھی تو غیر لڑکیوں سے آزادانہ اور بے جھجکاؤ گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی پاک دامنی پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ اور نہ ہی ان کی عزت میں کوئی کمی آتی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ شہزادوں بھر کیا کرتے پھرتے ہیں اور ان کے کتنی عورتوں سے تعلقات ہیں۔ جب وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتے تھے تو مجھے بھی حق تھا کہ اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹ سکوں۔

دوسرے دن میں نے تیار ہونے میں خاص اہتمام کیا۔ ورنہ شادی کے بعد سے تو میں نے اپنے آپ پر توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی۔ کس کے لیے بناؤ سنگھار کرتی۔ شوہر کو تو ڈانٹ ڈپٹ کرنے اور طعنے دینے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔ ایسے بے حس شخص کے لیے کیا تیاری کرتی۔ اب کسی نے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیا تھا تو مجھے بھی اپنے آپ پر توجہ دینے کا خیال آیا۔ میں نے آسمانی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا۔ بالوں کو برش کر کے کندھوں پر کھلا چھوڑ دیا اور ہلکا سا میک اپ کر کے دفتر کے لیے روانہ ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ راستے میں کئی لوگوں نے مجھے غور سے دیکھا اور دفتر میں بھی لوگ مجھے اس روپ میں دیکھ کر چونک گئے۔ لیکن میرا اصل ٹارگٹ تو شاہد تھا جس کے بلاوے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ دس بجے کے قریب انٹرکام کی کھنٹی بجی۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں بلا رہا تھا۔ میں نے فائلیں اٹھائیں اور لہرائی بل کھاتی اس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے چونک کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”گڈ چینج۔“

میں نے شرمانے کی ایکٹنگ کی تو وہ کہنے لگا۔ ”اچھی لگ رہی ہیں اسی طرح رہا کریں۔“

میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”جب دل ہی مرجھا جائے تو کس کے لیے بناؤ سنگھار کروں؟“

”مجھے اندازہ ہے کہ آپ کن حالات سے گزر رہی ہیں۔ جب تک آپ خوف کے حصار سے باہر نہیں آئیں گی۔ آپ کا اسی طرح استحصال ہوتا رہے گا۔“

وہ مجھے بغاوت کی ترغیب دے رہا تھا لیکن مجھ میں اتنا بڑا قدم اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ”نوسر، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آپ نہیں جانتے کہ اس کے کتنے خوفناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔“

”جنگ میں فتح اور شکست کا امکان برابر برابر ہوتا ہے۔ آپ تو جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی شکست تسلیم

کر رہی ہیں۔“

”میں کیا کروں سر، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“

”کچھ نہیں، کسی بھی راستے پر چلنے کے لیے پہلا قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے۔ فی الحال جیسا چل رہا ہے۔ چلنے دیں۔ البتہ گھر سے باہر جو وقت گزرے۔ اس سے پوری طرح انجوائے کریں۔ اس طرح آپ کا اعتماد بحال ہوگا اور آپ بے خوفی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر سکیں گی۔“

”سر! یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں اس کا مطلب سمجھتے ہوئے انجان بن کر بولی۔ ”میں یہاں کام کرنے آتی ہوں اور چھٹی کے بعد سیدھی گھر چلی جاتی ہوں۔ مجھے زندگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع کب اور کیسے مل سکتا ہے؟“

”یہ میں آپ کو بتاؤں گا۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”پہلے آپ یہ تو طے کر لیں کہ جو راستہ دکھا رہا ہوں۔ آپ اس پر چلنے کے لیے تیار ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن فی الحال کسی محاذ آرائی کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”بس میں جیسا کہوں، وہ کرنی جائیں لیکن اس کے لیے آپ کو مجھے اپنے حالات تفصیل سے بتانا ہوں گے تاکہ ان کی روشنی میں آپ کو گائیڈ کر سکوں۔“

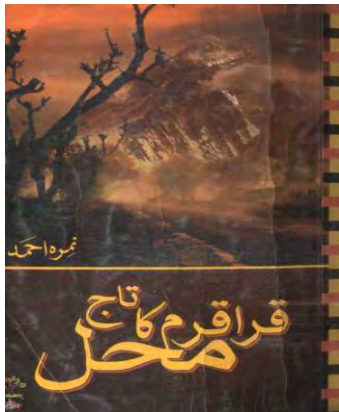
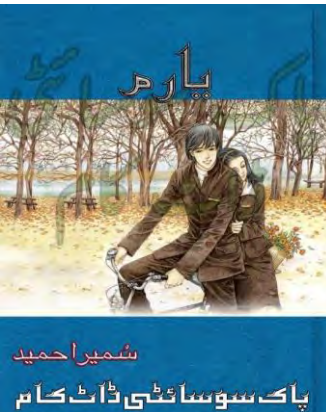
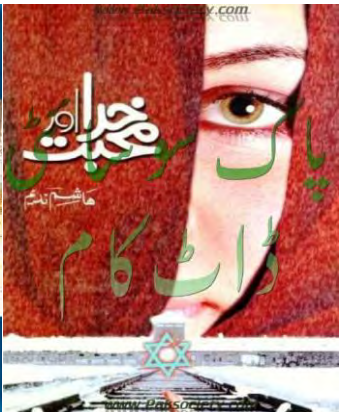
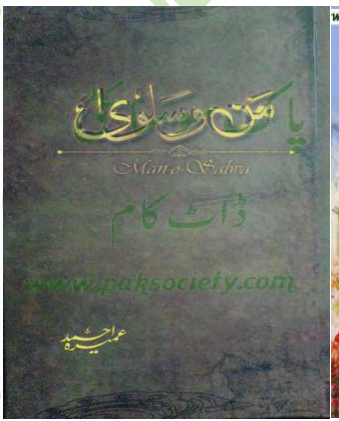
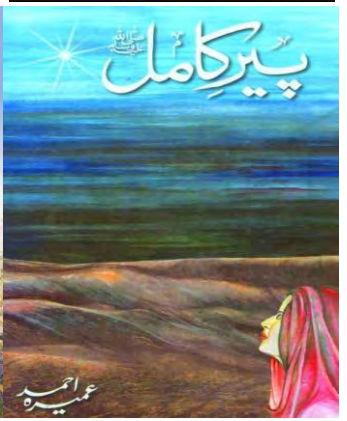
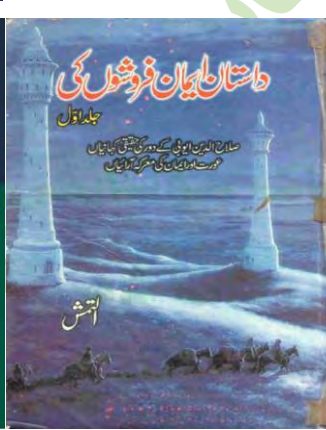
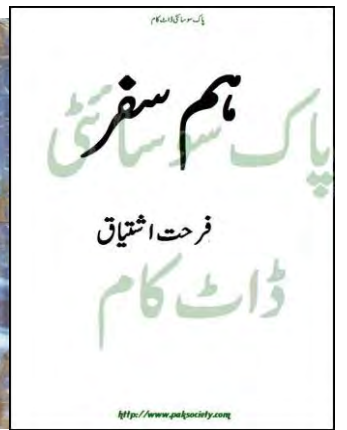
میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتی ہیں۔ آپ کا ہر راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔“

میں پھر بھی خاموش رہی تو اس نے کہا۔ ”آپ شاید یہاں بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہیں۔ ٹھیک ہے میں کل ایک کلائنٹ سے میٹنگ رکھ لیتا ہوں۔ واپسی پر ہم کسی ریسٹوران میں لینچ کریں گے۔ وہیں باقی باتیں بھی ہو جائیں گی۔“

اس کی تجویز سن کر میں تھوڑی سی پریشان ہو گئی کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی میٹنگ کے سلسلے میں دفتر سے باہر نہیں گئی تھی۔ رازی صاحب خود ہی سارے معاملات نمٹا لیتے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ پاس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی ہو۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ مناسب رہے گا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

”دراصل یہ آپ ہی کا کام ہے۔ رازی صاحب کو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



سانے رہنے کا شوق تھا۔ اس لیے وہ خود میٹنگ میں چلے جاتے تھے ورنہ اصولاً تو آپ کو جانا چاہیے تھا۔ اب آئندہ سے آپ ہی میٹنگ میں جایا کریں گی۔ میں ایک دو دفعہ آپ کے ساتھ چلا جاؤں گا۔“

اس نے بڑی ہوشیاری سے میرے دفتر سے باہر جانے کا بندوبست کر لیا۔ اب میں بلا روک ٹوک میٹنگ کے بہانے کہیں بھی جاسکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے سہ پہر میں تمام اشاف کو بلایا اور انہیں بھی بتا دیا کہ اب سز مہناز کلائنٹ سے میٹنگ کیا کریں گی۔ لہذا ان کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔ اشاف کے لوگوں کے لیے بھی یہ ایک حیرت انگیز اطلاع تھی لیکن کوئی کچھ نہیں بولا اور نہ ہی ان کا اس معاملے سے کوئی تعلق تھا۔ البتہ وہ حیران ضرور ہوئے ہوں گے کہ مجھے اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔

رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو ذہن انہی خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دل اور دماغ میں کشمکش چل رہی تھی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ یہ شوہر سے بے وفائی ہے اور کسی غیر مرد کا عورت سے خلوت میں ملنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ جبکہ دل بناوٹ پر آمادہ تھا کہ یہ بے وفائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ سے ہمدردی کر رہا ہے اور میری مدد کرنے پر آمادہ ہے تو مجھے اس کی پیشکش قبول کر لینا چاہیے۔ میں اس ٹھن اور جس زدہ ماحول سے فرار چاہ رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر حالات اسی سٹیج پر چلتے رہے تو کسی بھی وقت میرے دماغ کی رگ پھٹ سکتی ہے۔ بہر حال دل نے دماغ کی ہر دلیل مسترد کر دی اور میں نے شاہد کے مشوروں پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن ایک بار پھر میں بن سنور کرتیار ہوئی۔ لگتا تھا جیسے دفتر نہیں بلکہ ڈیٹ پر جا رہی ہوں اور حقیقت بھی یہی تھی میٹنگ کا تو بہانہ تھا۔ میں واقعی شاہد کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی تھی۔ دفتر پہنچ کر میں نے متعلقہ اشاف سے میٹنگ کے بارے میں بریفنگ لی اور گیارہ بجے کے قریب شاہد کے ہمراہ میٹنگ کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہ خود ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں برابر والی نشست پر بیٹھ گئی۔ میرا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی نئی نویلی محبوبہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہو۔ شاہد نے کار اشارت کرنے سے پہلے تعریفی نظروں سے میری جانب دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔ ”آج تو آپ غضب ڈھا رہی ہیں۔“

میں بری طرح شرما گئی۔ اس سے پہلے کسی مرد نے

میری اس طرح تعریف نہیں کی تھی۔ شوہر تو انتہائی غیر رومانٹک واقع ہوئے تھے۔ انہیں اس طرح کے جملے بولنا نہیں آتے تھے اور اگر آتے بھی ہوں گے تو کم از کم انہوں نے میرے لیے ایسا کوئی جملہ نہیں بولا۔ میٹنگ مقررہ وقت پر شروع ہوئی اور ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہو گئی اور شاہد لچکے کے لیے مجھے کلفٹن پر واقع ایک ریسٹوران میں لے گیا۔ اس وقت وہاں بہت کم لوگ تھے۔ اس نے بیٹھنے کے لیے اور نسبتاً مہر سکون گوشہ منتخب کیا اور میرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے بعد مجھ سے بولا۔ ”جی، اب بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا مسائل ہیں؟“

میں نے اے الف سے لے کر یے تک پوری کہانی سنا دی اور شادی کے بعد سے اب تک مجھ پر جو گزر رہی تھی وہ سب بلا کم و کاست بیان کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”واقعی آپ بڑے مشکل حالات سے گزر رہی ہیں۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات کیا ہوگی کہ آپ کی محنت کی کمائی بھی وہ اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔“

”کس کس زیادتی کا ذکر کروں۔“ میں منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ”میری زندگی تو ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس سے علیحدگی اختیار کر لوں۔“

”نہیں، اتنی جلدی کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے حالات بھی ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ رک گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”آپ نے کبھی اپنے شوہر سے ملازمت چھوڑنے کی بات کی ہے۔“

”نہیں۔“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”بس تو پھر پہلے آپ یہی پتا پھینک کر دیکھیں۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے اس کا ریوئل تو معلوم ہو جائے۔“

اس کے بعد کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہم نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ پھر اس نے آئس کریم منگوائی۔ پھر وہ بولا۔ ”مجھے آپ کے شوہر کی قسمت پر رشک آتا ہے لیکن وہ بہت ناشکر انسان ہے۔ اگر میری بیوی آپ جیسی ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں دھو کر پیتا۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ میرے بھی ایسے ہی جذبات ہیں۔ کاش تم میرے شوہر ہوتے تو زندگی کتنی آسان ہو جاتی لیکن یہ بات میری زبان پر نہ آسکی۔ اس کے ساتھ بیٹھنا

بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وقت یہیں ختم جائے اور میں اسے دیکھتی رہوں، لیکن کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے اٹھنا پڑ گیا۔

اس روز شام کو گھر آنے کے بعد میں نے پلان کے مطابق لباس تبدیل کیا اور پگن میں جانے کی بجائے بستر پر لیٹ گئی شہزاد دفتر سے آچکے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے وہیں سے چلا تے ہوئے کہا۔ ”ارے بھئی، کیا بات ہے۔ چائے کیوں نہیں بنی اب تک؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ غصے میں بھرے ہوئے بیڈروم تک آئے اور مجھے بستر پر لیٹا ہوا دیکھ کر ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولے۔ ”کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ہاں۔“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”سر اور ٹانگوں میں شدید درد ہو رہا ہے۔ دفتر میں کام زیادہ تھا اور واپسی میں کھڑے ہو کر آنا پڑا۔ پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔“ ”ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔ میں امی سے کہتا ہوں۔ وہ چائے بنا لیں گی۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے چادر تان لی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ کھانا بھی ساس نے ہی بنایا۔ رات کو جب وہ کمرے میں آئے اور انہوں نے میرا حال پوچھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اب تو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن بستر سے اٹھنے کی ہمت نہیں۔“ ”میرا خیال ہے کہ تم تھوڑا سا کھانا کھا لو۔ اس کے بعد کوئی ٹیبلٹ لے لیتا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولے۔ ”تم دو چار دن کی چھٹی لے لو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ ”دفتر میں کام بہت زیادہ ہے۔“ میں نے لہجے میں بے چارگی سموتے ہوئے کہا۔ ”چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں تو سوچ رہی ہوں کہ چاب ہی چھوڑ دوں۔ اب مجھ سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ سارا دن دفتر میں سرکھاؤ۔ شام کو گھر کے کام کرو۔ میرے تو اعصاب جواب دیتے جا رہے ہیں۔“ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ مضطرب لہجے میں بولے۔ ”اگر تم نے ملازمت چھوڑ دی تو گزارہ کیسے ہوگا؟“

”جیسے پہلے ہو رہا تھا۔“ میں نے بے رنجی سے کہا۔ ”آخر ان گھروں میں بھی تو لوگ زندہ ہیں جہاں عورتیں ملازمت نہیں کرتیں۔“

”تم جانتی ہو کہ میری تنخواہ اتنی نہیں کہ تمام اخراجات برداشت کر سکوں۔ چند ماہ کی بات اور ہے میری پروموشن ہو جائے تو بے شک چاب چھوڑ دینا۔ تم چاہو تو کھانا پکانے کے لیے کوئی ملازمہ رکھ سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے، آپ کہتے ہیں تو یہی سہی لیکن میں بہت تھک چکی ہوں اور میرے لیے زیادہ عرصہ چاب کرنا ممکن نہیں۔ آپ کی پروموشن کے بعد میں گھر بیٹھ جاؤں گی۔“ ”جیسے تمہاری مرضی لیکن فی الحال تم کسی ملازمہ کا بندوبست کر لو تا کہ تمہارا ابو جھ کچھ کم ہو جائے۔“

دوسرے دن میں نے شاہد کو یہ بات بتائی تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میرا اندازہ درست نکلا۔ اسے تم سے نہیں بلکہ تمہاری تنخواہ سے دلچسپی ہے۔ اب آپ اس صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کر سکتی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”پروموشن تو ایک بہانہ ہے۔ وہ کبھی بھی آپ کو ملازمت چھوڑنے نہیں دے گا۔ البتہ اس کے عوض آپ کو چھوٹی موٹی رعایتیں ملتی رہیں گی جیسے کل آپ نے کام کی زیادتی کا شکوہ کیا تو اس نے فوراً ہی ملازمہ رکھنے کی بات کر دی۔ اب اس کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری بات لکھ لیں کہ اس کے رویے میں مزید بہتری آتی جائے گی۔“

شاہد کا کہنا حرف بحرف درست ثابت ہوا۔ نہ صرف ملازمہ رکھ لی گئی بلکہ شہزاد نے اپنے کام خود کرنا شروع کر دیے۔ اس طرح مجھے اس کے کپڑے استری کرنے اور جوتے پالش کرنے سے بھی نجات مل گئی۔ اب میرے پاس شام میں کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ میں صرف رات کو کھانا گرم کر کے میز پر رکھ دیتی اور دو چار برتن دھو کر فارغ ہو جاتی۔ صبح کو بھی صرف ناشتا بنانا ہوتا تھا۔ اس طرح مجھے کافی سکون مل گیا لیکن میرے دل میں شہزاد کی وقعت اور کم ہو گئی۔ شاہد کی بات میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی کہ شہزاد کو تم سے نہیں بلکہ تمہاری تنخواہ سے دلچسپی ہے۔

اب میں بیک وقت دو مردوں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ شہزاد کو میں نے نوکری چھوڑنے کی دھمکی دے کر اپنے لیے بہت سی رعایتیں حاصل کر لی تھیں۔ اس کا رویہ بھی پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ دوسری طرف شاہد پوری طرح میرے حسن کا اسیر ہو چکا تھا اس کی واری دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ دیر سے دفتر آتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا تھا بلکہ بات اس سے بھی آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن!

میٹنگ کے بہانے اپنے ساتھ باہر لے جاتا۔ کسی اچھے ریستوران میں لہجے کروانا اور ہم ایک دو گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد واپس آ جاتے۔

ایک دن میں دفتر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر آئی تو شاہد وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس طرف کیسے آ گیا تو اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”میں اسی راستے سے گزرتا ہوں۔ آج سوچا کہ آپ کو بھی ساتھ لے لوں۔“

”آپ نے ناحق تکلیف کی۔ میں بس سے چلی جاتی ہوں۔“ میں نے رسماً کہا حالانکہ دل میں خوش ہو رہی تھی کہ چلو کم از کم ایک دن تو بس کے دھکے کھانے سے نجات ملی۔

”تکلیف کیسی۔ مجھے تو خوشی ہے کہ آپ کے کسی کام آسکا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ میری تو خواہش ہے کہ آپ روزانہ میرے ساتھ جایا کریں۔“

”جی نہیں۔ کسی نے دیکھ لیا تو میرا تماشا بن جائے گا۔“

”اگر لوگوں کا اتنا ہی ڈر ہے تو چہرے پر نقاب ڈال لیا کریں۔ کوئی نہیں پہچان سکے گا کہ میرے ساتھ کون خاتون سفر کر رہی ہیں۔“

اس کی تجویز مقبول تھی۔ چادر تو میں ویسے بھی لیتی تھی۔ اب میں نے اسی کے ایک کونے کو نقاب کی طرح چہرے پر لینا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ کار میں جانے لگی۔ واپسی میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا البتہ یہ احتیاط ضرور کرتی کہ پہلے میں دفتر سے نکل کر پیدل چلتی ہوئی بس اسٹاپ تک آتی اور وہ دس پندرہ منٹ بعد آتا تھا۔ اکثر یہ بھی ہونے لگا کہ واپسی میں ہم تھوڑی دیر کے لیے کسی ریستوران یا آکس کریم پارلر پر رک جاتے کیونکہ اب مجھے بس سے سفر نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے میں چالیس منٹ بیٹھ جاتی تھی اور اگر گھر پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو بھی جاتی تو دفتر میں کام کرنے کی زیادتی کا بہانہ موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ دو تین مرتبہ ڈیفنس میں بنے ہوئے منی سینما میں بھی جا چکی تھی۔ اس طرح میں رفتہ رفتہ اس کے سحر میں ڈوبتی چلی گئی اور شہزاد میرے لیے ثانوی ہو گیا جس کی حیثیت ایک شوپس سے زیادہ نہ تھی۔

ایک دن میں نے باتوں باتوں میں اس سے ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھا تو وہ دھمی لہجے میں بولا۔ ”میرا حال بھی آپ سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ دیکھنے میں خوش باش اور زندہ دل نظر آتا ہوں لیکن اندر سے بہت دہمی ہوں۔“

شاید آپ کے علم میں ہو کہ میں بھی شادی شدہ ہوں لیکن میری ازدواجی زندگی بہت بری گزر رہی ہے۔ والدین نے اپنی مرضی سے میری شادی کی تھی۔ رشتے میں وہ میری کزن ہے۔ کہنے کو وہ گریجویٹ ہے لیکن میری نظر میں جاہلوں سے بدتر ہے۔ اسے کھانے پینے اور پہننے اور بھیننے کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ بات بات پر لڑنا جھگڑنا اس کا معمول ہے۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی وہ لڑ جھگڑ کر میرے گھر والوں سے الگ ہو گئی لیکن پھر بھی اسے چین نہیں آیا۔ اب بھی مجھ سے لڑ جھگڑ کر میسے گئی ہوئی ہے۔ چھ مہینے ہو گئے ہیں لیکن آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ میں شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتا ہوں۔ البتہ آپ سے ملنے کے بعد میرا یہ احساس محرومی کسی حد تک دور ہو گیا ہے۔ کاش آپ مجھے پہلے مل جاتیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہم ریستوران کے کیمین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جہاں مکمل پرائیویسی تھی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی تو اس کی جسارت بڑھ گئی۔ وہ میری زلفوں سے کھیلنے لگا پھر اس نے میری گردن کے گرد بازو ڈال کر مجھے اپنے سے قریب کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرتا۔ ہیرے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میں فوراً ہی سنبھل گئی۔

شاہد کے حالات جاننے کے بعد مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ پہلے وہ میرا ہمدرد تھا۔ اب میں اس کی ہمدرد، مونس و غم گسار اور نہ جانے کیا کچھ بن گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کا حصہ معلوم ہونے لگا جب شام کو وہ مجھے گھر کے پاس اتارتا تو جی چاہتا کہوں مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ جب تک اس کی بیوی کا پتا صاف نہ ہو جائے اور مجھے شہزاد سے طلاق نہ مل جائے۔ ہمارا ملاپ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان دونوں مجاذوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔ میں چھٹی دیر شاہد کے پاس بیٹھتی، اس کے حالات پر ہمدردی کرتی رہتی۔ اس کی بیوی کو برا بھلا کہتی کہ اس نے شاہد جیسے ہیرے کی قدر نہیں کی۔ جواب میں وہ بھی میری تعریفوں کے پل باندھ دیتا۔ اور ہمیشہ ایک ہی جملہ دہراتا کہ کاش میں اسے پہلے مل گئی ہوتی۔

دوسری جانب میرا رویہ شہزاد کے ساتھ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ مجھے اس کی شکل بری لگنے لگی تھی۔ پہلے وہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرتا اور لعن طعن کیا کرتا تھا۔ اب میں اسے

بات بات پر جھڑکنے لگی تھی۔ میرے دل سے اس کا ڈر خوف نکل گیا تھا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ اگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ اب میرے پاس اس کا متبادل شاہد کی صورت میں موجود تھا۔ اگر شہزاد میری زندگی سے نکل جاتا تو یہ آسانی شاہد سے شادی کر سکتی تھی۔ اس کی وارنٹی اور جنون کو دیکھ کر تو یہی لگتا تھا کہ وہ میرے اشارے کا منتظر ہے اور میں جب کہوں گی وہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کر لے گا۔

اس روز میرا شہزاد سے بہت زبردست جھگڑا ہوا۔ ہوا یوں کہ عید قریب آرہی تھی اور میں چاہ رہی تھی کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے گھر کی تزئین و آرائش ہو جائے کیونکہ دروازوں اور دیواروں کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ پردے، قالین، صوفے سبھی بوسیدہ حالت میں تھے۔ انہیں بدلنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا کہ میرے اکاؤنٹ سے کچھ پیسے نکال کر یہ سارے کام کروالیے جائیں لیکن اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ سراسر اسراف ہے۔ صوفے، پردے اور قالین بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ البتہ وہ رنگ روغن کروادے گا۔ اس پر مجھے غصہ آ گیا اور تیز لہجے میں بولی۔

”یہ میرا پیسا ہے۔ میں جیسے چاہوں خرچ کروں۔ تم مجھے روکنے والے کون ہوتے ہو؟“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔ شوہر ہوں تمہارا۔ اس طرح اللے تلے کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر میں اپنی مرضی سے پیسے خرچ نہیں کر سکتی تو میں یہ نوکری ہی چھوڑ دیتی ہوں۔“

”چھوڑ دو۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن تم ہی رل جاؤ گی۔ میں تمہاری بے جا فرمائشیں پوری نہیں کر سکوں گا۔“

دوسرے دن میں نے شاہد کو یہ واقعہ سنایا تو وہ لاتعلقی کے انداز میں بولا۔ ”کوئی بات نہیں، تم اس کے پیچھے لگی رہو۔ تنگ آ کر وہ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہو جائے گا۔“

وہ یکا یک ہی آپ سے تم برا گیا تھا۔ مجھے اس کے بدلے ہوئے رویے پر خاصی حیرت ہوئی لیکن سنبھلتے ہوئے بولی۔

”نہیں سر، وہ بے حد ڈھیٹ اور ضدی انسان ہے۔“

اس کے انکار کو اقرار میں نہیں بدل سکتی۔ اب تو اس پر نوکری چھوڑنے کی دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا بلکہ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ میرے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ میں ایسے

شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں نے اس سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں اس کا رد عمل جاننے کے لیے لمحہ بھر کو رکی پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟“

”میں!“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ میں بے شرمی سے ہنستے ہوئے بولی۔ ”جب میں اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہوں تو آپ بھی اپنی بیوی کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ویسے بھی اس نے آپ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ پھر ہم دونوں مل کر ایک نئے سفر کا آغاز کر سکیں گے۔“

”دیکھو مہنازا اس میں کوئی شک نہیں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور اگر پہلے مل جاتیں تو شاید تمہیں پا کر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ تمہارے حالات جان کر مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اسی لیے تمہاری دل جوئی کرتا رہا تا کہ تم خوش رہو اور دل لگا کر دفتر کا کام کرو لیکن تمہیں یہ غلط نہیں کیسے ہو گئی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اشارتا بھی ایسی کوئی بات کہی ہو۔ ویسے بھی میری بیوی واپس آگئی ہے اور بچوں کی خاطر میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ تمہارے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ اپنے شوہر کی وفادار بن کر رہو۔ ہمارے معاشرے میں ہزاروں لاکھوں عورتیں اس سے بھی برے حالات میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ جو عورت اپنے شوہر سے وفا نہیں کرتی۔ کوئی دوسرا مرد بھی اسے قبول نہیں کرتا۔“

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ مجھ میں شاید سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں تو خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔ میں نے واپس اپنی سیٹ پر آکر استغنیٰ لکھا لیکن شاہد نے اسے منظور نہیں کیا اور مشورہ دیا کہ میں چند روز کے لیے چھٹی لے لوں۔ میں نے بھی گھر آ کر یہی سوچا کہ نوکری چھوڑنے کے بعد گھر میں میری رہی سہی وقت بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے ایک ہفتے بعد دوبارہ کام پر واپس آگئی۔ اب میرے اور شاہد کے درمیان صرف باس اور ماتحت کا رشتہ ہے۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ بھی کہے لیکن میں تو اسے فلرٹ ہی سمجھوں گی۔



ہوتے۔ ایسے میں وہ اپنے ماحول سے اس قدر بیگانہ ہو جاتا کہ اردگرد کا شور و غل بھی مجھے ڈسٹرب نہ کرتا۔ ویسے بھی جو کہانی اس وقت میں پڑھ رہا تھا، وہ ایک دلچسپ موڑ پر تھی جہاں ایک عورت اپنی بیٹی کا گناہ چھپانے کے لیے اپنی بیٹی

میں اپنے ماحول سے بے خبر کہانی میں کھویا ہوا تھا، بلکہ یہ میری عادت تھی کہ کہانیاں پڑھتے ہوئے میں پوری طرح کہانی میں گم ہو جاتا۔ اس کے کرداروں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا، ان کے ساتھ ہی خوشی اور غم محسوس

بے حس

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
آداب و نیاز

زیر نظر روداد کافی پرانی ہے، ایک بار پہلے بھی لکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس طرح سے بیان نہیں کر پایا تھا اس لیے دوبارہ نئے زاویے سے لکھ رہا ہوں۔ یہ انداز آپ کو بھی پسند آئے گا۔ انسان کس قدر بے حس ہو چکا ہے یہی بتانا چاہتا ہوں۔

اختر شہاب
(کراچی)



کی نابالغ لڑکی پر مجرمانہ حملے کی خبر، سیاسی رہنماؤں کی بد اعمالیاں اور لالچے تللوں کی خبریں۔ میں نے اخبار اٹھا کر دور پھینک دیا۔

”آخر یہ قوم کے لیڈر ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“ میں نے سوچا۔ ”بحیثیت مسلمان ہمیں ایک قوم ہونا چاہئے تھا، مگر لوگ زبانوں کے حوالے سے، تہذیبوں کے حوالے سے، علاقے کے حوالے سے فرقوں کے حوالے سے اور نہ جانے کتنے حوالوں سے تقسیم در تقسیم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ اس قدر کم عقل ہیں کہ محض سیاسی لیڈروں کے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کو تیار ہیں اور یہ سیاسی حضرات بجائے اس کے کہ اس ملک کو ایک فلاحی ریاست بنائیں، قانون کی بالادستی قائم کریں، محض اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے، اپنی حکومت مضبوط کرنے کے لیے، قانون کے رکھوالوں کو چھوٹ دے کر اس ملک کو پولیس اسٹیٹ بنا چکے ہیں۔ کیا ہم مکمل تباہی کی طرف جا رہے ہیں یا واپسی کا کوئی راستہ ہے؟ خیر مجھے کیا؟“ میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے سوچا۔ ”میں کون سا قوم کا مصلح ہوں۔ میری بلا سے جو ہوتا ہے ہو مجھ پر تو اللہ کا فضل ہے۔ اچھی نوکری مل گئی ہے۔ ہنگاموں سے دور، پرسکون علاقے میں رہ رہا ہوں۔ زکوٰۃ بھی دیتا ہوں اور حسب توفیق غریب غریبا کی امداد اور خیرات بھی کرتا ہوں اور اللہ نے چاہا تو شادی بھی جلد ہی ہو جائے گی، پھر بھی جیسے حالات بگڑتے جا رہے ہیں، ان میں تو یہاں رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے امریکا نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ بقول ایک صاحب کے وہاں کے قاعدے قانون دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہاں مسلمان نہیں ہیں مگر اسلام ضرور موجود ہے۔“

”آہ یہ میری سوچ کیسی خود غرضانہ ہے۔“ میں نے خود گلای کی اور مزید سوچنے لگا۔ ”صرف میں ہی یہ نہیں سوچتا بلکہ پورے معاشرے میں ہی شعوری یا لاشعوری طور پر یہی سوچ کارفرما ہو گئی ہے کہ اگر کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے تو ہمیں کیا؟ ہم تو محفوظ و مامون ہیں۔ اگر کسی دوسرے کا گھر جلا ہے تو فکر کی کوئی بات نہیں؟ آگ کے شعلے ابھی گھر سے بہت دور ہیں۔ اگر کسی کے گھر ڈاکا پڑا ہے، کسی کی عزت لٹی ہے تو ضرور ان کی کوئی غلطی ہوگی۔ گویا ہری طور پر اور زبانی لوگ ایک دوسرے سے ہمدردی کا اظہار ضرور کرتے ہیں مگر عملی طور پر ان کے دل مردہ ہو گئے ہیں اور درد کا صحیح احساس ان کے دلوں میں نہیں جاگتا اور نہ وہ اجتماعی طور پر ان برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ

کے ہمراہ بیٹی کے نوزائیدہ بچے کو ٹھکانے لگانے جا رہی تھی۔ کہانی کے اس موڑ پر مجھے مصنف کے الفاظ سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ آیا ٹھکانے لگانے سے اس کی مراد بچے کا گلا گھونٹ کر ڈن کر دینا ہے یا وہ اسے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے کی یا پھر ایڈمی ہوم کے باہر گوارے میں ڈالے گی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ عورت راز داری سے یہ بچہ اپنی کسی بے اولاد سہیلی کو دینے جا رہی ہو۔ میں اس قدر کہانیاں پڑھ چکا تھا کہ کسی کہانی کے انجام کے بارے میں میرا اندازہ عموماً درست ہوتا تھا مگر اس کہانی میں مصنف نے مجھے الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا دیا تھا لہذا کہانی میں میری دلچسپی بڑھ گئی تھی مگر جب میں کہانی کے اس موڑ پر پہنچا جب ان ماں بیٹیوں کو قانون کے محافظ گھیر لیتے ہیں، ان کا جرم عیاں ہو جاتا ہے اور وہ انہیں تھانے لے جانے کی بجائے وہیں مک مکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور رشوت میں اس لڑکی کا بدن طلب کرتے ہیں۔ لڑکی کو جرم کرنے پر مزید گناہ کے لیے مجبور کرتے ہیں، تب اس لڑکی کی ماں، لڑکی کو ان کی بات مان لینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتی ہے۔

”ان کی بات مان لے۔ یہاں تو وہ دو ہیں، تھانے میں بہت ہوں گے۔“ تو مصنف کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے شاک سا لگا۔ اس سے آگے پڑھا بھی نہیں گیا اور میں نے رسالہ بند کر دیا۔

”یہ ہمارا معاشرہ آخر کدھر جا رہا ہے؟“ میں نے وہیں لیٹے ہوئے سوچا۔ ادیب جو معاشرے کے نباض ہوتے ہیں اور معاشرتی برائیوں کو کبھی کبھلے عام اور کبھی ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کر کے وہ معاشرے کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، وہی ادیب جب ایسے الفاظ لکھنے پر آ جائیں جن سے معاشرے کی بے حسی کی عکاسی ہوتی ہو اور لوگ تب بھی ان کے الفاظ کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ خود کو سنبھالنے اور معاشرے کو بگڑنے سے بچانے کی اجتماعی کوشش نہ کریں تو اس معاشرے کے بگڑنے اور تباہ ہونے میں بس تھوڑا ہی وقت رہ جاتا ہے۔

مجھے اپنا گلا خشک ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اٹھا، میز پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی اٹھایا اور کرسی پر بیٹھ کر پینے لگا تو میری نظر سامنے رکھے اخبار پر پڑی۔ جس بات سے متاثر ہو کر میں نے رسالہ بند کر دیا تھا، اخبار میں زیادہ تر خبریں اسی بات کے بارے میں تھیں۔ شہر بھر میں ڈاکوؤں کی خبریں، اجتماعی آبروریزی کی خبر، قانون کے محافظ

خالی ہاتھ کسی کا پیٹ نہیں بھر سکتیں۔ کسی کے تن پر کپڑا نہیں ڈال سکتیں۔ کسی مظلوم کو اس کا حق نہیں دلا سکتیں؛ جب تک اس کے لیے متحد ہو کر عملی جدوجہد نہ کی جائے۔

ان حالات میں جب کسی کا گھر جلتا ہے، کسی کی عزت لٹی ہے یا کسی کے ہاں ڈاکا پڑتا ہے تو وہ یہ ضرور سوچتا ہے کہ میرے ساتھ یہ کیا ہوا؟ میرے ساتھ یہ کیوں ہوا؟ میں نے تو کسی کا حق نہیں مارا، میں نے تو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی میں تو کسی برائی میں ملوث نہیں ہوں تو پھر مجھے کس بات کی کس جرم کی سزا مل رہی ہے حالانکہ یہ سوچتے ہوئے وہ فطرت کے اس قانون کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے کہ قدرت کی مہربانیاں اور مہربانیاں سب کے لیے یکساں ہیں۔ ہوا چلتی ہے تو سب کے لیے، خوشبو پھیلتی ہے تو سب کے لیے، بارش سرسبز یا بنجر ہرزمن پر ہوتی ہے اور طوفان آتا ہے تو امیر غریب، بچے بوڑھے، گناہ گار اور بے گناہ سبھی اس کا شکار ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے کہ گناہوں کے ساتھ گن بھی پس جاتا ہے۔

لہذا کسی کی تمام اچھائیوں کے باوجود اس کے ساتھ کوئی برائی ہوتی ہے تو اس میں اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے برائیوں کے خلاف جدوجہد میں معروف لوگوں کو تنہا چھوڑ دیا۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں سرد ہا کر خود کو محفوظ و مامون تصور کیا اور برائیوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ کسی ظالم کا ہاتھ نہ پکڑا، کسی برائی کو دیکھ کر منع نہ کیا۔ معاشرے کی خرابیوں کو برانہ سمجھا اور کسی مظلوم کے ساتھ ہمدردی نہ کی بلکہ اپنی جان کے خوف سے، اپنی رسوائی کے ڈر سے مظلوم سے آنکھ بچا کر گزر گیا۔ سواب وہ بھی اس سلوک کا مستحق ہے اور اب اس کی مدد کو کوئی نہ آئے گا۔

”تم ان رسالوں کا پچھا چھوڑ کر کچھ دین و دنیا کی بھی خبر لو گے یا نہیں؟“ اماں بی اندر سے آتے ہوئے بولیں۔

”جاؤ باہر دیکھو کون آیا ہے۔“

ماں کی آواز سن کر وہ بڑا کر اٹھا اور سیدھا باہر آ گیا۔ باہر دروازے پر ٹیلی گراف آفس کا ملازم تھا۔ ”صاحب یہ ایک سپرٹس ٹیلی گرام آیا ہے۔“ وہ بولا۔ اتنی کی دہائی میں رابطے کا تیز ترین اور ہر ایک کی پہنچ کا واحد ذریعہ ٹیلی گرام ہی تھا۔

میں تار لے کر سید پر دستخط کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شاید یہ ٹیلی گرام ابو کی طرف سے ہے۔ وہ آج کل دوسرے شہر میں دورے پر گئے ہوئے تھے انھوں نے شاید اپنی

واپسی کی اطلاع دی ہو۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے لفافے میں سے کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔ میں کل کی ٹرین سے سول سروس کے انٹرویو کے لیے آ رہی ہوں۔ انٹرویو پرسوں ہے۔ مزید معلومات حاصل کر کے رکھنا۔

”شہلا“

میرے ذہن میں جیسے خوشگوار یادوں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ شہلا کے والدین 1965 میں ہمارے پڑوسی تھے اور ہم بچپن میں ساتھ ہی کھیلے تھے۔ پھر وہ لوگ والد کے ٹرانسفر کی وجہ سے دوسرے شہر چلے گئے تھے مگر دونوں گھروں کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ برقرار تھا۔ پھر اچانک کافی عرصے بعد وہ لوگ دو سال پہلے یہاں آئے تھے اور یہاں سال بھر رہنے کے بعد شہلا کے والد کا ٹرانسفر دوبارہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس عرصے میں بچپن کی دوستی واضح پسندیدگی کا روپ دھار گئی تھی۔ گودونوں میں سے کسی نے بھی اس پسندیدگی کا، اس محبت کا اظہار ایک دوسرے سے نہیں کیا تھا مگر یہ پسندیدگی اس قدر واضح اور شفاف تھی کہ دونوں گھروں کی نظریں آگئی تھی اور دونوں گھروں میں یہ خاموش معاہدہ ہو گیا تھا کہ اس کے یعنی میرے نوکر ہونے کے بعد شادی ہو جائے گی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا تھا کہ اسی دوران میں شہلانے سول سروس کے مقابلے کا امتحان دیا تھا۔

”گو یا وہ اس میں پاس ہو گئی۔“ میں نے سوچا۔

”ویری گڈ۔“

”امی شہلا آ رہی ہے۔“ وہ اندر آتے ہوئے بولا۔

”اسی کا ٹیلی گرام تھا۔“

”اچھا! وہ خوش ہو گئیں۔“ کب؟“

”کل صبح کی ٹرین سے۔“

”بھائی جان! آپ تو انھیں لینے نہیں جاسکیں گے۔“

اس کی چھوٹی بہن عارفہ سے چھیڑتے ہوئے بولی۔

”کیوں؟“ اس نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

”اس لیے کہ آپ نئی نئی نوکری کی وجہ سے چھٹی نہیں

کر سکتے، تبھی تو مجھے شاپنگ کو نہیں لے گئے تھے۔“ اسے پرانی بات یاد تھی۔

”نہیں بھئی اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اس وقت تو نوکری کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا اور اب تو تین ماہ ہو گئے

نوکری کو۔ اب ایک آدھ دن کی چھٹی تو میں کر سکتا ہوں۔“ میں نے وضاحت کی۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ بہن بولی۔ ”اب تو ایک آدھ دن

میری ”ہیں“ کا دوسرا مطلب لیتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ کل زبردستی کی چھٹی ہے اور تمہیں دفتر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ تمہیں علم ہوگا کہ، ابھی پچھلے دنوں ہمارے شہر میں کچھ بااثر شخصیتوں نے ایک لڑکی کے ساتھ گینگ ریپ کیا تھا اور پولیس ان کے خلاف کارروائی کرنے میں ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے، تو اسی سلسلے میں ایک سیاسی تنظیم کی کال پر مکمل ہڑتال ہے۔“

”یاریہ تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔“ میں پریشان ہو گیا۔

”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دفتر میں یہ پالیسی غیر سرکاری طور پر طے شدہ ہے کہ ہڑتال کی صورت میں ڈیوٹی پر آنے کا رسک لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ تم نے ہو، کہیں زیادہ ڈتے داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دفتر جانے کی کوشش میں اپنی جان خطرے میں نہ ڈال دو، اسی لیے تمہیں بتانے آ گیا۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”کل مجھے اسٹیشن جانا ہے۔“

”خیریت؟“

”یار کل میری منگیتر یعنی تمہاری مستقبل کی بھابی آرہی ہے۔“

”تویوں کہونا۔“ وہ ہنسا اور بولا۔ ”مگر اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے.....! انہیں تمہارے گھر کا پتا تو معلوم ہے نا وہ لوگ خود ہی سچ کر لیں گے۔“

”یار گھر کا پتا تو انہیں معلوم ہی ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ اکیلی آرہی ہے اور ایسی صورت حال میں اسٹیشن سے گھر تک اکیلی لڑکی کا آنا بڑی پریشانی والا معاملہ ہو جائے گا۔ عام حالات میں تو اور بات تھی۔“

”کہتے تو تم ٹھیک ہو۔“ وہ بولا۔ ”اچھا خیر کل اگر تھوڑی سی بھی منجائش ہوئی تو میں تمہارے پاس آ جاؤں گا اور دونوں گلیوں گلیوں نکل چلیں گے۔“

”یار کل کی صورت حال کا کچھ پتا نہیں، میں ایسا کرتا ہوں کہ آج رات نکل جاتا ہوں۔ رات وہیں اسٹیشن پر ہی گزار لوں گا۔“

”چلو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”رہنے دو یار، تم کہاں خوار ہو گے۔“

کہا ہفتے بھر کی بھی چھٹی کر سکتے ہیں۔ آپ سوچ لیں امی! ابھی تو منگنی بھی نہیں ہوئی اور ابھی سے یہ حال ہے۔ شادی کے بعد تو ماں باپ کو بھی بھول جائیں گے۔“ بہن نے وضاحت قبول نہیں کی اور پھر چھیڑ دیا۔

”ارے تمہیں شاپنگ بھی کرا دوں گا، چائیز بھی کھلا دوں گا۔“

”اچھا مجھے رشوت دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گے مگر ایک شرط ہے، میں بھی اسٹیشن جاؤں گی۔“

”پاگل ہوئی ہو کیا؟“ میں نے کہا۔ ”اکیلا تو میں بس میں بھی چلا جاؤں گا اور تمہارے ساتھ ٹیکسی کرنا پڑے گی۔ تم میرا ڈبل خرچا کراؤ گی اور پھر تم چلی گئیں تو کھانا کون پکائے گا؟“

”پکانے کی کیا ضرورت، وہ جو آپ مجھے باہر کھلاتے، وہی گھر لے آئیں گے اور گھر میں کھالیں گے۔“

”مگر وہ وعدہ تو تنخواہ ملنے پر ہے اور ابھی تنخواہ ملنے میں پورا ہفتہ باقی ہے۔“

”اچھا چلیں معاف کیا مگر تنخواہ پر چائیز کے علاوہ میں ایک سوٹ بھی لوں گی۔“

”اچھا بابا لے لینا۔“ اس نے بات ختم کی اور بولا۔

”اب میری جان چھوڑو۔“

شہلا کے آنے کی خبر سن کر مجھ پر اضطراب سا طاری ہو گیا تھا کیونکہ میں اسے کافی عرصے بعد دیکھنے والا تھا۔ ”اب وہ آئے گی تو اس سے پوچھوں گا کہ وہ اس رشتے پر خوش بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دور رہ کر اس کے خیالات میں تبدیلی ہی نہ آگئی ہو۔“ میں نے سوچا۔ ”خیر یہ تو آئندہ کی باتیں ہیں میں کیوں نہ ابھی جا کر اپنے گولیگ انور کو بتاؤں کل میں نہ آسکوں گا۔“ ابھی میں تیار ہو کر نکلنے ہی والا تھا کہ انور خود ہی آ گیا۔

”یار میں تمہاری طرف ہی آرہا تھا۔“ میں اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ”اچھا ہوا جو تم خود ہی آ گئے۔“

”میں تمہارے پاس کل کے سلسلے میں آیا ہوں۔“

”ہں؟“ میں حیران ہو گیا۔ ”اسے میرے کل پروگرام کا پتا کیسے چل گیا؟“ میں نے خود ہی اپنے خیال کو رد کر دیا۔ ”ہو سکتا ہے یہ بھی چھٹی کرنا چاہ رہا ہو۔ پھر تو بڑا مسئلہ ہوگا۔ نئی نئی نوکری ہے کون میرا کام دیکھے گا؟ مجھے کل جانا بھی ضروری ہے۔“

”یعنی تمہیں کل کے بارے میں کچھ پتا نہیں!“ انور

ماہنامہ سرگزشت

218

جولائی 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”اچھا! جیسے تمہاری مرضی۔“

”امی یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے احمقانہ سا سوال کیا۔
 ”پڑوس میں ڈاکو آگئے ہیں۔“ وہ بولیں۔
 ”تو آپ اپنا گھر کیوں بند کر رہی ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“

”تم ان کی کیا مدد کر سکتے ہو؟ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی ہتھیار ہے تمہارے پاس؟ لاشی ڈنڈے کا معاملہ ہوتا تو کوئی اور بات تھی۔ ان دیکھی موت کے سامنے جانا حماقت ہوتی ہے، بہادری نہیں۔“

”واقعی!“ میں نے سوچا۔ ”اسلحے کے نام پر تو ہمارے گھر میں سبزی کاٹنے والی چھری ہی ہے اور وہ بھی کندھی۔“
 ”چلو اندر یہاں سے۔“ اماں بی وہیں کھڑا دیکھ کر بولیں۔ ”فوراً اندر چل کے بیٹھو میں صحن کی گرل بھی بند کر رہی ہوں۔“

وہ صحن سے چل کر اندر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکو واقعی بائیں طرف والے پڑوسی کے گھر میں موجود تھے اور وہاں سے فائرنگ اور جوانی فائرنگ کی آوازیں مجھے اور گھر والوں کو خوف زدہ کر رہی تھیں۔ پریشان اور خوف زدہ ہونے والی بات تو تھی کہ دونوں گھروں کے درمیان چھوٹی سی دیوار تھی اور ڈاکو وہاں سے ناکام ہو کر دیوار پھاند کر ادھر بھی آسکتے تھے۔ ناکامی کی بات پر، مجھے ڈاکوؤں کے دو واقعات یاد آگئے جو میں نے حال ہی میں سنے تھے، یعنی ڈاکو کسی گھر میں ڈاکا ڈالنے گئے۔ سامان زبور اور نقدی وغیرہ لوٹنے کے بعد وہاں سے جانے لگے تو اس گھر میں موجود لڑکی نے کہا۔

”بھیا تم یہ سب لوٹ کر لے جا رہے ہو تو مجھے بھی گولی مارتے جاؤ۔ ان میں زیادہ سامان میرے جہیز کا ہے اور میرے سسرال والے یہ بات نہ مانیں گے کہ ہم لٹ گئے، وہ جہیز کے بغیر مجھے قبول نہیں کریں گے اور میرے باپ میں اب اتنی اہم نہیں کہ وہ دوبارہ اتنا جہیز بنا سکیں۔ میں یوں جو گھٹ گھٹ کر مروں گی تو اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم مجھے گولی مار دو۔“

پتا نہیں کیسے یہ باتیں ان ڈاکوؤں کے دل کو لگ گئیں اور ان میں سے ایک نے کہا۔ ”اچھا یہ بات ہے، لویہ سب سامان پڑا ہے اور ہم جاتے ہیں۔“ تو انھوں نے سب سامان وہاں چھوڑا اور تیسرے گھر جا کر ڈاکا ڈال دیا۔

دوسرے واقعے میں ڈاکو اسی گھر میں آگئے جو ماہ ڈیڑھ ماہ پہلے ہی لٹ چکا تھا اور شروع کے پانچ سات منٹ کے ہنگامے کے بعد جب انھوں نے گھر والوں کو ڈرا دھمکا کر ایک کونے میں بند کر دیا اور چھوٹی چھوٹی چیزیں قبضے

ذہن میں چل رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسٹیشن پر تو میں چلا جاؤں گا گمرات کہاں گزروں گا۔ ویٹنگ روم میں یا نزدیکی ہوٹل میں۔ کہیں پولیس والے رات کو ویٹنگ روم وغیرہ تو چیک نہیں کرتے۔ خواجواہ آوارہ گردی کے الزام میں پکڑا گیا تو کیا ہوگا۔

”خیر رات تو گزری جاوے گی مگر اسٹیشن سے واپسی کا کیا ہوگا؟ کیا شام تک وہیں رہنا ہوگا۔“ میں نے سوچا کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس سیاسی تنظیم کے ارکان ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ گاڑیوں پر پتھراؤ اور تازہ جلاتو معمولی سی بات ہوگئی تھی، اب تو راہ چلتوں پر بھی فائرنگ ہونے لگی ہے۔ افغانستان کی بدولت ہر قسم کے اسلحے آرام سے ملنے لگے ہیں۔ ”خیر کل کی بات کل دیکھی جائے گی۔“ میں نے یہ سوچا ”اللہ تعالیٰ ضرور کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔“

”امی کل ہڑتال ہے اور میں رات کا کھانا کھا کر ہی اسٹیشن چلا جاؤں گا تاکہ شہلا کو کسی نہ کسی طرح گھر لاسکوں ورنہ اس اکیلی کے لیے تو بڑا مسئلہ ہوگا۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ اماں بی نے کہا۔ ”مگر ہم رات بھرا کیلر ہیں گے۔ تمہارے ابو بھی نہیں ہیں۔“
 ”آپ ایسا کریں کہ پڑوس کے کسی بچے کو سلانے کے لیے بلا لیں۔“

رات کا کھانا کھاتے کھاتے 10 بج گئے تھے۔ ویسے بھی مجھے اسٹیشن جانے کی جلدی نہ تھی، چنتی دیر سے جاؤں گا اتنا ہی کم وقت انتظار گاہ میں گزارنا ہوگا لہذا رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہی گھر سے نکلوں گا۔

میں ابھی جانے کے لیے تیار ہی ہو رہا تھا کہ دو تین فائرنگوں کی آواز سنائی دی، مجھے محسوس ہوا کہ جیسے یہ فائرنگ گلی میں ہی ہوئی ہے۔ میں جلدی سے کمرے سے نکل کر صحن میں آیا تو مجھے پڑوسیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

”جلدی کرو کھڑکی دروازے بند کرو۔ ڈاکو آگئے ڈاکا ڈالنے۔“ اور پھر چاروں طرف کھڑکیاں دروازے بند کرنے کا شور مچنے لگا۔

میں حیران و پریشان سا صحن میں کھڑا تھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکو واقعی آئے بھی ہیں اور آئے ہیں تو کس گھر میں آئے ہیں کہ اماں بی نے جلدی جلدی تمام کھڑکیاں دروازے بند کرنا شروع کر دیئے۔

میں لینے کے بعد گھر والوں سے کہا کہ زیور نکالو۔

”زیور اب کہاں؟“ گھر والوں نے جواب دیا۔ ایک ماہ پہلے تو تمہارے بھائی بند سب لوٹ کر لے چکے ہیں۔“
”کیا یہ صحیح کہہ رہے ہیں؟“ ایک ڈاکو نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے استاد بات صحیح ہے۔ میں نے سنا تھا کہ دوسرے گروپ نے اس علاقے میں ڈاکا مارا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ یہی گھر ہو۔“

یہ بات سن کر ڈاکوؤں نے ان کی ایک ایک چیز واپس کر دی۔ بلکہ ان کے گھر میں آئے ہوئے ایک مہمان کی جیب سے جو پندرہ سو روپے نکالے تھے وہ بھی واپس کر دیئے اور یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئے ”باہر کا گیٹ بند رکھا کریں۔“
پڑوسیوں کے گھر سے ابھرنے والی ایک تیز چیخ نے مجھے پھر باہر کی صورت حال کی طرف متوجہ کر لیا۔ وہاں سے اب خوفزدہ سی روکی روکی آوازیں آرہی تھیں۔

”ارے چابی کہاں ہیں؟“

”جلدی سے چابی لاؤ۔“ کوئی ڈپٹ رہا تھا۔ ”ہمیں مت مارو ابھی دے رہے ہیں۔“

پھر دونوں دو تین قاتر ہوئے اور آواز آئی۔ ”اکبر صاحب آپ خیریت سے ہیں؟“

یہ سب باتیں سن کر میرا خون کھول رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کاش میرے پاس بھی اسلحہ ہوتا تو میں کم از کم ان کا مقابلہ تو ضرور کرتا۔ موت تو ایک دن آتی ہے۔ کیوں نہ بہادری سے حق کی خاطر جان دے دی جائے۔ مجھے اپنے محلے داروں پر بھی غصہ آ رہا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کسی نہ کسی گھر میں اسلحہ ضرور ہوگا مگر وہ سب اپنے بلوں میں کیوترکی طرح دبکے ہوئے تھے۔ صرف ایک واحد شخص تھا جو فائرنگ کر رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر اپنے باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکنے کا ارادہ کیا تا کہ دوسری طرف کے حالات سے آگاہی ہو مگر پڑوس سے آئی ہوئی ایک گولی نے جب کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تو اماں کی چیخ اور بہن کی التجاؤں نے مجھے واپس آنے پر مجبور کر دیا مگر محفوظ جگہ پہنچنے پر بھی مجھے قرار نہ تھا۔ میں گھر میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے پڑوسیوں کی کیسے مدد کروں۔ مجھے اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ ”میرے گھر میں فون بھی نہیں ہے جو میں پولیس کو بلا لیتا“ میں نے سوچا۔ پولیس کے نام پر میرے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا اور میں

تیزی سے دوڑ کر اندر گیا کیونکہ مجھے یاد آ گیا تھا کہ کل ہی تو میں اپنی بہن کے بیچے کو سالگرہ کا تحفہ دینے کے لیے پولیس سائرن والی گاڑی لایا تھا۔ گاڑی نکال کر میں باورچی خانے کی کھڑکی کے پاس پہنچا اور سائرن کی آواز کھول دی ساتھ ہی پڑوس کے گھر سے آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ”پولیس آگئی بھاگو۔“ اور ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بھی بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد ایک گاڑی کی آواز سنائی دی اور سکوت چھا گیا۔

خوف، دہشت کے اس ہنگامے کے بعد جب وہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے باہر نکلا تو اسے علم ہوا کہ جو ابی فائرنگ اس پڑوسی کا کرائے دار اپنی سائیڈ سے کر رہا تھا اور اس فائرنگ کا فائدہ یہ ہوا کہ بات صرف یہ جھجھوڑیوں پر ٹل گئی تھی۔

مجھے یہ بھی علم ہوا کہ سائرن کی آواز سن کر ڈاکو کہہ رہے تھے۔ ”پولیس نے وعدہ خلافی کی ہے۔ ان سے بعد میں نمٹ لیں گے۔“

باہر کھڑے ہوئے لوگ پڑوسی سے اظہارِ ہمدردی کے ساتھ ساتھ تبصرے بھی کر رہے تھے مگر میں صرف اتنا ہی کہہ پایا۔ ”صاحب میں آپ سے کبھی اور اپنے آپ سے کبھی شرمندہ ہوں کہ آپ کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ کاش میرے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو صورت حال دوسری ہوتی۔“

”میاں صاحبزادے!“ ایک صاحب طنز یہ بولے ”جن کے پاس ہتھیار تھے انھوں نے کیا کر لیا جو تم کچھ کرتے۔“
”بڑے صاحب! یہ تو اپنے اپنے حوصلے اور ضمیر کی بات ہے۔“ میں بولا۔ ”بہر حال میں کل ہی لائسنس حاصل کرنے کے لیے درخواست دے دوں گا۔“

”ایسی غلطی بھی نہ کرنا۔“ ایک اور نے کہا۔ ”تم کون سے جاگیر دار، سرمایہ دار یا ڈرگ مافیا کے کارندے ہو۔ لائسنس والا ہتھیار رکھ کر خود کو مصیبت میں ڈالو گے۔ گولی کہیں چلے گی، ہتھیار تمہارا ضبط ہوگا۔ ہر تیسرے دن تو تمہیں تھانے جانا ہوگا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی اور کا معاملہ تمہارے گلے منڈھ دیا جائے۔ بلا لائسنس خرید لو، سکھی رہو گے۔“

”مگر بلا لائسنس تو مزید پیشانی کا باعث ہے کہ آدمی رکھ تو سکتا ہے چلا نہیں سکتا۔ پکڑے جانے کا خدشہ الگ۔“

”تو جنہوں نے نہیں چلائے ان کے پاس کون سا لائسنس تھا۔ یہ تو انھوں نے اپنی جان کی حفاظت کو اپنا حوصلہ بڑھانے کو رکھے ہیں۔ اپنی جان کو کوئی مسئلہ ہو تو شاید چلا بھی دیں گے۔“

منقلب گرد باد

وہ ہوا جس کا سب سے زیادہ دباؤ مرکز میں ہوتا ہے اور چاروں طرف بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہوائیں اندر سے باہر کی طرف چلتی ہیں۔ گرد باد کے مخالف رخ ہونے کی وجہ سے انہیں منقلب گرد باد کہا جاتا ہے۔ زمین کی محوری گردش کی وجہ سے یہ ہوائیں شمالی نصف کرے میں گھڑی کی سوئیوں کے مطابق اور جنوبی نصف کرے میں ان کے برعکس چلتی ہیں۔ یہ ہوائیں چونکہ اندر سے باہر کی طرف چلتی ہیں اس لیے خشک ہوتی ہیں اور بارش نہیں برسا سکتیں بلکہ مطلع صاف اور خوشگوار ہوتا ہے۔ گرمیوں میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے اور سردیوں میں کم ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں سردیوں میں کچھ دنوں کے لیے گرد باد چلتے ہیں۔ یہ گرد باد چونکہ خلج فارس اور بحیرہ روم سے اٹھتے ہیں اس لیے ان میں نمی ہوتی ہے اور یہ کوہ ہندو کش سے ٹکرا کر پاکستان میں بارش برساتے ہیں۔

مرسلہ: زویا برکاتی۔ کراچی

رہی ہیں۔ میں پھر جا کے کمرے میں لیٹ گیا۔ مگر فجر کی اذان پر میں اٹھ بیٹھا۔

”میں نماز پڑھ کر نکل جاتا ہوں۔ ابھی تو کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔“ میں نے سوچا اس وقت تک اماں بی بی بھی کافی حد تک نارمل ہو چکی تھیں۔ سوانہوں نے میری بات کی تائید کی اور ناشائبانے چلی گئیں۔

ناشتا کر کے میں جب گھر سے نکلا اور کچھ دور تک پہنچا تو دیکھ لے ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ سڑک دور تک ویران نظر آ رہی ہے اور سواری تو کیا کوئی شخص پیدل چلتا بھی نہ دکھائی دیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے بعد میں گھر واپس چل دیا۔ ”اچھا چلو پڑوسی سے گاڑی مانگ لیتا ہوں۔“ میں نے سوچا ”وہ یقیناً انکار نہیں کریں گے کیونکہ میں بھی ان کے کام آتا رہتا ہوں۔“ پڑوسی نے جاگنے میں کافی وقت لیا اور مسلسل تیل بجانے کے بعد جب وہ آنکھیں ملتے ہوئے باہر نکل کر گیٹ پر آئے تو مدعا سن کر بولے۔

”دیکھو جاوید میاں! عام حالات میں تم میری گاڑی

”جو دوسروں کے لیے حوصلہ نہیں کرتا، وہ اپنا وقت پڑنے پر بھی بزدل ہی ہوتا ہے۔ اب اکرم صاحب نے بھی تو حوصلہ کیا۔ چاہے ہوائی فائرنگ ہی کی۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کا نقصان تو کم ہو گیا نا۔“

”میاں اصل کمال تو تمہارا ہے۔ جو تم نے پولیس والا سائرن بجا دیا، ورنہ تو نہ جانے اور کتنا نقصان ہوتا۔“ دائیں طرف والے پڑوسی نے کہا۔

میں باہر سے اندر آیا اور والدہ کو تمام حالات سنانے کے بعد بولا۔ ”امی کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب آپ کسی کو بلا لیں تاکہ میں اسٹیشن چلا جاؤں۔“ مگر لگتا تھا کہ گزرے ہوئے چند منٹوں نے برسوں کا اعتماد ختم کر دیا تھا۔ تحفظ کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ بے یقینی حاوی ہو گئی تھی۔ تبھی تو اماں بی بی نے جو بڑے حوصلے والی خاتون تھیں مجھے اسٹیشن جانے سے منع کر دیا۔

”اب میں تمہیں اسٹیشن نہیں جانے دوں گی۔“ وہ پولیس۔ ”ڈاکو یہاں سے ناکام واپس گئے ہیں۔ ان کا کیا پتا، کہیں دوبارہ آ جائیں اور اس دفعہ ہمارے یہاں ہی آئیں تو گھر میں ہم عورتیں کیا کریں گی؟“

”کرنا کیا ہے۔“ میں ماحول بدلنے کو مزاجیہ لہجے میں بولا۔ ”گھر میں جو ہو گا وہ دے دیجئے گا۔ ویسے بھی ہمارے یہاں کیا ہے، خالی ہاتھ ہی جائیں گے۔ بلکہ ایسا کریں پڑوس سے کچھ زور وغیرہ نہ منگوائیں۔ کیونکہ سنا ہے ڈاکو خالی ہاتھ جانے کو برا شگون سمجھتے ہیں۔“

”چپ کرو۔“ اماں بی بی نے کہا۔ ”منہ سے بدقالیں مت نکالو۔“

”مگر وہ شہلا.....“ میں نے اماں کو حالات کی سنگینی کا احساس دلانا چاہا۔

”وہ کوئی دودھ پیتی بچی نہیں ہے۔ ماشاء اللہ پڑوسی لکھی سمجھدار بچی ہے۔ اللہ خیر کرے گا اور ریح انشاء اللہ کوئی نہ کوئی سلسلہ اسٹیشن جانے کا ضرور بن جائے گا۔“

”بس بھیا میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“ چھوٹی بہن نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ بولی۔

رات بھر میں سکون سے نہ سو سکا۔ آنکھ لگی بھی تو ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ ایک دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پھر ڈاکو آ گئے ہوں اور باہر فائرنگ ہو رہی ہے۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو دیکھا والدہ اور بہن ابھی تک جاگ

لے جاتے رہے ہو اور میں نے کبھی انکار نہیں کیا، مگر آج نہیں۔ آج تمہیں گاڑی دے کر مجھے گاڑی سے ہاتھ دھونا منظور نہیں۔“

”انکل کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی صبح ہے۔ میں خیریت سے اسٹیشن پہنچ جاؤں گا اور آپ کی گاڑی کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔“

”تم ابھی بچے ہو۔“ وہ بولے۔ ”مجھے شہر کے تمام حالات کا علم ہے، اسی لیے کہہ رہا ہوں اگر میری گاڑی تباہ ہوگئی تو میں کیا کام سے کیونکہ میرا تو بزنس ہی گھونسنے پھرنے کا ہے۔“

”انکل آپ کی گاڑی کو کچھ ہوا تو میں ذمے دار ہوں گا۔“

”پھر وہی بات، مہیاں اگر گاڑی چلی گئی تباہ ہوگئی

تو ہفتہ دس دن تو گئے نا اس کو صحیح کرانے میں۔ یا اگر بالفرض تم مجھے نئی بھی لے دو تو وہ بھی ایک آدھ دن میں تو نہ مل جائے گی۔

لہذا میرے بزنس کا تو ہو گیا کہاڑا اور پھر میں تمہیں وجہ بتاؤں کہ میں کیوں گاڑی نہیں دینا چاہتا، تو اس کی وجہ یہ ہے

کہ جیسا کہ تمہیں علم ہے کہ بطور اسٹیٹ ایجنٹ مجھے تقریباً سارے ہی شہر میں گھومنا پڑتا ہے اور بہت سے لوگوں سے

واسطہ پڑتا ہے۔ اسی لیے مجھے شہر کے حالات سے آگاہی زیادہ ہے۔ لہذا آج کی یہ ہڑتال دراصل کسی کی بے حرمتی

پر احتجاج نہیں ہے۔ یہ دراصل حکومت کے خلاف اپنی طاقت کا مظاہرہ ہے اسی لیے ان لوگوں نے یہ طے کیا ہے کہ سڑک

پر گاڑی نام کی کوئی چیز نہیں چلنے دیں گے چاہے اس میں دو چار جانیں بھی چلی جائیں۔ لہذا میں تمہیں بھی یہ مشورہ دوں

گا کہ باہر نکلنے کا خیال چھوڑ کر گھر میں بیٹھو کیونکہ یہ ہنگامہ مزید تین چار دن چلے گا۔“

میں وہاں سے بڑا دل گرفتہ سا گھر آیا۔ والدہ کو تمام صورت حال بتائی اور بولا۔ ”گاڑی تو کوئی مل نہیں رہی۔ لہذا میں

پیدل ہی اسٹیشن جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید رستے میں کوئی لفٹ دے دے ورنہ امید ہے کہ گاڑی کے آنے تک

میں اسٹیشن پہنچ ہی جاؤں گا۔“

”جاؤ بیٹا! خدا کے حوالے۔“ اماں بی نے کہا۔

”اسٹیشن پہنچ جاؤ تو حالات دیکھ کر ہی واپس آنے کی کوشش کرنا۔“ آیت الکرسی پڑھ کر اماں مجھ پر دم کرتی ہوئی بولی۔

گھر سے نکل کر مجھے اندازہ ہوا کہ پڑوسی کی بات کس قدر حقیقت پر مبنی تھی کیونکہ کافی دور چلنے کے بعد بھی گاڑی نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی، پھر بھی میں چلتا رہا اور جب ایک

گلی کے نزدیک پہنچا تو مجھے ایک سفید کار آتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے لفٹ لینے کی کوشش کروں گا، مگر جو نئی وہ کار نزدیک پہنچی۔ نہ جانے کہاں سے تین چار لڑکے اچانک نمودار ہو گئے اور انہوں نے گاڑی پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ کار والے نے اچانک اسپید بڑھا کر اپنی گاڑی اس طرح لہرائی کہ وہ اٹلتے اٹلتے پیچھے مگر پھر بھی وہ پتھراؤ سے محفوظ نہ رہا۔ گاڑی کے ٹکلتے ہی وہ لڑکے بھی گلی میں غائب ہو گئے اور میں سڑک پر خوفزدہ سا تہا کھڑا رہ گیا۔ پھر اس ڈر سے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لوگ آگئے تو کہیں مجھے بھی ہنگامہ کرنے کے الزام میں نہ پکڑ لیں، میں بھاگ کر نزدیک کی گلی میں گھس گیا۔

اس حادثے کے بعد میں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور بجائے سڑک کے راستے جانے کے میں گلیوں گلیوں

اپنا راستہ طے کرنے لگا، پھر بھی دو چار گلیاں طے کرنے کے بعد مجھے سڑک تو عبور کرنا ہی پڑتی تھی۔ مین روڈ سے گزرتا ہی پڑتا تھا۔

ابھی تین چار بلاک عبور کر کے میں مین روڈ کے نزدیک پہنچا ہی تھا اور اس خیال میں تھا کہ بھاگ کر تیزی سے

سڑک کراس کروں اور سامنے گلی میں چلا جاؤں کہ اسی مین روڈ پر پولیس کی ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں سہم کر ایک مکان

کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا تاکہ گاڑی نکل جائے تو میں سڑک کراس کروں مگر جیسے ہی گاڑی گلی کے نزدیک پہنچی اس پر

دو اطراف سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ پولیس والوں نے بھی اپنی گاڑی تیزی سے گھمائی اور جوابی فائرنگ کرنا شروع کر

دی۔ میں گھبرا کر واپس بھاگا اور پناہ لینے کی کوئی جگہ تلاش کرنے لگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”یہاں تو میرا کوئی واقف بھی نہیں۔“ میں نے سوچا۔

”میں یونہی بھاگتا ہوا پولیس کے ہاتھوں مروں گا یا دہشت گردوں کے۔ میں نے بڑی بے وقوفی کی جو گھر سے نکل آیا۔

یا اللہ میری جان بچا۔“

یہی سوچتا ہوا بھاگ رہا تھا کہ اچانک ایک مکان سے ایک لڑکے نے سر نکال کہا۔ ”کہاں بھاگ رہے ہو؟ کیا

مرنے کا ارادہ ہے؟ جلدی سے اندر آ جاؤ۔“

فوراً ہی اس مکان میں گھس گیا اور لڑکے نے دروازہ بند کر دیا تو تیزی سے دھڑکتا ہوا دل آہستہ آہستہ اعتدال پر

آنے لگا۔ میرے حواس کچھ بجا ہوئے تو میں نے دیکھا کہ کمرے میں دو تین لڑکے لوڈو ٹھیل رہے تھے مگر اس وقت

کھیلنا بند کر کے تجس نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔
 میں نے انہیں اپنی تمام رام کہانی سنا لی تو وہ بھی اس
 صورت حال پر ہنسوس کرنے لگے۔ ابھی میری داستان ختم بھی نہ
 ہوئی تھی کہ باہر فائرنگ کے ساتھ سائرن کی بھی آوازیں آنے
 لگیں، اسی لڑکے نے جس نے مجھے اندر بلا یا تھا پھر باہر جھانکا
 اور اپنے ساتھیوں کو بتانے لگا۔ ”پولیس کی تین چار گاڑیاں اور
 آگنی ہیں اور لگتا ہے انہوں نے علاقہ گھیرے میں لے لیا ہے۔
 تم بہت خوش قسمت ہو۔“ وہ لڑکا مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے
 بولا۔ ”جو میں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر جھانکا اور
 تمہیں اندر بلا لیا، ورنہ اس وقت یا تو تم پولیس کی گاڑی میں
 پڑے مار کھا رہے ہوتے یا پھر تمہارے بارے میں ایڈمی کو فون
 کیا جا رہا ہوتا۔“ وہ ہنسا۔

کوئی چار گھنٹے ادا سی، خوف اور پریشانی کے عالم میں
 وہیں بیٹھا رہا اور باہر قانون کے محافظوں اور دہشت گردوں
 میں آنکھ پھولی ہوتی رہی۔ مجھے اب باہر کی اتنی فکر نہ تھی بلکہ
 میرے ذہن میں ایک بڑا سوال ڈنک مار رہا تھا کہ گاڑی
 تو آگنی ہوگی اور اب شہلا کیا کر رہی ہوگی؟ کیا سوچ رہی
 ہوگی؟ خدا کرے وہ نہ آئی ہو۔ خدا کرے کسی وجہ سے اس
 کا پروگرام کینسل ہو گیا ہو۔

جب صورت حال کچھ معمول پر آئی تو ان لڑکوں کے
 مشورے پر میں نے آگے جانے کی بجائے گھر لوٹنے کا فیصلہ
 کیا کیونکہ آگے تو ابھی بہت رستہ پڑا تھا جبکہ گھر واپسی کا رستہ
 آسان اور نزدیک تھا، ویسے بھی گاڑی کو اسٹیشن پر آئے ہوئے
 دو گھنٹے سے زائد ہو چکے تھے۔

شام ہوتے ہوتے میں گھر پہنچا تو اماں بی نے مجھے
 تنہا پا کر متوحش نظروں سے دیکھا۔ میں نے اپنی ناکامی کی تمام
 داستان سنا دی۔

رات کی خبروں میں حکومت نے ہڑتال کی خبر کو ناکام
 قرار دیا تھا مگر مجھے علم تھا کہ اصل صورت حال کیا ہے اور چونکہ اس
 ہڑتال میں چند افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ لہذا ہنگامہ اور بڑھ
 گیا تھا اور ایک دن کی ہڑتال بڑھ کر تین چار دنوں کی ہنگامہ
 آرائی، توڑ پھوڑ اور خونریزی پر محیط ہو گئی تھی۔ پہلے ہی دن
 کا تجربہ اتنا ہولناک تھا کہ پھر میں نے گھر سے نکلنے کی ہمت نہ
 کی البتہ فون پر ریلوے والوں سے رابطہ ضرور کیا تھا اور ان کے
 پاس صرف ایک جواب تھا کہ ٹرین وقت پر آگئی تھی۔
 مسافروں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔ اس ناکامی کے
 بعد شہلا کے گھر فون کر کے رابطہ کیا گیا تھا اور وہ لوگ بھی یہ

خبر سن کر پریشان ہو گئے کہ شہلا وہاں سے روانہ ہونے کے
 بعد ابھی تک ان کے گھر نہیں پہنچی تھی۔

☆.....☆

تیسرے دن حالات کچھ حد تک معمول پر آ گئے تھے
 میں نے پتا کر لیا تھا کہ وہ اسٹیشن پر رک گئی ہوگی۔ میں نے ٹیکسی
 پکڑی اور روانہ ہو گیا۔ ادھر ادھر بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملی تب
 میں نے خونچے والوں سے معلومات لینی شروع کی۔ ان سے
 جو باتیں معلوم ہوئیں اس کو اگر الفاظ کا پیرہن دوں تو واقعات
 کچھ یوں بنتے ہیں۔

وہ پڑھی لکھی اور عقلمند لڑکی تھی مگر اسٹیشن پر آ کر جب
 اچانک اسے اس صورت حال سے واسطہ پڑا کہ اسے رسیو کرنے
 والا کوئی نہیں ہے اور اس پر سزا دیہ کہ یہاں سے شہر جانے کی
 کوئی سبیل نہیں ہے تو وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔ یہ بات تو اس کی
 سمجھ میں آ رہی تھی کہ ہڑتال کی وجہ سے اسے کوئی لینے نہیں
 آیا مگر یہ مسئلہ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ یہاں سے جائے گی
 کیسے اور اگر یہاں سے نکل نہ سکی تو یہاں ٹھہرنے کا کیا انتظام
 ہوگا؟

اس طرح اور بہت سے لوگ بھی وہاں پریشان بیٹھے
 ہوئے اپنے اپنے انداز سے اس صورت حال پر تبصرہ کر رہے تھے
 کیونکہ اسٹیشن پر موجود قلیوں کا کہنا تھا کہ یہاں سے نکلنے کی
 کوشش کرنا حماقت ہے۔ ویسے بھی اسٹیشن سے اترتے ہی
 سب لوگ اپنے اپنے المل وھیال سمیت ادھر ادھر بکھر گئے تھے
 اور وہ تنہا پریشان سی کھڑی تھی۔ تنہا لڑکی کو دیکھ کر شہدوں نے
 ادھر ادھر منڈلانا شروع کر دیا اور یہ صورت حال دیکھ کر وہ اور بھی
 پریشان ہو گئی تھی۔ آخر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک فیملی کے
 پاس جا کر کھڑی ہو گئی تاکہ دیکھنے والے اسے بھی ان کا ایک
 حصہ سمجھیں اور ان غنڈوں سے نجات ملے مگر وہ کب تک وہاں
 کھڑی رہ سکتی تھی۔ آخر اس نے ریلوے کے افسران سے مدد
 لینے کا فیصلہ کیا اور وہاں سے گزرتے ہوئے سفید کوٹ میں
 ملیوس ایک ٹی بی کو روک لیا۔

”سنیں! آپ لوگ مسافروں کو ان کی منزل تک
 پہنچانے کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟“

”بی بی آپ کا دماغ تو صحیح ہے؟“ وہ بولا۔ ”بی بی آپ
 اے والے ہی ٹرانزٹ مسافروں کا خیال کرتے ہیں۔ منزل
 پر پہنچانا ان کی بھی ذمے داری نہیں ہوتی اور پھر یہ تو غریب
 ساریلوے کا حکم ہے۔“

”مگر ایسی ہنگامی صورت حال میں آپ انسانی ہمدردی کی

بنیاد پر کم از کم مسافروں کو ٹھہرانے کا مسئلہ تو حل کر سکتے ہیں؟“
 ”اس کے لیے ویننگ روم ہے۔ آپ وہاں چلی جائیں۔“
 کیارات بھی وہیں بسر کروں گی؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”وہاں آپ مہینا بھر بھی ٹھہریں تو ریلوے کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وہ بولا اور آگے بڑھ گیا۔
 تبھی ایک فیشن ایبل سی عورت اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔ ”سنو میں کافی دیر سے تمہیں تنہا اور پریشان کھڑا دیکھ رہی ہوں۔ کیا کوئی لینے نہیں آیا؟“

”آپ سے مطلب؟“ اس نے اسے گھورا۔
 ”ارے بھئی ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں کوئی ایری غیر سی عورت نہیں ہوں۔ مشہور سماجی کارکن ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے دیکھ لو۔“ اس نے پرس سے کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔
 ”میں یہاں اپنے ایک عزیز کو لینے آئی تھی۔“ وہ اسے کارڈ پڑھتا دیکھ کر بولی۔ ”وہ تو آئے نہیں، شاید انہیں ہڑتال کی اطلاع مل گئی ہوگی۔ سو میں گھر جا رہی تھی کہ تم پر نظر پڑی۔ تم دور ہی سے پریشان نظر آ رہی تھیں۔ میں اس خیال سے رک گئی کہ اکیلی لڑکی اور زمانہ خراب ہے۔ بہر حال اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ بات کرتے ہوئے وہ لڑکی کو بھی دیکھتی جا رہی تھی جس کے چہرے کا تناؤ آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔

”مگر.....“

”اگر مگر نہیں۔ تم اکیلی لڑکی ہو۔ یہاں کہاں وقت گزارو گی؟ اور ہڑتال کا پتا نہیں کب ختم ہو۔ کب کوئی تمہیں لینے آئے اور کب تم حفاظت سے گھر جاؤ۔ اسی خیال سے میں نے تمہیں پوچھ بھی لیا کہ خدا نخواستہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو میں کل خدا کو کیا جواب دوں گی۔ اگر تم میری مدد لینا نہیں چاہتی تو تمہاری مرضی۔ میرا فرض ادا ہو گیا۔ میرے ضمیر پر اب کوئی بوجھ نہیں رہا۔“ وہ بڑے غیر محسوس طریقے سے لڑکی کو اپنی جانب سے مطمئن کر رہی تھی۔ اس کے شکوک دور کر رہی تھی۔ ”ویسے اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہ ہو کیونکہ ظاہر ہے ایک انجان عورت پر کون اعتبار کرے گا بلکہ میں بھی تمہاری جگہ ہوتی تو شاید اعتبار نہ کرتی۔“ اس نے ایک اور حملہ کیا۔ ”تو اس کا حل یہ ہے کہ تم کسی اگلی ٹرین سے واپس چلی جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ اس وقت تک یہاں ٹھہر جاؤں گی جب تک تم گاڑی میں سوار نہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد میں چلی جاؤں گی۔“

اس کا یہ وار کبھی خالی نہیں جاتا تھا۔ کوئی شخص گھر سے کسی کام کے لیے نکلتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ کام پورا کر کے ہی لوٹے اور ویسے بھی یہ لڑکی کسی مجبوری کسی کام کے باعث ہی تنہا سفر کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا سوچنے لگیں؟“ وہ اس کو چپ دیکھ کر بولی۔ ”تم میری لڑکیوں کی طرح ہو۔“ لڑکیوں کا لفظ اس نے ایک خاص انداز میں ادا کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو میں تمہیں ہڑتال ختم ہوتے ہی جہاں کہو گی چھوڑ آؤں گی بلکہ ایسا کرنا کہ وہاں سے فون کر کے میرے گھر کا پتا دینا۔ ان کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی اور تم بھی آرام اور خیریت سے رہو گی، اگر تم واپس جانا چاہو اور پیسوں کا مسئلہ ہو تو شرم نہیں کرو، میں تمہیں رقم بھی دے سکتی ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔“

”نہیں نہیں، پیسوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپ کو نہیں جانتی اور.....“

”نہیں جانتیں، تو میرے ساتھ مت آؤ۔“ اس نے ناراض ہوتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔ ”تم اگر مجھے نہیں جانتیں تو ایک زمانہ مجھے جانتا ہے۔ بہر حال تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ واپس چلی جاؤ۔“ اس نے جانے کے لیے قدم اٹھائے اور واپس مڑ کر فیصلہ کن حملہ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تو جا رہی ہوں مگر جاتے جاتے ایک اور بات تمہیں بتا دوں کہ میرے گھر میں، میں اور میری لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ مرد صرف چوکیدار ہے۔“

”اچھا چلیں ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ وہ اعتماد کے فریب کا شکار ہوگئی تھی۔ ”مگر یہ تو بتائیں کہ باہر ہڑتال ہے، ہم یہاں سے کیسے جائیں گے۔“
 ”ہم جیسوں کے لیے کوئی ہڑتال نہیں ہوتی۔ ہڑتال تو غریب عوام کے لیے ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز سے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

اتنا تو معلوم ہو ہی چکا تھا کہ ایک اکیلی لڑکی جس کا حلیہ بھی شہلا سے ملتا جلتا تھا وہ کسی فیشن ایبل عورت کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ اگر وہ شہلا ہی تھی تو اب تک تو.....
 اسے گھر آ جانا چاہیے تھا مگر آج ہڑتال کو گزرے ہوئے پندرہواں روز تھا۔ ان پندرہ دنوں میں میں کہاں کہاں نہ خوار ہوا تھا۔ کہاں کہاں میں نے شہلا کو نہ ڈھونڈا تھا۔ تھانوں میں، اسپتالوں میں، رکشا ٹیکسی ڈرائیوروں سے میں شہلا کا حلیہ

بتا کر معلومات حاصل کرتا پھرا تھا مگر لگتا تھا کہ شہلا کو زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا کیونکہ شہلا کے ان کے پاس نہ پہنچنے کی اطلاع پا کر اس کے گھر والے بھی روتے پینتے ان کے ہاں آگئے تھے اور وہ بھی اس کے ساتھ شہلا کو سارے شہر میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

ہر رات جب وہ مایوس اور نامراد گھر لوٹتے تو گھر والوں کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ سب کچھ تو ان کے چہروں پر ہی لکھا ہوتا۔

مجھے لگتا جیسے گھر پر نحوست نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں یا پھر وہ انسان نہیں رہے، رو بوٹ ہو گئے ہیں۔ مشینی انداز میں سب کام کرتے چلے جا رہے ہیں۔ خواب میں چل پھر رہے ہیں۔ وہ گھر جہاں پہلے ہنسی مذاق اور رونق ہو کر تھی جیسے قبرستان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہاں سوائے آنسوؤں کے، اترتے چہروں کے اور دعاؤں کی آوازوں کے اور کچھ نہیں ہے۔

ان پندرہ دنوں میں، میں دفتر بھی نہ گیا تھا اور اب جبکہ ناکامی حواس پر غالب آتی جا رہی تھی شہلا کے ملنے کی امید کم سے کم ہوتی جا رہی تھی اور زندگی دوبارہ اپنی ڈگر پر لوٹنے کی کوشش کر رہی تھی تو اسے بھی نوکری پر جانے کا خیال آیا تھا کیونکہ پیغام ملا تھا کہ اگر کل تک وہ نوکری پر نہیں آیا تو نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ میرے غم برہمارے ساتھ پیش آنے والے حادثے پر افسوس تو کبھی کو تھا مگر غم سے زیادہ اہم تو زندگی ہے۔ غم جاناں سے بڑا غم، غم دوراں ہے۔ سو میں آج دفتر آ ہی گیا تھا۔

دفتر میں بھی سامان صحیح طرح کام نہیں ہوا۔ اک عجیب سی بے چینی، اک بے گلی طاری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہے یا پھر ہونے والا ہے۔ دفتر سے نکل کر جب واپس آ رہا تھا تو راستے میں مجھے کیکروں کے جھنڈ کے پاس لوگوں کا مجمع نظر آیا جسے دیکھ کر میں بھی رک گیا۔ تجسس کشاں کشاں اسے بھی لوگوں کے درمیان لے گیا۔

لوگوں کے ہجوم سے اندر کھس کر جب وہ نیچے دیکھنے کے قابل ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے سر پر آسمان گر پڑا ہے۔ ٹائٹس کپکانے لگیں میں نے سہارے کے لیے ساتھ کھڑے آدمی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔

وہاں شہلا کی لاش پڑی تھی۔ لگتا تھا اسے اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ہلاک کرنے سے پہلے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، یہ تو بتانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس کی

ظاہری حالت خود اپنی کہانی کہہ رہی تھی۔ میرا جی چاہا خوب زور زور سے روؤں۔ شہلا کی لاش کندھے پر اٹھا کر ان ہڑتال کرنے والوں کے پاس لے جاؤں اور ان سے پوچھوں کہ بتاؤ کہ اس کا کیا قصور تھا؟ کیا ملائم لوگوں کو ہڑتال کر کے تم نے اس جیسے کتنے گھرانے اجاڑے؟ مگر یہ کوئی فلمی سین نہ تھا۔ نہ میں کوئی ہیرو تھا۔ میں اسی دنیا کا ایک عام بزدل شخص تھا۔ شرافت کا دعوے دار تھا۔ اخلاقی قدروں کا پجاری تھا اور سب سے بڑھ کر موجودہ زہریلے معاشرے کا اسیر تھا جو گناہ گار پر پتھر اچھالنے سے پہلے اپنے گریبان میں کبھی نہیں جھانکتے۔

”اب جو رسوائی ہو چکی ہے اسے مزید بڑھانے سے کیا فائدہ؟“ میں نے سوچا۔ ”خو! خواہ خود کو متاثر ہانے سے انصاف تو نہیں مل سکتا اور نہ ہی شہلا واپس آ سکتی ہے۔ پولیس یہاں سے لاش مردہ خانے لے جائے گی۔ اسے وہاں سے ہی وصول کرنا بہتر ہوگا۔ بلکہ اسے نہ پہچانا ہی بہتر ہے۔ وہ لوگ خود ہی اسے لاوارث قرار دے کر دفن کر دیں گے۔“

میں وہاں سے باہر نکل آیا مگر آگے جا کر میں نے ایک دکان سے چادر خرید کر شہلا کی شہرہ لاش پر ڈال دی اور واپس گھر روانہ ہو گیا۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے گھر والوں کو یا شہلا کے ماں باپ کو یہ اندوہناک خبر کیسے سناؤں گا؟ وہ لوگ یہ کیسے برداشت کریں گے؟ اسے خود اپنے خیالات پر تعجب ہو رہا تھا کہ میں نے یہ کیسے سوچا کہ شہلا کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفن دیا جائے۔ کیا وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی بے حس ہو گیا ہوں؟

”خیر۔“ میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ ”میں پہلے یہ خبر نکل کر سناؤں گا اور بعد میں ان کے مشورے پر عمل کروں گا۔“ مگر جونہی میں باہر سے گھر میں داخل ہوا۔ دعا کی آواز نے قدم روک لیے۔ شہلا کی امی جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگ رہی تھیں۔

”یا خدا! اب ہمیں تیری رحمت نہیں چاہئے۔ اب تو اسے گھر نہ لانا۔ اب تو اسے موت دے دینا۔“ اور میں کھڑا سوچے جا رہا تھا کہ اس کہانی کے مصنف نے جو الفاظ لکھے، وہ تو بے حس تھی۔ میں تو شہلا کو لینے نہ جا سکا وہ بے بسی تھی، مگر اک ماں کی اس دعا کو کیا نام دوں؟ بے بسی یا بے حس۔



سوزا

محترمی عذرا رسول
السلام علیکم

میں ایک اور ناقابل فراموش واقعہ کو کہانی کی شکل میں حاضر ہوں۔ اس تحریر میں سبق ہی سبق ہے یہی وجہ ہے کہ اسے میں نے سرگزشت کے معیار کا سمجھا ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

شہناز احمد
(لاہور)

”میرا نام نور زمان ہے۔ پٹھے کے لحاظ سے میں ایک خانساں ہوں۔ جو کہانی میں آپ کو سنانے والا ہوں۔ وہ بالکل سچی ہے۔ صرف کرداروں کے نام تبدیل کیے ہیں۔ تاکہ ان کی شناخت کو صیغہ راز میں رکھا جاسکے۔“ کہتے ہوئے نور زمان نے میری طرف دیکھا۔

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا۔ ”بلا جھک پوری کہانی سناتے چلے جاؤ میں اسے بلا کم و کاست شائع کراؤں گی۔“

اس نے دھیسے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”یہ کوئی چودہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اور میری بیوی حمیدہ ایک کوشی میں کام کرتے تھے۔ مالک کا نام صدیق احمد تھا۔ وہ ایک انجینئر تھے۔ ایک کنال پر بنا ہوا گھر تھا۔ جہاں وہ اپنی بیگم طلعت اور تین بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ جب میں نے اور حمیدہ نے کام شروع کیا تو دونوں بیٹیوں صائمہ اور عائشہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ صائمہ کینیڈا میں اور عائشہ دہلی میں رہائش پذیر تھیں۔ بیٹا نعمان ابھی کنوارہ تھا۔

وہ بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتا ہوا انجینئرنگ کر رہا تھا۔ نعمان جنہیں ہم چھوٹا صاحب کہتے تھے۔ بہت خوش شکل، اسمارٹ اور اچھے قد کاٹھ کے مالک تھے۔ مزاج میں گرمی اور ضد تھی۔ جس چیز پر ہاتھ رکھتے تھے وہ لے کر چھوڑتے تھے۔ وہ بیگم صاحبہ کی آنکھ کا تارا تھے۔ صدیق صاحب اگر کسی چیز کے لیے منع بھی کر دیتے تو وہ چھپ کر ان کو بتائے بغیر انہیں دے دیتی تھیں۔“

☆.....☆.....☆

چھوٹے صاحب کو پرانا ڈرائیور محمد دین کالج چھوڑنے جاتا تھا۔ واپسی پر وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ آتے تھے۔

”ابو مجھے اپنے لیے گاڑی چاہیے۔“ ناشتے پر انہوں نے یہ دھماکا کیا۔

صدیق صاحب کا ہاتھ منہ تک جاتے جاتے رک گیا۔ ”کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مجھے ڈرائیور کے ساتھ جانے میں شرمندگی ہوتی ہے۔ اور پھر واپسی کے لیے کسی نہ کسی دوست کی منت کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ یہ میرے لیے کس قدر شرمندگی کا باعث ہے؟“ انہوں نے باپ سے کہا۔ وہ تو دنگ رہ گئے۔

”دیکھو میاں! میں تقریباً ریٹائرڈ ہونے والا ہوں۔

تمام عمر عزت سے نوکری کر کے ہی اس قابل ہوا ہوں کہ تم لوگوں کو اچھی رہائش دے سکوں۔ گاڑی بھی میں نے یہ مشکل قسطوں میں خریدی ہے۔ تمہیں تو شاید اندازہ بھی نہ ہوگا۔ سوری۔ یہ خواہش میں آپ کی پوری نہ کر سکوں گا۔“

کری زور سے پیچھے کھینٹتے ہوئے غصے سے انہوں نے کہا تو چھوٹے صاحب اور بیگم صاحبہ ڈرا گھبرا گئے۔

دراصل صدیق صاحب ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے لیکن جب سال چھ ماہ میں غصے میں آتے تو ان سے خوف

آتا تھا۔ اس دن بات آئی گئی ہو گئی لیکن اگلے دن بیگم صاحبہ نے دنی دبی زبان سے خواہش پر کم از کم غور کرنے کے لیے کہا تو بدک گئے۔ ”زلزلہ آنے کے بعد اسے کہو نوکری کے لیے اپلائی کرے اور پھر اپنے لیے جو مرضی چاہے خریدتا رہے۔“

”اس ملک میں نئے ڈگری یافتہ کو کون اتنا دے گا کہ وہ گاڑی لے سکے۔“ وہ منمنائیں۔

”تو ٹھیک ہے ملک سے باہر چلا جائے۔ وہاں اس

کی ڈگری کی مانگ ہے۔ بہت سے نوجوان آج کل جا رہے ہیں۔ محنت کرنی ہوگی تو صاحبزادے کو ہوش آ جائیں گے۔“

یہ بات چھوٹے صاحب کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔

آئیڈیا بے حد پسند آیا۔ غیر ملکوں میں نوکریاں کافی مل رہی تھیں۔ اب بس زلزلہ کا انتظار تھا۔

چھوٹے صاحب کا کافی اچھا رزلٹ آیا۔ بہت بڑی

پارٹی دی گئی۔ صدیق صاحب کے ایک دوست سعودی

عرب میں ایک شخص کو جانتے تھے۔ ان سے نوکری کی بات

کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ایک آدھ مہینے کے اندر پتا

کر کے اطلاع کریں گے۔

چھوٹے صاحب نے تیاریاں شروع کر دیں۔

پاسپورٹ، نئے کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ جس دن ان کو نوکری

ملنے کی خوشخبری ملی۔ خوشی کے مارے برا حال ہو گیا۔

جوں جوں جانے کا وقت نزدیک آ رہا تھا بیگم صاحبہ کا

غم اور فکر کے برا حال تھا۔ وہ ان کے لاڈلے بیٹے تھے۔

جنہیں اپنا کوئی کام کرنے کی عادت نہ تھی۔ کبھی گھر سے باہر

نہیں رہے تھے اور اب یوں پورے ایک سال کے لیے؟

جگر کا کلکرا آنکھوں سے جدا ہو رہا تھا۔ وہ تو دن میں کوئی

دسیوں بار روتیں۔

☆.....☆.....☆

چھوٹے صاحب نے سعودی عرب پہنچ کر فون کیا۔

ماں سے بات کی، بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں تب ماں

کو تسلی ہوئی۔ مجھے یاد ہے شروع شروع میں ان کے کافی

فون آتے تھے۔ پھر کم ہو گئے۔ پھر ایک دن فون پر بالکل

رونے والے ہو گئے۔ ”ابو..... میرا دل بالکل نہیں لگ رہا۔

باہر سائٹ پر اس قدر گرمی ہے کہ برداشت سے باہر ہے۔

یوں بھی تفریح کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں واپس آنا چاہتا

ہوں۔“

صدیق صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بیوی

سے بات نہ کی، نہ کرائی۔ بس سمجھاتے رہے کہ نوکری کنٹریکٹ کی ہے۔ ایک سال کے اندر واپس آنا ناممکن ہے۔ بس تھوڑا صبر سے کام لو۔ شروع شروع میں ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔ بعد میں دل لگ جائے گا۔ تنخواہ بھی اچھی خاصی مل رہی ہے۔“ دونوں میں کافی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ لیکن اب صدیق صاحب بھی پریشان رہنے لگے۔ بیٹے کے دل کا حال جان چکے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت گزرا۔ اس عرصہ میں بیگم صاحبہ نے بستر پکڑ لیا۔ چپ چاپ، گم صم سی رہنے لگیں۔ ایک دن میری بیوی حمیدہ سے کہنے لگیں۔

”میدان۔ تمہیں پتا ہے کہ میرا بیٹا بہت ارمانوں، دعاؤں سے مجھے ملا ہے؟ میری اوپر تلے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں تو سسرال والوں نے ناک میں دم کر دیا۔“

”تین.....!“ حمیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

کیونکہ ہمیں تو صرف دو کا پتا تھا۔

”ہاں! تین۔ جب میری تیسری بیٹی پیدا ہوئی تو میری تند نے کہا کہ اس کا نام بشری رکھ دیں۔ شرطیہ بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کے بعد۔“ وہ رکیں، گہرا سانس لیا۔ حمیدہ ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔

”خیر! تیسری کا نام ہم نے بشری رکھا۔ وہ بڑی پیاری بچی تھی دس ماہ کی ہوئی تو ماشاء اللہ بیٹھ تو سکتی تھی ہی کبھی کبھی چیزیں پکڑ کر کھڑا ہونے کی کوشش بھی کرتی۔ میں اس کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ پھر ایک دن..... بیگم صاحبہ بالکل خاموش سی ہو گئیں۔ نظریں جیسے خلا میں گاڑھ دین۔ میں اس کو نہلانے کے لیے غسل خانے میں لے گئی۔ چھوٹا کپڑے دھونے والا ٹب تھا۔ اس میں نیم گرم پانی ڈالا اور اس میں تھوڑا سا صابن ڈال کر گھولا تو جھاگ بن گئی۔ بشری کو اس میں بٹھایا۔ وہ بہت زیادہ خوش ہو کر جھاگ سے کھیلنے لگی۔ میں نے نیل پالش کی بند شیشی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ کلکاریاں مارتے ہوئے کھیلتی رہی۔ اندر میرے کمرے میں فون بج رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔ میری بڑی پرانی دوست کا فون تھا۔ وہ کراچی سے اپنے ماں باپ کے گھر لاہور آئی ہوئی تھی۔ مجھے باتوں باتوں میں دھیان ہی نہ رہا کہ میری دس ماہ کی بچی ٹب میں اکیلی بیٹھی ہے۔ جب احساس ہوا تو لپک کر باہر آئی۔ بشری کا منہ نیچے جھکا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی۔ پریشان ہو کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو میری پیاری بیٹی۔ لاڈلی بشری مرچکی

تھی۔“

اب بیگم صاحبہ نے باقاعدہ سکیوں سے رونا شروع کر دیا۔ ہم دونوں میاں بیوی کو بہت افسوس ہوا۔

”کیسے؟“ حمیدہ نے پوچھا۔

”میری نیل پالش کی بوتل پانی میں گری تو اس نے جھک کر اٹھانے کی کوشش کی۔ پانی میں صابن کی وجہ سے پھسلن تھی وہ اپنا آپ سنبھال نہ سکی اور اٹنے منہ پانی میں جا پڑی۔ ابھی باتیں کرنے کے قابل نہ ہوئی تھی۔ وہ غریب مجھے آواز بھی نہ دے سکی۔ منہ، حلق میں صابن والا پانی جا چکا تھا۔ یوں میری بشری ہمیں چھوڑ گئی لیکن اگلے سال مجھے اپنا بھائی نعمان تحفے میں دے گئی۔ میرا قیمتی۔ لاڈلہ بچہ۔“

☆.....☆.....☆

خدا خدا کر کے چھوٹے صاحب واپس آئے تو بدلے بدلے تھے۔ رنگ سا نولا پڑ گیا تھا۔ ذرا سنجیدہ سے ہو گئے تھے۔ جسم بھی کمزور لگ رہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ رقم بچا کر ضرور لائے تھے۔ کتنی؟ میں نہیں جانتا۔

بیگم صاحبہ تو جیسے پھر سے جی اٹھیں۔ ”بھئی! میں اب اپنے بیٹے کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ یہیں کہیں لاہور میں ہی نوکری ڈھونڈے۔“

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں سے ہم دیکھ رہے تھے کہ چھوٹے صاحب خوب تیار ہو کر آفس جانے لگے ہیں۔ کبھی کبھی تو گھر میں گنگناتے بھی تھے۔ ماں باپ خوش ہو گئے۔

”میں اب اپنے چاند کی شادی کروں گی۔“ بیگم صاحبہ نے کہنا شروع کیا۔

خاندان میں لڑکیوں کی بھرمار تھی۔ بھائی کی تین۔ دیور، بہن کی بیٹیاں۔ ایک آدھ تو بہت پسند تھی۔ بیٹے سے رات کھانے پر ذکر کیا۔ دہلی زبان سے بھائی کی بیٹی عفت کی بات کی تو وہ جیسے بدل سے گئے۔

”عفت؟“ وہ ذرا غصے سے بولے۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں نا امی؟“ انہوں نے پرانی عادت اپناتے ہوئے ماں سے بدتمیزی سے کہا۔

”کیوں۔ عفت میں کیا برائی ہے؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”خوش شکل ہے۔ پڑھی لکھی ہے..... اور.....“

”بس امی۔ پلیز۔ میں خاندان میں کسی بھی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔ نہ عفت سے، نہ ارم سے اور نہ باقی کسی سے۔“ اس نے بہت بدتمیزی سے ہاتھ اٹھا کر ماں سے کہا۔

وہ بے چاری بچھری گئیں۔

”میں اپنی مرضی سے شادی کروں گا۔ اس لیے مہربانی کر کے اس کا ذکر دوبارہ نہ کریں۔“ کرسی کو پیچھے تھکیٹ کر انہوں نے ڈھیٹ پن سے کہا۔ ماں باپ منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

”اب چھوٹے صاحب کا یہ معمول بن گیا کہ تقریباً ہر تیسرے روز گھر پر فون کرتے، میں فون اٹھاتا تو کہتے۔ نور زمان۔ امی سے کہنا کہ آفس کے دوست کھانے کے لیے باہر جا رہے ہیں۔ میرا کھانے پر انتظار نہ کریں۔“ ماں باپ خوش ہو جاتے کہ بیٹے نے اچھے دوست بنا لیے لیکن سوشل ہو گیا ہے۔

وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے نئے موبائل پر گزارتے جو وہ اپنے لیے سعودی عرب سے لائے تھے۔ ایک دن میں سائیکل پر ڈنل روٹی لے کر آ رہا تھا کہ میں نے چھوٹے صاحب کو مارکیٹ کے پاس گاڑی روک کر جوس پیتے دیکھا۔ برابر میں ایک جوان لڑکی تھی۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

میں حیران رہ گیا۔ لڑکی کو زیادہ غور سے نہ دیکھ سکا۔ بس منہ چھپا کر گھر کی طرف چل دیا۔ بیگم صاحبہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ حمیدہ سے بات کی۔ وہ بھی ذرا پریشان ہو گئی۔ ”جوان لڑکی کا کیا کام کسی غیر مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا۔“ اس نے ذرا نفرت سے کہا۔

”بھئی بھاگوان۔ نئے زمانے کے امیر لوگ ہیں ہو سکتا ہے ساتھ کام کرتی ہو۔“ برا تو مجھے بھی لگا۔ لیکن بات بنائی۔

☆.....☆.....☆

آخر ہمارا شک سچ ثابت ہوا۔ چھوٹے صاحب نے ایک دن شام کے وقت ماں باپ سے میٹنگ کی۔ ”امی۔ ابو۔“ انہوں نے ذرا گلا صاف کرتے

ہوئے کہا۔ وہ تھوڑے نروس سے لگ رہے تھے۔ ”میں کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ ”ارے واقعی؟“ اماں، ابا اس طرح اچھلے جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔

”کون ہے لڑکی۔ کس خاندان سے ہے۔ کہاں دیکھی ہے۔؟“ امی نے پوچھا۔

”وہ۔ میرے ساتھ دفتر میں کام کرتی ہے۔ نام شازیہ ہے۔ بہت اچھی اور نیک لڑکی ہے۔“ اب وہ بھی شیر ہو گئے۔ ”خاندان بھی اچھا ہے۔ پڑھے لکھے سادہ سے لوگ ہیں۔ میں اس کو کافی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت سلجھی ہوئی اچھی لڑکی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ لوگوں کے لیے یہ کتنا ضروری ہے کہ وہ مذہبی ہو، ماڈرن نہ ہو تو بس اب سوچئے کہ سب خوبیاں اس میں موجود ہیں۔“

امی سوچ میں پڑ گئیں کہ اتنا کچھ اتنی جلدی پتا چل گیا؟ وہ دل میں کہنے لگیں۔

”آپ لوگ رضامند ہو جائیں تو وہ اپنے گھر والوں سے بات کر لے گی۔ آپ ان سے مل لیتا۔ پتا کرو لیتا اور پھر رشتے کی بات کر لیتا۔ ایک آدھ دن میں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے۔

ماں باپ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”اللہ کرے لڑکی اچھی ہو، اچھے خاندان سے ہو۔ ہماری تو نسل اس سے چلے گی۔“ امی نے ابو سے کہا۔ ”آمین۔“

”تو پھر کب چلنا ہے بیگم؟“ صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”جب وہ کہے گا۔“ اگلے دو دن خیریت سے گزر گئے۔

”امی میں آپ کو شازیہ کی امی کا فون نمبر دیتا ہوں۔ آپ ان سے بات کر لیں اور کوئی دن جانے کے لیے مقرر کر لیں۔“ چھوٹے صاحب نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ ”یہ لیں یہ نمبر ہے۔ ان کا نام مسز جمیل ہے۔“

بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں نمبر دے کر وہ باہر نکل گئے۔ کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے نمبر گھمایا۔

مسز جمیل صاحبہ سے بات ہوئی۔ ملاقات کے لیے اجازت مانگی جو فوراً مل گئی۔ اگلے دن کے سہ پہر کا وقت دیا گیا۔

چھوٹے صاحب کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔

سنجالی۔ ”ہم نے ان کے والدین سے بات کی تھی رشتے کی۔ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔“

”اوہ۔ کتنا سوچ کر؟“

”بھئی۔ ہمیں کیا پتا میاں صاحبزادے۔ یہ ان پر منحصر ہے۔“ صاحب اور بیگم کمرے میں چلے گئے۔ میں گھر سے باہر آیا جہاں ڈرائیور محمد دین گاڑی پر کپڑا مار رہا تھا۔ وہ کافی گندی ہو رہی تھی۔ شاید کافی دور سے آئی تھی۔

”یار نور زمان۔ یہ ہمارے چھوٹے صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے میرے قریب آ کر ہولے سے کہا۔ پھر بتانے لگا کہ ان کا گھر کافی دور تھا۔ گلیاں بھی تنگ تھیں گھر چھوٹا سا تھا۔ ملازم بھی شاید کوئی نہ تھا۔ بی بی نے گیٹ بھی خود ہی کھولا تھا۔

”یار۔ میں نے اس بی بی کو صاحب کے ساتھ کافی دفعہ دیکھا ہوا ہے۔“ محمد دین نے ذرا مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

”بات سن یار محمد دین۔ تم ذرا اس سے دور ہی رہو۔ ہمارا تمہارا معاملہ نہیں ہے یہ لوگ جانیں اور ان کے کام۔“ میں نے دین محمد کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

یہ تو ابتداء تھی۔ دو دن بعد مسز جمیل نے فون کر کے کہا کہ ان کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

”جمیل صاحب تو کہہ رہے تھے کہ آپ لوگوں کا پتا تو کروالیں۔ لڑکے کا پتا کر لیں۔ لیکن میں نے کہا کہ نہیں جی۔ کوئی ضرورت نہیں مجھے تو لڑکی کی والدہ بہت پسند آئی تھیں۔“ وہ جوش سے کہہ رہی تھیں۔

بیگم صاحبہ کا چہرہ زرد سے زرد ہوتا رہا۔ دل بیٹھے سا گیا۔ ہلکی سی اُمید تھی۔ کہ شاید ادھر سے انکار ہو جائے۔

☆.....☆.....☆

رشتہ پکا ہونے کی دیر تھی کہ زیور۔ کپڑے۔ چیزیں وغیرہ دھڑا دھڑا آرڈر ہونے لگیں۔ دونوں بہنوں کو اطلاع دے دی گئی۔ دونوں اپنے بچوں سمیت آئیں۔ رات میٹنگ ہوئی۔ لڑکی والوں کے خاندان کے متعلق بحث ہوئی۔ ان میں صدیق صاحب جیسے خاندان کی طرح کوئی بھی چیز روایتی نہ تھی۔ کسی چیز پر اعتراض تو چھوڑو۔ تنقید بھی نہ ہو سکتی تھی۔ ذرا سی بات پر ہی چھوٹے صاحب کا پارہ۔ آسمان پر چڑھ جاتا۔

”ابھی سے اس کا یہ حال ہے تو بعد میں تو یہ بالکل جو رو کا غلام بن کر رہ جائے گا۔“ صائمہ بی بی ذرا فکرمند سے

”آپ لوگ کیا لے کر جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے ایک وغیرہ۔“ انہوں نے ماں سے پوچھا۔

”عام طور پر تو رشتہ دیکھنے جاتے ہیں تو کچھ بھی لے کر نہیں جاتے۔“ امی نے سادگی سے کہا۔

”کیا بات کر رہی ہیں امی۔ خالی ہاتھ جائیں گی آپ؟ اچھا بڑا سا ایک لے کر جائیں۔“

☆.....☆.....☆

شام پانچ بجے پہنچنے کے لیے انہیں پونے پانچ پر نکلنا پڑا۔ گھر ایسے علاقے میں تھا جس سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ محمد دین ڈرائیور ساتھ تھا۔

جب چھ بجے گاڑی واپس گیٹ میں داخل ہو رہی تھی تو چھوٹے صاحب کی بے چینی دیدنی تھی۔ صاحب اور بیگم صاحبہ گاڑی سے نکلے۔ ذرا چپ چپ سے تھے۔

”کیا ہوا۔ گھر آسانی سے مل گیا۔ کیسے لوگ تھے۔ لڑکی آپ کو کیسی لگی؟“ سب سوالات ایک ہی سانس میں انہوں نے داغ دیئے۔

”ٹھہر تو سکی۔ اندر تو آنے دو۔“ امی نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

وہ ذرا ٹھیک سے گئے۔ ”کیا ہوا؟“

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے آپ کو لوگ اچھے لگے؟“

”ٹھیک تھے۔“

”اور گھر یار؟“

”ٹھیک تھا۔“ سادہ سا جواب آیا۔

”شاز یہ ملی؟“ بے چینی سے پوچھا گیا۔

”ملی۔ ٹھیک تھی۔“ جوش کا فقدان تھا امی کے جواب

میں۔

”اوہ۔“

”آپ مجھے پوری بات کیوں نہیں بتا رہے ہیں؟“

تنگ آ کر صاحب نے پوچھا۔

”بھئی اور کیا بتاؤں۔ تم نے ان کا گھر دیکھا ہوا ہے؟“

”نہیں۔ کیوں؟ چھوٹا سا ہے؟ شاز یہ بے چاری

مجھے بتا رہی تھی کہ ان کا گھر بہت بڑا نہیں ہے۔ اس کے والد

کی حلال کی کمائی سے بن اتنا ہی بس سکا۔“

”گھر تو چھوڑو۔ بیگم۔ کیا قصہ لے بیٹھی ہو۔“

صاحب نے بیٹے کے چہرے پر افسردگی دیکھ کر بات

صاحبہ اور صدیق صاحب کو بچے کو زیادہ پکڑنے نہیں دیتی تھیں۔

”آپ چھوڑ دیں۔ وہ رورہی ہے۔ آپ سے نہیں سنہیلے گی۔“ وہ بے بی فاطمہ کے متعلق کہتیں۔ زیادہ تر اپنے میکے میں بیٹھی رہتیں۔ پیدائش کا خرچ حالانکہ ان لوگوں نے کیا۔ دفتر سے گھر آنے کی بجائے نعمان صاحب بھی وہیں چلے جاتے۔ پھر رات دیر تک وہاں رکنے کے بعد گھر لوٹتے تو دونوں ماں باپ سوچکے ہوتے۔

انہی دنوں بڑی بیگم صاحبہ بیمار پڑ گئیں۔ پہلے تو بخار تھا۔ پھر شوگر کا مرض ہو گیا۔ جوڑوں کا درد، سب کچھ ہی تو جیسے ایک دم ہو گیا۔ وہ بستر سے لگ گئیں۔

ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی نہ تھا۔ میری بیوی حمیدہ سر وغیرہ دبا دیتی۔ لیکن اصل خدمت تو اپنی اولاد کرتی ہے۔ وہ کوئی نہ کر رہا تھا۔ صدیق صاحب بے چارے خود بھی کمزور ہو رہے تھے۔ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اب بیوی کی بیماری پر خرچوں پر خرچے۔ کبھی دبی زبان سے بیوی سے شکایت کرتے۔ ”دیکھو ذرا اپنے لاڈلے کو۔ تمہارے پاس دو پل بھی آ کر نہیں بیٹھتا۔ سسرال میں گھسار ہوتا ہے۔“

”چلیں۔ ایسے نہ سوچیں۔ بچہ ہے ٹھیک ہو جائے گا۔“ متحدو بیماریوں نے آخر ان کی جان کو لے کر چھوڑا۔ چھ ماہ کے اندر۔ ایک رات اچانک طبیعت بگڑ گئی۔ صدیق صاحب نے بیٹے کو فون کیا۔ انہیں اسپتال لے جانا تھا۔ وہ سالے کے بیٹے کی سالگرہ میں تھے۔ جو شہر سے کافی دور کسی ہوٹل میں منائی جا رہی تھی۔

”آپ ایسویٹنس منگوا لیں ابو۔ مجھے پہنچنے میں کم از کم ایک دو گھنٹے لگ جائیں گے۔“ سرگوشی میں کہا گیا۔ کیونکہ پیچھے میوزک کا کافی شور تھا۔

صاحبہ کی گاڑی چھوٹے صاحب کے پاس تھی۔ پریشانی میں پڑوس میں جا کر میں خواجہ صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے گاڑی نکالی۔ بیگم صاحبہ کو ڈالا۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے کار میں دم توڑ دیا۔

صدیق صاحب تو جیسے صدے سے سن سے رہ گئے۔ اسپتال والوں نے بھی تصدیق کر دی۔ ہمیں بھی بہت افسوس ہوا۔ بہت اچھی خاتون تھیں وہ۔ بے ضرر۔ نرم دل اور جلدی ہی اعتماد کرنے والی۔

چھوٹے صاحب ماں کے مرنے کے دو گھنٹے بعد پہنچے۔ وہ بھی صدے سے لگ رہ گئے۔ لیکن جو حیرت انگیز!

آخر کار شادی کا دن آن پہنچا۔ سردی بے پناہ تھی۔ برات میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ بڑے صاحب وضع دار قسم کے لوگوں میں سے تھے کہ برات کے بجائے ولیمہ پر سب کو بلایا جائے تاکہ لڑکی والوں پر بوجھ نہ پڑے۔ شازیہ بی بی بہو بن کر گھر میں داخل ہو گئیں تو سب کو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ وہ بہت محبت، عزت سے سب سے پیش آتیں۔ صائمہ بی بی کی بڑی بیٹی نائلہ سے بھی جیسے فوری دوستی ہو گئی۔ وہ صرف پندرہ برس کی تھی۔ اسی طرح عائشہ بی بی کا چھوٹا بیٹا احسن جو صرف چار برس کا تھا وہ بھی مامی مامی کرنے لگا۔

”چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ لڑکی اچھی سبھاؤ والی ہے؟“ میں اور حمیدہ بی بی ریلیکس ہو گئے۔ دونوں دو لہا دلہن شمالی علاقہ جات میں ایک ہفتہ کے لیے چلے گئے تو بچوں نے واقعی انہیں مس کیا۔

وہ لوگ واپس آئے تو سب کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آئے۔ چھوٹے صاحب بھی بہت خوش تھے کہ ان کی پسند سب کو پسند آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شادی کے دو ماہ کے اندر کچھ عجیب سی باتیں رونما ہونے لگیں۔ چھوٹے صاحب بڑی بیگم سے بری طرح اٹھتے۔ ہر بات پر ککتہ چینی، بحث۔ اس موقع پر شازیہ بی بی ان کو بہت نرمی سے سمجھاتیں۔ ”ایسے اپنی ماں سے بات نہ کریں۔ ماں کے قدموں میں جنت ہوتی ہے۔“ وہ آہستہ سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر کہتیں۔

بیگم صاحبہ جی ہی جی میں سراہتیں۔ محبت پاش نظروں سے دیکھتیں۔ کتنی اچھی بچی ہے۔ وہ سوچتیں۔ میں خواخواہ اس کے حق میں نہ تھی۔

یہ بات مجھے اور میری بیوی حمیدہ کو کچھ عرصے بعد پتا چلی کہ چھوٹے صاحب جب ماں سے بحث کرتے تو شازیہ بی بی ہی ان کے کان بھرتیں۔ وہ عادت سے مجبور بھڑک جاتے اور وہ ان دونوں کے درمیان صلح صفائی کرانے لگ جاتیں۔ ملازموں سے بدتمیزی۔ الزام تراشی ان کی عادت تھی۔ بیگم صاحبہ تو سب کے سامنے ان کی تعریفوں کے پل بانہتے نہ کھٹکتیں۔ لیکن ہم نے ان کو اچھی طرح جان لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پہلے سال ان کے یہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔ لیکن ہم نے نوٹ کیا کہ شازیہ بی بی، بیگم

بات تھی۔ وہ شازیہ بی بی کی تھی۔

بھڑکیلے کپڑے بدل کر سفید سادہ جوڑا پہن کر انہوں نے جو زارو قطار۔ دھواں دھار رونا شروع کیا۔ بین ڈالے۔ ”ہائے امی۔ ہائے امی۔ آپ کیوں چلی گئیں۔ ابھی تو میں نے آپ کی خدمت بھی نہ کی۔ اب فاطمہ کس کو دادو کہے گی۔“ وہ اتنی اونچی آواز میں بین ڈال رہی تھیں کہ پاس بیٹھی ہوئی خواتین بھی معترف ہو گئیں۔

”کتنی خوش قسمت تھی طلعت، کتنی فرمانبردار بہو ملی۔“

”دیکھو۔ کتنا پریشان ہو رہی ہے۔“

عائشہ بی بی تو آگئیں۔ صائمہ بی بی نہ آسکیں۔ کینیڈا دور جو بہت ہے۔

☆.....☆.....☆

بیکم صاحبہ کے جانے سے گھر میں عجیب سا خلا پیدا ہو گیا۔ صاحبہ بہت تنہا ہو گئے۔ چھوٹے صاحب نے ماں کا صدمہ تو بہت لیا لیکن بیوی اور چھوٹی بچی نے توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ ان کے وہی ڈھنگ شروع ہو گئے۔

چھوٹی بی بی نے اب ذرا گھر کے سرو سامان کو دیکھنا شروع کیا۔ مثلاً کھانے کے کمرے میں پڑے قیمتی، خوبصورت برتن۔ ڈیکوریشن میں غائب ہونے لگے۔ ایک دن دیکھا تو ایک ڈبہ بند کر کے ٹیپ لگا رہی تھیں۔ میں اچانک آ گیا تو ذرا گھبرا گیا۔

”نور زمان۔ یہ ڈبہ گاڑی کی ڈگی میں رکھ دو۔ احتیاط سے ڈبہ بہت وزنی تھا۔“

مجھے اٹھانے میں تھوڑی سی دقت ہوئی۔ تو بولیں۔

”احتیاط سے پکڑو۔ برتن ہیں۔ ٹوٹ نہ جائیں۔“ ان کے منہ سے نکل گیا۔

میں ملازم آدمی۔ حیران۔ پریشان ہو کر رہ گیا۔ یہ نہ پوچھ سکا کہ اس گھر کے برتن کہاں جا رہے ہیں۔ بغیر اجازت کے۔

بڑے صاحب کی تنہائی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ نوکری بھی نہیں تھی کہ گھر سے نکل جاتے۔ پنشن لگ تو لگی تھی لیکن شاید زیادہ نہ تھی۔

گھر کے تمام اخراجات وہی اٹھاتے تھے۔ چھوٹے صاحب کی تنخواہ کہاں جاتی تھی۔ پتا نہ چلتا تھا۔ گرم موسم ہوتے ہی بجلی کے بل بھی بڑھنے لگے تو ایک دن چھوٹے صاحب سے کہنے لگے۔ ”بھئی خرچے بہت زیادہ ہیں۔ آپ ذرا ان میں اپنا تھوڑا سا حصہ ڈال دیں تو اچھا ہے۔“

جاوا

انڈونیشیا کا ایک اہم جزیرہ۔ رقبہ: 51024 مربع میل یا 132187 مربع کلومیٹر۔ اس میں کئی

آتش فشاں پہاڑ ہیں۔ آب و ہوا گرم اور ساحل غیر صحت بخش ہے۔ پہاڑ گھنے جنگلات سے ڈھکے ہوئے

ہیں۔ ان میں ساگونان کی لکڑی بافراط پائی جاتی ہے۔ میدانی علاقہ زرخیز ہے۔ ربڑ، کافی، چائے، نیسکر اور

تمباکو کی کاشت ہوتی ہے۔ یہ کپڑوں کی سجاوٹ کے باتک کے طریقے کے لیے مشہور ہے۔ جاوا دنیا کا

نہنگان آباد جزیرہ ہے اور صدیوں سے انڈونیشیا کا سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مرکز چلا آرہا ہے۔ یہاں

سے کونین، چینی، کھوپرا، ربڑ اور ساگونان کی لکڑی باہر بھیجی جاتی ہے۔ شمالی مشرقی جاوا میں تیل کے کنوئیں

ہیں۔ گندھک، سونا اور فاسفیٹ بھی معمولی مقدار میں نکلتی ہے۔ اندرونی علاقے میں شیر، گینڈا، بن مانس،

چیتے اور مختلف قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم انسان کا ابتدائی ٹکسن جاوا ہی تھا۔ ساحلی

علاقے پر عرب اور چینی تاجر آباد ہیں۔ آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن ان پر ہندو اور بدھ

مت کا خاصا اثر ہے۔ سب سے بڑا شہر جاکارتا ہے۔ یہ انڈونیشیا کا دارالحکومت بھی ہے۔ پہلے اس کا نام

بیشویا تھا۔ تیرہویں صدی میں یہاں مسلمان اور 1596ء میں ولندیزی آئے۔ 1619ء میں

ولندیزیوں نے یہاں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور بعد میں یہاں کے حاکم بن گئے۔ دوسری جنگ

عظیم کے بعد جاوا جمہوریہ انڈونیشیا میں شامل ہو گیا۔

مرسلہ: نسیم زبیری۔ چیٹوٹ

”ابو۔ کمال بات کرتے ہیں آپ بھی۔ میرے پاس فالتو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ہمارے اپنے اخراجات

بہت ہیں۔ فاطمہ کا اسکول خرچ۔ پیٹرول۔ پھر کبھی کبھی دوستوں کو کھانے پر لے کر جانا۔ سوری۔ میرے پاس تو بالکل بھی پیسے نہیں ہیں۔“ بہت غصیلے لہجے میں بدتمیزی سے انہوں نے کہا۔ اور چلتے بنے۔

بڑے صاحب بے چارے حیران رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور شاید پوری زندگی

جولائی 2016ء

233

ماہنامہ سرگزشت

نہ بھولے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ شازیہ بی بی بڑے صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں۔ چھوٹے صاحب دفتر گئے ہوئے تھے۔ میں نے گرم روٹی صاحب کو دی تو دروازے پر دستک ہوئی۔ ”جاؤ دیکھو۔ نور زمان کون آیا ہے۔“ میں باہر نکلا تو باہر چوکیدار بل لے کر کھڑا تھا۔ بجلی کا۔

میں نے ہاتھ میں پکڑا۔ اُن پڑھ ہونے کے باوجود میں نے نظر ڈالی تو دھک سے رہ گیا۔ عام دنوں سے دوگنا سے بھی زیادہ تھا۔ وہ ہی ہاتھ میں پکڑے پکڑے میں بے دھیانی میں اندر آیا۔ صاحب کھانا کھا رہے تھے۔

”نور زمان کون تھا۔“ صاحب نے کھانا کھاتے کھاتے پوچھا۔

”وہ چوکیدار تھا۔“ میں نے کہا۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“

”بل لے کر آیا تھا۔ بجلی کا۔“ میں نے ذرا رک کر کہا۔

”بجلی کا؟“ لاؤ دو مجھے دیکھوں کتنے کا ہے۔“ صاحب نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

”آپ پہلے کھانا کھالیں تو پھر۔“ میں نے بل ذرا پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں کھانا بعد میں کھاؤں گا۔ لاؤ دو بل مجھے۔“ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بل آگے کیا۔ نظر کی صینک وہ لگا چکے تھے۔ نظر ڈالی۔

”کیا؟“ وہ جیسے بے یقینی سے بولے۔ ”چند رہ ہزار نو سو اتنی روپے؟“

شازیہ بی بی نے بھی کھانا روک کر ان کی طرف دیکھا۔ ”سنائے۔ بل کتنا زیادہ آیا ہے۔“ ذرا غصے سے انہوں نے ان کو مخاطب کیا۔ ”میں تو یہ بل نہ دے سکوں گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غصہ خدا کا میں نے ابھی اپنے کمرے کا اے سی تک آن نہیں کیا کہ بل زیادہ نہ آجائے۔ بے انتہا غصے سے بڑ بڑاتے ہوئے صاحب نے کھانا پونہی چھوڑ دیا۔“

کرسی گھیسٹ کر پیچھے کی۔ ”بتا دینا صاحبزادے کو کہ یہ بل اتنا آیا ہے۔ جب وہ آئے تو فوراً میرے کمرے میں بھیجنا۔“ بے پناہ غصہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ لہجہ سخت تھا۔

”صاحب جی۔ آپ کھانا تو کھالیں؟“ میں نے آگے بڑھ کر ان سے کہا۔

”رہنے دو نور زمان! میری بھوک ہی مرگئی ہے۔“ افسردگی سے انہوں نے کہا۔ اپنے کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔

”ہوں۔ بل زیادہ آیا ہے تو ہمارا کیا قصور ہے؟“ بہت بدتمیزی سے شازیہ بی بی نے کہا۔ ”ہم تو خود اوپر چہم کی طرح گرم کمرے میں وقت گزارتے ہیں۔ تمام رات ہم تینوں جاگتے رہتے ہیں۔ دماغ خراب ہو گیا ہے بوڑھے کا۔“ بات دبی زبان میں کہی گئی لیکن مجھے آواز سنائی دے گئی۔ بہت افسوس ہوا ان کے لہجے پر۔

”تم کیا یہاں کھڑے تماشا دیکھ رہے ہو۔ جاؤ میرے لیے گرم پھلکا بنا کر لگاؤ۔“ غصے سے مجھے کہا۔

میں سچن میں آ گیا۔ ان کی بات پر غور کرنے لگا۔ وہ بالکل غلط کہہ رہی تھیں کہ ان کا کمرہ گرم ہے۔ میں جب بھی انہیں اوپر جا کر کھانے کے لیے بلاتا تو کمرہ باہر تک ٹھنڈا ہوتا۔ اے سی دن رات چلتا رہتا۔ یہ میں بھی جانتا تھا کہ باہر لگے ہوئے پائپ میں سے پانی نکلتا رہتا ہے۔

☆.....☆.....☆

شام ہو گئی۔ عام طور پر چھوٹے صاحب پانچ بجے تک گھر آ جاتے تھے۔ اس دن نہ آئے۔ بڑے صاحب نے تین مرتبہ مجھ سے پوچھا۔ رات آٹھ بجے ان کی گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئے تو چہرے پر حلقی اور غصہ عیاں تھا۔ سیدھا اوپر جانے لگے۔ تو بڑے صاحب نے اچانک دروازہ کھولا۔ اور باہر آ گئے۔

”آگے آپ؟“ ذرا طعنے سے انہوں نے کہا۔ ”آپ کو بیگم صاحب سے فون پر پتا تو چل گیا ہوگا کہ بجلی کا بل بہت زیادہ آ گیا ہے۔“ انہوں نے بیٹے کے سامنے بل کرتے ہوئے کہا۔

”ابو۔ معاف کیجیے۔ میں صبح کا گیا ہوا اب واپس آرہا ہوں اور تھکا ہوا ہوں۔ مجھے تھوڑی دیر آرام کرنے دیں۔ بل کی بات بھی کر لیں گے۔“ بل باپ کے حوالے کرتے ہوئے بہت بدتمیزی کی اور بل پر نظر نہ ڈالی پھر دھڑ دھڑ کر کے اوپر چلے گئے۔ دروازہ زور سے بند کرنے کی آواز آئی۔

بڑے صاحب کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ حیران پریشان۔ تقریباً دو گھنٹے بعد نیچے آئے تو بیوی بچہ بھی ساتھ تھے۔ نہادھو کر فریش ہو کر لیکن چہرے پر بہت غصہ عیاں تھا۔ ”ہاں۔ اب بتائیے کیا بات کر رہے تھے آپ؟“

”میں تم سے بجلی کے بل کی بات کر رہا تھا۔ اس دفعہ پہلے سے ڈبل آیا ہے۔ آخری تاریخ بھی تین دن بعد کی ہے۔“ بڑے صاحب نے وہیں میز پر پڑے بل کو ان کے سامنے لہرایا۔

”تو میں کیا کروں؟ بل کی ادائیگی میری سرور نہیں ہے۔ یہ آپ کے کام ہیں۔“ بہت غصے۔ بدتمیزی سے جواب ملا۔

”میرے کام ہیں؟“ اب ان کی آواز میں بھی غصہ آ گیا۔ ”تم لوگ بجلی استعمال نہیں کرتے؟“

”ہم نے کیا بجلی استعمال کرنی ہے۔ ہمارے کمرے میں ایک پرانا، بابا آدم کے زمانے کا اے سی لگا ہوا ہے۔ جس سے ٹھنڈی ہوا تو کیا آتی ہے گرم ضرور آتی ہے۔ ہم تینوں تمام رات اس جہنم میں جاگ کر گزارتے ہیں۔ ہاں البتہ آپ کے پاس تمام سہولیات ہیں اے سی، فریج، کولر۔ پکھے۔“ بہت نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”میں نے ابھی تک اپنے کمرے کا اے سی آن نہیں کیا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بل میری استطاعت سے زیادہ آئے گا۔ میرا خیال ہے اب سے تم کم از کم آدھا بل ضرور دو۔ میری پیشین میں اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔“

”آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ کیا بات کر رہے ہیں آپ۔ میں آدھا بل پے کروں۔ پہلے ہی اپنی بچی اور بیوی کا مشکل سے خرچا برداشت کرتا ہوں۔“ بدتمیزی اور گستاخی کی حد پار ہو چکی تھی۔ ”میرا اپنا پاپ مجھے بالکل بنا رہا ہے۔ مجھ سے آدمے پیسے مانگ رہا ہے۔“ اپنی بیگم صاحبہ کو تنگ سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”بکواس بند کرو نعمان۔ حد سے نہ بڑھو۔ کہیں میرا ہاتھ نہ اٹھ جائے۔“ بڑے صاحب کو میں نے اتنا مشتعل بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کا ہاتھ واقعہ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

”آپ مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے؟“ وہ خطرناک حد تک نزدیک آگئے۔

”بس کریں۔ نعمان پلیز۔“ شازیہ بی بی نے خاوند کو کندھے سے پکڑ کر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ”چلیں۔ بات ختم کریں۔“

”بات ختم تو یوں ہو سکتی ہے کہ یہ مجھ سے کبھی بھی کسی قسم کی مالی مدد کا ذکر نہ کریں۔“ بڑی نفرت سے کار جھاڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”نور زمان۔ ہم کھانے کے لیے باہر جا رہے ہیں۔“

ہو گیا۔

”ٹھہرو جان! ذرا مجھے ان سے بات تو کرنے دو۔ بیوی کو ایک طرف دھکیل کر وہ باپ کی طرف پلٹے جن کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔“

”آپ۔ آپ۔ آپ ابواتنا کر سکتے ہیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“ انتہائی بدتمیزی سے وہ باپ کے قریب آگئے۔ لگتا تھا کہ ہاتھ پائی کا ارادہ ہے۔

”یہ بکواس کر رہی ہے نعمان۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو؟ اپنے باپ کو۔ وہ ایسی گھناؤنی حرکت کر سکتا ہے؟“ انہوں نے دکھ اور غصے سے کہا۔

”میری بیوی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ ایسی بات کیوں کہے گی۔ جس میں صداقت نہ ہو؟ جھوٹے آپ ہیں۔“

”میں نے اسے کہا تھا کہ آپ سے کہہ دے کہ ہمارے پاس ابھی پیسے نہیں ہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ وہ بے چاری پہلے ہی ڈری ہوئی تھی کہ آپ اسے ڈانٹیں گے۔ میں نے بھیجا تھا آپ کے پاس۔ اور آپ نے کیا کیا؟“ انتہائی نفرت بھرے لہجے میں انہوں نے کہا۔

”یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ وہ کانپ رہے تھے۔ ”میں کمرے میں آرام کر رہا تھا اس نے دستک کے بغیر دروازہ زور سے کھول دیا۔ میں گھبرا گیا پوچھا کیا بات ہے تو کافی بدتمیزی سے کچھ پیسوں کی بات کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ باہر جاؤ.....“ وہ رکے۔ ”میں نے کہا اپنے میاں کو بھیجو وہ ہی مجھ سے بات کرے گا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ میں تو اسے چھوٹے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ بہت غصے اور افسوس سے انہوں نے کہا۔

اس عرصہ میں شازیہ بی بی اوپر جا چکی تھیں۔ ”تم اس کو میرے سامنے بلا کر پوچھ لو۔“

”مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کی ہر بات پر یقین ہے۔ افسوس تو مجھے آپ پر آرہا ہے۔ من آرہی ہے۔ آپ کے بظاہر نیک وجود سے۔ اُف۔ میں تو اب اس گھر میں ایک بل بھی نہیں رہ سکتا۔ میری تو ایک بیٹی بھی ہے۔ اگر آج آپ نے میری بیوی کو نہیں بخشا تو ہو سکتا ہے کل میری بیٹی کو بھی نہ بخشیں۔“ اس قدر بدتمیزی اور گستاخی سے انہوں نے باپ کی طرف دیکھ کر کہا اور دھپ دھپ کرتے اوپر چلے گئے۔

”نعمان۔ میری بات سنو۔ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔“

انتظار نہ کرنا۔“ بی بی کو گود میں لیتے ہوئے انہوں نے بیگم کا ہاتھ تھاما اور باہر لنگی ہوئی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گئے۔

”یہ بجلی کا آدھا بل تو آپ کو ہر حال میں دینا ہوگا میاں صاحبزادے۔ میرے پاس اس وقت بالکل گنجائش نہیں ہے۔ اگر کل کلاں کو بجلی کٹ گئی تو مجھے نہ کہنا۔“ بہت اونچی آواز سے صاحب نے ان کو پکار کر کہا۔ انہوں نے سنایا نہیں؟ میں نہیں جانتا۔

☆.....☆.....☆

چھٹی کا دن تھا۔ میں باورچی خانہ میں آ کر چائے کا پانی رکھ رہا تھا۔ بڑے صاحب ابھی اپنے کمرے میں ہی تھے۔ میں نے دیکھا کہ شازہ بی بی تیز تیز قدموں سے صاحب کے کمرے میں جا رہی ہیں۔ اچانک مجھے ان کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ میں دھک سے رہ گیا۔ ذہن میں آیا کہ کہیں بڑے صاحب خدا نہ کرے انتقال نہ کر گئے ہوں۔

”پلیز انکل۔ مجھے نہ بچ کریں۔ میں آپ کی بیٹیوں کی طرح ہوں۔ چھوڑیں مجھے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے ہانپتے ہوئے نکلیں۔

میں بھی کچن سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ حیران، پریشان۔

”نعمان۔ نومی نیچے آؤ۔“ انہوں نے چیخنے ہوئے چھوٹے صاحب کو پکارا۔

بڑے صاحب اب باہر آ چکے تھے۔ ”یہ کیا بکھاس کر رہی ہو تم۔“ نفرت سے انہوں نے کہا۔

دو۔ دو۔ تین تین میٹریاں پھلاتے ہوئے چھوٹے صاحب نیچے آ گئے۔ ”کیا ہوا میری جان۔ کیا ہو گیا؟“ وہ لپک کر بیوی کو تھانسنے لگے جو ان کے ہاتھ لگتے ہی جھول سی گئیں۔

”آپ کے اہانے۔ مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔“ شدت سے روتے ہوئے انہوں نے اپنے میاں سے کہا۔

”کیا ہوا۔ کیا؟“ نفرت سے بھرپور نظر بوڑھے باپ پر ڈالی۔ جواب تمہارے گئے تھے۔

”انہوں نے مجھے ایسی جگہ چھوڑا جو میرے لیے باعثِ شرم ہے۔ میں مرجاؤں گی لیکن اب یہاں نہیں رہوں گی۔ جہاں میری عزت تار تار ہو سکتی ہے۔“ سر کی طرف اشارہ کر کے یہ گھناؤنا الزام انہوں نے لگایا۔ تو میں بھی پاگل سا

سراسر بکواس۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ وہ صدمے سے گر رہے تھے۔ میں نے جلدی سے تھاما۔

”نور زمان۔ اللہ گواہ ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟“ وہ صوفے پر ڈھے سے گئے۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔ ماتھے پر بے تحاشا پینا آ گیا۔

میں جلدی سے پانی لے کر آیا۔ پلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بے چارے یوں ہی ٹھہرا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد چھوٹے صاحب اپنی بیگم اور بی بی کے ساتھ نیچے اترے۔ تین چار کپڑوں کے بیگ میٹریوں سے نیچے دھکیلتے ہوئے۔

”ہم جا رہے ہیں۔ کبھی نہ آنے کے لیے؟“ انہوں نے نفرت سے پھینکارتے ہوئے لہجے میں باپ سے کہا جو نقاہت کے باعث آنکھیں بھی نہ کھول سکے۔

☆.....☆.....☆

ان کو گئے ہوئے تین چار دن ہوئے تھے۔ صاحب بستر پر پڑ گئے۔ دیوانوں کی طرح مجھے بلا کر بار بار یہی بات دہراتے رہے۔ کہ وہ سچے ہیں۔

میں اور حمیدہ بھی کبھی سوچتے کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ پانچ وقت کے نمازی ہیں۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ مجھے ان کے گھر بارہ سال ہو گئے تھے۔ اتنا تو مجھے بھی پتا چل گیا تھا کہ یہ سب ایک گھناؤنا ڈراما تھا۔ گھر سے الگ ہو جانے کا۔

میں نے ان کے سسرال کے نمبر پر فون پر بات کرنی چاہی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

صاحب کے حالات خراب سے خراب ہو رہے تھے۔ ہم میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ چھوٹی بی بی کا نمبر ڈھونڈ کر دہی فون کرنا چاہا نمبر کنیکٹ ہی نہ ہو سکا۔ برآمد والے پڑوسی کو بلا کر لائے۔ انہوں نے ڈاکٹر کو دکھایا۔

”بے پناہ پریشانی اور اسٹریس ہے۔“ انہوں نے کہا۔ دوائیں لکھ کر دیں۔ میرے پاس چھوٹے صاحب کا موبائل نمبر تھا جب بھی گھماتا جواب آتا کہ اس نمبر سے بات نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے نمبر بدل لیا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کریں۔ دس دن اسی طرح گزر گئے۔ گیارہویں دن بی بی کا نمبر دہی میں مل گیا۔ وہ تو بے حد پریشان ہو گئیں۔

”نور زمان! میں فوراً آرہی ہوں۔“ تیسرے دن وہ بے چاری پریشان حال اکیلی بچوں کو چھوڑ کر آ گئیں۔ باپ

عید کے خوشنما رنگ جولائی 2016ء کے رنگارنگ پاکیزہ کے سنگ

پاکیزہ

کراچی

ماہنامہ



تذکرت سیمما نے اعتبار وفا کا دکھایا دل پزیر اختتام

انجم انصار اور درثمن بلال کے ناولوں کی نئی اقساط

مدیحہ شاہد کے قلم کا جادو پتھر کا دیس بنا

نایاب جیلانی نے واکیے وفا کے انوکھے باب

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی روح پرور کاوش..... یادوں کی مالا

معروف مصنفہ، اور دلنواز شاعرہ

ناہید فاطمہ حسنین

سے ایک شعری نشست

خالدہ نسیم کے قلم سے ایک سچا مکمل ناول

رضوانہ پرنس اور عالیہ حرا کی خوب صورت تحریریں

عید کے نمبر کے لیے بطور خاص

سیمما بنت عاصم، نزہت جبین ضیا، سحرش فاطمہ،

غزالہ فرخ و دیگر قابل فخر لکھاریوں کی حسین کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و کہانیاں لیے دل خوش کن سلسلے آف آپ سے خوش ووق قارئین کے لیے

آخری دموں پر تھے۔

”میں نے کچھ نہیں کیا بیٹا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ

دہرا رہے تھے۔

”کیا ہوا تھا۔ نور زمان۔ بتاؤ مجھے۔“ وہ مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھیں، میں کیا بتاتا۔ تھوڑا بہت ایک ایک کرتا یا۔

”پاگل ہے وہ لڑکی۔ کینی۔ ایسی حرکت میرا باپ کبھی نہیں کر سکتا اور وہ ہمارا بھائی۔ لعنت ہے ایسی اولاد پر۔ ایسے لڑکوں پر جن کو دو تین سال میں بیوی اتنی عزیز ہو جاتی ہے کہ ماں باپ پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ان کی غلط سلسلہ بات کا یقین کر لیتے ہیں۔“

”اللہ اس کو عافیت کرے۔ اگر میرے باپ کو کچھ ہو گیا تو میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ رورو کر وہ باپ کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ اسی شام صدیق صاحب کا انتقال ہو گیا۔

وہ اپنے کردار پر لگے ہوئے دھبے کو برداشت نہ کر سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہمارے لیے بھی یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ کسی نے نعمان صاحب کو باپ کی وفات کا بتا دیا تھا۔ وہ بھی جنازے پر آئے تو غم سے بے حال تھے۔ بیوی بچی کو نہ لائے۔ بہن کے نزدیک روتے ہوئے بڑھے۔

”خبردار۔ مجھ سے دور رہو میرے باپ کے قاتل۔ جاؤ اپنی چیتیتی کے پاس۔ تم نے میرے باپ کو مار دیا بد بخت۔ ایسا گھناؤنا الزام اپنے بوڑھے باپ پر؟ لعنت ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گی کہ وہ تمہیں ایک لڑکا ضرور دے اور وہ بھی بالکل تمہاری بیوی اور تمہاری طرح ہو۔ بے حیا۔ بد کردار۔ نافرمان۔“ ہشربائی انداز میں عائشہ بی بی بھائی کو کہہ رہی تھیں۔

رشتہ داروں نے بیچ میں پڑ کر چپ کرایا۔ وہ سر جھکا کر چلے گئے۔

اسی دن ڈرائیور دین محمد نے مجھے بتایا۔ ”نور زمان۔ میں بہت دنوں سے یہ بات سوچ رہا تھا کہ تمہیں کہوں یا نہ کہوں لیکن میرا خیال ہے کہ کہہ دوں۔“ ہم دونوں قبرستان سے واپس آئے تھے۔ بھاری دل کے ساتھ۔

”یاد ہے وہ دن جب چھوٹے صاحب شازیہ بی بی اور بچی کو لے کر غصے سے گھر سے باہر نکلے تھے؟ مجھے گاڑی نکالنے کو کہا۔ سامان ڈیڑھی میں رکھوایا اور پھر مجھے اپنے سسرال کی طرف گاڑی موڑنے کو کہا۔ ابھی تھوڑی دیر چلے تھے تو

شازیہ بی بی نے شوہر کو لگاوٹ سے کہا۔ ”کیوں کیسا تھا میرا پلان۔ میری ایکٹنگ“ وہ بہت کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

”بھئی مان گئے۔ تمہاری اداکاری پر تو انعام ملنا چاہیے۔“ وہ بھی اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔ ”تھوڑی دیر کے لیے تو میں بھی گھبرا گیا تھا۔ تمہاری چیخوں کی آوازیں سن کر۔“

”بھئی! اور کیا طریقہ کیا جاسکتا تھا۔ اس منحوس گھر سے نکلنے کا۔ خرچا دو، خرچا دو۔“ وہ بہت بری شکل بنا بنا کر کہہ رہی تھیں۔ میں گاڑی چلاتا رہا۔

”وہ تو بے چارے سو رہے تھے مجھے ایک دم کمرے میں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ جب میں نے کہا کہ ہم ابھی بل نہیں دے سکتے تو انہوں نے ہاتھ سے ذرا غصے سے مجھے اشارہ کیا تھا کہ میں باہر چلی جاؤں اور تمہیں سمجھوں۔ بس مجھے غصہ آ گیا۔ اور باقی کی کہانی تو آپ جانتے ہی ہیں۔“ اس نے ایک عجیب سا تہقہہ لگایا۔

یقین کرنا۔ مجھے کراہیت سی شروع ہو گئی اس کی شکل دیکھ کر۔

”اب جنازے پر کیا کرنے آیا ہے۔ اس کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ چلے گئے ہیں۔ ویسے یا نور زمان ایک بات ہے۔ میری تین بیٹیاں ہیں اور ہر وقت اپنی بیوی کو اپنی قسمت کی خرابی کی شکایت کرتا ہوں کہ بیٹا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بہت سے مسئلوں سے بچالیا۔“

☆.....☆

”بی بی جی“ نور زمان یہ کہتے ہوئے رو دیا۔ ”آپ سمجھ رہی ہوں گی کہ کہانی ختم ہو گئی۔ نہیں۔ کہانی تو بعد میں شروع ہوئی۔ دعویٰ والی باجی نے بنگلا فروخت کر دیا اور تمام پیسے رفاہی ادارے کو دے دیے۔ میں نے ایک دوسرے بنگلے میں نوکری کر لی۔ پھر آپ کے پاس آ گیا۔ رات میں آپ جس برات میں مجھے بھی لے گئی تھیں وہاں میں نے چھوٹے صاحب کو دیکھا۔ کس بے چارگی سے وہیل چیئر پر پڑے تھے۔ پوچھنے پر بتا چلا کہ دو ماہ پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور بیوی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ آپ کی وہ دوست جن کی شادی میں ہم گئے وہ ترس کھا کر اپنے ہاں لے آئی ہیں۔ یہی سب دیکھ کر میں رات سے مسلسل رورہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔“



صحیح راستہ

محترم مدیر السلام علیکم! ایک ایسی روداد ارسال کر رہا ہوں جس کا ایک کردار میں خود بھی ہوں بلکہ اصل ہیرو ہی میں ہوں، اگر میں عقل مندی سے کام نہ لیتا تو شاید وہ کچھ ہو جاتا جو عادل چاہتا تھا۔ ویسے اس کہانی کو نیا اختتام دینے کا سہرا میری بیگم کے سر ہے۔ اس نے ہی یہ راہ سجھائی تھی۔

اسلم فاروق
(حیدرآباد)

”کون ہے بھائی۔“
”یار میں ہوں عادل۔“ باہر سے میرے دوست عادل کی آواز آئی۔
عادل کا اتنی رات گئے آنا حیرت کا سبب تھا۔ بہر حال میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ میرا بہت پرانا دوست تھا۔
اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آ رہی تھی جو کچھ یوں تھی ایک صاحب نے رات گئے اپنے دوست کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں کچھ دیر لگی

رات کا وقت، شاید پارہ سو پارہ بجے ہوں گے۔ دروازے کی گھنٹی نے چونکا دیا تھا۔ کون ہو سکتا تھا۔ بیوی برابر میں سوئی ہوئی تھی۔ دونوں سے اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔
گھنٹی دوبارہ بجی۔ میرے پاس عام طور پر اتنی رات گئے کوئی بھی نہیں آیا کرتا۔ بہر حال جو بھی تھا، مل جانے کے ارادے سے نہیں آیا ہوگا۔ دوبارہ بجنے والی گھنٹی یہی بتا رہی تھی۔
میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو صاحب خانہ اس شان سے کھڑا تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار بھی دوسرے ہاتھ میں اشرفیوں کی تھیلی تھی اور خود اس کے پیچھے اس کی کنواری بہن حجاب میں کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ ”دیکھو کسی کا اتنی رات گئے کسی کے دروازے پر دستک دینے کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ نمبر ایک پیسوں کی ضرورت ہے۔ تو اس کے لیے اشرفیوں کا ایک توڑا لے آیا ہوں۔ جاؤ لے جاؤ اور اپنی ضرورت پوری کر لو۔ نمبر دو، کسی دشمن کے حملے کا خوف ہے۔ تو اس کے لیے بھی تیار ہو کر آیا ہوں۔ یہ تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ چلو میرے ساتھ دیکھتا ہوں کون ہے دشمن۔ نمبر تین یہ کہ تمہیں خواہشات نے پریشان کیا ہے۔ تو تم یہ جانتے ہو کہ میری یہ بہن کنواری ہے۔ باحیا ہے، ابھی چلو اور اس سے اپنا نکاح پڑھو الو۔“

تو یہ تھا دوستی کا معیار، لیکن یہ بات اگلے وقتوں کی تھی اور میرے دوست عادل نے آج کے زمانے میں میرے دروازے کی گھنٹی بجائی تھی۔

کوئی نہ کوئی بات ضرور تھی۔ میں اسے اندر لے آیا۔ ”بتاؤ خیریت تو ہے ناں؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ اچھے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”یار میں اس وقت ایک پرابلم میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اور تم کو میرا ساتھ دینا ہے۔ میں اس وقت تم پر ہی بھروسہ کر سکتا ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو۔“

”یار مجھے شادی کرنی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیا!“ میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”شادی کرنی ہے! یار تمہاری شادی تو ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ اچھی بیوی ہے تین بچے ہیں پھر کیسی شادی؟“

”سمجھا کرو۔ مجھے اسی وقت نکاح پڑھوانا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”میں نے نکاح خواں کو تیار کر رکھا ہے۔“

وہ پرانی حکایت یاد آگئی۔ یا تو پیسوں کی ضرورت ہوگی یا دشمن کا خوف ہوگا یا نفسانی.... خواہش۔ واہ پرانی حکایتی بھی کمال کی ہوتی تھیں۔

انسانی زندگی کے کیسے کیسے گوشوں پر اس کی نگاہ ہوتی تھی۔

”آخر کس سے شادی کرنے کا ارادہ ہے؟“

”وہ لڑکی گاڑی میں بیٹھی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”تمہاری سزکی بھی مدد چاہیے اس وقت۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ.....! میرا مطلب ہے ذرا اس کا میک اپ کر دیں۔ وقتی طور پر دو چار چوڑیاں پہنا دیں۔“

”یار عادل، تم سنجیدہ ہو۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں بھائی، بالکل سنجیدہ ہوں۔ پلیز تم ذرا بھابی کو یہ پھونشن سمجھا دو۔“

”تم مجھے بتاؤ وہ لڑکی ہے کون؟“

”یہ سب اطمینان سے بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ اس کا نام رضوانہ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”میری فرم میں میرے ساتھ کام کرتی ہے۔ پلیز تم ذرا بھابی کو یہ پھونشن بتا دو۔ میں اسے لے کر آتا ہوں۔“

”ہاں لیکن اس نکاح سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

”کیا پیسوں وغیرہ کی ضرورت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں بھائی پیسے تو میرے پاس ہیں۔“ اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر دکھاتے ہوئے بتایا۔ ”گھر سے پچاس ہزار لے کر چلا ہوں۔“

”تو پھر کیا کام ہے۔“

”رضوانہ کے گھر جانا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے گھر والوں کو انفارم کرنے۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو۔ جاؤ اب بھابی کو اٹھا دو۔ سوری لیکن اس وقت ایمر جنسی ہے۔“

”اچھا تم اسے لے کر آؤ۔ میں جب تک چندا سے بات کرتا ہوں۔“ چندا میری بیوی کا نام تھا۔

وہ اس لڑکی کو لینے چلا گیا۔ جب کہ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے جب چندا کو اٹھا کر یہ پھونشن بتائی تو وہ بھی حیران رہ گئی تھی۔ ”یہ کیا پاگل پن ہے یہ کیا سوچھی ہے عادل بھائی کو۔“

ہم چونکہ ایک دوسرے سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اس لیے چندا عادل کی بیوی راحیلہ کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔ بھی بھی وہ اس کے پاس چلی جایا کرتی تھی اور بھی راحیلہ ہمارے یہاں آ جاتی۔

”میں تو ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ نہ جانے وہ کم

بخت کون ہے۔ عادل بھائی کیسے اس کے چکر میں پڑ گئے۔
 میں ابھی راحیلہ بھابی کو فون کر کے بتا دیتی ہوں۔“
 ”نہیں نہیں ایسا مت کرو۔“ میں نے اسے منع
 کر دیا۔ ”وہ بہت بھروسے سے ہمارے پاس آیا ہے۔
 اس طرح راحیلہ کو بتانا مناسب نہیں ہوگا۔“
 ”تو پھر کیا کیا جائے۔ کسی طرح اسے روکنا تو ہو
 گا۔“

”نی الحال تو وہی کرو جو وہ کہہ رہا ہے۔“ میں
 نے کہا۔ ”وہ لڑکی آئے تو اس کا استقبال کرنا۔ اس کو ہلکا
 سا تیار کر دینا۔ جب تک میں سوچتا ہوں کہ کس طرح
 اس قصے کو ختم کر سکتے ہیں۔“
 دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جا کر دروازہ
 کھولا۔ عادل اس لڑکی کو لے کر آیا تھا۔ لڑکی اس کے
 پیچھے کھڑی تھی جس کا نام اس نے رضوانہ بتایا تھا۔

میں ان دونوں کو اندر لے آیا۔ اس دوران چندا
 بھی کمرے سے نکل کر آگئی تھی۔ عادل نے بہت لہک
 کر چندا کو سلام کیا تھا۔ ”بھابی! اس وقت آپ لوگوں کو
 ہم دونوں کا ساتھ دینا ہوگا۔“ اس نے کہا۔
 میں جانتا تھا کہ اس وقت چندا کے سینے میں کیسی
 آگ دہک رہی ہوگی لیکن وہ خاموش رہی۔

”چندا، رضوانہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ میں
 نے کہا۔ ”اس کو ہلکا سا تیار کر دینا۔“

”ہاں بھابی! لیکن ذرا جلدی۔“ عادل نے چندا
 کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں نکاح بھی پڑھوانا ہے۔“

چندا اس لڑکی کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں
 لے گئی۔ میں اور عادل ایک طرف بیٹھ گئے۔ ”ہاں
 اب بتاؤ کیا چوبیٹن ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ لڑکی
 تمہارے ہاتھ کیسے آئی؟“

”یار بتانا کہ یہ میرے ساتھ فرم میں کام کرتی
 ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے باپ اس کی شادی
 نہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شخص اس کو پسند نہیں
 ہے۔ مجبوراً اسے یہ قدم اٹھانا پڑا ہے۔“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ قدم تو دن میں
 بھی اٹھایا جاسکتا تھا۔ اتنی رات گئے کیا ضرورت پیش
 آگئی۔“

”اسے رات دس بجے پتا چلا کہ کل اس کا نکاح
 ہونے والا ہے۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے

بوکھلا کر مجھے فون کر دیا۔ میں نے کہا کہ فوراً گھر سے نکل
 آؤ۔ میں گاڑی لے کر اس کے گھر کے پاس پہنچ گیا۔
 ہم بہت دیر تک گاڑی میں کھومتے رہے۔ اس دوران
 ہم نے پوری پلاننگ کر لی۔“
 ”اور وہ پلاننگ یہ تھی کہ فوری طور پر نکاح پڑھوا
 لو۔“

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلا دی۔ ”اس کے
 علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر میں نے اپنے ایک
 جاننے والے نکاح خواں کو پکڑا۔ اس نے کہا لڑکی کو
 لے آؤ میں نکاح پڑھوادوں گا۔ باقی کارروائی بعد میں
 ہوتی رہے گی۔ اس وقت فوری طور پر تمہارا اور بھابی کا
 خیال آ گیا۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آ گیا۔ یہ
 ہے پوری کہانی۔“

”تم کیا کہہ رہے تھے کہ میں اس کے گھر جا کر
 اس کے گھر والوں کو بتا دوں۔“

”ہاں، ان کو صرف انفارم کرنا ہے کہ ان کی بیٹی
 خیریت سے ہے اور وہ کوئی غلط قدم نہیں اٹھا رہی بلکہ
 اپنا نکاح پڑھوا رہی ہے۔ صرف یہ بتانا ہے، ان سے
 اجازت وغیرہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کو صرف
 انفارم کر دینا ہے۔“

”اور تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس کے گھر والوں
 سے جا کر بھڑ جاؤں تاکہ وہ سب مل کر میری پٹائی
 کر دیں۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے گھر والے بہت
 ہی مرعباں مرنج قسم کے لوگ ہیں۔ ان کے لیے یہی
 اطمینان بہت ہوگا کہ ان کی بیٹی زندہ ہے اور خیریت
 سے ہے۔“

”ایک بات بتاؤ۔ کیا تم سیدھے طریقے سے
 اس کے گھر والوں سے اپنا رشتہ نہیں مانگ سکتے تھے؟“

”یار! کیسی بات کر رہے ہو۔ پوری کہانی بتا دی
 کہ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج ہی رات کو دس بجے خود
 رضوانہ کو اس بات کا پتا چلا ہے کہ اس کا نکاح ہونے والا
 ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں ایسا کرتا تو بھی
 اس کے گھر والے مجھ سے اس رشتے کے لیے تیار نہیں
 ہوتے کیونکہ میں شادی شدہ بھی ہوں اور میرے بچے
 بھی ہیں۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”خیر دیکھا

جائے گا۔“

ابھی تک میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ میں اس نکاح کو رکوانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے عادل کی بیوی راجیلہ کا خیال آرہا تھا۔ بے چاری بہت اچھی عورت تھی۔ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ بچے بھی بہت پیارے پیارے تھے۔

اس دوران چند اس لڑکی کو تیار کر کے لے آئی۔ اچھی خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ ہلکے میک اپ کے بعد وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھی۔

عجیب پجوشن تھی۔ ہم سب گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ میں عادل کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھا۔ جب کہ چند اور وہ لڑکی پچھلی سیٹ پر تھی۔

”پہلے ہم رضوانہ کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔“ عادل نے کہا۔ ”میرا خیال یہ تھا کہ پہلے نکاح ہو جائے۔ اس کے بعد جا کر بتا دیں گے لیکن رضوانہ اس بات پر اصرار کر رہی ہے کہ پہلے گھر والوں کو بتایا جائے۔“

اور اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال آ گیا۔ رضوانہ اس بات پر کیوں اصرار کر رہی تھی۔ کیا وہ چاہتی تھی کہ اس کے والدین کسی طرح پہلے سے باخبر ہو کر اس نکاح کو رکوا دیں۔ ورنہ یہی کام تو نکاح کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔

لیکن اس صورت میں ہاتھ پاؤں کٹ کر رہ جاتے۔ کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔ یقیناً یہی بات ہوگی۔ کسی طرح اس نے عادل کا ساتھ دینا قبول کر لیا تھا اور اب پچھتا رہی ہوگی۔ کوئی راستہ تلاش کر رہی ہوگی۔ اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا تھا۔

مجھے تو یہ شادی کرائی تھی۔ چاہے رضوانہ کی مرضی کچھ بھی ہو۔ ہم سفر کرتے ہوئے ایک کالونی میں آ گئے۔ اس وقت ہر طرف سناٹا تھا۔ بجلی کے کھمبوں کے بلب بھی روتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

بہت اداسی کا سا عالم تھا۔ عادل نے ایک مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ ”جاؤ یا روہ سامنے والا مکان ہے۔“ عادل نے بتایا۔

”میں بھی چل رہی ہوں۔“ رضوانہ اچانک بول پڑی۔

”کیوں تم کیوں جاؤ گی؟“ عادل نے حیرت

سے پوچھا۔

”سمجھا کرو، میں جب اس طرح دلہن بنی ہوئی اس روپ میں ان کے سامنے بیٹھوں گی اور انہیں احساس دلاؤں گی کہ آپ لوگ میرے ساتھ اچھا نہیں کر رہے تھے اور اب میں اپنی مرضی سے نکاح کرنے جا رہی ہوں تو پھر شاید انہیں احساس ہو۔“

”بے وقوفی کی بات ہے۔ تم کو دیکھتے ہی وہ تم پر جھپٹ پڑیں گے۔“ عادل نے کہا۔ ”تم کی زبردستی اندر لے جائیں گے۔ تم کچھ بھی نہیں کر سکو گی۔“

رضوانہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ ”یار! اسلم اب تم چلے جاؤ۔“ عادل نے میری طرف دیکھا۔ ”سلیقے سے بات کرنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا میں گے۔“

میں گاڑی سے اتر اور اپنی خیریت کی خیر منانا ہوا اس گھر کی طرف چل دیا۔ یہ ایک رسک تھا۔ اس کے گھر والے میرے پیچھے بھی پڑ سکتے تھے۔ دنیا بھر کے سوالات ہو سکتے تھے۔

بہر حال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی کھٹکی بجا دی اور خدا سے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگا۔

دس منٹ کے بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گیٹ پر روشنی ہو گئی تھی۔ وہ پچاس کی عمر کے لگ بھگ ایک معقول صورت شخص تھے جو پریشان لگا ہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ عادل نے مجھے رضوانہ کے باپ کے نام سے آگاہ کر دیا تھا۔

”معاف کیجیے گا کیا آپ ساجد صاحب ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں میں ہی ساجد ہوں لیکن آپ کون ہیں؟“

”پریشان نہ ہوں۔ سب خیر ہے۔ میں آپ کو کچھ سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔ پلیز ذرا دو منٹ سنجیدگی سے میری بات سن لیں۔ میں آپ کا ہمدرد ہوں۔“

”جی ہاں سن رہا ہوں فرمائیں۔“

”رضوانہ کیا آپ کی بیٹی کا نام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے سکتے ہیں رہ گئے۔ پھر سخت لہجے میں بولے۔ ”کون ہوتے ہو تم رضوانہ کے بارے میں پوچھنے والے۔“

”آپ ذرا اطمینان سے میری بات سن لیں۔“ میں نے کہا۔ ”یقیناً یہ کوئی خوشگوار لمحہ نہیں ہے لیکن میری بات سن لیں۔ اسی میں بھلائی ہے۔“

اس دوران گھر کے دوسرے لوگ بھی گیٹ پر آگئے تھے۔ ایک نوجوان تھا۔ جو شاید رضوانہ کا بھائی ہو گا۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک عورت تھی جو اس کی ماں ہو گی۔ یہ سب کے سب سیدھے سادے لوگ معلوم ہو رہے تھے۔

”دیکھیں رضوانہ بالکل خیریت سے ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ بس آپ کو تھوڑا سا ڈراما کرنا ہو گا اس کے بعد حالات آپ کے قابو میں آ جائیں گے۔“

”کیسا ڈراما؟“

”دیکھیں وہ بے وقوف لڑکی ایک شادی شدہ مرد کے چنگل میں پھنس کر اس سے نکاح کرنے جا رہی ہے۔ جب کہ میں اس شخص کا دوست ہوں..... میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسا ہو۔ آپ میری بات سنتے رہیں آپ کو تھوڑا سا ڈراما کرنا ہو گا۔“

”کیسا ڈراما بتاؤ تم جو کہو گے میں وہی کروں گا۔“ اس بار ان کے لہجے میں نرمی کھلی ہوئی تھی۔

”اب آپ جائیں اور اس شخص سے کہیں کہ آپ اس رشتے کے لیے تیار ہیں لیکن یہ انداز مناسب نہیں ہے کہ اس طرح رات گئے کوئی لڑکی گھر سے بھاگ کر کسی سے نکاح کر لے۔ تم ایک ہفتے کے بعد یا قاعدہ رخصت کر کے لے جاؤ میں خاندان والوں کو سمجھا دوں گا۔“

”اس کے بعد کیا ہو گا؟ کیا وہ مان جائے گا۔“

”آپ یہی بات اپنی لڑکی سے بھی کہیں۔ ایک بات بتا دوں۔ میری بیوی بھی آپ کی بیٹی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہے۔ اس نے راستے میں اچھا خاصا سمجھا دیا ہو گا۔ یعنی لوہا گرم ہو گا۔ آپ اپنی بیٹی سے بھی یہی کہیں اس کے لیے آپ کو پوری اداکاری کرنی ہو گی۔“

”ہاں ہاں وہ میں کر لوں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا۔“

”ہاں ہاں وہ میں کر لوں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا۔“

”اس کے بعد یہ ہو گا کہ آپ کی بیٹی آپ کے ساتھ آ جائے گی۔ آپ کو ایک ہفتے کا موقع مل چکا ہو گا۔ اس دوران آپ اس کی شادی کر دیں لیکن خدا کے لیے اس سے مت کیجیے گا جس کی وجہ سے وہ گھر سے بھاگی ہے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی۔“

”اگر ایسا تھا تو اس پاگل کو بتادینا چاہیے تھا۔“

”آپ لوگ سنتے کہاں ہیں۔ والدین تو اولاد کو اپنا زرخیز غلام سمجھتے ہیں۔ بس آ جائیں میرے ساتھ اور ڈرامے کے لیے تیار رہیں۔“

”میں بھی چلتا ہوں۔“ اس کے بھائی نے کہا۔ ”نہیں تم نہیں ورنہ وہ گاڑی لے کر بھاگ جائے گا۔“ میں نے سمجھایا۔

لڑکی کا باپ کچھ ہنچکچاتا ہوا میرے ساتھ چل پڑا۔ عادل نے گاڑی کچھ فاصلے پر کھڑی کی ہوئی تھی۔ پھر وہی سب کچھ ہوا جس کی میں نے ہدایت کی تھی۔ رضوانہ کے باپ نے عادل کو گلے لگا لیا تھا۔ ”تم لوگ یہ کیا حماقت کر رہے تھے۔ دیکھو رشتے اس طرح نہیں بنتے۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد باقاعدہ رات لے کر آؤ اور رضوانہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”کیا..... کیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ عادل نے خوش ہو کر پوچھا۔

”میں ایک باپ ہوں اور کوئی شریف باپ یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی بیٹی اس طرح بھٹکتی پھرے۔ اگر اس نے تم کو پسند کر لیا ہے تو پھر یہ اس کی مرضی۔ اب انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔“

رضوانہ نے چندا سے لیے ہوئے زیورات اتار کر چندا کے حوالے کر دیئے۔ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ گھر واپس چلی گئی۔

اس کہانی کا یہ ایک انجام تو ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بظاہر تو سب ٹھیک ہو گیا تھا۔ لیکن آگ اب بھی لگی ہوئی تھی۔

ہم گھر واپس آگئے۔ عادل آنے والے دنوں کے خیال سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ بھی بھی اپنے اطمینان کے لیے مجھ سے پوچھ لیتا۔ ”یار اس کے باپ نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہے نا، ایک ہفتے کے بعد وہ ہماری شادی تو کر دے گا نا؟“

”ہاں ہاں وہ میں کر لوں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا۔“

”ہاں ہاں وہ میں کر لوں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہو گا۔“

”ہاں اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔“
میں نے کہا۔ ”اور وہ خود بھی بہت معقول آدمی دکھائی
دے رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہو
گا۔“

”تو پھر ایسا کرو کہ کل یا پرسوں تم باقاعدہ پیغام
لے کر اس کے گھر جاؤ۔“ عادل نے کہا۔
”اب اس کی کیا ضرورت ہے۔“

”ضرورت ہے نا۔ تم دن اور تاریخ طے کرو
گے۔ وہی جس طرح ہوا کرتا ہے۔ نکاح کہاں ہوگا،
کتنے لوگ شریک ہوں گے، کیا نکاح کے بعد بھی رخصتی
کا ارادہ ہے یا کچھ دنوں کے بعد رخصتی ہوگی۔“

”ہاں یہ سب تو طے کرنا ہوگا۔“ میری بیوی چندا
بھی بول پڑی۔ ”بلکہ آپ اکیلے نہیں میں بھی جاؤں
گی۔ پتا تو چلے کہ فیملی رشتہ مانگنے آئی ہے۔“

”گڈ، بھابی نے بالکل ٹھیک کہا۔ تم دونوں چلے
جانا۔ کچھ لے جانا ہو تو مجھے بتاؤ۔“

”کیا لے جانا ہے۔ بس مٹھائی وغیرہ۔ راستے
سے لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اور اتنا تو خود میں بھی
کر سکتا ہوں۔“

عادل کچھ دیر کے بعد چلا گیا تھا۔ اس کے جانے
کے بعد چندا نے کہا۔ ”اب یہ عادل صاحب سر ہی پیٹتے
رہ جائیں گے۔“

”ہاں خدا کرے اس لڑکی کو عقل آگئی ہو۔“
”آگئی ہے عقل میں نے راستے بھر بھڑکایا ہے
اس کو۔“ چندا نے بتایا۔ ”اے احساس ہو گیا ہے کہ وہ
بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔“

”تو کیوں نہ چل کر دیکھا جائے کہ کیا حالات
ہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن عادل بھائی سے کیا کہا
جائے گا۔“ چندا نے پوچھا۔

”وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا۔
”سب سے زیادہ ناراض تو وہ مجھ سے ہو گا کیونکہ
میرے ہی کہنے پر اس نے لڑکی کو واپس جانے دیا تھا۔“

دوسری شام کو ہم دونوں میاں بیوی اس لڑکی کے
گھر پہنچ گئے تھے گھر والوں نے بہت گرم جوشی سے
ہمارا استقبال کیا تھا۔ لڑکی کا باپ بار بار میرا شکریہ ادا
کر رہا تھا۔ ”جناب جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا

ہے۔ آپ نے جو ترکیب بتائی تھی وہی ترکیب کام
آگئی۔“

”رضوانہ کیسی ہے وہ کیا کہہ رہی ہے؟“
”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بھی ہوش ٹھکانے
آگئے ہیں۔“ باپ نے بتایا۔ ”اور سب سے بڑی بات
یہ ہے کہ وہ اس بات پر راضی ہو گئی ہے کہ گھر والے
جہاں بہتر سمجھیں وہاں رشتہ کر سکتے ہیں۔“

”اور آج جس نکاح کا پروگرام تھا اس کا کیا
ہوا۔“ میں نے پوچھا۔
”وہ تو ختم کر دیا ہے۔“
”ختم کر دیا۔“

”جی ہاں کیونکہ رضوانہ کی مرضی نہیں تھی۔
دراصل اب اس واقعے کے بعد ہمیں اس بات کا
احساس ہو گیا ہے کہ چیک اینڈ بیلنس دونوں طرف ہونا
چاہیے۔ اولاد کی طرف سے بھی اور والدین کی طرف
سے بھی۔ والدین کو اپنی مرضی اور انا کی خاطر اولاد کو
کسی امتحان میں نہیں ڈال دینا چاہیے۔ اسی طرح اولاد
کو بھی چاہیے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتے وقت وقتی جنون اور
جوش میں نہ آئے بلکہ والدین کو بھی اپنی مرضی میں شامل
کر لینا چاہیے۔“

”یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے
رشتے باہمی مشاورت سے ہوں۔“

”بالکل، باہمی مشاورت، دونوں غور کریں کہ
اس رشتے میں بھلائی یا بہتری ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو
بسم اللہ۔ چاہے وہ رشتہ والدین کی طرف سے آیا ہو یا
خود اس لڑکی نے کسی کو پسند کر لیا ہو۔ دونوں دیکھیں
سوچیں سمجھیں ٹھنڈے دل اور دماغ کے ساتھ۔ پھر
اپنی انا اور ضد کو ایک طرف رکھ کر فیصلہ کر لیں۔“

یہ بہت اچھی بات تھی۔ اس کہانی کا انجام ہی یہی
ہے۔ یہ ایک راستہ ہے ہر گھرانے کے لیے والدین
کے لیے بھی اور اولاد کے لیے بھی۔

”تو اب آپ نے کیا کرنا ہے؟“ میں نے ابھتے
ہوئے پوچھا۔
”میری بیٹی نے عادل کو پسند کر لیا ہے۔ اس لیے
مجھے ہاں کر دینا چاہیے۔“

میں سر ہلاتے افسوس کرتے ہوئے واپس آ گیا

پولیو زدہ محبت

جناب مدیر اعلیٰ سرگزشت

السلام علیکم

انسان کی بے چارگی کو لوگ کس طرح "کیش" کراتے ہیں اس کا بھرپور احاطہ کرتی روداد ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین سرگزشت کو بھی پسند آئے گی۔

محمد جمیل اختر
(راولپنڈی)



صبح کا وقت کتنا شاندار ہوتا ہے یہ چیز یا کتنا خوبصورت گاتی ہیں۔ اسفندیار دس سال کا ہے اور پولیو کا مریض ہے وہ سارا دن ایک بیکار سامان کی طرح بچی گھر میں تو بچی باہر پڑا رہتا ہے گویا وہ کوئی قابل توجہ چیز ہی نہ ہو صبح سویرے اٹھتا ہے۔ رینگتا رینگتا غسل خانے جاتا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر ایک بیڑھی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ خود ناشتے کا مطالبہ نہیں کرتا پہلے اُس کے بھائی ناشتا کرتے ہیں جو کہ اُس کے ابا کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اُس کا باپ مستری ہے اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی یہ ہنر سکھار رہا ہے اگر اسفندیار کو پولیو نہ ہوتا تو شاید وہ بھی یہ ہنر سیکھ رہا ہوتا، کبھی کبھار اسفندیار یہ سوچتا تو اس ہو جاتا کہ کاش اُس کی ٹانگیں ٹھیک ہوتیں تو وہ کیسی اچھی اچھی عمارتیں بناتا۔ ایسی عمارتیں کہ گاؤں میں کسی نے دیکھی نہ سنی ہوں گی وہ سارا دن دماغ میں رنگ برنگی عمارتیں بناتا رہتا، وہ ناشتے کا مطالبہ خونہ کرتا کہ اُس کا باپ کریم بخش ایک سخت مزاج آدمی تھا کہ جس کو اسفندیار سے سخت چڑھتی یا شاید وہ اس سے نفرت کرتا تھا، سو ایک بار ناشتا مانگنے پر اُس کا باپ غصے میں آ گیا، اسفندیار نے ابھی کہا ہی تھا۔

”اماں ناشتا.....“

”ہاں ہاں اس نواب زادے کو پہلے ناشتا دو اس نے

کام پر جانا ہے نا۔“

”نہیں ابا وہ میں تو ویسے ہی.....“

”جاننا ہوں جاننا ہوں سارا دن گھر میں ہی رہنا ہے نا،

پڑیا۔

”استاد جی!“

”جی بیٹا۔“

”استاد جی ایک بات بتائیں؟“

”پوچھو۔“

”یہ اسکول جانے کے لیے کتنی رقم چاہیے ہوتی ہے؟“

”کیوں تم نے آنا ہے کیا؟“

”جی آنا تو ہے پر اماں کہتی ہیں اسکول جانے لیے بڑی

رقم چاہیے جو میرے ابا کے پاس نہیں ہے۔“

اس دوران کریم بخش بھی ادھر آگلا۔

”سلام استاد جی۔“

”وعلیکم السلام کریم بخش۔“

”کریم بخش ذرا یہ کل اپنے بیٹے کا اسکول لے آنا۔“

”کس بیٹے کو جی؟“

”یہی اس اسفندیار کو۔“

”اوہ کیوں جی۔“

”اسکول میں داخل کرانا ہے۔“

”اونہ کریں استاد جی کیوں ظلم کر دے ہو، ایک لولا

آدی بھلا کیا پڑھے گا۔“

”پڑھ لے گا کچھ نا کچھ تم بھیج دو۔“

”اچھا استاد جی۔“

اس کے باپ نے استاد جی کے سامنے اُسے کچھ نہ کہا

لیکن جیسے ہی استاد جی گئے اس کے باپ نے وہ سنا لیں کہ اس

کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ”اب نواب صاحب اسکول

جائیں گے۔ بڑے افسر بنیں گے۔“

اُس کا باپ اُسے نواب صاحب ہی کہتا اصل میں کریم

بخش نے اس کا نام چودھری صاحب کے بیٹھے چودھری

اسفندیار کو دیکھ کر رکھا تھا۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں تھا کہ نام

ایک رکھنے سے قسمت ایک نہیں ہوتی، اور یوں بھی اگر اس کے

باپ کو پتا ہوتا کہ اس نے محذور ہونا ہے تو وہ نام بھلا کیوں رکھتا

لیکن اب تو نام رکھا جا چکا تھا۔

”استاد جی کہتے ہیں پیسے نہیں لگیں گے۔“ اسفندیار

سننایا۔

”نہیں کیسے نہیں لگتے پیسے، یہ امیروں کے شوق ہیں

پڑھائی لکھائی۔“

”بیچارے کو جانیں دیں۔“ اس کی ماں نے کہا۔

توڑتے رہنا روٹیاں گھر بیٹھے کر۔“

سو وہ خود ناشتا نہیں مانگتا تھا جب ملتا کھا لیتا۔ اُس کی

ماں کافی خیال رکھنے والی عورت تھی لیکن وہ اُس کے باپ کے

سامنے کبھی نہ بول سکتی تھی، اُس کے باپ کے سامنے بھلا کیسے

کوئی بولے۔ اُس کا غصہ ایسا تھا کہ سب چپ کر کے بیٹھے

جاتے، وہ ایک بیکار آدمی تھا کہ جو سارا دن کچھ بھی نہیں کرتا

تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد اس کا باپ اور دونوں بھائی کام پر

چلے جاتے اور ماں گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو جاتی

اور وہ رہنکتا ہوا باہر کے دروازے تک آ جاتا پھر باہر لوگوں کو

آتے جاتے دیکھتا رہتا، اُس کے بھائیوں نے اُسے ایک بار

دو چھڑیاں بنا کر دی تھیں کہ جن کے سہارے وہ کھڑا ہو کر چل

سکتا تھا لیکن وہ گھر کے دروازے پر وہ چھڑیاں لے کر کبھی نہ

آتا۔ اسکول کے بچے جب چھٹی کر کے لوٹ رہے ہوتے تو وہ

اُس کی چھڑیاں چھین لیتے اور مذاق اڑاتے کہ اب لے کے

دکھاؤ، جب وہ رہنکتا ہوا ان کے پیچھے پہنچتا تو وہ اور دور بھاگ

جاتے اور دور بہت دور گلی کے سرے پر چھڑیاں رکھ کر چلے

جاتے پھر اس کے لیے یہ بڑی مصیبت ہوتی اور وہ رہنکتا ہوا

گلی کے سرے سے چھڑیاں اٹھا کر لاتا۔

”دن اسی طرح بیکار سے گزر رہے تھے کہ ایک دن

دروازے پر بیٹھے بٹھائے اُس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نا

میں بھی ان بچوں کے ساتھ اسکول جاؤں لیکن اُسے اسکول

کون جانے دے گا اس بار بیٹھے اُسے بھی کچھ یقین نہیں تھا، وہ

ماں کے پاس آیا، اماں جی یہ بچے جو اسکول جاتے ہیں کتنے

اچھے کپڑے پہن کر جاتے ہیں۔“

”ہاں تو؟“

”وہ وہ اماں میں بھی اسکول جایا کروں۔“

”تو وہاں کیا کرے گا، اور کیسے جائے گا، چل تو تو سکتا

نہیں۔“

”نہیں نہیں اماں میں چل لوں گا بس مجھے اسکول بھیج

دے۔“

”اسکول جانے کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں، تیرا ابا

راضی نہیں ہوگا۔“

بہت سے پیسے اب وہ کہاں سے لاتا، وہ بڑا پریشان

ہوا، ایک بار پرائمری اسکول کے استاد اشرف گلی سے گزرے

جو ہمیشہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مسکراتے ہوئے گزرتے تھے

، آج جب ان کا ہاتھ سر پر تھا تو اسفندیار نے استاد جی کا ہاتھ

ہاں ہاں تو حمایت کر لے، کر لے یہ بھی شوق پورا۔
چار دن میں اس کا شوق پورا ہو جائے گا جب دو کلو میٹر چل کے
جائے گا تو لگ پتا جائے گا۔

☆.....☆

روز ڈوبتا سورج شاید یہ پیغام دیتا ہے کہ یہاں سب کا
قیام عارضی ہے، اس عارضی قیام میں کسی کو آسانی میسر آ جاتی
ہے تو کسی سے یہ زندگی گزرتی نہیں، اسے گزارنی پڑتی ہے۔
اس کی زندگی ہمیشہ سے جدوجہد بھری رہی تھی۔

بچپن سے پولیو کا مریض، چھڑی کے سہارے جسم گھسینا
ہوا اسفندیار۔ آپ اگر گھر میں بھی بیٹھے ہوں تو بھی اسے اس
کے چلنے کی آواز سے پہچان لیں گے۔

وہ دھند میں لپٹی صبح تھی جب وہ گورنمنٹ پرائمری
اسکول چک 21 میں داخل ہوا۔ سارے لڑکوں نے حیرت
سے اُسے دیکھا تھا کہ اب یہ لنگڑا بھی ہمارے ساتھ پڑھے گا؟
وہ چپ کر کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

”اسفندیار پتر شاہاش تو اسکول آیا، ادھر آ پہلے تیرا نام
رجسٹر میں داخل کر دوں۔“

”اسفندیار۔“

”واہ بچے کیا خوبصورت نام ہے، چل اب بیٹھ جا۔“

اور اسفندیار کو محسوس ہوا کہ نام حاضری کے رجسٹر میں آنا
بہت ہی بڑے اعزاز کی بات ہے۔ بعض باتیں بہت چھوٹی
ہوتی ہیں لیکن وہ محسوس کی جائیں تو بہت بڑی ہوتی ہیں، جیسے
اسفندیار اُس رات دیر تک جاگتا رہا تھا اُسے نیند نہ آتی تھی۔
وہ چار پائی پر کر دیشیں بدلتا رہا، نیند آتی بھی تو تھوڑی دیر بعد
آنکھ کھل جاتی۔ چھت کے پاس بنے روشندان سے اُس نے
جب بھی دیکھا باہر اندھیرا ہی تھا یہ صبح کیوں نہیں ہوتی۔ یہ صبح
کب ہوگی کہ اُس نے اسکول جانا تھا۔ اسکول جانا مشکل کام
تھا لیکن وہ لڑھکتا دھکے کھاتے تین سال لگا تاہر اسکول جاتا رہا
اب اُسے پڑھنا بھی آ گیا تھا اور وہ کچھ جملے لکھ بھی سکتا تھا،
اُسے پڑھنے کا ایسا شوق تھا کہ گاؤں کی دیواروں پر لکھے
اشتہارات سے لے کر، دکانوں کے نام تک اُس نے سب کچھ
پڑھ ڈالا۔

ایک روز کا قصہ ہے کہ کریم بخش، شیدے ہوٹل والے
کے پاس بیٹھا تھا کہ بات چل نکلی صدیق ترکان کی۔ ”ارے
کریم بخش سنا ہے، صدیق ترکان گھر میں نیا کمر بنوا رہا ہے“

شیدے نے کہا۔

”واہ جی واہ اُس کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آ گیا؟“
”سنا ہے لکڑی کی قیمت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے،
مجھے تو لگتا ہے آگے جا کر لکڑی سونے کے بھاڈو کیے گی، تم دیکھنا
ایک دن صدیق ترکان اور حمید زرگر میں کچھ فرق نہ ہوگا۔
دونوں پیسے میں کھیلیں گے اور ہم ادھر دودھ پتی ہی بناتے
رہیں گے، میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں اُسے ضرور ترکان بناتا۔“

کریم بخش کے دونوں بیٹے اب راج مسٹریوں کا کام
پوری طرح سیکھ چکے تھے سو وہ انہیں کیسے دوسرا ہنر سکھاتا، تبھی
اُسے یاد آیا کہ اُس کے دو نہیں تین بیٹے ہیں۔ یہ اسفندیار بھی تو
اُس کا بیٹا ہی تھا۔

”اجھا تو شیدے ایک بات بتا، کیا کوئی لنگڑا آدمی
ترکان بن سکتا ہے؟“

”او بھئی کریم بخش، ترکان کو کون سا بھانگنا دوڑانا ہوتا
ہے، ایک ہی جگہ بیٹھ کر کام کرنا ہوتا ہے، مجھے لگتا ہے تم
اپنے بھلے لڑکے کو ترکان بنانا چاہتے ہو جو اسکول میں بابو
بن رہا ہے۔“

”ہاں یار، بچہ ضد کر بیٹھا تو داخل کر دیا اسکول میں،
کتا ہیں اسے استاد اشرف ہی لے کر دیتے ہیں، اُسے ابھی
نہیں پتا کہ غریب کا بیٹا کبھی بابو نہیں بن سکتا، چلو جو وقت ضائع
ہوا سو ہوا، اب میں اُسے کل ہی صدیق کے پاس لے
کر جاتا ہوں۔“ گھر آتے ہی اس نے حکم جاری کر دیا۔
”علیم بخش کی ماں کل سے یہ اسفندیار اسکول نہیں
جائے گا۔“

”کیوں اب کیا ہو گیا؟“

”بس کل سے اے صدیق ترکان کے پاس بیٹھانا ہے
کوئی ہنر سیکھ لے گا تو زندگی سنور جائے گی۔“
”لیکن ابا میں نے سنا ہے پڑھ لکھ کر بھی ہم بڑا آدمی
بن سکتے ہیں، میں بہت دل لگا کر پڑھوں گا، قسم لے لو ابا میں
بہت پڑھوں گا اور بڑا آدمی بن کے دکھاؤں گا۔“

”اوائے کا کے بات سن، کل سے تو میرے ساتھ چلے گا
، تین جماعتیں پڑھی ہیں اور زبان ابھی سے چلنے لگی ہے، چل
اب سو جا۔“

”لیکن ابا کل سے امتحان ہیں۔“

”اوائے تجھے ایک دفعہ سمجھ نہیں آتی۔“

اور لائین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اُس نے اپنے باپ کی
آنکھیں دیکھی تھیں اور اُس کے بعد اُس نے کچھ نہیں کہا تھا کہ۔

اُسے سارے جواب مل گئے تھے۔

☆.....☆

صدیق ترکان سے اُس کے باپ نے بات کر لی تھی سو اگلی صبح وہ نکلڑاتا ہوا صدیق ترکان کی دکان پر پہنچ گیا، صدیق ترکان ویسے تو بہت اچھا استاد تھا پر جب بھی اُسے غصہ آتا تو جو چیز بھی اُس کے پاس پڑی ہوتی اٹھا کر اسفندیار کو دے مارتا، اور اسفندیار بیچارہ کیا کہتا اور وہ کہہ ہی کیا سکتا تھا، اُس کو کبھی بکھارا سکول اور کتابیں بہت یاد آتیں لیکن اب اسکول کا قصہ ماضی ہو گیا تھا، وہ دو سال لگا تا صدیق ترکان کی دکان پر کام کرتا رہا، اُس کا خواب تھا قلم تراشنا اور وہ دروازے اور کھڑکیاں تراش رہا تھا، یقیناً ہر خواب کو تعبیر کار راستہ نہیں ملتا، اور ایک غریب اور مجبور انسان کے بھلا کون سے خواب؟

ان دو سالوں میں اور تو کچھ نہ ہوا بس اُس نے نئی جیسا کھیاں ضرور بنائی تھیں۔

پھر ایک روز کریم بخش کو پوسٹ ماسٹر نے نئی صلاح دے دی ڈاکخانے کا ڈاک کیا عرصہ چھ ماہ کے لیے کہیں جا رہا تھا لیکن وہ ڈیوٹی پر بھی رہنا چاہتا تھا چونکہ وہ پوسٹ ماسٹر کا رشتے دار بھی تھا سو اُس نے یہ طریقہ نکالا کہ وہ کام پر بھی نہ آئے اور دفتر میں حاضری بھی لگتی رہے، اور اُس کی تنخواہ کا کچھ حصہ اُس کی جگہ ڈیوٹی کرنے والے ملازم کو دے دیے جائیں لیکن اتنی کم اجرت پر کون کام کرنے پر راضی ہوتا، یہ 1963ء کا قصہ ہے کہ جب اسفندیار بارہ سال کا تھا، کریم بخش کو جب پوسٹ ماسٹر نے کہا کہ وہ پورے پانچ روپے ہر ماہ اسفندیار کو دے گا تو کریم بخش کو یہ سودا زیادہ منافع بخش لگا، اور وہ ساری باتیں جو اُس نے دو سال پہلے ترکان کی اہمیت بیان کرنے کے لیے کی تھیں سب بیکار ہو گئیں، اور وہ صدیق ترکان سے لڑ پڑا کہ اُس نے دو سال میں اسفندیار کو کوئی کام کیوں نہیں سکھایا، صدیق نے بہتر کہا کہ ہنر آہستہ آہستہ آتا لیکن کریم بخش نے ایک نہ سنی اور اسفندیار کو وہاں سے اٹھا کر پوسٹ ماسٹر کے حوالے کر دیا کہ جناب اب یہ آپ کی امانت ہے، اسفندیار سے بھلا کس نے پوچھا تھا، اُس کی رائے بھلا کون سکاوائے تھی، پولیوزدہ رائے۔

☆.....☆

ڈاک کا کام کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا، اُسے صبح تین بجے ملتان سے آنے والی ٹرین سے ڈاک کا لفافہ لینا ہوتا تھا اور پھر سارا دن خطوں کی تقسیم کا تکلیف دہ کام، ریلوے اسٹیشن

ماہنامہ سرگزشت

اس کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ وہ رات کو اگر ایک بجے نکلڑانا شروع کرتا تو تین بجے ضرور پہنچ جاتا لیکن اُسے رات میں کتوں سے خوف آتا تھا سو وہ سرشام ہی ریلوے اسٹیشن چلا جاتا اور ایک بیچ پر سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں رہتا۔ پھر تین بجے ڈاک کا لفافہ لے کر گرتا پڑتا وہ ڈاک خانے آتا، اُن دنوں اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ دن بہت طویل ہو گئے ہیں اور راتیں طویل تر۔

چھ ماہ تک وہ مسلسل انہی طویل روز و شب کے درمیان لڑھکتا رہا اور جب چھ ماہ بعد ڈاکیا واپس آیا تو اس کی زندگی میں سکون آیا، لیکن کچھ لوگوں کی زندگی میں سکون بالکل بھی نہیں ہوتا۔

☆.....☆

اُس کے باپ نے مولوی نصیر کی جذبات سے لبریز تقریر سنی تو مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں بھی اپنے بچوں کو آپ جیسا عالم بنانا چاہتا ہوں، مولوی صاحب نے کہا ضرور یہ تو بہت بڑی سعادت ہے، تم بھی اپنے بیٹے کو سرگودھا کے بڑے مدرسے میں داخل کرادو کہ جہاں سے میں نے تعلیم حاصل کی ہے، اور مولوی صاحب نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مدرسے کے منتظم کے نام ایک خط بھی لکھ دیا۔

سو کریم بخش گھر آیا اور اسفندیار کو یہ خبر دی کہ وہ کل سرگودھا جا رہا ہے۔

اسفندیار کے پاس کچھ سوال تھے لیکن جواب کس کے پاس تھے۔ سارے سوال پولیوزدہ تھے اور ایسے سوالوں کے کوئی جواب نہیں ہوتے۔

☆.....☆

اسفندیار اب مدرسے آ گیا وہ دن رات اب پڑھتا رہتا اور اس نے کتابوں کو زندگی بنا لیا اور اس سے باہر وہ کچھ بھی نہیں سوچتا تھا، پھر سن 1965ء کی جنگ کا تقارن بج اٹھا اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں تعطیلات ہو گئیں، اسفندیار بھی مدرسے میں ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد واپس آ گیا، پھر جنگ ختم ہو گئی لیکن اسفندیار کبھی بھی واپس نہ جاسکا اور نہ اُسے کسی نے کہا کہ وہ واپس جائے۔ وہ سارا دن گلی میں بیٹھا رہتا، بچے اُسے چھیڑتے ہوئے گزر جاتے اور وہ انہیں کچھ بھی نہ کہتا، یہی وہ دن تھے جب اُس کے دل میں محبت نے گھر کر لیا، یہی وہ دن تھے جب اُسے محسوس ہوا یہ پھول، کلیاں کتنی خوبصورت ہیں، یہی وہ دن تھے جب اُسے محسوس ہوا کہ یہ چڑیاں اور کوئیلیں کتنا خوبصورت گاتی ہیں اور یہی وہ دن تھے

جولائی 2016ء

248

جب اُسے محسوس ہوا کہ دن اور رات کچھ بدل سے گئے ہیں، یہی وہ دن تھے جب اُسے ثریا سے محبت ہو گئی۔ وہ اُس کے تایا کی بیٹی تھی، جب ایک بار وہ گلی میں بیٹھا تھا اور لڑکے اُس کی پسا کھیاں اٹھا کر بھاگ رہے تھے تو اُس وقت ثریا اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی یہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے آئی اور لڑکوں سے وہ پسا کھیاں لے کر اسے دے دیں پھر لڑکوں سے بولی کہ خیردار آج کے بعد کسی نے اسفندیار کو کچھ کہا، پہلی بار ہاں زندگی میں پہلی بار اسفندیار کو محسوس ہوا کہ وہ ہے۔ کوئی تو ہے جو اس کی بھی حمایت کر سکتا ہے، کوئی تو ہے جو اس کی خاطر اوروں سے لڑ بھی سکتا ہے اور پھر اس دن کے بعد اسفندیار دن رات ثریا کے خواب دیکھنے لگا۔ ثریا اُسے جب بھی دیکھتی مسکراتی اور اسفندیار کو گلستا کہ وہ دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی ہے۔

انہی دنوں کریم بخش کو اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے لیے قرض چاہئے تھا سو وہ اینٹوں کے بھٹا مالک کے پاس گیا اور قرض کا مطالبہ کیا لیکن اس کے پاس رہن رکھوانے کو کچھ نہیں تھا، کریم بخش نے آہ سرد کھینچ کر بھٹے پر کام کرتے مزدوروں کی طرف دیکھا۔ پھر اُس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

”چودھری صاحب اگر میں اپنا ایک بیٹا آپ کے پاس رکھوادوں، مزدوری بھی کرتا رہے گا اور تنخواہ بھی نہیں لے گا، تو کیا مجھے قرض مل جائے گا؟“

”چودھری کے لیے اس سے زیادہ منافع بخش اور کیا ہوتا۔“ اس نے کہا۔ ”ہاں پر دو سال کام کرنا ہوگا، منظور ہے؟“

”ہاں جی ہاں جی بڑی مہربانی، مجھے منظور ہے کل میں بچدے جاؤں گا اور قرض لے جاؤں گا۔“

اور ان دنوں جب اسفندیار محبت کے خواب دیکھ رہا تھا اُسے اس کے باپ نے بھٹا مالک کے پاس دو سال کے لیے رہن رکھوادیا۔

☆.....☆

غریب اور مجبور کی بھلا کیا رائے ہوتی ہے، بے وقعت سی بے معنی سی رائے، اسفندیار بھٹا مزدوروں کے ساتھ سارا دن کام کرتا اور پھر شام کو ایک کچے جھونپڑے میں کہ جس کے فرش پر تمام مزدور سویا کرتے تھے پڑ رہتا، رات دیر تک وہ گاؤں کے بارے سوچتا رہتا، اُس کی ماں بھلا اب کیسی ہوگی، وہ بھائی کہ جس کی شادی کی خاطر وہ یہاں کام کر رہا تھا نہ جانے کیسا ہوگا۔ اُس کی شادی بھی ہوگئی ہوگی، نہیں شاید شادی

نہ ہوئی ہے ورنہ اُسے بھی تو کوئی بلانے آتا کہ آخر اُس کی قربانی ہی کی بدولت تو انہیں قرض ملا تھا، اُس کا دل کہتا تھا کہ ابھی شادی میں کچھ روز ہیں اور اُس بیچارے کے دل کی کیا بات کہ اُس کا دل تو ثریا کے خواب بھی دیکھا کرتا، اُسے رہ رہ کر خیال آتا کہ ثریا ضرور اُسے یاد کرتی ہوگی، کیوں یاد کرتی ہوگی وہ اس لیے کہ وہ ثریا کو یاد کرتا ہے اور یوں بھی ثریا اُسے محبت سے بھی دیکھتی تھی۔ بھلا جب لڑکے اُس سے اُس کے چھڑی کھینچ کر بھاگتے تھے تو وہ کیسے لپک کر آتی اور ان لڑکوں کو بھگا دیتی تھی۔ یقیناً ثریا اس کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔

بھٹے پر دن سے رات کرنا کچھ آسان نہیں تھا، جاگیردار کے ملازم جو کیدار ان تمام مزدوروں کو صبح منہ اندھیرے ہی اٹھا دیتے برائے نام ناشا دیتے کہ سانس چلتی رہے اور پھر کام، جو کیدار جو سارا دن درختوں کے نیچے بیٹھ کر تاش کھیلتے اور چرس کے سگریٹ پیتے رہتے تھے دوپہر کو جب سورج سوانیزے پہ ہوتا تو مزدوروں کے آگے کھانا رکھ دیا جاتا۔ دن بھر کے بھوکے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ایسے حالات میں کبھی کسی کو یہ خیال نہیں آتا تھا کہ بکا ہوا کیا ہے انسانوں پر ایسے حالات بھی آتے ہیں کہ جب چٹکنے کی حس ختم ہو جاتی ہے، اور مدعا صرف پیٹ کا ایندھن بھرنا رہ جاتا ہے سو وہ یہی ایندھن پورا کرتے تھے، رات کو بھی ایندھن پورا کیا اور فرش پر بازوؤں کا تکیہ بنا کر سب سو جاتے تھے، اسفندیار رات گئے تک سوچتا رہتا کہ ان مزدوروں کو ایسی جلدی نیند کیسے آ جاتی ہے۔ سر رکھتے ہیں سو جاتے ہیں تھکن سے ٹوٹ تو اُس کا جسم بھی رہا ہوتا ہے لیکن بہت تھک جاؤ تو بھی نیند مشکل سے آتی ہے اور وہ تو زندگی بھر کی مشقت کے بعد بے حد تھک چکا تھا سو وہ رات گئے تک سوچتا رہتا۔

☆.....☆

وقت نے گزرنا ہوتا ہے سو گزر گیا اور اسفندیار گھر واپس آ گیا۔ اُس کا باپ بہت خوش تھا کہ اُس نے اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ دو سال بھائی کی خاطر بھٹے پر کام کیا تھا۔ وہ بھی خوش تھا کہ اُس کا باپ پہلی بار کسی بات پر خوش تھا لیکن اُسے دکھ بھی تھا کہ جب وہ اینٹوں کے بھٹے پر کام کر رہا تھا تو اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے بڑے بھائی کی شادی کر دی گئی تھی اور اُس سے چھوٹے کی مگنی بھی ہو چکی تھی وہ سوچتا کہ اُس کی قربانی سے تو قرض ملا تھا شادی کے لیے پھر اُسے کیوں نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

وہ اب سارا سارا دن گلی میں بیٹھا ہوتا بس کبھی کبھار ثریا اُس کے گھر آ جاتی۔ وہ جب بھی اِس کی خیریت پوچھتی تو ا

تو نے محنت کی اور بڑے بھائی کی شادی ہو گئی اب تھوڑی سی اور محنت کرے گا تو دوسرے بھائی کی شادی بھی ہو جائے گی، دیکھ تو نے اس گھر کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔“

اسفندیار پچھلے دو سال کے شب و روز سوچتا تو پریشان ہوتا کہ کیا نیندیں پھر پریشان ہو جائیں گی۔ کیا دن ویسے ہی بے سکون ہو جائیں گے اور پھر دن رات ویسے ہو گئے کہ اُس کی بھلا کون سی لائے تھی۔

☆.....☆

دو سال اتنے ہی پریشان کن اور مشکلات سے لبریز گزرے جیسے کہ اس سے پہلے سال گزرے تھے اور جب وہ واپس آیا تو دوسرے بھائی کی شادی بھی ہو چکی تھی، سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ اُس کی چچی اب اس رشتے کے لیے رضامند نہیں تھی۔ وہ روز ان کے گھر آتی اور کہتی کہ اسفندیار کو کہیں کہ وہ ثریا کو طلاق دے۔ میں نے نہیں کرنی ایک لنگڑے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی۔

گھر والوں سے لے کر سارے گاؤں کے لوگوں نے اسفندیار کو کہا کہ وہ ثریا کو طلاق دے دے۔ بھلا اُس کا تمہارے ساتھ جوڑ ہی کیا ہے لیکن اسفندیار نے کبھی طلاق نہ دی کہ ثریا اُس کی زندگی کی پہلی خوشی تھی۔ پہلی اور اکیلی محبت تھی۔ اسی محبت کے خوابوں میں اُس نے چار سال قیدیوں سے بدتر حالات میں زندگی گزار لی لیکن وہ صرف اپنے لیے ثریا کو یہ اذیت نہیں دے سکتا تھا سو ایک روز اُس نے ثریا سے پوچھا تھا۔

”تم کہو تو میں طلاق دے دیتا ہوں۔“

”یہ تم نے سوچا ہی کیوں۔“

”لوگ کہتے ہیں کہ یہ ظلم ہے میں تمہارے قابل نہیں۔“

”لوگ تو کچھ بھی کہتے ہیں لوگوں کا کیا ہے۔“

”لوگ ہمیں کبھی ایک نہیں ہونے دیں گے تمہاری

ماں ابھی بھی اس شادی کے خلاف ہے۔“

”میں انتظار کروں گی، کیا تم انتظار کرو گے۔“

”میں منتظر ہوں۔“

اور پھر زندگی انتظار میں گزرتی رہی ہے۔ دونوں

بوڑھے ہو گئے مگر کبھی باپ نے گھر کی دہائی دے کر اور کبھی

محلے والوں کی سازشوں نے انہیں ایک ہونے نہیں دیا۔

میں نے انہیں بڑھاپے کی آخری حدوں میں دیکھا

اور ٹھان لیا کہ ان کی کہانی لکھوں گا۔

اُسے لگتا کہ اُس کے دکھ کم ہونے لگے ہیں اور وہ سارے زخم جو بٹھے پر کام کرنے کی وجہ سے ہوئے تھے آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے ہیں، کیا لفظوں میں جادو ہوتا ہے ہاں لفظوں میں جادو ہوتا ہے، اُسے یہی لگتا تھا کہ ثریا کی باتیں ہی کچھ ایسی تھیں۔

انہی دنوں ثریا کا ابا یعنی اسفندیار کا چچا بہت بیمار ہوا جب اُسے لگا کہ اُس کی زندگی کے دن کم ہیں تو اُس نے ایک دن کریم بخش کو بلایا اور اُسے کہا کہ دیکھ کریم بخش مجھے لگتا ہے۔ اب جانے کا ویلا ہے پر ثریا کا بھار ہے سر پر، سوچتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ ساری رات نیند نہیں آتی۔“

”بھائی جان آپ فکر کیوں کرتے ہیں ثریا جیسے آپ کی دھی ہے ویسے میری دھی ہے۔“

”تو نے میرا بڑا بوجھ کم کر دیا پر تیرے تو بڑے بیٹے کی شادی ہو چکی ہے جب کہ چھوٹے کا تو نے اپنے دوست دلا اور کی بیٹی سے نکاح کر دیا ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”بھائی جان میرا ایک اور بیٹا بھی تو ہے اسفندیار۔“

”لیکن وہ تو.....“

”وہ کیا بھائی جان۔“

بوڑھے بیمار باپ نے ایک بار پھر سوچا پھر اپنی بیماری پر دھیان دیا تو کہا۔ ”اچھا چل ٹھیک ہے جیسے تو مناسب سمجھ، بس نکاح میرے سامنے ہی کر دے رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔“

”کل ہی نکاح کرا لیتے ہیں بھائی جان۔“

نکاح کی خبر جب اسفندیار کو معلوم ہوئی تو اُسے سمجھ نہ آتی تھی کہ وہ ان ٹوٹی ہوئی ناگوں کے ساتھ سارے گاؤں میں کیسے بھاگتا پھرے، کاش اُس کے پر لگ جاتے اور وہ پوری دنیا کا چکر لگاتا، وہ خوش ہی اتنا تھا زندگی میں پہلی بار اتنا خوش، ادھر ثریا بھی خوش تھی کہ اُسے اسفندیار سے بچپن ہی سے ایک لگاؤ تھا بیچارہ اتنا اچھا تو تھا۔

اس رشتے سے اگر کوئی ناخوش تھا تو وہ ثریا کی ماں تھی جس نے سارا دن واویلا مچائے رکھا کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دے گی لیکن بیمار شوہر کے آگے زیادہ ضد نہ کر سکی اور یہ نکاح ہو گیا۔

نکاح کے چند روز بعد ہی ثریا کا باپ چل بسا۔ یہ اُس سے کچھ ماہ بعد کی بات ہے کہ کریم بخش کو دوسرے بیٹے کی شادی کے لیے قرض لینے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اب کی بار بھی رہن رکھوانے کو پاس کچھ نہ تھا۔

”اسفندیار پھر صرف دو سال کی بات ہے، جیسے پہلے

مظلوم ظالم

محترم مدیر السلام علیکم
میں سرگزشت کی مستقل قاری ہوں۔ لکھنے لکھانے کا شوق کم
عمری میں تھا۔ گزشتہ ماہ ایک سچ بیانی پڑھتے ہوئے یاد آیا کہ میں
نے بھی ایک ایسا کردار دیکھا ہے جو خود میں منفرد ہے۔ آپ بھی
ملاحظہ کریں کہ وہ لڑکی کیسی عجیب و غریب فطرت کی تھی۔

کلثوم اشفاق
(کراچی)



تاہناک نظر آیا اس لیے ان کا رشتہ قبول کر لیا ورنہ پہلے بیٹی
والے یہ ضرور دیکھتے تھے کہ ذاتی گھر ہے یا نہیں۔ اماں کو یہ
رشتہ اس لحاظ سے پسند تھا کہ میرے شوہر کے آگے بیچھے کوئی
نہیں تھا۔ ان کے والدین کا کئی برس پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

میری شادی ہوئی تو میرے شوہر کا ذاتی مکان نہیں
تھا۔ وہ کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ پڑھے
لکھے اور ذہین آدمی تھے، ایک پرائیویٹ فرم میں خاصی
معتول ملازمت کرتے تھے۔ ان کا مستقبل ابو کو بہت

صرف ایک بہن تھی، اس کی بھی دو ماہ قبل شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ دیہی جا چکی تھی۔
میں خود بھی پڑھی لکھی تھی اور بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی لیکن امتحان کا نتیجہ آنے سے قبل ہی میری شادی ہو گئی۔

اشفاق بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ اس دور کے عام مردوں کی طرح نہیں تھے جو عورتوں کو بھڑکی جوتی سمجھتے ہیں۔

مجھے وہاں سب سے زیادہ تکلیف مکان کی تھی۔ مالک مکان عجیب بد مزاج قسم کا آدمی تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر ٹوکتا تھا۔ اوپر کا مکان تھا اسی لیے ہمارے زور سے چلنے پر بھی اعتراض ہوتا تھا۔ ہم شادی کے بعد دو سال میں تین مکان بدل چکے تھے۔ اس دوران میں اللہ نے ہمیں ایک ننھے پھول سے نوازا دیا تھا۔

مکان بدل بدل کر میں شدید کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی اور اب میری زندگی کا واحد مقصد ذاتی مکان بنانا تھا۔ میں نے اس مقصد کے لیے کمیشیاں ڈالیں۔ اس کے علاوہ بھی ہر ماہ کچھ نہ کچھ پیسے انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

ان ہی دنوں نارتھ ناظم آباد کا علاقہ آباد ہو رہا تھا۔ وہاں کچھ بلاکس میں دو دو، چار چار مکان نظر آنے لگے تھے۔

ایک دن میرے شوہر آفس سے آئے تو بہت خوش تھے۔ وہ خود ہی بولے۔ ”کلٹوم! اللہ نے آخر تمہاری سن ہی لی۔ ہمارے نیجر یا سین صاحب امریکا شفٹ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں نارتھ ناظم آباد میں ایک مکان کی تعمیر شروع کی تھی لیکن ابھی اس کا صرف ڈھانچا ہی کھڑا ہوا تھا کہ ان کا ویزا آ گیا۔ وہ ادھورا مکان میں ان سے خرید رہا ہوں، ہم اس میں رہ کے بھی اسے بنا سکتے ہیں۔ اچھا خاصا بڑا چھ سو گز کا پلاٹ ہے۔“

”لیکن اشفاق، اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“
نے فکر مندی سے پوچھا۔

”یاسین صاحب کو پیسوں کی فکر نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”وہ کہہ رہے تھے کہ فوری طور پر آپ جو کچھ دے سکتے ہیں، دے دیں۔ بقیہ رقم بعد میں ادا کر دیں۔“

میرے پاس جمع پونجی، زیورات اور کمیٹی وغیرہ ملا کر پچیس ہزار روپے ہوں گے۔ یاسین صاحب اس ادھورے مکان کے چالیس ہزار مانگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ مسئلہ

یہ تھا کہ ان کا کوئی قریبی عزیز بھی کراچی میں نہیں تھا جو اس مکان کی دیکھ بھال کرتا۔ خالی مکان پر تو لوگ یونہی قبضہ کر لیتے ہیں۔

آخر وہ اشفاق کی تجویز... مان گئے کہ پچیس ہزار روپے ابھی لے لیں بقیہ رقم اشفاق ایک سال بعد ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیں گے۔

یوں ہمیں اپنا مکان نصیب ہوا۔ وہ مکان رنگ و روغن اور پلاسٹر سے محروم تھا۔

اس میں صرف کھڑکیاں اور دروازے لگے ہوئے تھے۔ بجلی، پانی اور گیس کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں ان مشکلات کی پروا کیے بغیر فوراً ہی اس ادھورے مکان میں شفٹ ہو گئی۔ بعد میں اشفاق کو اپنے دفتر سے قرض بھی مل گیا۔ اس سے ہم نے نہ صرف بچنے کا مکان مکمل کرایا بلکہ اوپر بھی ایک منزل بنالی۔ دفتر کا قرض چکانے کے لیے بھی ہر ماہ ایک معقول رقم کی ضرورت تھی۔ اشفاق نے اس مقصد کے لیے مکان کا گراؤنڈ فلور کرائے پر اٹھا دیا اور ہم لوگ اوپر چلے گئے۔

میں خود فرعون قسم کے مکان مالکان کی ڈسی ہوئی تھی اس لیے مجھے کرائے داروں کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں ان سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتی۔ کرائے کے لیے کبھی تقاضا نہ کرتی۔ اکثر الیکٹرک اور گیس کا بل بھی وہ لوگ وقت پر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر کرائے داروں کے بچے اپنا گھر چھوڑ کر ہمارے گھر میں ادھم مچاتے رہتے تھے۔

اب اللہ نے مجھے مزید دو بیٹوں سے نوازا دیا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اشفاق کرائے داروں کی بے تکلفی بلکہ ڈھٹائی سے تنگ آ کر ان سے مکان خالی کراتے رہے۔ اس وقت تک میرا بیٹا فرخ اور جہا نکیر بھی بڑے ہو چکے تھے، ان کے بعد سعد یہ تھی جو اب دوسری یا تیسری میں پڑھ رہی تھی۔

ہمارے مکان کی حالت اب بہت بہتر ہو گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں مکانات کی قیمتیں اور کرایوں میں بھی بہت اضافہ ہوا تھا۔ کرائے کی مد میں بھی خاصی معقول آمدنی ہو جاتی تھی لیکن اشفاق کو میرا کرائے داروں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں تھا۔ بے تکلف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کرائے دار اور وہ مالک مکان ہیں۔

اشفاق کو میری اس عادت سے اب چڑ ہو گئی تھی۔

جامی نور الدین عبدالرحمن

(1414ء-1492ء)

ایرانی شاعر اور صوفی۔ خراسان کی ولایت جام کے ایک قصبہ خرد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں باپ کے ساتھ ہرات اور سمرقند گئے۔ جو ایک زمانے میں اسلامی علوم اور ایرانی ادب کے مراکز تھے۔ تعلیم کے بعد سلوک و عرفان سے رجوع کیا اور سعد الدین محمد کاشغری اور خواجہ علی سمرقندی کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ علم عرفان میں اتنی ترقی کی کہ بہاء الدین نقشبندی کے حلقہ طریقت میں ان کا شمار خلفاء میں ہونے لگا۔ 1472ء میں حج کیا۔ مختلف شہروں کی سیاحت کر کے ہرات واپس آئے اور وہیں انتقال کیا۔ سلطان ابوسعید گرگانی، سلطان حسین مرزا، میر علی شیرانوائی، اوزون حسن، آق قیونلو، سلطان یعقوب آق قیونلو، سلطان محمد قانع اور سلطان بایزید دوم مولانا جامی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گوشہ نشین اور درویش منش تھے۔ نظم و نثر کی تصنیفات 49 ہیں۔ نظم میں سات مثنویوں (ہفت اورنگ) سلسلۃ الذهب، سلمان والہسال، تحفۃ الاحرار، سجد الابرار، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، فردنامہ اسکندری اور غزلوں کے تین مجموعے آپ کی یادگار ہیں۔ نثر میں گیارہ کتابیں تصنیف کیں۔

مرسلہ: نوروز فیروز۔ پشاور

اس سے ابھی تک میری صرف ایک ملاقات ہوئی تھی، وہ بھی اس وقت جب وہ لوگ مکان میں شفٹ ہوئے تھے۔ عجیب سی روکھی طبیعت کی عورت تھی لیکن اس کا شوہر بہت شریف اور مسکین لگ رہا تھا۔ ان کی بیٹی بھی خاصی سہمی ہوئی تھی اور بات کرتے ہوئے خوف زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

شوہر صبح دفتر چلا جاتا، عورت بھی تھوڑی دیر بعد بعد تیار ہو کر گھر سے نکل جاتی۔ گھر میں ان کی نوخیز بیٹی اور چھوٹا بیٹا رہ جاتا۔ وہ بچی گھر کی صفائی سے لے کر دیگر تمام کام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے بھائی کا بھی خیال رکھتی تھی۔ خیال کیا رکھتی تھی۔ وہ اکثر مجھے اس کی کمر پر لدا ہوا نظر

اب تو فرخ بھی اس بات پر غصہ کرنے لگا تھا۔ اس وقت جو کرائے دار تھے ان سے یہ مشکل اشفاق نے مکان خالی کرایا اور کہنے لگے۔ ”کٹھوم، اب میں مکان کرائے نہیں دوں گا۔“

”لیکن اس سے ہمیں خاصی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ فرخ، جہاں تک اور سعد یہ کے تعلیمی اخراجات نکل آتے ہیں۔ کچھ رقم پس انداز بھی ہو جاتی ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”بس میں اب ایک شرط پر مکان کرائے پر دوں گا۔“ اشفاق نے کہا۔ ”تم کرائے داروں سے کسی قسم کا میل جول نہیں رکھو گی۔ ورنہ لوگ یونہی سر پر چڑھتے رہیں گے۔“

”چلیے آپ یہ چاہتے ہیں تو یہی کہی۔“ میں نے کہا۔ میں زینے کے اس دروازے میں تالا ڈال دوں گا، جس کے ذریعے تم نیچے والے حصے میں جاتی ہو، اس کے علاوہ کرایہ بھی میں خود ہی وصول کروں گا۔ تمہیں کرائے داروں سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ان سے ملنے کی۔“ میں نے برامان کر کہا۔ ”وہ کوئی میرے سگے ہوں گے۔“

”امی برا نہ مائیں، ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ فرخ نے ہنس کر کہا۔ پھر کئی لوگ مکان کرائے پر لینے آئے۔ اشفاق ہر آدمی سے خود ملتے تھے اور انکار کر دیتے تھے۔ آخر انہیں محمود صاحب پسند آ گئے۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ چھوٹی جیلی تھی۔ دو بچے اور دو میاں بیوی۔ ایک بیٹی تقریباً چودہ، پندرہ برس کی رہی ہوگی۔ بیٹا بہت چھوٹا تھا اور صرف دو سال کا تھا۔

مجھے ایک لمحے کو حیرت ہوئی تھی کہ بچوں کی عمروں میں عموماً اتنا فرق نہیں ہوتا۔

”تم اپنا بھروسہ رہنے دو۔“ اشفاق نے میری بات سن کر کہا۔ ”ان کے بچوں کی عمر میں بارہ سال کا وقفہ ہے یا چوبیس سال کا، تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔“

انہوں نے زینے کے درمیانی دروازے پر تالا ڈال دیا۔

آنے والے کرائے دار بہت سہجے ہوئے نظر آتے تھے لیکن کرائے دار کی بیوی ساجدہ کچھ عجیب فطرت کی مالک تھی۔

اس نے رسما بھی ان بچیوں کو گھر میں نہیں بلایا لیکن بچیاں خود ہی اندر گھس گئیں۔

”آئی۔“ ان میں سے ایک لڑکی نے کہا۔ ”ہمارے گھر میں پرسوں میلاد ہے، امی نے کہا ہے کہ آپ ضرور آئیں۔“

ساجدہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاہدہ بول اٹھی۔

”امی، میں چلی جاؤں گی۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ساجدہ نے درشت لہجے میں کہا۔ پھر وہ ان بچیوں سے بولی۔ ”بیٹا! مجھے وقت ملا تو میں ضرور آنے کی کوشش کروں گی۔“

بچیاں اپنا سامنہ لے کر وہاں سے آگئیں۔

ان کے جاتے ہی ساجدہ، بیٹی پر برس پڑی۔ ”تجھے کیا ضرورت تھی کہ تو اس کرنے کی؟ میں نے تجھے سمجھایا تھا کہ تجھے محلے میں کہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”امی، میں تو.....“

”بس دور ہو جا یہاں سے۔“ ساجدہ نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔

میں نے نفرت سے سوچا، عجیب عورت ہے۔ ہر وقت اپنی بیٹی کو جھڑکتی اور مارتی رہتی ہے۔

کچھ دن مزید گزر گئے۔ ساجدہ کا وہی معمول برقرار رہا۔ وہ اب شاہدہ پر کچھ زیادہ ہی سختی کرنے لگی تھی۔

ایک دن میری بیٹی سعدیہ نے مجھ سے کہا۔ ”امی، میں رابعہ کی گڑیا سے اپنے گڈے کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

میں بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی دشمن نہیں ہوں۔ میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔

بچیوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سعدیہ نے اس شادی میں محلے کی تمام بچیوں کو شرکت کا بلا وا دیا۔ وہ بے چاری ساجدہ کے گھر میں جا پہنچی، اس وقت ساجدہ اپنے معمول کے مطابق گھر میں نہیں تھی۔

لڑکیوں کو دیکھ کر شاہدہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔

”میرا دل تو بہت چاہتا ہے کہ میں بھی دوسرے گھروں میں جاؤں لیکن امی مجھے کہیں جانے نہیں دیتیں۔ میں رات کو ابو سے بات کروں گی۔ وہ مجھے ضرور اجازت دے دیں گے۔“

اسی وقت دروازہ کھلا اور ساجدہ اندر داخل ہوئی۔ میں اوپر کی جھری سے سب دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر شاہدہ پریشان ہو گئی۔

آتا تھا اور نہ بلند آواز میں رونا شروع کر دیتا۔ ان کے یہ تمام معمولات میں اوپر گیلری سے دیکھتی رہتی تھی۔

اس لڑکی نے بھی کئی مرتبہ مجھے دیکھا تھا اور مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے سلام بھی کیا تھا۔

تین چار گھنٹے بعد ساجدہ واپس آجاتی اور گھر میں چیخ پکار شروع ہو جاتی۔ وہ اپنی بیٹی پر بہت سختی کرتی تھی۔ مجھے بعد میں اس کا نام شاہدہ معلوم ہوا تھا۔ وہ گھر میں آتے ہی شاہدہ پر برسے لگتی۔ کبھی صفائی پر، کبھی برتن گندے دھونے پر، کبھی کسی اور بات پر۔

ایسے موقعوں پر شاہدہ آنسو بہاتی رہتی اور کام کرتی رہتی۔ بعض اوقات تو ساجدہ اسے معمولی سی بات پر دھتک کر رکھ دیتی۔ وہ بیٹی مار کھانے کے بعد کچھ دیر کسی کونے کھدے میں بیٹھی روتی پھر دوبارہ کام میں جت جاتی۔

آہستہ آہستہ مجھے اس بیٹی سے ہمدردی ہونے لگی۔

میں نے ایک دن اشفاق سے کرائے داروں کے بارے میں بات کرنا چاہی تو وہ بری طرح بگڑ گئے اور بولے۔

”نہیں کلثوم، تم ان لوگوں کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاؤ گی۔ نہ کسی قسم کی ہمدردی کرو گی۔“

میں بھی اس وقت خاموش ہو گئی لیکن اپنی عادت سے مجبور ہو کر تاک جھانک سے باز نہیں آئی۔

میں نے یہ نوٹ کیا تھا کہ ساجدہ ٹھیک نو بجے گھر سے نکلتی تھی اور ایک بجے دوپہر تک واپس آتی تھی۔ اس نے پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے لیکن وہ مجھے اتنی تعلیم یافتہ نہیں لگتی تھی، ممکن ہے کسی چھوٹے سے اسکول میں چھوٹے بچوں کو پڑھاتی ہو۔

میری بیٹی سعدیہ اس وقت بارہ سال کی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے ضد کرتی کہ میں نیچے والی آئی کے گھر جاؤں گی لیکن اشفاق اور فرخ کے خوف سے ہمیشہ اسے منع کر دیتی تھی۔

ان ہی دنوں محلے کے ایک گھر سے میلا د شریف میں شرکت کا بلا وا آیا۔ آنے والی محلے کی دو تین لڑکیاں تھیں۔

میں نے ان سے کہا کہ تم لوگ ہمارے کرائے داروں کو بھی دعوت دے دو۔

میرے کہنے پر وہ نیچے بھی چلی گئیں۔ دستک کے جواب میں دروازہ ساجدہ نے کھولا۔ میں اوپر گیلری کی ایک جھری سے سب دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ ساجدہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

میرے منہ سے ہمدردی کے دو بول سنتے ہی شاہدہ سسک سسک کر رونے لگی اور بولی۔ ”آنٹی! میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ امی کو مجھ سے زیادہ گڈو کی فکر ہے۔“

گڈو، شاہدہ کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ وہ اب بھی بہت بری طرح رو رہا تھا۔ ”امی سمجھ رہی تھیں کہ میں جان بوجھ کر اسے رلا دیتی ہوں، بس اسی بات پر انہوں نے مجھے دھتک کر رکھ دیا۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ گڈو کے پیٹ میں درد ہے۔ پیٹ میں درد ہو تو بچے اسی طرح بلک کر روتے ہیں۔ تم فکر مت کرو، میں ابھی اوپر سے پیٹ کے درد کی دوا بچھواتی ہوں۔“ مجھے یاد آ گیا کہ پچھلے دنوں میری بیٹی ناہید آئی تھی اپنے بچے کی دوا یہیں بھول گئی تھی۔

”لیکن آنٹی، امی ناراض ہوں گی کہ.....“

”تم امی کو کچھ مت بتانا۔ اس وقت تمہارا بھائی تکلیف میں ہے۔ اس کی تکلیف دور کرو ورنہ یہ شام تک یونہی روتا رہے گا، ہاں دوا کھلانے کے بعد اس کے پیٹ کی سیکائی بھی کر دینا۔“ پھر میں نے اپنے جیس سے مجبور ہو کر پوچھا۔ ”تمہاری امی کس اسکول میں پڑھاتی ہیں؟“

”امی پڑھاتی نہیں ہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”وہ ایک اسکول میں دستکاری سکھاتی ہیں۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہیں۔“

”اچھا، میں تمہارے بھائی کے لیے دوا لے کر آتی ہوں۔“ مجھے اس بچے کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے ساجدہ کے پارے میں سوچا کہ عجیب ماں ہے، اپنے بیمار بچے کا بھی خیال نہیں ہے۔

اس کے بعد اکثر موقع دیکھ کر میں شاہدہ کے پاس جانے لگی۔ میں نے سختی سے اسے منع کر دیا تھا کہ تم اپنی امی کو

ساجدہ نے اپنی چادر ایک کرسی پر پھینکی اور شاہدہ سے بولی۔ ”یہ لڑکیاں یہاں کیوں آئی ہیں، تو میرے لیے پانی لے کر آ۔“

وہ بے چاری جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔ میری بیٹی نے ہمت کر کے کہا۔ ”آنٹی! ہم لوگ گڑیا گڈے کی شادی کر رہے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ شاہدہ بھی اس میں شریک ہو۔“

”نہیں بیٹا، شاہدہ کہیں نہیں جائے گی۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں جاسکے۔“

بچیاں مایوس ہو کر واپس آ گئیں۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ میں اب ساجدہ کو زیادہ اپنے گھر میں نہیں رہنے دوں گی اور ان لوگوں سے مکان خالی کرالوں گی۔

اس کے دوسرے ہی دن صبح کی بات ہے۔ اشفاق آفس اور بچے اسکول جا چکے تھے۔ اجانک شاہدہ کے گھر سے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا گئی۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ ساجدہ اپنی بیٹی کو بری طرح مار رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں مداخلت کرتی، وہ اپنی چادر اوڑھ کر باہر نکل گئی۔

شاہدہ کچھ دیر تک وہیں صحن میں بیٹھی رہی، پھر وہ بھی اٹھ گئی، کیونکہ اس کا چھوٹا بھائی بری طرح رو رہا تھا۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر باہر لے آئی لیکن وہ اس کے باوجود مسلسل روتا رہا۔

مجھ سے رہا نہ گیا۔ اس دن بجلی کا بل آیا تھا۔ میں نے کرائے داروں کا بل اٹھایا اور زینے والے دروازے کی چابی لے کر نیچے پہنچ گئی۔ میں نے تالا کھولا تو معلوم ہوا کہ دروازہ دوسری طرف سے بھی بند ہے۔ میں نے دروازے پر ہولے ہولے دستک دی۔

فوراً ہی شاہدہ کی سبھی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”بیٹا! میں تمہاری مالک مکان ہوں، بجلی کا بل لے کر آئی ہوں۔“

مجھے اُمید نہیں تھی کہ شاہدہ دروازہ کھولے گی۔ اس نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد دروازہ کھول دیا۔ میں بجلی کا بل لے کر اندر چلی گئی۔

”کیا ہوا تھا بیٹی، تمہاری امی تمہیں کیوں مار رہی تھیں؟“ میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

شمارہ جون 2016ء کی منتخب صحیح بیابانیاں

ہماری پیشکش.....آپ کا انتخاب

☆ اول: بز دل.....محمد یوسف (جہلم)

☆ دوم: تمہی دامان.....ظہیر مرزا (کراچی)

☆ سوم: حاصل عشق.....سبین (کراچی)

پہلے دہرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ اپنی منتخب کتب

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔ مجھے اس کی ماں سے زیادہ اشفاق اور فرخ کی طرف سے پریشانی تھی۔ ان دونوں کو بھنگ بھی مل جاتی کہ میں کرائے داروں سے میل جول بڑھا رہی ہوں تو وہ لوگ گھر میں ایک قیامت کھڑی کر دیتے لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ میں خود مالک مکانوں کی حرکتوں کی ڈسی ہوئی تھی۔ اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ کرائے داروں کو کسی بھی طرح تکلیف نہ پہنچے۔ اس چکر میں خود میں کئی دفعہ نقصان اٹھا چکی تھی۔

ایک کرائے دار بغیر ڈپازٹ کے رہنے آگئے۔ انہوں نے اپنی ایسی مجبوری روئی کہ میرا دل پتھج گیا۔ پھر چند ماہ بعد انہوں نے کرایہ روکنا شروع کر دیا۔ ہر دفعہ اپنی مجبوری کا رونا روتے تھے۔ آخر ایک رات وہ لوگ خاموشی سے گھر خالی کر گئے۔ وہ تو شکر ہے کہ انہوں نے گھر میں کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی تھی۔ اشفاق خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔

دوسرے کرائے داروں کے بچے سارا دن ہمارے گھر میں دندناتے پھرتے اور ان کی ماں سوتی رہتی۔ وہ ہر وقت چائے کی پتی، چینی اور آٹا وغیرہ مانگتے رہتے تھے۔ اکثر کرائے دار کی بیوی مجھ سے ادھار نقد رقم بھی لے جاتی تھی۔ ان سے تنگ آ کر اشفاق نے بہت مشکل سے مکان خالی کرایا۔

اسی قسم کے کئی واقعات کے بعد اشفاق نے مجھ پر پابندی لگا دی تھی۔ میں اسی لیے خوف زدہ تھی کہ اشفاق اور فرخ کو میرے اس میل جول کا علم نہ ہو پائے۔ اب شاہدہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس دن صبح اس کی پھر پٹائی ہوئی تھی۔ میں پہنچی تو اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ میں نے ہمدردی کی تو وہ پھر رونے لگی۔ میں نے بہت مشکل سے اسے چپ کرایا اور اس سے پوچھا۔

”شاہدہ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری ماں تمہیں آئی بے رحمی سے کیوں مارتی ہے؟“

”چھوڑیں آنٹی، کوئی اور بات کریں۔“ شاہدہ نے کہا۔

میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم اپنی ماں سے بدتمیزی کرتی ہو؟“

”آئی! اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر آپ وعدہ کریں کہ میری بات کسی کو نہیں بتائیں گی تو میں کچھ بولوں۔“

”میں بھلا کسی کو کیوں بتانے لگی؟“ میں نے کہا۔

”نہیں آئی، پہلے آپ قسم کھائیں فرخ بھائی کی۔“

میں نے قسم کھالی۔ ”اب بتاؤ کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ عورت میری سگی ماں نہیں ہے۔“ شاہدہ نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

میں حیران رہ گئی۔ ”سگی ماں نہیں ہے؟“

”ہاں، یہ میری سوتیلی ماں ہے۔“ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”اور تمہاری ماں؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ کہاں گئی؟“

”ان کا انتقال تو اس وقت ہو گیا تھا جب میں صرف تین سال کی تھی۔ ابو نے عہد کیا تھا کہ اب میں شاہدہ کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کروں گا۔“

”پھر..... یہ..... شادی.....؟“

”میرا باپ بہت شریف آدمی ہے، لاہور میں ابو کا کراچی کا بزنس تھا۔ پھر کچھ غلط دوستوں کی صحبت میں پڑ کر وہ ہیرا منڈی جانے لگے۔ میری ماں سے وہیں ایک کوشٹے پر ابو کی ملاقات ہوئی تھی۔“

میں حیرت سے منہ پھاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”ابو شریف آدمی تھے اس لیے وہ اس عورت کو عزت دینے کی خاطر بیاہ لائے لیکن طوائف بھی کبھی سدھری ہے۔ اس کے چکر میں ابو کا بزنس تو پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ مجبوراً انہیں نوکری کرنا پڑی اور ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔“

”تم اسکول کیوں نہیں جاتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جب لاہور میں تھی تو نوٹس میں پڑھ رہی تھی۔ پھر جب ابو کراچی آگئے تو میری سوتیلی ماں نے مجھے مزید نہیں پڑھنے دیا اور گھر بٹھالیا۔ وہ ابھی تک نہیں سدھری ہے۔“ شاہدہ نے کہا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ وہ صبح بن ٹھن کر کسی اسکول جاتی ہے، وہ اپنے ملاقاتیوں سے ملنے جاتی ہے۔“ شاہدہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

”لیکن آئی آپ کو اللہ کا واسطہ، یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو ورنہ میری سوتیلی ماں میری جان لے لے گی۔“

میں کچھ دیر بیٹھ کر اوپر آگئی کیونکہ ساجدہ کے آنے کا بھی وقت ہو گیا تھا۔

”اب مجھے اس محصوم بچی پر کچھ زیادہ ہی ترس آنے لگا۔“

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”شکور عمر میں مجھ سے کم سے کم پندرہ سال تو بڑا ہوگا۔ یہ سمجھ لیں مجھ سے دگنی عمر کا ہے۔ وہ بالکل جاہل اور اجڑا آدمی ہے اور رکشا چلاتا ہے۔“

”تمہارے ابو کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ابو تو وہاں میری شادی کرنا نہیں چاہتے ہیں لیکن

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نمبر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلشنگ

سپینس، جاسوسی پاکیزہ، سرگزشت

C-63 نیو ایسیسینشن اینڈ ہارنگ اتھارٹی ہن دکن روڈ، لاہور

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر ہو گئی تھی کہ ساجدہ ایک طوائف ہے جو شادی کے بعد بھی اپنی روش تبدیل نہیں کر سکی۔ اگر محلے والوں کو علم ہو گیا تو ان کا رد عمل بہت شدید ہوگا۔ وہ میرے کہنے سے پہلے ہی ساجدہ کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔“

میں نے سوچا، اس سے پہلے کہ ایسی کوئی نوبت آئے، میں خود ہی اشفاق سے بات کرتی ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ شاہدہ نے مجھے فرخ کی قسم دی ہے کہ میں اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کروں گی۔ میں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھی۔

دو، تین مہینے اسی اضطراب کے عالم میں گزر گئے۔ میں نے ایک آدھ دفعہ دہلی زبان میں اشفاق سے کہا بھی کہ مکان خالی کرالیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ان کے کرائے دار بہت شریف ہیں، پابندی سے کرایہ دیتے ہیں، کسی بات میں مداخلت نہیں کرتے۔ مجھے ایسے کرائے دار پھر کہاں ملیں گے؟

”لیکن وہ ساجدہ تو پوری جلا دے وہ اپنی نوجوان بیٹی کو.....“

”اس کی بات چھوڑو کلثوم۔“ اشفاق نے بیزاری سے کہا۔ ”یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے، ہم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں؟“

”ابو! فرخ نے ہنس کر کہا۔ ”امی کو شاید یہ اعتراض ہے کہ ساجدہ آنٹی ان سے کھلتی ملتی نہیں ہیں۔“

”تم زیادہ بک بک مت کیا کرو، میری بلا سے، وہ اپنے بچوں کو ذبح کر دے۔“

ان سب باتوں کے باوجود میں نے شاہدہ سے تنہائی میں ملنا نہیں چھوڑا۔

ایک دن میں گئی تو شاہدہ خلاف معمول بہت اداس تھی۔ میں نے اداسی کا سبب پوچھا تو وہ ہلکے ہلکے کر رونے لگی۔

”ارے ارے، کیا ہو گیا؟“ میں نے اسے سینے سے لگا کر اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

”آنٹی، امی میری شادی ایک ایسے آدمی سے کرا رہی ہیں جو نہ صرف عمر میں مجھ سے بہت بڑا ہے بلکہ بالکل جاہل ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

جولائی 2016ء

257

ماہنامہ سرگزشت

سے تو بہتر ہے کہ ایک ہی مرتبہ جان دے دی جائے۔“
”ایسی بات نہیں کرتے بیٹے۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

”اور میں کیا کر سکتی ہوں؟“ وہ پھر رونے لگی۔ میں رخصت ہونے لگی تو وہ بولی۔ ”آئی، ہو سکتا ہے کہ اب ہماری ملاقات نہ ہو، کل سے میری ماں کے اسکول کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ اسکول کی چھٹی تو مجبوری ہے ورنہ ابو کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ چھٹیوں کے باوجود کہاں جاتی ہے اور کس سے ملتی ہے؟“ وہ گلے لگ کر روتی رہی اور بولی۔ ”خدا حافظ آئی۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔“

میں بوجھل دل کے ساتھ واپس آگئی۔ میں دل ہی دل میں اس کے الفاظ سے ہول رہی تھی کہ میں کچھ کھا کر اپنی زندگی ختم کر لوں گی، رخصت ہوتے وقت بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھ سے آخری ملاقات کر رہی ہو۔
میں اسی کشمکش اور اضطراب میں تھی کہ اشفاق آفس سے لوٹ آئے۔ انہوں نے میری شکل دیکھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے کلثوم، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بس سر میں شدید درد ہے۔“

رات کو میں نے اشفاق سے کہا۔ ”آپ کی نظر میں کسی ایسے شریف لڑکے کا رشتہ ہے جس کا تعلق پنجاب سے ہو؟“

”کیوں بھئی، خیریت؟“ اشفاق نے ہنس کر کہا۔
”یہ تم نے رشتے کرانا کب سے شروع کر دیے؟“
”ایک بہت ہی شریف اور معصوم بچی کے لیے رشتے کی ضرورت ہے۔“ میں نے شاہدہ کا نام لیے بغیر کہا۔
”لڑکی بہت خوب صورت اور گھریلو کام کاج میں مطلق ہے لیکن اسے زیادہ پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ میٹرک میں اسے اسکول چھوڑنا پڑا۔“

”ایک رشتہ ہے تو۔“ اشفاق نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”میں کل اس کے باپ سے بات کر کے تمہیں بتاؤں گا۔“

میں خوش ہو گئی کہ اشفاق نے زیادہ جرح نہیں کی۔
”دوسرے دن اشفاق نے مجھے بتایا کہ میرے اسسٹنٹ حنیف صاحب کا تعلق گجرات سے ہے۔ ان کا بیٹا ڈپلوما ہولڈر ہے اور وہی کسی کمپنی میں سپروائزر ہے۔ سنبھلے

میری سوتیلی ماں انہیں مجبور کر رہی ہے۔ شاید اس نے ان جاہل لوگوں سے اچھی خاصی رقم لے لی ہے۔ اسی لیے ابو پر دباؤ بڑھا رہی ہے کاش..... کاش، میری سگی ماں زندہ ہوتی۔“ یہ کہہ کر وہ ہلکے ہلکے کر رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دلا سے دیے کہ تم فکر مت کرو، تمہارے ابو ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

”وہ امی کے دباؤ میں ہیں، وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتے۔“

”بیٹا، تم نے تو قسم دے کر مجھے خود ہی منع کر دیا ہے ورنہ میں تمہاری زندگی برباد نہ ہونے دیتی۔“

”نہیں آئی! وہ آنسو پوچھ کر بولی۔ ”آپ تو بہت اچھی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ میری ماں آپ کے ساتھ بدسلوکی کرے۔ میرے مقدر میں جو بھی ہے، وہ ہو کر رہے گا۔“

میں دل گرفتہ سی گھر آگئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس مظلوم بچی کی مدد کیسے کروں؟ میں تو اشفاق یا فرخ سے یہ بات کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ شاہدہ نے مجھے قسم ہی ایسی دی تھی۔

چند دن بعد مجھے شاہدہ نے روتے ہوئے بتایا کہ کل ابو نے اس رکشا والے سے میری منگنی کر دی ہے اور تین ماہ بعد شادی ہے۔

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ شام کو ساجدہ دروازے پر دستک دے کر ہمارے گھر آئی تو میں حیران رہ گئی۔

”میں مٹھائی لائی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں نے اس پورے عرصے میں اسے پہلی مرتبہ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”کیسی مٹھائی ہے؟“ میں بھی اخلافا مسکرا کر بولی۔
”کل میری بیٹی کی منگنی ہو گئی ہے۔“ یہ کہہ کر ساجدہ وہاں سے روانہ ہو گئی اور میں مٹھائی کی پلیٹ کو گھورتی رہ گئی۔

میں شدید غلجبان میں مبتلا تھی کہ اس مظلوم بچی کو اس کی سوتیلی ماں سے کیسے بچاؤں؟

دوسرے دن میں موقع پا کر پھر شاہدہ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ بہت اداس اور معصوم تھی، بات بات پر روتی تھی۔
روتے ہوئے بولی۔ ”آئی، میں اس جاہل آدمی سے کسی بھی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔ آپ دیکھیے گا، میں کچھ کھا کر اپنی زندگی ختم کر لوں گی، شادی کے بعد بار بار مرنے

موتی

سپوپل میں لعاب آمیز مواد جو سخت ہو کر موتی بن جاتا ہے کافی قیمتی ہوتا ہے اور جو اہرات کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ موتی کی پیداوار کے بڑے بڑے مراکز سری لنکا، خلیج فارس، جاپان، شمال مشرقی بورنیو، کیلے فورنیا کے ساحل اور خلیج میکسیکو ہیں۔

مرسلہ: عبادت علی۔ سیالکوٹ

موتی جھرا

ایک بیماری۔ ابتدا میں درد اور طبیعت بوجھل رہتی ہے۔ عام طور پر پہلی علامت یہ ہوتی ہے کہ گلے اور سینے پر باریک باریک سرخ دانے سے نکل آتے ہیں۔ جن کے ساتھ ہی بخار بھی ہو جاتا ہے۔ علاج کے طور پر سچے موتی منی کے ساتھ کھلائے جاتے ہیں تاکہ اندرونی گرمی دانوں کی صورت میں باہر نکل آئے۔ بے احتیاطی کی صورت میں یہ مرض مہلک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ٹھنڈ لگ جائے تو پچھلے دنوں پر بہت جلد اثر ہو جاتا ہے۔ نمونیہ وغیرہ قسم کی وچھید گیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہذا احتیاط رکھنی چاہیے کہ کھانسی وغیرہ نہ ہو۔ ٹھنڈ سے بچنا چاہیے۔ چوتھے یا پانچویں روز یہ دانے مرجھانے لگتے ہیں اور مرلیس اچھا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: سلیم فرمان نیازی۔ سیالکوٹ

ہوئے معقول لوگ ہیں، اکلوتا بیٹا ہے۔ انہیں اس کے لیے پنجاب ہی کی لڑکی کی تلاش ہے۔“

پھر میں نے ڈرتے ڈرتے انہیں بتایا کہ شاہدہ کے والدین اس کی شادی ایک جاہل رکشا ڈرائیور سے کر رہے ہیں اگر اس بچی کی شادی حنیف صاحب کے بیٹے کے ساتھ ہو جائے تو بہت اچھا رہے گا۔

”لیکن کلثوم، شاہدہ کی تو ممکن ہو چکی ہے۔“ اشفاق نے کہا۔

”آپ شاہدہ کے باپ سے بات تو کریں۔ ممکن ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ یوں بھی وہ لوگ شاید ساجدہ کے رشتے دار ہیں، اس لیے شاہدہ کا باپ مجبور ہو گیا ہے۔“

اشفاق نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن انہوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے یہ سب تفصیل کیسے معلوم ہوئی۔

دوسرے دن اشفاق نے شاہدہ کے باپ کو گھر بلا لیا اور انہیں حنیف صاحب کے بیٹے کے بارے میں بتایا۔

وہ خوش ہو گیا اور بولا۔ ”اشفاق صاحب! اگر ایسا ہو جائے تو میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مجھے بھی سعودی

عرب میں جا بٹل رہی ہے۔ میں جانے سے پہلے شاہدہ کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ جوان بچی کے سر پر باپ موجود نہ ہو تو کیا کچھ ہو سکتا ہے بس میں اسی مجبوری کی بنا پر راضی ہو گیا تھا۔ آپ حنیف صاحب سے ضرور بات کریں۔“

دوسرے دن حنیف صاحب، اشفاق کے ساتھ خود ہی آگئے۔ اشفاق نے شاہدہ کے باپ کو بھی بلا لیا۔ ان لوگوں میں کچھ دیر بات ہوئی رہی۔ پھر وہ لوگ چائے پی کر خوشی خوشی رخصت ہو گئے۔

دو دن بعد مجھے اطلاع ملی کہ شاہدہ کی منگنی شکور سے توڑ دی گئی ہے۔ اب اس کی شادی حنیف صاحب کے بیٹے عرفان سے ہو رہی ہے۔

اتفاق سے عرفان اگلے ہی مہینے پاکستان آ رہا تھا۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق ایک ماہ کے اندر اندر نہ صرف شاہدہ کی شادی ہو گئی بلکہ وہ رخصت ہو کر دینی چلی گئی۔

حنیف صاحب بہت خوش تھے کہ انہیں اتنی سکھڑ، خوب صورت اور فرمانبردار بہو ملی ہے۔ میں بھی بہت خوش تھی کہ میں نے ایک مظلوم کی زندگی تباہ ہونے سے بلکہ اسے بے موت مرنے سے بچا لیا تھا۔

اشفاق کہتے تھے، کلثوم اتم نے اپنی پوری زندگی میں نیکی کا یہ ہی کام کیا ہے۔ اس کا اجر تو تمہیں اللہ ہی دے گا۔

کچھ عرصے بعد ہی میں سب کچھ بھول بھال گئی۔ ساجدہ بھی ہمارا مکان چھوڑ گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ دوبارہ لاہور شفٹ ہو گئے ہیں، شاہدہ کے باپ کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی تھی۔

پھر کئی سال گزر گئے، میرے تینوں بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ فرخ شادی کے بعد امریکا شفٹ ہو گیا، پھر اس نے چھوٹے بھائی کو بھی وہیں بلا لیا۔ سعدیہ کی شادی ایک سیرکاری افسر سے ہو گئی۔ وہ ان دنوں اسلام آباد میں مقیم تھی۔

گزشتہ ہفتے اچانک میرے داماد تسلیم نے اسلام آباد سے ٹیلی فون کیا کہ سعدیہ کی طبیعت خراب ہے۔ اس کی ڈیلیوری میں کچھ پیچیدگی ہے، آپ اسلام آباد آجائیں تو میری ڈھارس بندھی رہے گی۔ گھر میں کسی بزرگ کا ہونا ضروری ہے۔

میں اس کا ٹیلی فون ملتے ہی اسلام آباد کے لیے روانہ

ہوگئی۔

بہاؤ پور سے ٹرین میں تین چار عورتیں سوار ہوئیں۔ سفر کے دوران میں عورتیں ایک دوسرے سے بات کر کے اپنا وقت گزار لیتی ہیں، وہ مجھ سے بھی بات کرنے لگیں۔ وہ کسی شادی کی تقریب سے آرہی تھیں۔ اسی شادی کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔

وہ مجھ سے بھی باتیں کرنے لگیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔ میری بیٹی بیمار ہے۔

”اللہ شفا دے گا بہن۔“ ایک عورت خلوص سے بولی، پھر وہ دوسری عورت سے مخاطب ہوئی۔ ”سارہ بہن، مجھے شادی کی تصویریں تو دکھاؤ۔“

”ہاں، تصویروں کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔“ سارہ نے کہا۔

میں نے سارہ کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہو لیکن یہ یاد نہیں آیا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟

اس نے ایک البم اس عورت کے حوالے کر دیا جو میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

وہ البم دیکھنے لگی تو غیر ارادی طور پر میری نظریں بھی ادھر اٹھ گئیں۔

ایک گروپ فوٹو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھی۔ اس گروپ فوٹو میں شاہدہ بھی بیٹھی تھی۔

میں نے اس خاتون سے پوچھا۔ ”یہ لڑکی کون ہے؟“

”یہ میری بہو ہے شاہدہ۔“ خاتون نے جواب دیا۔

”عرفان رشتے میں میرا بھتیجا ہے۔“

میں نے ان عورتوں کو بتایا کہ شاہدہ چند برس پہلے کراچی میں میرے ہی گھر میں کرائے پر رہتی تھی۔ میرے شوہر ہی نے عرفان کے ساتھ اس کی شادی کرائی تھی۔ بہت پیاری بچی ہے لیکن اس کی ماں بہت ظالم تھی۔

میری اس بات پر سارہ چونک کر بولی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”میں ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ اصل میں اس بے چاری کی ماں سوتیلی تھی، اس لیے اس پر بہت ظلم ڈھائی تھی۔ اس نے ایک طرح سے شاہدہ کو گھر میں قید کر رکھا تھا۔ وہ اصل میں اچھے خاندان کی عورت نہیں تھی۔“

”بی بی ذرا منہ سنبھال کر بات کرو۔ شاہدہ کی کوئی

سوتیلی ماں نہیں ہے۔ وہ میری سگی بہن کی بیٹی ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ ساجدہ باجی اس پر ظلم کرتی تھیں۔“

”میں تو یہی دیکھتی تھی کہ وہ اسے کہیں آنے جانے نہیں دیتی تھی۔“ میں نے سخت سے کہا۔

”ارے بہن، شاہدہ بہت آفت کی پرکالہ لڑکی تھی۔ اسے بات ادھر کی ادھر لگانے میں تو کمال حاصل تھا۔ اس نے اپنے سگے ماموں اور ماں میں ایسی لگائی تھی کہ ماموں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور باجی سے ہمیشہ کے لیے نانا توڑ لیا۔ وہ لوگ لاہور میں تھے تو کوئی ان سے نہیں ملتا تھا۔ پھر رمضان بھائی نے اپنا تبادلہ کراچی کرا لیا۔“

”تو کیا رمضان صاحب کا کراچی کا بزنس نہیں تھا؟“

”بزنس! سارہ طنز سے بولی۔ ”انہیں تو ملازمت

بھی بہت معمولی سی ملی تھی۔ پھر ان کا تبادلہ کراچی ہوا تو باجی نے بھی اسکول میں بچیوں کو دست کاری سکھانا شروع کر دی

اس چکر میں شاہدہ کی پڑھائی مکمل نہ ہو سکی۔“

”لیکن شاہدہ نے تو کہا تھا کہ.....“

”شاہدہ نے کچھ بھی کہا ہو وہ اول درجے کی جھوٹی ہے۔“ عرفان کی رشتے دار خاتون بولیں۔ ”اس نے اپنی لگائی بجھائی سے پورے سسرال میں پھوٹ ڈال دی ہے۔

یہ تو عرفان ہی کا دل ہے کہ اسے برداشت کر رہا ہے، اس کی ماں شاید اسی لیے اسے گھر سے باہر نہیں نکلتے دیتی تھی کہ وہ قہے کہانیاں گڑھ کر سنسنی پھیلانے کی عادی تھی۔ ابھی شادی کے موقع پر اس نے عرفان کے چچا زاد اور اس کی بیوی کے

درمیان ایسا قساد ڈالا ہے کہ میں کیا بتاؤں؟“ سارہ نے کہا۔

”مجیب مزاج کی لڑکی ہے۔ وہ نہ جانے کیوں شروع ہی سے باجی کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ وہ بات بات پر باجی سے زبان درازی کرتی تھی۔ باجی غصے میں آکر اسے مار بیٹھتی تھی۔ یوں، اس کے ذہن میں ماں سے دشمنی پلتی رہی۔“

وہ عورتیں لاہور اتر گئیں میں دیر تک سوچتی رہی کہ

شاہدہ اور ساجدہ میں ظالم کون اور مظلوم کون تھا؟ سارہ کی یہ بات بھی درست ہی تھی کہ وہ ساجدہ کی سگی بہن تھی۔ میں اسے دیکھ کر اس لیے چونکی تھی کہ اس کی شکل ساجدہ سے بہت ملتی تھی۔

بس اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ شاہدہ کس قسم کے ذہنی مرض میں مبتلا تھی۔

جولائی 2016ء



ڈاٹنگ فریب نظر کام

محترم مدیر سرگزشت
السلام علیکم

ایک اور واقعہ کہانی کے انداز میں بھیج رہا ہوں۔ گزشتہ تحاریر
کی طرح قارئین اس تحریر کو بھی پسندیدگی کی سند عطا
کریں گے۔

اعجاز احمد راحیل
(سابووال)

کبھی، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم جو دیکھتے
ہیں سوچتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔
یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جو میرے دوست واصف کی
ہے۔ ہم پاکستان شریف کے قریب ایک گاؤں میں رہتے تھے۔
واصف اور میرا بچپن اکٹھا گزرا۔ وہ گاؤں کے ایک
چھوٹے زمیندار کا بیٹا تھا۔ ہم سارا دن اکٹھے کھیلتے تھے۔
مجھے آج بھی سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ وہ بڑا سنہرا دور
تھا۔ واصف کے گھر کے گن میں ایک بیری اور شہوت کا

جولائی 2016ء

261

ماہنامہ سرگزشت

درخت تھا۔ جن کی چھاؤں میں ہم گرمیوں کی چھیوں کا کام کیا کرتے تھے۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہمارے والدین نے پانچویں کلاس کے بعد ہمیں ساتھ والے گاؤں کے ہائی اسکول میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ وہاں ہم آٹھویں تک اکٹھے پڑھتے رہے پھر ابو جان نے مجھے شہر کے اسکول میں داخلہ دلوا دیا۔ صبح اسکول جاتا اور شام کو گھر واپس آتا تھا۔ میری اور اس کی ملاقات جمعہ والے دن ہوتی تھی۔

وقت کا پھیلا دھیرے دھیرے گردش کرتا رہا۔ میٹرک کے ایگزیمٹ قریب تھے۔ ایک شام واصف ہمارے گھر آیا۔ ہم کافی دیر گپ شپ لگاتے رہے، باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ ہمارے اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب بتا رہے تھے کہ گورنمنٹ ہائی اسکول تحصیل نور پور میں پیپر ہوں گے۔ میں یہ سن کر خوش ہو گیا کیونکہ میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھا رہا پھر اپنے گھر چلا گیا۔ امتحان سے ایک ماہ قبل ہم کچھ دوستوں نے مل کر ایک مکان کرایہ پر لے لیا اور وہیں رہنے لگے۔ ہمارے استاد ارشاد صاحب بھی ہمیں وہیں ٹیوشن پڑھانے آجاتے تھے۔ وہ ہمیں فزکس، کیمسٹری، بیا لوجی اور میٹھ پڑھاتے تھے۔ امتحان سے تین چار دن پہلے میں گھر آیا تو واصف سے میری ملاقات ہوئی۔ میں اسے بیٹھک میں بیٹھا کر گھر چلا گیا اور چائے کا کہہ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”اعجاز یار آپ کا بھائی علی بتا رہا تھا کہ آپ اب شہر میں رہتے ہو۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ میں بھی ادھر آ جاؤں کیونکہ جو وقت شہر آنے جانے میں لگے گا۔ وہ بھی بیچ جائے گا اور میں اتنی دیر میں پیپر کی تیاری بھی کر لوں گا۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں بھی پیپر کے دوران وہاں رہوں گا۔ آپ ایسا کریں کہ میرے ساتھ ہی ادھر رہیں۔“

”شکریہ یار میں آج ہی اپنے ابو کو جا کر بتاتا ہوں، اور آپ واپس کب جاؤ گے؟“

”میں گل سیکنڈ ٹائم جاؤں گا۔ صبح جمعہ ہے۔ اسکول بند ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔ اتنی دیر میں میرا بھائی چائے لے کر آ گیا۔ واصف اور میں نے اکٹھے چائے پی۔ وہ کچھ دیر مزید بیٹھا رہا پھر اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے دن ہم اکٹھے شہر والے مکان میں چلے گئے۔ رول نمبر سلپ ہمیں مل گئی تھی۔ ہمارا پہلا پیپر انگلش اے کا تھا۔ ہم سب دوست انگلش کے پیپر کی تیاری کرنے لگے۔ آج جب مجھے وہ دن یاد آتے ہیں تو ہنسی آ جاتی ہے۔ وہ اس لیے کہ اسٹوڈنٹس جتنا ان دنوں پڑھتے ہیں، اگر سال بھر اسی طرح پڑھیں تو کامیاب ہو جائیں۔ ہم دن کو پیپر دے کر واپس آتے، کچھ دیر آرام کرتے پھر اگلے پیپر کی تیاری شروع کر دیتے اور رات کا کھانا کھا کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے۔ اگلے دن چھٹی ہوتی تھی۔ وہ دن بھی پیپر کی تیاری میں گزر جاتا تھا۔ میں اور واصف رات کو ایک ہی چار پائی پہ سوتے تھے۔ ہم رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر گپ شپ لگاتے تھے۔ اس دن میرا تیسرا پیپر جو کہ فزکس کا تھا۔ جبکہ واصف کا اسلامیات امتحان کا پیپر تھا۔ ہم پیپر دے کر کمرے میں واپس آ کر میٹھ کی تیاری کرنے لگے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اور واصف چار پائی پہ لیٹے ہوئے تھے۔

”یار اعجاز آپ کو ایک بات بتاؤں؟“ وہ میری طرف کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔

”ہاں بتاؤ؟“

”مجھے لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں“ وہ بولا۔ ”میرا دل چاہتا ہے دنیا کی سب لڑکیاں میرے ارد گرد بیٹھی ہوں اور میں کسی بادشاہ کی طرح ان کے درمیان بیٹھا ہوں۔“

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہاں یار یہ حقیقت ہے اور اب بھی دو لڑکیوں کے ساتھ میری فرینڈ شپ چل رہی ہے۔ ان سے اکثر ملتا بھی ہوں۔“

آخری فقرہ اس نے ذومعنی انداز میں کہا تھا۔ واصف میرا ہم عمر تھا۔ میری عمر کو کہ اس وقت اٹھارہ سال تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ میں ان باتوں سے دور رہتا تھا۔ شاید اس کی وجہ ابو جان کا ڈر تھا۔

”کمال ہے یار۔“ میرے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے۔

”آپ سناؤ کسی لڑکی کو دوست بنایا ہے؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”نہیں یار۔“ میں نے جھینپے جھینپے انداز میں جواب دیا۔

پھر وہ اپنی باتیں بتانے لگا۔ میں بھی سنتا رہا۔ جب

اکتاہٹ محسوس ہوئی تو آخر میں نے کہا۔ ”اچھا یار اب پیچھے کی تیاری کرنی چاہیے۔“
”اچھا ٹھیک ہے۔“

پھر ہم پیچھے کی تیاری کرنے لگے۔ دن گزرتے گئے۔ ہمارے پیچھے زخم ہوئے تو ہم واپس گاؤں آگئے۔ جب رزلٹ آیا تو ہم دونوں پاس ہو گئے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد واصف نے آرمی جوائن کر لی اور میں نے گورنمنٹ کالج ساہیوال میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ وہ جب چھٹی پہ گھر آتا مجھ سے لازمی ملتا تھا۔ اس کی گفتگو کا محور لڑکیاں ہی ہوتی تھیں۔ میں اس کی باتیں مزے لے لے کر سنتا تھا۔ اب میں بھی بھرپور نوجوان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں لڑکیوں میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔ میں جب سکیئنڈ ایئر میں تھا۔ انہی دنوں ایک حادثے میں میری ہائیں ٹانگ ٹوٹ گئی۔ واصف ان دنوں کھاریاں کینٹ میں تھا۔ جب اسے پتا چلا تو وہ بھی آیا تھا اور یہ میری اور اس کی اس گاؤں میں آخری ملاقات تھی۔ وہ ایک یادگار ملاقات تھی۔ وہ مجھے ہنس ہنس کر اپنی فلرٹ بازیوں کے قصے سناتا رہا۔ ”یار اعجاز جب سے آرمی جوائن کی ہے۔ سب برادری والے بہت عزت کرنے لگے ہیں اور سچ پوچھو تو جہاں جاتا ہوں لڑکیاں بہت لفٹ کرواتی ہیں۔“

حسب سابق اس کی تان لڑکیوں پہ آ کے ٹوٹی تھی۔

”اچھا۔“ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں موبائل فون نئے نئے متعارف ہوئے تھے۔ وہ جاتے ہوئے اپنا نمبر دے گیا اور میرا نمبر لے گیا تھا۔ ہمارا اب فون پہ رابطہ ہوتا تھا۔ میری اور اس کی جب بھی بات ہوتی تھی۔ وہ مجھے اپنے نئے نئے معاشقوں کے بارے میں بتاتا تھا۔ میں اسے فوجی فلرٹ باز کہتا تھا۔ جب میں اسے اس نام سے پکارتا تھا۔ وہ ہنس کر کہتا۔
”اعجاز! آپ جو بھی کہو میں لڑکیوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

☆.....☆

وہ گرمیوں کی ایک خوبصورت سی شام تھی۔ دن بھر وقفے وقفے سے بارش کے بعد مطلع صاف ہو چکا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں محن میں چارپائی پر نیم دراز تھا۔ سرگزشت کے ایک پرانے شمارے میں طاہر جاوید

مغل صاحب کی سلسلہ وار کہانی ”تاوان“ پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ واصف کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کر لی۔ سلام دعا اور حال چال پوچھنے کے بعد اس نے کہا۔ ”اعجاز! آج میں بہت خوش ہوں۔ ہماری یونٹ افریقا جارہی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میں پاکستان سے دوسرے ملک جاؤں گا۔“

”اچھا یار موج کرنا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ کافی دیر ہماری افریقا کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ چند دن بعد وہ افریقا چلا گیا تھا۔ چھ سات ماہ بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ اس دوران مجھ میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں۔ میں ذرا ذرا سی بات پہ غصہ میں آ جاتا تھا۔ میں نے کالج جانا بھی چھوڑ دیا اور کچھ عرصہ بعد فیصل آباد میں ایک ٹیکسٹائل مل میں جاب کر لی۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ اچانک میری زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا کہ میں بکسر بکھر گیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ 2009 اوائل مارچ کے دن تھے۔ میرے مخالفین کا قتل ہو گیا۔ انہوں نے میرے خلاف قتل کی ایف آئی آر درج کروادی۔ پورا سال تھانے، جیل اور عدالتوں میں گزرا تھا۔ واصف سے میرا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ رہا ہونے کے بعد میں گھر والوں کے ساتھ ساہیوال شفٹ ہو گیا تھا۔ دشمنوں کی اوٹ پناہنگ کال سے تنگ آ کر میں نے اپنا نمبر بھی بدل لیا تھا۔ واصف کو افریقا گئے ہوئے تقریباً دو سال ہونے والے تھے۔ پاکستان شریف والے گاؤں میں اب میں نہیں جاتا تھا۔

زندگی پھر سے اپنی ڈگر پہ چلنے لگی تھی۔ ہمیں ساہیوال آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ گزرا ہوا وقت جو بہت کشن تھا۔ مجھے اب خواب کی طرح لگتا تھا۔ ایسا خواب جس نے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ گاؤں، وہ گھر جس میں میرا بچپن گزرا تھا اور واصف جو میرا بہت گہرا دوست تھا۔ میں نے بارہا اس کے بارے میں پتا کیا، لیکن میرا رابطہ نہ ہو سکا۔

☆.....☆

وہ جنوری کی ایک خشک شام تھی۔ میں ان دنوں (کواٹہ) فیصل آباد میں جاب کرتا تھا۔ پانچ بجے ڈیوٹی آف ہوئی تو میں اپنے کمرے میں آ کر چارپائی پہ لیٹ گیا۔ مجھے

”میں نہیں مانتا یار۔“

”میں جب ملنے آؤں گا تو آپ کو یقین دلا دوں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہماری کچھ دیر مزید بات ہوتی رہی۔ پھر کال منقطع ہو گئی۔ پندرہ دن بعد میں فیصل آباد سے واپس اپنے گھر آ گیا تھا۔ ان دنوں میرا اور واصف کا فون پر روز رابطہ ہوتا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہوتی تھیں۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ واصف کی کال آ گئی۔

”میں کل آپ کے گھر آؤں گا۔“ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے بتایا۔

”او کے ٹھیک ہے۔ جب آپ کا دل چاہے آ جانا۔ میں بھی گھر آ گیا ہوں۔“

ہماری دس منٹ بات ہوئی پھر اس نے یہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ”اچھا اب سب باتیں رو برو ہوں گی۔“

اگلے دن لگ بھگ دس بجے واصف ہمارے گھر آ گیا۔ وہ ایک روشن دن تھا۔ دھوپ چاروں اطراف بھیلی ہوئی تھی۔ ہم گر بجوشی سے ملے۔ ایک دوسرے سے حال احوال پوچھا۔ پھر گزرے دنوں کی باتیں شروع ہو گئیں۔

”اعجاز! وہ دن کتنے اچھے تھے۔ کسی بات کی فکر نہیں تھی۔ جب سے بڑے ہوئے ہیں زندگی مشکل ہو گئی ہے۔“

”ہاں یار آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کو یاد ہے نا۔ جب ہم پھوٹے تھے، آپ کہا کرتے تھے، پتا نہیں ہم کب بڑے ہوں گے؟“

میری بات سن کر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔ مگر اب اپنے بڑے ہونے کا بھی دکھ ہو رہا ہے۔“

باتوں کے دوران ہم نے چائے وغیرہ پی لی تھی۔ اسی اثنا میں میرا بھائی کھانا لے کر آ گیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی ہماری گفتگو جاری رہی۔ کھانے بعد ہم گھومنے پھرنے دریا کی طرف نکل گئے۔ یہ دریا ہمارے گھر کے بالکل قریب ہے اور سارا سال خشک رہتا ہے۔ تاہم بارشوں اور سیلاب کے دنوں میں اس میں پانی آ جاتا ہے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے باتیں کرتے ہوئے ایک پتھر پر آ کر بیٹھ گئے۔

”اچھا اب بتاؤ کہ آپ کی فلرٹ بازیاں کہاں تک پہنچی ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یار بتایا تو تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہماری کچھ دیر مزید بات ہوتی رہی۔ پھر کال منقطع ہو گئی۔ پندرہ دن بعد میں فیصل آباد سے واپس اپنے گھر آ گیا تھا۔ ان دنوں میرا اور واصف کا فون پر روز رابطہ ہوتا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہوتی تھیں۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ واصف کی کال آ گئی۔

”میں کل آپ کے گھر آؤں گا۔“ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے بتایا۔

”او کے ٹھیک ہے۔ جب آپ کا دل چاہے آ جانا۔ میں بھی گھر آ گیا ہوں۔“

ہماری دس منٹ بات ہوئی پھر اس نے یہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ”اچھا اب سب باتیں رو برو ہوں گی۔“

لیٹے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ ان دنوں نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی۔ گھنٹی بجتی رہی۔ پھر خاموش ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے پھر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے بے دلی سے کال ریسیو کر لی۔

”السلام علیکم۔“ یہ آواز میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میں لیٹا ہوا تھا، ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”وعلیکم السلام واصف کیسے ہو یار؟“

”اعجاز! میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟“

”بس یار! زندہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا۔ جی شکر کرو کہ زندہ ہو۔ اس دور میں زندہ رہنا ہی بہت بڑی بات ہے، موبائل کے اسپیکر سے اس کی آواز ابھری۔ ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔ ”مجھے پاکستان آئے دو ماہ ہو گئے ہیں۔ مجھے ابونے آپ کے بارے میں بتایا تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ آج کل میں بنوں حائل میں ہوں۔ پندرہ دن بعد واپس گھر آ رہا ہوں۔ آپ کہاں ہو؟ آپ کا نمبر بھی بڑی مشکل سے ملا ہے۔“

وہ نان اسٹاپ بولتا چلا گیا۔ مجھے بولنے کا موقع ملا تو میں نے کہا۔ ”میں فیصل آباد میں ہوں۔ آپ کا نمبر میرے پاس بھی نہیں تھا۔“

”اچھا جب میں گھر آؤں گا تو آپ بھی ساہیوال آ جانا میں آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ سے ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔“

اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ ہماری لگ بھگ ایک گھنٹے بات ہوئی۔ کافی باتیں ہوئیں۔ کال ڈراپ ہوئی تو میں کنفیمنس چائے پینے چلا گیا۔ میں چائے پیتے ہوئے آنے والے گھون کے بارے سوچ رہا تھا۔ میں چائے پی ہی رہا تھا کہ میرا ایک دوست بھی آ گیا۔ میں نے اس کے لیے بھی چائے منگوا لی۔ ہم وہاں کافی دیر بیٹھے کپ شپ لگاتے رہے۔ اسی دوران کھانے کا وقت ہو گیا۔ ہم نے رات کا کھانا کھایا اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات کو ہماری پھر بات ہوئی تھی۔ ہم گزرے وقت کو یاد کر کے خوب ہنستے رہے۔

”واصف! سناؤ یار آج کل آپ کا کتنی لڑکیوں سے چکر چل رہا ہے؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

یہ سن کر وہ تھوڑی دیر چپ ہو گیا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”اعجاز! اب میں نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہماری کچھ دیر مزید بات ہوتی رہی۔ پھر کال منقطع ہو گئی۔ پندرہ دن بعد میں فیصل آباد سے واپس اپنے گھر آ گیا تھا۔ ان دنوں میرا اور واصف کا فون پر روز رابطہ ہوتا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہوتی تھیں۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ واصف کی کال آ گئی۔

”میں کل آپ کے گھر آؤں گا۔“ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے بتایا۔

”او کے ٹھیک ہے۔ جب آپ کا دل چاہے آ جانا۔ میں بھی گھر آ گیا ہوں۔“

ہماری دس منٹ بات ہوئی پھر اس نے یہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ”اچھا اب سب باتیں رو برو ہوں گی۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہماری کچھ دیر مزید بات ہوتی رہی۔ پھر کال منقطع ہو گئی۔ پندرہ دن بعد میں فیصل آباد سے واپس اپنے گھر آ گیا تھا۔ ان دنوں میرا اور واصف کا فون پر روز رابطہ ہوتا تھا۔ ڈھیروں باتیں ہوتی تھیں۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوا تھا کہ واصف کی کال آ گئی۔

”میں کل آپ کے گھر آؤں گا۔“ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے بتایا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

رسالے حاصل کیجئے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شرمخاس (فون نمبر 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر 111 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 ٹیکس: 021-35802551

”میں نہیں مانتا۔ چور چوری چھوڑ سکتا ہے
بیرا پھیری نہیں۔“

وہ تھوڑی دیر چپ رہا، پھر بولا۔ ”اعجاز آپ مجھے
بچپن سے جانتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی پتا ہے میں لڑکیوں کو
بہت پسند کرتا ہوں۔ میری کوئی بات آپ سے چھپی ہوئی
نہیں ہے۔“ میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔ ذرا
توقف کے بعد وہ بولا۔ ”کچھ ماہ پہلے میرے ساتھ ایک ایسا
واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔“
”کیسا واقعہ؟“ میں نے تجسس زدہ لہجے میں
استفسار کیا۔

”اچھا پھر سنو۔“ وہ اپنی کہانی سنانے لگا۔

☆.....☆

جب میں افریقا گیا تھا۔ شروع شروع میں میرا دل
نہیں لگا تھا۔ میں ہر وقت اداس رہتا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا
کہ کسی طرح پاکستان پہنچ جاؤں۔ شاید میں اپنی اس بات پہ
عمل بھی کر لیتا مگر وہاں میری دوستی یونٹ کے ایک سپاہی
شہیر سے ہو گئی۔ وہ بہاولپور کا تھا۔ ہم فارغ وقت اکٹھے
رہتے، گپ شپ لگاتے۔ اس سے وقت ہنسی خوشی گزرنے
لگا تھا۔

واصف مجھے اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔

”ہماری ڈیوٹی صرف یہ تھی وہاں کے جنگلی قبائل کے
باشندوں کو نئی تہذیب سے متعارف کروانا اور پڑھانا
لکھانا۔ اس مقصد کے لیے وہاں پاکستان کے علاوہ مختلف
ممالک کی افواج کی یونٹس بھی آئی ہوئی تھیں۔“
میں دلچسپی سے اس کی روداد سن رہا تھا۔

”ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا اور میری دوستی شہیر سے
ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری اور اس کی
دوستی گہری ہو رہی تھی۔ ایک دن شہیر میرے پاس آیا اور کہنے
لگا۔“

”واصف آج میری پاکستان اپنے گھر والوں سے
بات ہوئی ہے۔ گھر والوں نے میری مکٹھی کر دی ہے۔ امی
جان کہہ رہی تھیں کہ جب واپس آؤ گے۔ تمہاری شادی
کر دیں گے۔“

میں نے اسے مبارکباد دی اور کہا یہ تو بہت اچھی خبر
سنائی ہے۔ پھر ہم کھانا کھانے میس میں چلے گئے۔

”وقت کا دلچسپی پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہم واپسی کی تیاری
کرنے لگے۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب ہم کراچی

اگر پورٹ پر تھے۔ وہاں سے ہم پنوں عاقل آگئے۔ چار پانچ دن بعد ہمیں ایک ماہ کی چھٹی یہ گھر بھیج دیا گیا۔ شبیر اور میرا سوبائل پہ رابطہ تھا۔ اس نے گھر جا کر مجھے کال کی کہ دس دن بعد میری شادی ہے۔ تم لازمی آنا۔ میرے سات آٹھ دن گھر والوں اور رشتے داروں سے ملنے ملائے گزر گئے۔ پھر میں شادی سے ایک دن قبل بہاولپور شبیر کے گھر چلا گیا۔“

اس کی روداد میں خاموشی سے بیٹھنا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے کوئی اہم بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ واصف نے دو سگریٹ سلگائے، ایک میری طرف بڑھا دیا۔ ”شادی میں شبیر کے کافی رشتے آئے ہوئے تھے جن میں لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ میرا دل خوش ہو گیا تھا۔ میں خوب انجوائے کر رہا تھا۔ عصر کے وقت میں اور شبیر ان کی بیٹھک کے سامنے چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے رکشاکار۔ جس سے کچھ مہمان اترنے لگے۔ جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ شبیر مجھے ”ابھی آیا“ کہہ کر جلدی سے ان کی طرف بڑھ گیا۔ رکشے سے اترنے والی عورت میری طرف ایک تک دیکھنے لگی۔

میں بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ عورت انتہائی خوبصورت تھی۔ سرخ و سفید گول چہرہ، روشن پیشانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی حسین عورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ کم و بیش چالیس سال کی تھی۔ مگر اپنی عمر سے دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ اس نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا، مسکرائی اور گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے ہمراہ آنے والا ایک مرد اور لڑکی بھی گھر چلے گئے۔ میرا دل بے قابو ہونے لگا تھا۔ اس کو دو بارہ دیکھنے کی خواہش میں مچلنے لگا۔ کچھ دیر بعد شبیر بھی آ گیا۔ وہ مجھے بھی گھر لے گیا۔ ہم دونوں کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شام ہو گئی۔ ہم نے رات کا کھانا جلدی کھالیا تھا۔ وہ مہندی کی رات تھی۔ پورا گھر رنگ برنگی لائٹس اور قہقہوں سے سجا ہوا تھا مگر میری آنکھیں اس چاند چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ دلہن کو مہندی لگائی جا رہی تھی۔ میں اپنے سوبائل سے تصویریں بنانے لگا۔ اچانک مجھے وہ نظر آ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اپنے ساتھ کھڑی لڑکی کو ہٹو کا دیا اور میری طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اس کے لبوں پہ دل آویز مسکراہٹ ابھری۔ لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا۔

میں نے چھٹ سے اس کی دو تین تصویریں بنالیں۔“ وہ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا دل اس کی قربت کے لیے مچلنے لگا تھا۔ مہندی کی رسم ختم ہوئی تو سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ میں بستر پہ لیٹا اس کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ گوکہ تصویر صاف نہیں تھی مگر وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر سو گیا۔ اگلے دن برأت تھی۔ میں صبح سویرے اٹھا اور حمام پہ چلا گیا۔ شبیر کروائی اور نہا کر گھر آ گیا۔ گھر آ کر میں لباس بدل کر تیار ہوا۔ بارات منڈی یزمان جانی تھی۔ میں نے شبیر کو گاڑی کا پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ برأت روانہ ہونے سے پہلے ایک لڑکا شبیر کا پیغام لے کر میرے پاس آیا کہ وہ بلا رہا ہے۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ وہ بولا۔ ”واصف بھائی امی جان کی دوست خالہ شائستہ اور ان کی بیٹی اور داماد کو بھی اپنی گاڑی میں لے جانا۔ انہیں گاڑی نہیں مل رہی۔ آپ کے لیے جو گاڑی بک کروائی تھی وہ آگئی ہے۔ آپ اس لڑکے کو ساتھ لے جائیں، گاڑی دکھا دے گا۔“

میں اس کے ساتھ چل پڑا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور اسے کہا کہ انہیں بھیج دو۔ تھوڑی دیر بعد وہ لڑکا انہیں اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ وہ تینوں وہی کل والے مہمان تھے۔ وہ عورت جس کا نام شائستہ تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ وہ تینوں بیک سیٹ پہ بیٹھ گئے۔

ہمیں گھر سے نکلے کافی وقت ہو چکا تھا۔ واصف کی کہانی میں انہماک سے سن رہا تھا۔ وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔

”برأت روانہ ہوئی۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ میں گا ہے گا ہے بیک ویو میں شائستہ کے مہتابی چہرے کو دیکھ لیتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم دلہن والوں کے ہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے برأت کا پرتپاک استقبال کیا۔ نکاح کے بعد کھانا لگ گیا۔ سب نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد دلہن کی رخصتی ہوئی۔ شام کو ہم واپس بہاولپور آ گئے۔ جب ہم گاڑی سے اترے تو شائستہ کے داماد وسیم نے مجھ سے گاڑی کے کرائے کے بارے پوچھا۔ تو میں نے کہا کہ کرایہ میں نے دے دیا ہے۔ اس نے حصہ دینا چاہا تو میں نے انکار کر دیا۔ شائستہ بھی قریب کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔

”وسیم آرمی والے بڑے دل والے ہوتے

ہیں۔ واصف حصہ نہیں لے گا۔ ویسے بھی افریقا سے کمائی کر کے آیا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ نہ صرف میرے نام سے واقف تھی بلکہ افریقا جانے کے بارے بھی جانتی تھی۔

”شکر یہ واصف۔“ وہ ہنستے بولی۔

پھر وہ تینوں گھر کے اندر چلے گئے۔ میں وہیں کھڑا ان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیٹھک میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں پہلے بھی دس بارہ مہمان بیٹھے تھے۔ عشاء کے وقت میں نے کھانا کھایا اور بستر پہ لیٹ گیا۔ میں عالم تصور میں شائستہ کو اپنے پاس دیکھتا رہا۔ اس کی دل آویز مسکراہٹ پہ قربان ہوتا رہا۔ میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ پھر نیند آنکھوں میں آئی۔

اگلے دن ولیمہ تھا۔ کافی مہمان آئے ہوئے تھے۔ دس بجے کھانا شروع ہوا۔ کچھ مہمان کھانا کھا کر رخصت ہو گئے۔ ظہر کے وقت تک بہت کم مہمان رہ گئے تھے۔ میرا ارادہ تھا صبح گھر واپس چلا جاؤں گا۔ عصر سے کچھ دیر قبل میں گھر سے باہر نکلا۔ ایک قریبی شاپ سے سگریٹ کا پیکٹ لیا اور بیٹھک میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ شبیر آ گیا۔

”یار واصف میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”خیر تو ہے نا؟“ میں نے زپر لب مسکراتے ہوئے

کہا۔

”یار خالہ شائستہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“

یکبارگی میرا دل دھڑکا۔ تاہم میں شبیر کی رہنمائی میں چل پڑا۔ گھر کا محن عبور کرنے کے بعد وہ میٹھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلتا ہوا چھت پہ پہنچ گیا۔ میری نظر شائستہ پہ پڑی۔ وہ سامنے چار پائی پہ بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس چار پائی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے فور شوک سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ ہیرے کی طرح دمک رہا تھا۔ شبیر نیچے چلا گیا تھا۔

”واصف بیٹھ جاؤ۔“

اس کی مترنم آواز ابھری۔ میں اس کے بالمقابل دوسری چار پائی پہ بیٹھ گیا۔ وہ حال چال پوچھنے کے بعد گویا ہوئی۔

”واصف میں نے جب تمہیں دیکھا۔ مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ پھر میں نے شبیر سے تمہارے بارے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟“ ذرا توقف کے بعد وہ بولی۔ ”اس نے مجھے

تمہارے متعلق بتایا۔“ میں خاموشی سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ ”میری نسوانی حس نے مجھے آگاہ کر دیا کہ تم گاہے گاہے میری طرف دیکھتے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک صاف دیکھ لی تھی۔“

میرا دل بے طرح دھڑکا۔ وہ یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں تو خود تم سے قریب ہونا چاہتی تھی۔“

اس کے اس جملے نے میرے اندر طوفان اٹھا دیئے میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے برابر میں بیٹھ کر اس کے مغموم چہرے کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اس نے بھی اپنا سر میرے کندھے سے لگا لیا۔ میرے اندر جذبات کا طوفان سا اٹھنے لگا تھا۔ میں مزید آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اس نے کہا۔ ”واصف تمہاری شکل کافی حد تک عدنان سے ملتی ہے۔ بالکل وہی چہرہ، ہیرا شکل، وہی آنکھیں، اسے پھڑے آٹھ برس ہو گئے ہیں۔“

اس کی بات سن کر میرے جذبات پر اس پڑ گئی۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ ”کیا عدنان اس کا محبوب تھا؟“

”عدنان میری زندگی تھا۔ مجھے بہت پیارا لگتا تھا۔ میری آس تھا۔“ اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی تھی۔

”شائستہ جی عدنان کون ہے؟ اور آپ بار بار تھا

کیوں کہہ رہی ہیں؟“ میں نے استفسار یہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اتری

نمی میں صاف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ سسک سسک کر رونے

لگی۔ میں غیر ارادی طور پہ اس کا شانہ تھکنے لگا۔ پھر وہ روتے

روتے بولی۔ ”واصف! عدنان میرا بڑا بیٹا تھا۔ وہ بھی آرمی

میں تھا۔ ایک سال پہلے وانا میں وطن دشمنوں سے لڑتے

ہوئے وہ شہید ہو گیا۔“

اس کی یہ بات سن کر میں اپنی نظروں میں گر گیا

تھا۔ میں نے گلو کیر لہجے میں کہا۔

”ماں جی! پلیز چپ ہو جائیں۔ آپ مجھے عدنان ہی

سمجھیں۔“

ذرا توقف کے بعد وہ بولا۔ ”میں اب بھی ان کے

ہاں ملتا جاتا ہوں۔ شائستہ کو ماں جی کہہ کر مخاطب

کرتا ہوں۔ ان کی بیٹی نسرین کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ وہ

بھی مجھے اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ اس دن فلرٹ سے تو پہ کر لی

کہ عورت صرف کھلونا نہیں، ماں اور بہن بھی ہے۔“

میرے دوست کانام صفدر انجم ہے۔ وہ محکمہ ریونیو رحیم یارخان میں ملازم ہے۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے جو اس کے قریبی دوست کے ساتھ پیش آیا۔ میں اسے آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر معیار پر پورا اترے تو سرگزشت کی قریبی اشاعت میں شامل کر دیجیے گا۔

طارق عزیز خان
(رحیم یارخان)

گاڑی کے کرائیشن کے باہر واقع فوارے کے قریب کھڑا مسافروں کی راہ تک رہا تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے سگریٹ سلگاری تھی۔ گوکہ ابھی دن ڈھلا ہی تھا تاہم سردی کی شدت اور تعطیل ہونے کی وجہ سے فوارا چوک قریب قریب ویرانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں مجھ سمیت دو موٹر سائیکل رکشے بھی موجود تھے جن میں سے ایک کا مالک غائب تھا جبکہ دوسرا اگلی سیٹ پر کبل کی بکل مارے چپ چاپ کرائیشن کے داخلی راستے کو تک رہا تھا۔ پشاور سے براستہ لاہور آنے والی عوام ایک سپریس کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بتی گودام کے راستے سے جھنگے کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے چند ایک مسافر دکھائی دیے جو گہری ہونٹوں کی دھند میں ٹرین کی اگلی لائٹ کا سراغ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موسم بتدریج سرد ہوتا جا رہا تھا اور ہوا کی کاٹ بھی برداشت سے باہر تھی۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ آج چھٹی کرلوں اور گھر جا کر ریڑ کے سامنے بیٹھ کر مزے سے ٹی وی دیکھوں۔ تاہم اسی دوران ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ٹرین کرائیشن کی حدود میں داخل ہوئی۔ میں نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سوچا کہ گھر کے قریب کی سواری ہی اٹھاؤں گا تاکہ وقت رہتے گھر پہنچ جاؤں۔ کچھ ہی دیر میں چند مسافر کرائیشن کی سیڑھیوں سے باہر آتے دکھائی دیے۔ ایک نوجوان مسافر رکشے کو دیکھتے ہی اس پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ دو تین مسافر ہاتھوں میں بیگ اٹھائے پیدل ہی ریلوے روڈ کی طرف نکل گئے۔ اب وہاں چار افراد پر مشتمل ایک فیملی تھی جن کے ساتھ کچھ دستی سامان تھا۔ خالی موٹر سائیکل رکشے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے ان لوگوں کی مرکز نگاہ میری ہی ٹیکسی تھی۔ میں نے فرنٹ ڈور کھولا اور سگریٹ کوزین پر پھینکتے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔

میرا نام ریاض احمد ہے۔ میں نے ضلع رحیم یارخان کے ایک دیہاتی علاقے میں آنکھ کھولی۔ مقامی اسکول سے میٹرک کے بعد خواجہ فرید کالج رحیم یارخان سے انٹر کیا۔ والد کے انتقال کے بعد مجھے ان کی جگہ ایک سرکاری ادارے میں ڈرائیور کی ملازمت مل گئی۔ والد صاحب کے زمانے ہی سے ہمیں ایک سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا جس میں، میں اپنی بوڑھی والدہ اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن اور بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ میری ملازمت بہت اچھی جا رہی تھی۔ تنخواہ نہ کم تھی کہ روٹی کے لالے پڑ جاتے اور نہ اتنی زیادہ کہ... سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ میں ایک ماہر ڈرائیور تھا۔ گاڑی چلانے میں میرا ہاتھ اتنا سیدھا تھا کہ اکثر و بیشتر افسران بالائے مجھے شہر سے باہر اپنے ساتھ لے جاتے۔ دوران ملازمت میں نے افسران کے سرکاری دوروں کا فائدہ اٹھا کر پنجاب کے تمام بڑے شہروں کی خوب سیاحت کی۔ اس دوران میری شادی ہو گئی۔ چھوٹے بہن بھائی اسکول سے کالج منتقل ہو چکے تھے۔ گوکہ گزارا ہو رہا تھا تاہم میں نے بیوی کے مشورے سے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی اور شام کے اوقات میں اسے ٹیکسی کی طرح کرائے پر چلانے لگا۔ میں زیادہ تر ریلوے اسٹیشن سے سواریوں کو اٹھاتا۔ میری کوشش ہوتی کہ دو چار پھیرے لگانے کے بعد رات دس بجے سے پہلے پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ سواری میرے آجانے کے بعد چھٹی کے دن گھروالوں کو بھی سیر و تفریح کے لیے جانا میرا معمول تھا۔ زندگی اچھی بسر ہو رہی تھی۔ یہ 1995ء کی سردیوں کا ذکر ہے۔ تمام گھروالے چند دن کے لیے آبائی گاؤں گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں میرا معمول تھا کہ میں ڈیوٹی سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا پھر اپنے لیے کھانا بناتا اور مغرب سے کچھ پہلے گاڑی لے کر اسٹیشن کی طرف نکل جاتا۔ یہ جنوری کا آخری جمعہ تھا۔ میں غروب آفتاب کے بعد

ایک ڈیرہ پر جانا تھا۔ جمال دین والی تک رسائی کے لیے پکی سڑک موجود ہے۔ اس وقت سات بجے کا وقت تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں جلد بازی نہ بھی کروں تو انہیں ان کی منزل تک چھوڑنے کے بعد میں دس بجے سے پہلے واپس اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ یوں کل ملا کر مجھے نمن سے چار گھنٹے کا سفر درپیش تھا۔ تاہم سچ بات یہ ہے کہ میں اتنے طویل سفر کے موڈ میں نہیں تھا۔ سردی اپنے جوہن پر تھی اور مجھ پرستی غالب آچکی تھی۔ مرد نے مجھے گوگولی کیفیت میں دیکھ کر دگنا کرایہ ادا کرنے کی پیشکش کی۔

”بات کرائے کی نہیں ہے سر..... دراصل میں.....“
 ”اگر تم چاہو تو رات وہیں ڈیرے پر ہی گزار سکتے ہو۔“ مرد نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”دیکھو بیٹا ہم یہاں اجنبی ہیں اور کسی ضروری کام سے آئے ہیں۔“ خاتون نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ ”ہم ایسے موسم اور رات میں ہر کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر ان کے سامان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ لوگ ٹیکسی کے قریب پہنچے تو میں نے سائینڈ ڈور کھول دیا۔ خاتون دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔ میں نے مرد کے ساتھ مل کر سامان

”جی سر، سواری چاہیے؟“ میں نے مہذب انداز میں فیملی کے مرد کو مخاطب کیا۔ وہ پینٹ کوٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر اسمارٹ شخص تھا۔ میں نے اندازہ لگایا جو بعد میں درست نکلا کہ خاتون اس کی بیوی اور ساتھ میں دو لڑکیاں اس کی بیٹیاں تھیں۔ وہ لوگ اپنے حلیے سے پڑھے لکھے معزز گھرانے کے لگ رہے تھے۔ باوقار سی خاتون نے گہرے رنگ کی موٹی شال پہن رکھی تھی جبکہ دونوں لڑکیوں نے شلوار تیس پر جینز کی جیکٹس اوڑھ رکھی تھیں انہوں سر کو مفلر سے ایسے ڈھانپا ہوا تھا کہ ان کے چہرے واضح تھے۔ ایک لڑکی چھوٹی عمر کی تھی جبکہ دوسری کی عمر کا اندازہ اٹھارہ سے بیس کے درمیان تھا۔ دونوں بہنیں بے پروائی سے چیونگ چباتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”نوجوان، کیا یہ ٹیکسی تمہاری ہے؟“ مرد مسافر نے بلند آواز سے پوچھا۔

”جی سر حکم کریں، کہاں جانا ہے آپ کو؟“

”بھئی بات یہ ہے کہ ہمیں شہر سے کچھ دور جانا ہے۔“ مرد نے بتایا کہ ان کی منزل رحیم یار خان شہر سے 35 کلومیٹر مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے واقع قصبہ جمال دین والی تھا۔ انہیں قصبے سے کچھ پہلے مین سڑک پر واقع



پچھلے حصے میں رکھا۔ نائروں کی ہوا چپک کی، اس دوران مرد فرنٹ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور اللہ کا نام لے کر گاڑی گیسٹر میں ڈال دی۔

ہم لوگ شاہی روڈ سے ہوتے ہوئے چوک پائی پاس پر پہنچے جہاں سے میں نے نائروں میں ہوا چپک کروائی اور نزدیکی پمپ سے پیٹرول بھر وایا۔ اب ہم شہر سے باہر جانے والے راستے شہباز پور روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ اس دوران میں زیادہ تر خاموش رہا جبکہ وہ لوگ گاہے بگاہے آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ کوا کولا فیکٹری سے کچھ آگے پہنچے تو مرد نے اپنے پیروں میں موجود بیگ کو ٹٹولا اور اچانک ایک ریو اور نکال کر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا۔ میں نے چونک کر مرد کی طرف دیکھا تو وہ بے پروائی سے بولا کہ رات کا وقت اور راستہ سنسان ہے اس لیے اس نے یہ اسلحہ ہم سب کی حفاظت کی غرض سے نکالا ہے۔ بات اس کی ٹھیک ہی تھی تاہم میں کچھ شینا گیا اور میرے دماغ میں عجیب عجیب خیال گردش کرنے لگے۔ کیا یہ لوگ مجھے لوٹ کر گاڑی چھین لینے کی فکر میں تھے؟ میں نے فوری طور پر اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ پڑھے لکھے خوشحال گھرانے کے معزز لوگ تھے اور انہیں خاص طور پر مجھے لوٹنے کے لیے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے کچھ پریشان دیکھ کر مرد نے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے اپنا نام عارف بتایا اور انکشاف کیا کہ وہ پاک آرمی کا ریٹائرڈ کرنل ہے۔ اس کا.... تعلق لاہور سے ہے اور آرمی کی طرف سے اسے جمال دین والی کے قریب زرعی زمین الاٹ ہوئی تھی۔

کرنل عارف نے کہا۔ ”ہم لوگ چاہتے تو اپنی گاڑی سے بائی روڈ سفر کر سکتے تھے لیکن میرے بیچے ٹرین کا سفر کرنا چاہتے تھے۔“

کرنل نے مجھ سے صرف میرا نام پوچھا جو میں نے بتا دیا۔ اس دوران ہم لوگ چوک بہادر پور کر اس کے جمال دین والی روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی کرنل کی بیوی اور چھوٹی بیٹی سیٹ سے فیک لگا کر آرام کر رہی تھیں جبکہ عین میری سیٹ کے عقب میں بیٹھی بڑی لڑکی متواتر چیونگم سے مشغول کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے کو تک رہی تھی۔ اس کے انداز میں بے پروائی تھی۔ اب تک کے سفر کے دوران میں نے ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں سنا تھا۔ کرنل صاحب مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے بھی سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ آخری راتوں کا کمزور سا چاند ماحول کو روشن کرنے میں ناکام دکھائی دیتا تھا۔ گاڑی کی

ہیڈلائٹس میں تاحید نظر سیاہ تارکول کی سنگل سڑک دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب گندم کے کھیت تھے۔ دن کے وقت جمال دین والی روڈ پر خاصا ٹریفک ہوتا ہے تاہم اس وقت سردی اور تاریکی کی وجہ سے روڈ سنسان دکھائی دے رہی تھی۔ اب تک کے سفر کے دوران ہم نے گنے سے لدی دو تین ٹریلیوں کو ہی اور فیک کیا تھا، جن کی منزل جمال دین والی شوگر مل تھی۔ ابھی ہم جمال دین والی سے قریب بیس کلومیٹر دور ہوں گے کہ ایک انہونی ہوگئی۔ اچانک تیز سیٹی کی آواز کے ساتھ گاڑی کا اگلا بائیں جانب کا ٹائر پتھر ہو گیا۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا تاہم اس سے پہلے کہ وہ بے قابو ہوتی میں نے مہارت کے ساتھ اسے سڑک کنارے روک لیا۔

”کیا ہوا ڈیڈی؟“ کرنل کی چھوٹی بیٹی نے چونک کر باپ سے پوچھا۔ اس دوران اس کی ماں اور بڑی بہن بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

”کچھ نہیں، بس تمہارے ٹرین کے سفر کا پہلا ایڈ ونچر ہو چکا ہے۔“ کرنل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میری طرف دیکھا۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا اور نیچے اتر کر ٹائر چیک کیا جس کا گرم ہوا خالی ہونے کی وجہ سے زمین سے لگا ہوا تھا۔ میں گھوم کر پچھلے حصے کی طرف آیا جہاں ایکسٹرا ٹائر موجود تھا۔ ڈکی کھولنے پر ایک تنی پریشانی نے مجھے گھیر لیا۔ بد قسمتی سے ایکسٹرا ٹائر گاڑی میں موجود تو تھا لیکن وہ بھی پتھر تھا۔ حالانکہ کل شام ہی کو میں نے ٹول بکس کے ساتھ اسے اچھی طرح چیک کر کے وہاں رکھا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔

”کیا ہوا؟“ کرنل نے جو میرے ساتھ ہی نیچے اتر آیا تھا، پوچھا۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے بتایا کہ ہم کن حالات سے دوچار ہو چکے تھے۔ میری بات سن کر وہ بھی پریشان دکھائی دینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ریو اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

”آپ فکر نہ کریں سر، یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وہ سامنے روشنی دیکھ رہے ہیں آپ؟“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہاں سڑک کے کنارے چند ایک دکانیں موجود ہیں اور یعنی طور پر وہاں پتھر کی دکان بھی ہوگی۔ ”میں وہاں جا کر پتھر لگوا آتا ہوں۔“ ”میرا خیال ہے دکان زیادہ دور نہیں ہے، میں بچوں کے ساتھ رکتا ہوں تم جاؤ اور جلدی واپس آؤ۔“ کرنل نے

تھکمانہ لہجے میں کہا۔

”پتا نہیں..... شاید مجھ سے ڈرتے ہوں۔“ شاہدہ نے عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر اگلے ہی لمحے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میں چلتے ہوئے ہولے ہولے کپکپا رہا تھا تاہم وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر سردی کا ذرا بھی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی رفتار بھی تیز تھی مجھے اس کا ساتھ دینے کے لیے دوڑنا پڑ رہا تھا۔ اس نے اپنا مظاہر اتار دیا اور وہ مجھے بولنے کا موقع دے بغیر ہی اپنی بنائی تصویروں کے بارے میں بتانے لگی۔ اس نے کہا کہ وہ اکیلی ڈرائیو کرتی ہوئی شہر سے باہر نکل جاتی ہے اور مظاہر فطرت کے ہر نئے انداز کو کبیرے میں قید کرتی۔

ہم باتیں کرتے کرتے سڑک کنارے بنی دو دکانوں کے باہر پہنچ گئے جو اس وقت بند تھیں۔ دکانوں کے سامنے ایک کچا چھپر تھا جبکہ سائیڈ میں ایک گھر کا بند دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر زور زور سے دروازہ بجایا۔ اندر سے کھانسنے کی آواز آئی اور کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا۔ ہاتھ میں لائٹین اٹھائے ایک بوڑھا باہر نکلا۔ دونوں دکانیں اور گھر اسی کا تھا۔ اس نے ہمیں انتظار کرنے کو کہا اور اندر کی طرف سے جا کر دکان کھول دی۔ ہم دونوں دکان کے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے پچھلے لگانے سے پہلے اندر سے ایک انگریزی لاکر دکان میں رکھ دی اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ”میں نے چائے کا کھد دیا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں میں ابھی پچھلے لگانے دیتا ہوں۔“

”اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اندر جا کے خود چائے بناؤں؟“ شاہدہ نے بوڑھے سے پوچھا۔

”ہاں بیٹی کیوں نہیں، آؤ میرے ساتھ۔“ اس سے پہلے کہ میں کوئی تبصرہ کرتا وہ بوڑھے کے ساتھ اندرونی دروازے کے اندر جا چکی تھی۔ مجھے شاہدہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ ماڈرن زمانے کی شہری لڑکی تھی۔ اگر اندر کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو اس کا باپ مجھے گولی مار دیتا۔ میں بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی میں اسے آواز دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ بوڑھا دکاندار واپس آ گیا۔

”شہر کی تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔“ بوڑھے نے پچھلے لگانے کا سامان سیٹ کرتے ہوئے بتایا۔ باورچی خانے میں میری بیوی کے ساتھ ایسے کھل مل گئی ہے جیسے برسوں سے اسے جانتی ہو۔ میں نے بوڑھے کی بات سنی ان سنی کر دی اور بے چینی سے اندرونی دروازے کو کھینکے لگا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گو کہ وقت زیادہ نہیں ہوا تھا تاہم پتا نہیں کیوں مجھے

کرتل کی بات پوری ہوتے ہی میں نے ڈکی سے ایکسٹرا ٹائر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس دوران کرتل ریوالور تھا سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے جلدی واپس آنے کی تاکید کی۔ میں نے ایک نظر پچھلی سیٹ پر ڈالی جہاں بیٹھے تینوں افراد سیٹ سے سر نکائے خاموش تھے۔ میں نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہی رہنے دیں اور ٹائر ہاتھ میں پکڑ کر وقت ضائع کیے بغیر سامنے کی طرف چل پڑا۔

”میری بات سنئے۔“

میں ایک دم ٹھنک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں کرتل کی بڑی بیٹی مجھے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ ”اگر برانہ مانیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بولی۔

”میں نے ڈیڈی سے اجازت لے لی ہے۔ ویسے بھی یہاں بیٹھی بور ہوتی رہوں گی۔“

”یہاں کھلے میں ٹھنڈ بہت ہے۔“ میں نے پیچھے گاڑی کی طرف دیکھا جو مجھ سے قریب بیس گز دور ہوگی۔ تاہم کچھ دور ہونے کی وجہ سے میں اندر کا منظر نہیں دیکھ سکا۔

”لاہور سے زیادہ تو نہیں ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور منہ میں موجود چوگلم سائیڈ میں اچھال دی۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے گاڑی میں خاموش بیٹھی لڑکی کی زبان کو جیسے پر لگ گئے۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے مسلسل باتیں کرنے لگی۔ اس نے اپنا نام شاہدہ بتایا اور کہا کہ وہ اپنے والد کی ملازمت کے دوران ملک کے تمام اہم علاقوں کی سیاحت کر چکی ہے۔ اس نے بی اے آنرز کیا ہوا تھا اور اسے فوٹو گرافی کا شوق تھا۔

باہر بلا کی سرد ہوا چل رہی تھی اور ہر سو دھند اور ویرانی کا راج تھا۔ دور تک جاتی سڑک خالی دکھائی دے رہی تھی۔ قریب کے کھیتوں سے بھی کبھار آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ میں نے سڑک کنارے پڑا لکڑی کا ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

”کتے ہمارے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔“ شاہدہ نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ میں نے ہنس کر کہا ”کیا وہ ہمیں جانتے ہیں؟“

خواہ مخواہ گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ خیر سب کچھ ٹھیک رہا اور کچھ ہی دیر میں شاہدہ ہاتھ میں چائے کے دو کپ اٹھائے دکان میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی خاتون بھی تھی۔ شاہدہ نے کپ میری طرف بڑھایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو گئیں۔ ایک سرد لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ اس کی انگلیاں برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی تھیں۔ شاید سردی کا اثر تھا۔ میں نے سگریٹ کی تلاش میں جیب پر ہاتھ مارا لیکن یاد آیا وہ تو میں گاڑی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ چائے پینے کے دوران شاہدہ نے حسب سابق اپنی باتیں جاری رکھیں۔ اس دوران بوڑھے دکاندار نے پیچھے لگا دیا۔ اس نے ہوا بھری اور ٹائر کو اچھی طرح چیک کر کے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی بیوی نے پیسے لینے سے صاف منع کر دیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ شاہدہ اور میں اس کے بچوں جیسے ہیں اور وہ ہم سے کسی صورت پیسے نہیں لے گی۔ بوڑھے نے بھی بیوی کی تائید کی۔ خیر میں نے ٹائر اٹھایا اور شاہدہ کو چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں میاں بیوی نے خالص دیہاتی انداز میں ہمیں دعائیں دیں اور ہم رخصت ہو کر واپس سڑک پر پہنچ گئے۔

”آپ کو گھر کے اندر نہیں جانا چاہیے تھا۔ مجھے فکر ہو رہی تھی۔“ میں نے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”بے چارے سیدھے سادے دیہاتی لوگ تھے بھلا ان سے مجھے کیا پریشانی ہو سکتی تھی؟“ شاہدہ کے لہجے میں حیرانی تھی۔ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ایک بار پھر اپنے ہارے میں بتانے لگی۔

”دراصل ہم تین بہنیں ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”اچھا، تو آپ کی تیسری بہن ساتھ نہیں آئیں؟“ میں نے سوچا شاید وہ شادی شدہ تھی اور لاہور میں اپنے گھر تھی۔

”آپ نے انٹر سے آگے کیوں نہیں پڑھا؟“ شاہدہ نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے التامجھ سے سوال کر دیا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چلتے چلتے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے آپ سے اپنی تعلیم کے بارے تو کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“

”اب کہیں گے کہ مجھے یہ کیسے پتا چلا کہ آپ ایک سرکاری محکمے میں پچھلے سات سال سے ڈرائیور کی نوکری کر رہے ہیں؟“

شاہدہ کی اس بات سے میں گڑبڑا گیا اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے اپنی تعلیم یا ملازمت کے بارے میں اس سے کوئی ذکر تک نہیں کیا تھا..... لیکن شاید..... ہو سکتا ہے میں نے گاڑی میں اس کے باپ سے ذکر کیا ہو۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ایک اور ہم پھوڑ دیا۔

”آج کل آپ گھر میں تنہا رہ رہے ہیں۔“

میں چلتے چلتے رک گیا اور قدرے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں اسے کیا کہوں۔ یہ لڑکی میرا دماغ خراب کیے دے رہی تھی۔ کہاں تو میں اس کے ساتھ چلنے پر خوش تھا اور اب یہ حال تھا کہ میں چاہتا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ بولے اور ہم جلد از جلد گاڑی تک پہنچ جائیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ شاہدہ نے مجھے تسلی دی۔

”دراصل میں چہرے پڑھ کر اندازہ لگا لیتی ہوں۔“

”بہت اچھا.....“ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”تو پھر چہرہ دیکھ کر بتائیں میرے پاس کتنے سگریٹ باقی ہیں؟“

”کوئی بھی نہیں۔“ جواب دیتے ہی وہ کھلا کھلا کر ہنس پڑی۔

”آپ کا پیکٹ ایک دم خالی ہے۔“

میں بھی مسکرا دیا۔ میں نے خود کو پرسکون محسوس کیا۔ اس کا اندازہ بیکسر غلط تھا میرے پاس پیکٹ میں ابھی بھی دو سگریٹ باقی تھے۔ میں خواہ مخواہ ہی اس کی باتوں سے پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ چہرہ پڑھنے والی بات بکواس تھی اور وہ مجھے تنگ کر رہی تھی۔ یقینی طور پر میں نے اپنے ہارے میں اس کی بتائی ہوئی باتوں کا ذکر اس کے باپ سے کیا تھا۔

اب ہم گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ کرنل صاحب ریوالور تھا مے گاڑی سے باہر کھڑے تھے اور ہماری ہی جانب دیکھ رہے تھے۔

اس دوران شاہدہ نے میرے کان کے عین قریب آ کر گہری ٹھنڈی سانس لی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں اٹنے قدموں پیچھے گھوم گیا۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں چکرا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ کرنل سے مجھے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ لیا وہ لپک کر میرے قریب پہنچا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟“

”وہ سر، آپ کی.....“ میں ہکلا کر رہ گیا۔ ”میں ٹھیک ہوں سر۔“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر آنکھیں

پھاڑ کر ادھر ادھر اندھیرے میں گھور ا۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ میں گاڑی کے قریب پہنچا تو میرے رہے رہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ٹائر میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ شاہدہ اپنی چھوٹی بہن اور ماں کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر براجمان تھی۔ بالکل اسی طرح، اسی حالت میں جیسے میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ سے سر نکالے آرام سے چیونگ چبا رہی تھی۔ موسم سرد ہونے کے باوجود میں پسینے میں نہا گیا۔ کرنل کی بیوی نے میری حالت کے پیش نظر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بوتل سے پانی کا ایک گلاس بھرا اور کھڑکی سے ہاتھ نکال کر شوہر کی طرف بڑھا دیا جو اس نے مجھے تھما دیا۔ میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور متوحش ہو کر چور نظروں سے شاہدہ کی طرف دیکھا۔ وہی بے پروائی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں واضح اجنبیت دکھائی دی۔ لگتا تھا اسے میری طبیعت کی بھی کوئی فکر لاحق نہیں تھی۔ یہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ کیا ہوا میں اڑ کر یہ کیا ماجرا ہے؟ یا اللہ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ان گنت سوچیں میرے دماغ میں در آئیں۔ میرا سر چکرانے لگا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا۔ کرنل مسلسل پوچھتا رہا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ تاہم میں ٹال گیا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر ٹائر تبدیل کیے۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے ٹول بکس ڈکی میں رکھا اور دل سے اپنی سلامتی کی دعا کی۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ سفر ختم ہو جائے۔ کرنل نے میری حالت کے پیش نظر آفر کی کہ میں آرام کروں باقی کے راستے وہ گاڑی چلائے گا۔

”نہیں سر میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی اور فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گیا۔ انجن کو گیس میں ڈالا اور ہم آگے بڑھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر چور نظروں سے اوپر لگے شیشے کی طرف دیکھا۔ وہی بیگانگی انداز۔ نہ جانے وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے کم از کم آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت میرے ساتھ گزارا تھا اور اب یوں بیٹھی تھی جیسے مجھے جانتی ہی نہ ہو۔ سوال یہ تھا کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو کر گاڑی تک کیسے پہنچ گئی؟ ایک اور بریشانی کی بات یہ تھی کہ کرنل نے میرے ساتھ جانے سے متعلق بیٹی سے کوئی بات چیت نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس کے ساتھ گزارا اب تک کا تمام وقت میرا وہم تھا۔ لیکن۔ یہ وہم بھی کتنا حقیقی تھا کہ پچھلے آدھے گھنٹے کی مصروفیت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ مجھے یاد تھی۔ سوالوں کی برسات میرے دماغ کو چکرائے

دے رہی تھی۔ یہ کوئی بھوت ہے یا چھلاوا جو میری نظروں سے اوجھل ہو کر گاڑی تک پہنچ گئی۔ مجھے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ گوکہ میں گاڑی کے اندر سوار یوں کے ہوتے ہوئے بھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ تاہم میں نے غیر ارادی طور پر ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھالی۔

”بھئی معاف کرنا۔ ویسے تو میں بھی کبھار ہی سگریٹ پیتا ہوں لیکن یہاں اس ویرانے میں مجھ سے رہا نہیں گیا۔“ کرنل نے خوش دلی سے اطلاع دی کہ اس نے میری بچائی ہوئی دونوں سگریٹس پھونک ڈالی تھیں۔ ایئر ٹیک میرے ہاتھوں میں لرز کر رہ گیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ کچھ دیر پہلے اس کی بیٹی یہ اطلاع مجھے دے چکی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے ماتھے پر آیا پسینا صاف کیا۔

میری سیٹ کے عین پیچھے شاہدہ براجمان تھی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے میرے لیے گاڑی چلانا مشکل ہو گیا۔ میں نے کرنل سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو باقی کے راستے وہ ڈرائیونگ کریں۔

”میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ کرنل اپنی طرف کا دروازہ کھول کر میری سائیڈ کی طرف بڑھا۔ ”شاید سردی کا اثر ہے، تم یہاں بیٹھ کر آرام کرو۔“

شاہدہ کی کہی چوتھی بات بھی درست تھی۔ لیکن شاید اس کی ہر بات سچ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے پچھروالے میاں بیوی سے ان کی اولاد کے نہ ہونے کا ذکر بھی کیا تھا۔ دونوں میاں بیوی نے حیرانی ظاہر کی تو شاہدہ بات گول کر گئی تھی۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ میں نے اپنی نظریں سامنے گڑا لیں۔ کرنل مجھ سے کوئی بات کر رہا تھا لیکن میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ میرے اندر اس کی بیٹی تو کجا خود اس کی طرف بھی دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ خدا خدا کر کے ہم منزل کے قریب پہنچ گئے۔ یہ جمال دین والی سے چند کلومیٹر پہلے سڑک کے کنارے واقع ایک ڈیرہ تھا۔ وہاں مرکزی گیٹ پر کچھ لوگ موجود تھے۔ شاید انھیں کرنل کے آنے کی اطلاع پہلے ہی سے تھی۔ انھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ خواتین اندر زانے میں چلی گئیں جبکہ میں اور کرنل اپنے میزبان کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ کرنل نے میری حالت کے بارے میں اپنے میزبان کو بتایا جس نے مجھے رات وہیں گزارنے کی پیشکش کی۔ سچ یہ ہے کہ میرا فوری واپسی کا نہ تو ارادہ تھا اور نہ ہی ایسی حالت کہ میں رات کے وقت اسی راستے پر ڈرائیو کرتا۔ کرنل کے میزبان نے مجھے بیٹھک سے ملحقہ ایک کمرے میں پہنچا دیا

اور آرام کرنے کا کہا۔ وہ رات میری زندگی کی خوفناک ترین رات تھی۔ جب بھی آنکھ لگتی میں خواب میں شاہدہ ہی کو دیکھتا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ سوتے جاگتے کروٹیں بدلتے جیسے تیسے رات گزر ہی گئی۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد کزن نے مجھ سے طبیعت کا پوچھا۔

”سر اگر آپ غلط نہ سمجھیں تو ایک بات پوچھوں؟“ میں نے خود پر بہت جبر کیا لیکن میں پوچھ ہی بیٹھا کہ کیا وہ گلبرگ میں رہتے تھے؟ میری بات سن کر کزن حیران رہ گیا۔ اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ مجھے گھورا اور پوچھا کہ یہ بات مجھے کیسے معلوم ہوئی؟ گویا وہ واقعی گلبرگ ہی کا رہائشی تھا۔

میں نے کچھ ہنسی کھاتے ہوئے رات پیش آنے والا پورا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔ اس دوران وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا میری بات سنتا رہا۔ میں نے اپنی بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

”سر کیا آپ ٹھیک ہیں؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں“ کزن عارف نے ایک طویل گہرا سانس لے کر سر اٹھایا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ پھر اس نے انکشاف کیا کہ شاہدہ میری بیٹی تھی جو تین سال پہلے ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو چکی ہے۔ ”وہ میری زاہدہ کی جڑواں تھی۔“ کزن کا اشارہ اپنی بڑی بیٹی کی طرف تھا۔ اس نے میری ہر بات کی تصدیق کی جو شاہدہ مجھ سے کر چکی تھی۔ اب میرے پاس کہنے سننے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اس عجیب و غریب واقعے کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے اس سے جانے کی اجازت مانگی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور ہم ساتھ ساتھ چلتے باہر نکل آئے۔ مجھے کزن سے دلی ہمدردی تھی لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا دماغ ابھی بھی رات کے واقعات میں الجھا ہوا تھا۔ میں پوری طرح نارمل نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر فوری طور پر گھر پہنچ جاؤں۔ میں نے کزن سے ہاتھ ملایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی اشارت کر کے میں اسے مین گیٹ سے نکال کر سڑک پر لایا اور آخری پارمز کر ڈرے کے مرکزی گیٹ کی طرف دیکھا۔ یونہی میری نظر اوپر اٹھ گئی۔ اوہ میرے خدا۔ میری سٹی لم ہو گئی۔ قریب کی چھت پر کھڑی شاہدہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میرے دماغ میں آندھیاں ہی چلنے لگیں۔ نکل پورے سفر کے دوران زاہدہ نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر میری

طرف نہیں دیکھا تھا۔ یقینی طور وہاں شاہدہ ہی تھی۔ میں نے ایک سیلیٹر پر پورا وزن ڈال دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میں اس آسپہی ماحول سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ پتھر والی دکانوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ رک کر بوڑھے میاں بیوی سے حال احوال کر لوں۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھ میں ہمت نہیں ہوئی۔ میں جیسے تیسے شہر واپس پہنچا اور جاتے ہی گھر والوں کو فون کیا۔ میں نے انھیں جلد واپس آنے کی تاکید کی۔ اگلے ایک ہفتے تک میں بخار میں پھنکتا رہا۔ یہاں تک میرا قریبی دوست صفدر انجم مجھ سے ملنے آیا۔ وہ پہلا بندہ تھا جسے میں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات بتائے۔

☆☆☆

قارئین کرام، آپ نے یہاں تک کہ تمام حالات ریاض احمد کی زبانی سنے۔ اب آگے کے مختصر حالات میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے ریاض سے پورا واقعہ سننے کے بعد اسے تسلی دی اور مستقبل میں محتاط ڈرائیونگ کا مشورہ دیا۔ آنے والے دنوں میں ریاض کے ساتھ کچھ غیر معمولی واقعات پیش آنے لگے۔ زیادہ تر واقعات گاڑی چلاتے ہوئے ہی ہوئے۔ دراصل اسے کچھ نا دیدہ لوگ دکھائی دینے لگے تھے۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والے کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ خالی سڑک کے درمیان بریک لگا دیتا۔ پوچھنے پر بتاتا کہ کوئی سڑک پار کر رہا تھا۔ اس لیے اسے رکتا پڑا۔ کئی بار تو لوگوں نے اسے خالی گاڑی کے ساتھ دور دراز علاقوں کے چکر لگاتے پایا۔ وہ واپسی میں بتاتا کہ وہ کسی مسافر کو لے کر فلاں فلاں جگہ چھوڑ کر آیا ہے۔ اگر کوئی اسے جھوٹا کہتا تو وہ مسافر سے ملنے والی رقم نکال کر دکھاتا۔ ان دنوں اس کی ڈرائیونگ کی آمدنی غیر معمولی حد تک بڑھ چکی تھی۔ یہ ریاض کے پیش آنے والے واقعے کے چھ یا سات ماہ بعد کی بات ہے کہ ایک اتوار کے دن اس کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا۔ موقع پر موجود لوگوں نے بتایا کہ حادثہ ریاض کی غلطی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ اس نے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اچانک ہی بریک لگا دی اور پیچھے سے آنے والے ٹرک نے اسے پھل ڈالا۔ قارئین، ریاض کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی آپ جو بھی توجیح پیش کریں، بس میری ایک درخواست ہے کہ میرے دوست کے لیے دعاء کریں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ آمین۔

کالا علم

محترم و مکرم معراج رسول
سلامتی

بعض باتیں مخفی ہیں۔ ان کا علم ہر ایک کو نہیں ہوتا۔ زیرِ نظر واقعہ میرا اپنا ہے اس لیے میں صداقت کی قسم کھا سکتی ہوں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا کیا یہ کالا علم تھا اس پر مجھے آج بھی شبہ ہے اور میں لاکھ کوشش کے بعد بھی سمجھ نہیں پائی ہوں۔

سائبرہ
(کراچی)



قربان کر بیٹھتی ہیں۔ مجھے ان بد عقیدہ لوگوں پر خاص طور پر عورتوں پر غصہ بھی آتا تھا اور ترس بھی۔
اس دن بھی میں اخبار میں ایک ایسی ہی خبر پڑھ رہی تھی۔ ایک پیر صاحب جو خود کو ڈبل شاہ کہتے تھے، وہ لوگوں

آئے دن ڈبا بیروں، جعلی عالموں اور نو سر باز بیروں کے واقعات میں پڑھتی تھی اور حیران ہوتی تھی کہ اکیسویں صدی میں بھی لوگ اس قسم کی جہالت پر یقین رکھتے ہیں، عورتیں نہ صرف اپنی جمع پونجی، زیورات حتیٰ کہ آبرو تک

کے لاکھوں روپے ہڑپ کر کے سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ رقم کو اپنی کرامت سے دگنا کر دیتے تھے۔ یعنی سو روپے لے کر انہیں دو سو روپے میں تبدیل کر دیتے تھے، اسی خاصیت سے انہیں ڈبل شاہ کہا جاتا تھا۔

بیر صاحب نے ابتدائی چند ماہ میں تو اپنی ہاتھ کی صنائی سے لوگوں کی رقم ڈبل کی۔ کسی کے پانچ سو کو ایک ہزار میں تبدیل کر دیا، کسی کے دس ہزار کو بیس ہزار بنا دیے۔ ان کی اس کرامت پر لوگوں کے بالخصوص عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ بات ہزاروں سے شروع ہو کر لاکھوں تک پہنچی تو بیر صاحب حلقے اور مراقبے کے بہانے رقم دگنی کرنے میں ایک دن کا وقفہ کرنے لگے۔ یعنی آج رقم دو، پرسوں دگنے پیسے لے جاؤ۔

ایک دن اچانک وہ لوگوں کے لاکھوں روپے لے کر غائب ہو گئے۔ کچھ لوگ پولیس کے پاس پہنچ گئے۔ وہ لوگوں کا تقریباً دو کروڑ روپے لے کر فرار ہو گئے تھے۔ میرے چہرے پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”کیوں ہنس رہی ہو سارہ؟“ امی نے پوچھا۔ میں نے امی کو ان ڈبل شاہ صاحب کی کرامت کے بارے میں بتایا تو امی بھی ہنسنے لگیں، پھر بولیں۔ ”اچھا ہنسا چھوڑو، ذرا گھر کی صفائی کر لو اور شام کو ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہن لیتا۔“

”کیوں امی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”بیٹا، کچھ لوگ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔“ امی نے کہا۔

”امی، آپ بھی کمال کرتی ہیں، ابھی تو میں نے صرف اٹھ کر لیا ہے، بی اے کا داخلہ فارم جمع کرایا ہے اور آپ.....“

”بیٹا، گھر اتنا بہت اچھا ہے۔ لڑکا انجینئر ہے اور لوگ انتہائی شریف ہیں۔ اچھے رشتے بار بار نہیں ملتے۔“ امی نے کہا۔

شام کو ابو آئے تو انہوں نے بھی امی کی بات کی تائید کی۔ میں نے سوچا، اب تو مجھے یہ گھر چھوڑنا ہی پڑے گا۔ جب ابو بھی امی کے ہمنا ہو گئے ہیں تو پھر کچھ کہنا سننا فضول تھا۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔ ابو ایک بڑے بینک میں بہت اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔

شام کو باوقاری ایک خاتون کے ساتھ دو جوان اور خوب صورت عورتیں اور وجیہہ سب ایک نوجوان آ گیا۔ میں اس وقت چکن میں تھی، امی نے مجھے بتایا کہ عرفان اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ آ گیا ہے۔ چائے ذرا سلیقے سے لے کر آنا۔

میں چائے لے کر گئی تو تینوں خواتین کے ساتھ عرفان کی پُرشوق نظریں بھی میری طرف اٹھ گئیں۔

میں نے سلیقے سے چائے اور دوسرے لوازمات ان کے سامنے رکھے، اور امی کے اشارے پر ایک طرف بیٹھ گئی۔ مجھے عرفان اچھے لگے تھے۔ کسرتی جسم، دراز قامت اور گندی رنگ کے مالک۔ ان کی بڑی بڑی روٹن آنکھوں میں ذہانت تھی۔

امی نے مجھے بتایا۔ ”یہ عرفان کی امی ہیں۔“ ان کا اشارہ ایک باوقار خاتون کی طرف تھا۔ ”یہ عرفان کی پھوپھی ہیں۔“ انہوں نے ایک جوان اور خوب صورت خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ عرفان کی بڑی بہن ہیں۔“ ان کا اشارہ دوسری خاتون کی طرف تھا۔

تینوں خواتین ہی مجھے پُرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”آئی، آپ نے میرے بارے میں نہیں بتایا۔“ ایک بچی کی آواز آئی۔ مہمانوں کے ساتھ آئی ہوئی اس بچی کو سبھی نے نظر انداز کر رکھا تھا۔ وہ بہت پیاری سی سرخ و سفید، گول مثل بچی تھی۔ اپنے براؤن بالوں اور بھوری آنکھوں سے وہ مجھے بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔ ”میں شائلہ ہوں، عرفان بھائی کی کزن۔“ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔

”ارے بھئی۔“ امی ہنس کر بولیں۔ ”میں تو بالکل بھول ہی گئی تھی۔“ پھر وہ بولیں۔ ”سارہ، یہ شائلہ ہے، عرفان کے رشتے کی پھوپھی زاد بہن کی بیٹی۔“

بچی اٹھ کر میرے پاس آگئی اور بولی۔ ”فرزانہ باجی کہہ رہی تھیں کہ ہم بھابی ڈھونڈنے جا رہے ہیں، آپ میری بھابی ہیں؟“

اس کی بات سن کر میں نے نظریں جھکا لیں، پھر سب کے بے اختیار ہنسنے پر مجھے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

وہ لوگ میرے پورے خاص میں رہتے تھے لیکن عرفان اپنی جاب کی وجہ سے لاہور میں تھے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔

تھیں کہ دلہن، مجھے پوتا چاہیے۔ میں کب سے اس آس میں زندہ ہوں۔

”اباں یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔“ عرفان ہنس کر کہتے ”اب پوتی یا پوتا سا رزہ کے ہاتھ میں تو نہیں ہے نا۔“

”میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی بیٹا۔“ میری ساس نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو پوتا ہی ہوگا۔“

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔“ میری بجائے عرفان نے جواب دیا اور میں مسکرانے لگی۔

پھر میری ساس کی دعائیں رائیگاں چلی گئیں۔ میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو جنم دیا۔ میری ساس صاحبہ نے کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بس نیم دلی سے پوتی کی تعریف کی۔ شین اتنی خوب صورت تھی کہ جو دیکھتا تھا اس کی تعریف کرتا تھا۔ شین کی پیدائش پر امی اور ابو بھی کراچی سے آگئے تھے اور عرفان کی پھوپھو، فرزاندہ اور شائلہ بھی آئی تھیں۔ امی اور ابو بہت خوش تھے۔

سب لوگ چند دن لاہور میں رہ کر کراچی واپس چلے گئے۔ بس شائلہ رہ گئی۔ اس کے اسکول کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ وہ یوں بھی عرفان کی لاڈلی تھی۔

پھر وقت تیزی سے گزر گیا۔ شین تین سال کی ہوئی تھی کہ میں ایک دفعہ پھر امید سے تھی۔ میں نے عرفان کو یہ خبر سنائی تو وہ مجھوم اٹھے اور اپنی ماں کے لہجے میں بولے۔

”دلہن، اس دفعہ تو مجھے ہر حال میں پوتا چاہیے۔“ وہ اپنی بات کہہ کر خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے تو میں بولی۔

”اباں تو یوں کہتی ہیں جیسے پوتا پیدا کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”وہ اس مرتبہ بھی یہی کہیں گی بلکہ میں خود دعائیں مانگ رہی ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک بیٹا بھی دے دے۔ ہماری فیملی مکمل ہو جائے گی۔“

”یہ سب اللہ کی مرضی ہے سارو۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولے۔ ”ہماری قسمت میں لڑکا ہوا تو ہمیں ضرور ملے گا۔“

مجھے اپنے شوہر کی بات سن کر بہت خوشی ہوئی۔ میری ساس صاحبہ دوسرے ہی ہفتے پھر لاہور آگئیں اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے مجھے ہتھیلی کا چھالا بتالیا۔ وہ ہر طرح میرا دھیان رکھتی تھیں لیکن اٹھتے بیٹھتے ان کی پھر وہی رٹ شروع ہو چکی تھی کہ دلہن اس مرتبہ مجھے مایوس مت کرنا۔ میں تو اس دفعہ پوتے کا منہ دیکھ کر ہی واپس جاؤں گی۔“

امی کو یہ رشتہ پسند آ گیا اور ان لوگوں کو میں پسند آگئی۔ یوں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق دو ماہ کے اندر اندر میری شادی عرفان کے ساتھ ہو گئی اور میں کراچی جیسے شہر سے رخصت ہو کر میر پور خاص چلی گئی۔ چھوٹے سے اس شہر میں مجھے عجیب سی وحشت ہوئی تھی، عرفان نے مجھ سے کہا۔ ”سارو، بس کچھ دن اور برداشت کر لو، پھر میں تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ وہاں تمہارا دل لگ جائے گا۔“

عرفان کی پھوپھو شائستہ کے تین بیٹے تھے، تینوں لڑکیاں تھیں، ان میں شائلہ سب سے چھوٹی تھی۔ وہ بہت پناخہ بچی تھی۔ باتونی بھی بہت تھی۔ گھر بھر بلکہ پورا محلہ اس کی شرارتوں سے تنگ تھا لیکن وہ عرفان کی لاڈلی تھی۔ وہ مجھے بھی اچھی لگتی تھی اب ہر وقت وہ میرے ہی ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ ان دنوں پانچویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔ عرفان کے پھوپھا ٹھیکیداری کرتے تھے اور خاصے خوش حال تھے۔ ان کے خاندان کی ایک بات مجھے بہت گراں گزری کہ وہ لوگ لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے خلاف تھے۔ عرفان کی بہن فرزاندہ بھی صرف میٹرک پاس تھی۔

ایک مہینا دعوتوں اور آنے جانے میں گزر گیا پھر عرفان مجھے اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ وہ مجھ سے نوٹ کر پیار کرتے تھے۔ میں ان کی محبت بلکہ وحشت دیکھ کر پریشان ہونے لگی تھی۔ میرے سر میں درد بھی ہوتا تو وہ فوراً مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تھے۔ وہ ایک سرکاری ادارے میں ایکس سی این تھے۔ اس لیے ان کی تنخواہ معقول تھی۔ مجھے ان کی صرف ایک بات ناگوار گزرتی تھی کہ وہ تنخواہ کے علاوہ بھی ”بہت کچھ“ کماتے تھے۔ میں اسے رشوت کہتی تھی لیکن وہ اسے نظر انداز سمجھتے تھے۔

میں نے شروع شروع میں انہیں منع کیا لیکن پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ گھر میں ہر طرح کی آسودگی تھی۔ دو، دو گاڑیاں تھیں، دو ملازم تھے۔ محبت کرنے والا شوہر تھا تو مجھے دوسری باتوں میں سرکھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

چند مہینے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے وجود میں ایک اور وجود سانس لے رہا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ عرفان تو گویا خوشی سے پاگل ہو گئے۔ انہوں نے میرے کام کرنے میں بلکہ چلنے پھرنے پر بھی پابندی لگا دی۔

دو ہی دن بعد میری ساس صاحبہ لاہور آگئیں اور انہوں نے گھر کی کمان سنبھال لی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی کہتی

”اماں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں اس لیے میں دلہن نہیں ہوں۔ رہی پوتے کی بات تو یہ میرے اختیار میں نہیں ہے اگر میں خود اس قابل ہوتی تو پہلی ہی دفعہ آپ کو پوتے کا منہ دکھا دیتی۔“

”دلہن۔“ انہوں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تم کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہو۔ ہمارے خاندان میں عورت اس وقت تک دلہن رہتی ہے جب تک اس کا ایک بھی بزرگ زندہ رہتا ہے۔ عرفان کی شادی سے دو سال پہلے تک میں بھی دلہن ہی تھی کیونکہ میری ساس زندہ تھیں لیکن مجھے اس دفعہ ہر قیمت پر پوتا چاہیے۔“

میری پڑوسن رخسانہ اکثر ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ اس نے بھی میری ساس کی باتیں سن لی تھیں۔ موقع دیکھ کر وہ میرے کمرے میں آگئی اور بولی۔ ”سارہ! اگر تم چاہو تو تمہارے گھر بیٹا ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

”میرے چاہنے سے بیٹا کیسے ہوگا؟“

”اگر تم میری بات مانو تو میں کچھ کہوں؟“

”چلو، تم بھی کہہ لو۔“ میں نے بیزارگی سے کہا۔

”تم دیکھ رہی ہو کہ میری تین بیٹیاں ہیں، اس کے بعد بیٹا پیدا ہوا ہے۔“

”ہاں بھئی میں جانتی ہوں۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”تمہاری ساس کی طرح میری ساس کی بھی یہی آرزو تھی کہ انہیں پوتا چاہیے۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ عرفان بھائی ایسی کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔ میرے تو میاں بھی اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب چوتھی دفعہ بھی بیٹی ہوگی تو میں دوسری شادی کر لوں گا، پھر مجھے الزام مت دینا۔“

”تمہاری تمہید کچھ طویل ہوگئی۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اصل بات کرو۔“

”میں چوتھی مرتبہ امید سے ہوئی تو میری ساس نے مجھ سے کہا کہ شیخوپورہ سے دس پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں میں کوئی پیر صاحب ہیں۔ ان کے تعویذ سے شرطیہ بیٹا ہی پیدا ہوگا۔“

”پیر صاحب نے لڑکوں کی کوئی ٹیکٹری کھول رکھی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو یہ کرو سارہ۔“ رخسانہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ”اللہ والوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ پیر صاحب نے مجھے صرف تین تعویذ دیے تھے۔ ان تعویذوں کی تیاری میں انہیں بہت محنت کرنا پڑی تھی اور خاصے اخراجات بھی ہوئے تھے لیکن انہوں نے مجھ سے صرف دس ہزار روپے لیے تھے۔ دیکھ لو، ان کے تعویذوں کی برکت سے چوتھی دفعہ میں نے بیٹے کو جنم دیا۔“ پھر وہ سرگوشی میں بولی۔ ”تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ تمہارے پاس گاڑی بھی ہے اور تم اسے خود ہی ڈرائیو بھی کر سکتی ہو۔ ہم صبح جا کر شام کو واپس آ جائیں گے۔ عرفان بھائی سے میں کوئی بھی بھانہ کر دوں گی۔“

”رخسانہ تم کیسی پڑھی لکھی ہو کہ ان تعویذوں پر اعتبار کرتی ہو، یہ سب جعلی پیر ہوتے ہیں اور لوگوں سے صرف پیسا ہوتے ہیں۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو سارہ؟“ رخسانہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ”تم بے شک وہاں مت جاؤ لیکن پیر صاحب کے بارے میں ایسی باتیں تو مت کرو۔“

”رخسانہ، بیٹا دینا ہوگا تو مجھے اللہ دے گا۔ کسی پیر، فقیر میں اتنی قوت نہیں ہے کہ وہ مجھے بیٹا دے سکے۔“

رخسانہ خاموش ہو کر چلی گئی۔

جب ڈیلیوری کے دن قریب آئے تو میں خود بھی امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ میری ساس ہر رات مجھے زبردستی دودھ کا ایک گلاس پلایا کرتی تھیں۔ مجھے دودھ سے ذرا بھی رغبت نہیں تھی لیکن ان کا دل رکھنے کو پنی لیتی تھی۔

مجھے لیبر روم میں پہنچایا گیا تو میری نند، ساس اور پھوپھو تینوں باہر کارڈیور میں موجود تھیں۔ ان کے ساتھ رخسانہ بھی تھی۔ ڈیلیوری کے بعد نرس نے مجھے بتایا کہ مسز عرفان، مبارک ہو اللہ نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا فرمایا ہے۔“

میرا دل چاہا کہ میں بے اختیار سجدے میں گر جاؤں لیکن اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھی۔ میری آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد میری ساس اور نند کے ساتھ، ساتھ امی اور رخسانہ بھی میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میری ساس تو خوشی سے گویا پاگل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے پیچھے کا منہ چوما پھر میرا منہ چوما۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ رہے تھے۔ اسی وقت عرفان بھی آگئے۔ وہ بھی بہت خوش تھے۔ وہ اپنی ماں سے بولے۔ ”اماں اس دفعہ واقعی آپ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایڈ فرس لنکس
ایک کلک سے ڈاؤن لوڈ
ڈاؤن لوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلو ڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مکمل ریجنج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

<http://twitter.com/paksociety1>

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done



نے گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگی تھی جو قبول ہوگئی۔“

”بیٹا، دعا کے ساتھ میں نے بہت کچھ کیا تھا۔“ اماں نے کہا۔

ان کا یہ جملہ سن کر میں چونک اٹھی کہ دعا کے علاوہ انہوں نے اور کیا کیا ہے؟

میں اسپتال سے گھر آئی تو عرفان نے ایک چھوٹے موٹے جشن کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو کہنے لگے۔ ”سارو، یہ تو تمہارے گھر آنے کی خوشی میں ہے۔ اصل جشن تو اس وقت ہوگا جب میں اپنے بیٹے کا عقیقہ کروں گا۔“

”عمران کا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے اپنے بیٹے کا نام عمران رکھا ہے۔“

پھر عرفان نے ایک ہفتے کے اندر، اندر عمران کا عقیقہ کر لیا۔ اس موقع پر انہوں نے بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وہ یادگار جشن تھا۔

اس پارٹی میں خاصی چٹکن ہوگئی تھی۔ لاہور کے علاوہ بہت سے مہمان میر پور خاص سے بھی آئے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ عمران میرے نزدیک ہی سو رہا تھا کہ رخسانہ آگئی اور مسکرا کر بولی۔ ”سائزہ! دیکھا تم نے پیر صاحب کا کمال؟“

”پیر صاحب کا کمال؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”میں تو کسی پیر فقیر کے پاس نہیں گئی۔“

”تم نہیں گئیں لیکن میں آنٹی کو وہاں لے گئی تھی۔“

اس نے آنکھیں نیچا کر کہا۔ وہ میری ساس کو آنٹی کہتی تھی۔

”رخسانہ، تم کیا کہہ رہی ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ میں نے الجھ کر کہا۔

”بھئی جب آنٹی پچھلی مرتبہ آئی تھیں تو میں نے ان سے پیر صاحب کا ذکر کیا تھا۔“

مجھے یاد آ گیا کہ جب میں اُمید سے ہوئی تھی تو میری ساس فوراً ہی آگئی تھیں۔

”میں نے ان سے کہا کہ سائزہ تو وہاں جانے پر راضی نہیں ہے۔“ رخسانہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

”آنٹی نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں، ہو سکتا ہے کہ پیر صاحب ہمیں سائزہ کے لیے کوئی تعویذ دے دیں۔“

”پھر کیا اماں شیخوپورہ گئی تھیں؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ہاں وہ میرے ساتھ شیخوپورہ گئی تھیں۔ پیر صاحب پہلے تو تعویذ دینے پر راضی نہیں ہوئے تھے جس عورت کو بچے

کی خواہش ہے اسے خود آنا چاہیے۔ آنٹی نے بہانہ کر دیا کہ میری بہو بہت کمزور ہے۔ اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتی۔ ان کی خوشامد پر پیر صاحب نے پورے گیارہ تعویذ دیے تھے اور

آنٹی سے کہا تھا کہ اپنی بہو کو دودھ میں ملا کر پلا دیں۔“

”تم عجیب باتیں بتا رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

”آنٹی نے ان تعویذوں کے لیے پورے پچیس ہزار روپے پیر صاحب کو نظر آنے کے طور پر دیے تھے۔“ رخسانہ نے کہا۔

”تم تو پیروں اور اللہ والوں کو مانتی ہی نہیں ہو۔ اب اس کا ثبوت تمہارے سامنے ہے۔“ وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ اماں مجھے روز دودھ کا گلاس زبردستی کیوں پلاتی تھیں۔

میں نے عرفان سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ ”یہ اماں نے کیا حرکت کی؟“ وہ تھملا کر

بولے۔ ”جو کچھ کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ اس فراڈیے پیر کو فضول میں اتنی بڑی رقم دے دی۔ میں ان سے ابھی پوچھتا ہوں۔“

”عرفان پلیز۔“ میں نے انہیں روک دیا۔ ”وہ بڑی ہیں، اس وقت وہ بہت خوش ہیں۔ ان کی خوشی کو خاک میں

تہ ملائیں۔ ان سے کچھ مت کہیے گا۔“ رفتہ رفتہ سارے مہمان چلے گئے لیکن شائلہ وہیں رہ گئی کہ اس کے اسکول کی

چھٹیاں تھیں وہ اب میٹرک میں پڑھ رہی تھی اور عمر سے کہیں زیادہ بڑی لگتی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت

ہوگئی تھی۔ اس کی رنگت پہلے سے زیادہ سرخ و سفید، بال بہت گھنے اور روشنی ہو گئے تھے۔ ہمیں احساس نہیں ہوا تھا کہ

گزشتہ آٹھ سال پہلے نظر آنے والی چھوٹی سی گول منول بچی اب ایک بھر پور دو ٹیئرز بن چکی تھی۔

وہ ہمیشہ گرمیوں کی چھٹیاں ہمارے پاس ہی گزارتی تھی۔ وہ یوں بھی عرفان کی لاڈلی تھی۔ اس کی ضد پر عرفان

مجھے اور بچوں کو لے کر اکثر رات کا کھانا باہر کھایا کرتے تھے۔ وہ گھر کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔ میری زچگی کے

دوران میں اس نے پورے گھر کو سنبھال رکھا تھا، وہ کھانا بنانے میں طاق ہو چکی تھی۔

اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں تو وہ چلی گئی اور ہمارا گھر سونا ہو گیا۔ عمران تو ابھی چھوٹا تھا لیکن ٹین..... اس سے

کھل مل گئی تھی۔ وہ ہر وقت شائلہ باجی کو یاد کرتی رہتی تھی۔ عرفان بھی کچھ بچھ سے گئے تھے، میں جانتی تھی کہ وہ

شائلہ کو بہت چاہتے ہیں اس لیے اس کے جانے کا صدمہ ہے۔

میٹرک کے بعد شائلہ کے گھر والوں نے اسے گھر بٹھانا چاہا تو وہ اڑ گئی کہ میں تو آگے پڑھوں گی۔ اس نے فوراً عرفان کو ٹیلی فون کر دیا۔ عرفان اسی شام فلائٹ سے روانہ ہو گئے۔ ان کی بہن اور بہنوئی عرفان کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ وہ خاندان کے پہلے آدمی تھے جس نے انجینئرنگ کی تھی یوں بھی ان کی بہن ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔

عرفان کے کہنے پر وہ دونوں شائلہ کو کالج میں ایڈمیشن دلانے پر راضی ہو گئے۔

عرفان شائلہ کا داخلہ کرا کر لوٹے تو بہت خوش تھے۔ انہوں نے جانے سے پہلے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ میرا پورا خاص کیوں جا رہے ہیں۔

”یہ آپ نے اچھا کیا۔“ میں نے کہا۔ ”بھلا یہ بھی کوئی تک ہوتی کہ لڑکیوں کو میٹرک سے زیادہ نہیں پڑھایا جائے گا۔“ عرفان نے نہ صرف اس کا ایڈمیشن کرایا تھا بلکہ اس کی ٹیوشن کا بھی اہتمام کر دیا تھا۔ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے شائلہ کو معقول رقم بھیجتے تھے۔

مجھے خود بھی اس بات کا علم نہیں تھا، ایک دن مجھے مبین ہی نے بتایا کہ ماما، شائلہ باجی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ پاپان سے کہہ رہے تھے کہ میں صبح پے پیج دوں گا۔ وہ کل ہی تمہیں مل جائیں گے۔

”بیٹا اگر وہ شائلہ باجی کو پیسے بھیجتے ہیں تو سب سے دو۔ وہ تمہیں بھی تو پیسے دیتے رہتے ہیں۔“ مبین اس وقت سات سال کی تھی۔

پھر اچانک عرفان کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ کراچی میرا اپنا شہر تھا لیکن لاہور چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں عرفان کے ساتھ کراچی آ گئی۔ یہاں بھی ادارے کی طرف سے عرفان کو بہت بڑا بنگلا ملا تھا۔ اس کا لان ہی اتنا بڑا تھا کہ میری بیٹی مبین اس میں سائیکل دوڑاتی پھرتی تھی۔ عمران بھی ابھی گھٹنوں چلنے لگا تھا۔ کراچی اور میر پور خاص میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ اس لیے میر پور خاص سے عرفان کے والد اور والدہ اکثر کراچی آ جاتے تھے۔ میرے سراب ریٹائر ہو چکے تھے اس لیے ان کے پاس وقت ہی وقت تھا لیکن میر پور خاص میں ان کی تھوڑی بہت زمین تھی اس لیے وہ مستقل طور پر کراچی آنے کو

تیار نہیں تھے۔

کراچی آ کر دو سال میں مجھے دو بڑے صدموں سے دوچار ہونا پڑا۔ میرے ابو دل کے دورے میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد امی بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ عرفان ان کی بہت دلجوئی کرتے تھے۔ وہ اکثر ان پر زور دیتے تھے کہ آپ مستقل طور پر ہمارے ساتھ چل کر رہیں لیکن امی ہمیشہ انکار کر دیتیں۔ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں جو ابو نے بہت محنت اور پیار سے بنایا تھا۔

امی بیمار رہنے لگی تھیں۔ آخر وہ ابو کے غم میں کھلتی ہی چلی گئیں اور ایک رات خاموشی سے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔

عمران اب تین سال کا ہو چکا تھا اور اپنی توہلی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ مبین ساتویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔

ایک طرف میں، عرفان اور بچے لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے کہ ملازمہ اندر سے عرفان کا سیل فون لے کر آئی اور بولی۔ ”صاحب کا ٹیلی فون آرہا ہے۔“

جب تک وہ سیل فون ہم تک لائی فون بند ہو چکا تھا۔ اس وقت عرفان کے آفس کا کوئی سپروائزر آ گیا۔ وہ اس سے باتیں کرنے کے لیے اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد ان کا سیل فون پھر بجا۔

میں نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“
”سارہ بھابی!“ دوسری طرف سے شائلہ کی مترنم آواز سنائی دی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“
”میں بالکل ٹھیک ہوں، بچے بھی ٹھیک ٹھاک ہیں، تم کیسی ہو؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”میرا امت پوچھیں۔“ اس نے کہا۔ ”عرفان بھائی کہاں ہیں؟“ اس کی آواز سے مجھے لگا جیسے اسے کوئی پریشانی ہو۔

”وہ ذرا معروف ہیں، تم بتاؤ خیریت سے ہو، کوئی پریشانی ہے؟“

”ارے بھابی، کیا بتاؤں۔ میں تو بہت پریشان ہوں۔“

اسی وقت عرفان آ گئے۔ میں نے کہا۔ ”لو، تمہارے بھائی آ گئے ان سے بات کر لو۔“ میں نے سیل فون عرفان کی طرف بڑھا دیا۔

وہ شائلہ سے بات کرنے لگے۔ پھر بولے۔ ”ایسا

کیسے ہو سکتا ہے..... اچھا..... تم ایسا کرو، خاموشی سے یہاں چلی آؤ۔ پھپھو سے میں خود بات کر لوں گا، پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔“

وہ فون سے فارغ ہوئے تو خود ہی مجھ سے بولے۔
”پھپھو، شائلہ کی شادی کر رہی ہیں۔“

”ارے کب، یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”یہ خوشی کی بات نہیں ہے سارہ!“ عرفان نے کہا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ شائلہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے۔ پھپھو اسے پڑھانا نہیں چاہ رہی ہیں، دوسری بات یہ کہ جس لڑکے سے پھپھو نے اس کی شادی طے کی ہے، وہ پھوپھو پاجان کی طرح ٹھیکے دار ہے۔ تعلیم بھی واجبی سی ہے۔ وہ لوگ وہیں میر پور خاص میں رہتے ہیں، میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔“

”پھر آپ نے کیا کہا شائلہ سے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس سے کہہ دیا کہ تم خاموشی سے کراچی

چلی آؤ۔ میں پھپھو سے خود نمٹ لوں گا۔“ عرفان نے کہا۔

”لیکن عرفان، آپ کم سے کم پھپھو سے بات تو

کر لیں۔“ میں نے کہا۔

”بھئی، ان سے کیا بات کروں؟“ عرفان نے جھنجھلا

کر کہا۔ ”وہ مجھ سے بحث کرنے لگیں گی، میری بات ان کی

سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک میں خود

میر پور خاص نہیں جاؤں گا اور میں فی الحال کراچی سے جا

نہیں سکتا، یہاں ایک ضروری پروجیکٹ میں مصروف ہوں۔

شائلہ یہاں آجائے گی تو اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوادوں

گا۔“

میں خاموش ہو گئی۔ پورے خاندان میں ان کی عزت

تھی، خاندان والے ان کی بات مانتے تھے اور پھپھو تو یوں

بھی ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ خاندان کے کئی لڑکوں کو

انہوں نے ملازمت دلائی تھی۔ اس وجہ سے لوگ مزید ان

سے دبتے تھے۔

دوسرے دن دوپہر کو شائلہ اپنا سوٹ کیس لے کر

کراچی آ گئی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی تھی۔ اس

کے لباس اور گفتگو سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ میر پور خاص جیسے

چھوٹے سے شہر میں رہتی ہے۔ اس کے کپڑے جدید فیشن

کے تھے، اس کے پاس بہت مہنگا سیل فون تھا۔ میں جانتی تھی

کہ اتنا مہنگا فون اسے پھپھو نے نہیں دلوا یا ہوگا، یہ عرفان ہی کا

تختہ ہوگا۔

عرفان نے دوسرے ہی دن اس کے داخلے کے سلسلے میں کوشش شروع کر دی۔ داخلوں کی تاریخ گزر چکی تھی لیکن یہ کام عرفان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ہر سرکاری ادارے میں ان کے تعلقات تھے۔ انہوں نے گھر بیٹھے دو چار فون گھمائے اور شائلہ کا داخلہ کراچی یونیورسٹی میں ہو گیا۔

اس دن عرفان اور بچوں کے جاننے کے بعد میں ٹی وی

دیکھ رہی تھی کہ پھپھو کا ٹیلی فون آ گیا۔ میں نے سلام کرنے

کے بعد ان کی خیریت پوچھی۔ ”بیٹا، ہم لوگ خیریت سے

ہیں، ذرا تم شائلہ سے میری بات کرادو۔“

”شائلہ تو اس وقت سو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ابھی تک سو رہی ہے؟“ پھپھو نے ناگواری سے

کہا۔ ”اس سے کہنا کہ بس بہت کراچی کی سیر کر لی، اب

واپس آ جائے۔“

”کراچی کی سیر؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”پھپھو،

وہ تو یہاں پڑھنے آئی ہے۔“

”بھاڑ میں گئی ایسی پڑھائی۔“ پھپھو نے غصے میں کہا۔

”میں نے اس کی شادی طے کر دی ہے اور اسے پڑھنے کی

سوچ رہی ہے۔“

”شادی؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”ہاں بھئی شادی۔“ پھپھو نے کہا۔ ”لڑکا دہنی کی کسی

بڑی کمپنی میں کام کرتا ہے۔ بہت اچھے اور سنبھلے ہوئے لوگ

ہیں۔“

اسی وقت مجھے شائلہ نظر آئی۔ وہ میزٹیوں سے نیچے

اتر رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں سے آواز دی۔ ”شائلہ،

تمہاری امی کا فون ہے۔“

شائلہ نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کیا، پھر میرے

بلانے پر ناگواری سے آئی اور ریسیور مجھ سے لے لیا۔

”السلام علیکم امی..... نہیں میں نے تو یہاں یونیورسٹی میں

ایڈمیشن لے لیا ہے..... آپ عرفان بھائی سے بات کر لیں۔

ان کا فون نمبر تو آپ کے پاس ہے نا..... میں نے کہہ تو دیا

کہ میں ابھی نہیں آرہی..... اچھا خدا حافظ۔“ فون کار ریسیور

کر پڈل پر رکھ کر وہ مجھ سے بولی۔ ”بھائی! آپ بھی کمال

کرتی ہیں۔ انہیں یہ سب تفصیل بتانے کی کیا ضرورت تھی؟

وہ پہلے میرے سیل فون پر کال کر رہی تھیں، جب میں نے

فون نہیں اٹھایا تو انہوں نے آپ کو فون کر دیا۔ عرفان بھائی

”میں بھی تو آپ کو یہی بتانے کی کوشش کر رہی ہوں بیگم صاحبہ!“ زینت نے کہا۔ ”صاحب اور شائلہ بی بی کے تعلقات.....“

”بس کرو زینت۔“ میں نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے، تم شائلہ کے ساتھ ساتھ عرفان پر بھی کچھ اچھا ل رہی ہو۔“ میں بھتا کر اٹھی، اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے زینت پر شدید غصہ آ گیا تھا۔ شائلہ، عرفان کی گود میں کھیلی ہوئی بچی تھی۔ وہ اس کے لیے کوئی ایسی بات برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔

ایک ہفتے بعد میں نے عرفان کے جانے سے پہلے کہا۔ ”مجھے کچھ پیسے دے دیں، میں شاپنگ کے لیے جاؤں گی۔“

”اکیلی؟“ انہوں نے پوچھا۔
 ”نہیں، فرحانہ کو بلا لوں گی۔“ فرحانہ میری شادی سے پہلے کی دوست تھی۔ وہ فیڈرل بی ایریا میں رہتی تھی۔
 ”اتنی دور سے اس بے چاری کو بلاؤ گی؟“ عرفان نے کہا۔

”میں پہلے اس کے گھر جا کر اسے ساتھ لوں، پھر شاپنگ کے بعد ہم لوگ یہاں آئیں گے، رات کا کھانا فرحانہ ہمارے ساتھ کھائے گی، پھر ڈرائیور سے چھوڑ آئے گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آپ بھی بال کی کھال نکالتے ہیں۔“

عرفان نے جیب سے والٹ نکال کر اس میں سے چند بڑے نوٹ نکالے اور گنے بغیر مجھے دیتے ہوئے بولے۔ ”تم کب تک واپس آؤ گی؟ بچے بھی اسکول سے آ جائیں گے۔“

”انہیں زینت دیکھ لے گی، آپ فکر مت کریں۔“ ان کے جانے کے بعد میں نے پہلے تو خود ڈرائیورنگ کا فیصلہ کیا لیکن یہ سوچ کر ڈرائیور کو ساتھ لے لیا کہ پارکنگ مشکل سے ملتی تھی۔ یوں بھی لینڈ کروزر جیسی بڑی گاڑی کو پارک کرنے کے لیے بھی بڑی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے فرحانہ کو پہلے ہی فون کر دیا تھا۔ وہ تیار بیٹھی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کا ہارن بجایا تو فوراً ہی گھر سے باہر آگئی۔ شادی کے دس سال بعد بھی اس بے چاری کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر فرحانہ بولی۔ ”سارہ، میں تم سے.....“ وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔

”کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
 اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”میں تم سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ تم میری بات سنتی کب ہو؟“
 میں سمجھ گئی کہ وہ ڈرائیور کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی ہے۔ ہمارے طبقے کے ساتھ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ گھر کے ملازمین کے سامنے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بات لحوں میں پھیل جاتی ہے۔

گھریلو ملازمین مالی، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ جب دوسرے گھروں کے ملازمین کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں تو ان کا پسندیدہ موضوع ان کے مالکان کی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ڈرائیور نے ہمیں کلفٹن کے ایک معروف شاپنگ مال پر چھوڑ دیا۔ میرے دل میں کھد بدھتی ہوئی تھی کہ فرحانہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ ایک سال پہلے تک ایک اسکول میں پڑھاتی تھی، پھر اس کے شوہر نعیم نے اسے ملازمت کرنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ فرحانہ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

میں نے اس دن اپنے بچوں اور شائلہ کے لیے خوب شاپنگ کی۔ ضد کر کے دوسوٹ فرحانہ کو بھی دلوادے ورنہ وہ سوٹ لینے پر راضی نہیں تھی۔

شاپنگ سے فارغ ہو کر ہم دونوں ایک ریسٹورانٹ میں جا بیٹھے اور میں نے فرحانہ سے کہا۔ ”ہاں، اب بتاؤ تم کیا کہنے والی تھیں؟“

”میں تمہیں بتا تو دوں گی لیکن تم برداشت نہیں کر پاؤ گی۔“ فرحانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔
 ”بات بہت خاص ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔
 ”پچھلے ہفتے میں اپنے اسکول کی ٹیچرز کے ساتھ پکنگ کے لیے سی سائڈ پر گئی تھی۔ میں نے اسکول چھوڑ دیا ہے لیکن وہاں کی ٹیچرز مجھے نہیں چھوڑتیں۔“

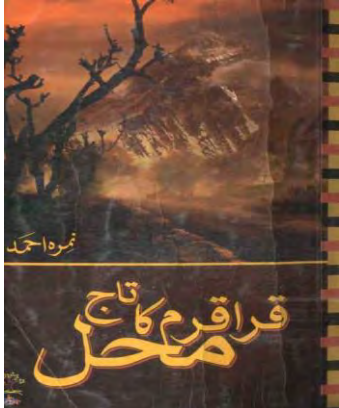
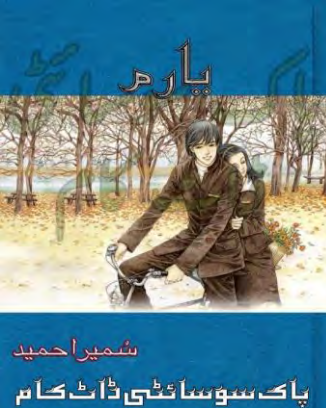
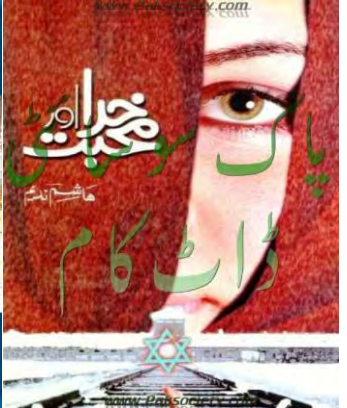
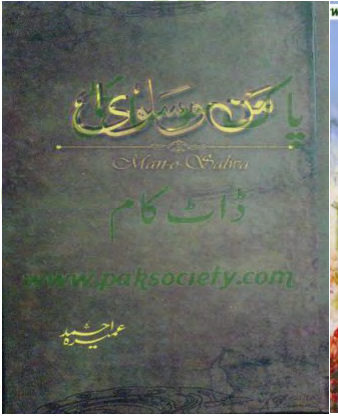
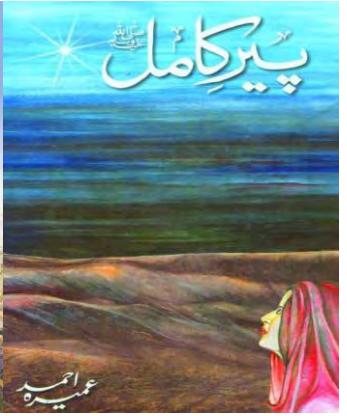
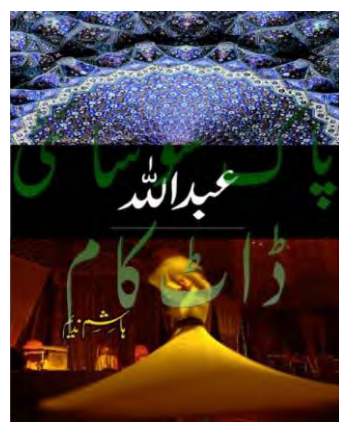
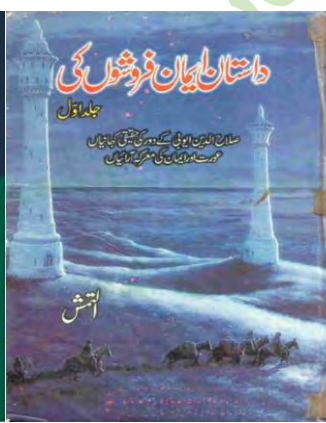
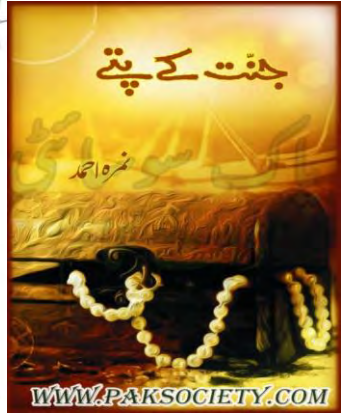
”بتا بھی چکو، سسپنس کیوں پھیلا رہی ہو؟“ میں نے کہا۔

”وہاں میں نے تمہاری کزن شائلہ اور عرفان بھائی کو دیکھا تھا۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“ میں نے کہا۔

”خاص بات یہ ہے کہ وہ وہاں پکنگ منار ہے تھے، میں سمجھی کہ تم اور بچے بھی موجود ہو گے لیکن شائلہ وہاں اکیلی تھی۔ عرفان بھائی وہاں اپنے جگھے کے ہٹ میں ٹھہرے۔“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہوئے تھے۔ وہ دونوں دیر تک پانی میں اٹھیلیاں کرتے رہے تھے، پھر ہماری طرف دیکھے بغیر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہٹ میں گھس گئے۔ میں وہاں کئی گھنٹے رہی تھی۔ اس وقت تو وہ ہٹ سے نکلے نہیں تھے۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرے ہاتھ بیروں میں سنسنی ہو رہی تھی اور دل بیضا جا رہا تھا۔“

”یہ گزشتہ ہفتے کی بات ہے۔“ فرحانہ نے کہا۔

مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ شائلہ نے اس دن یونیورسٹی کی طرف سے پکنک پر جانے کا بہانہ بنایا تھا اور صبح صبح ہی گاڑی لے کر نکل گئی تھی۔ پھر وہ شام ڈھلے لوٹی تھی۔ اس کے آنے کے آدھے گھنٹے بعد عرفان بھی آگئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ یہ آپ کا رنگ کیوں اتنا کالا ہو رہا ہے تو وہ بیزاری سے بولے تھے کہ آج مجھے دھوپ میں کھڑے ہو کر گھنٹوں کام کرانا پڑا ہے۔ اتنی شدید دھوپ میں میرا رنگ کالا نہیں ہوگا تو گورا ہوگا؟

شائلہ کا رنگ بھی پھیکا پھیکا سا بلکہ کچھ چھلسا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں تو مجھے علم تھا کہ وہ پکنک پر گئی تھی۔ پکنک پر جا کر چہرے کی جلد اسی طرح جھلس جاتی ہے۔

”تمہیں یقین ہے کہ وہ عرفان ہی تھے؟“ میں نے اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینا چاہی۔

فرحانہ نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولی۔ ”اب تم کہو گی کہ تمہیں یقین ہے کہ تم میرے ساتھ بیٹھی ہو۔ ان باتوں کو چھوڑو اور گھر کی فکر کرو، اس سے پہلے کہ عرفان بھائی تمہارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ تم انہیں لگام دینے کی کوشش کرو۔“

”میں ان سے کس منہ سے ایسی بات کر سکتی ہوں؟“ میں نے الجھ کر کہا۔

”اس کا واحد حل یہ ہے کہ شائلہ کو یہاں سے چلا کر دو۔ وہ اگر مزید تمہارے گھر میں رہی تو تمہارا بسا بسا گھر اجڑ جائے گا، تم کہتی ہو کہ عرفان اسے اپنی سگی بہنوں کی طرح چاہتے ہیں، سگی بہنوں کے ساتھ کوئی بھائی یوں اٹھیلیاں نہیں کرتا۔ پھر اس کا گیلا لباس جسم سے چپکا ہوا تھا اور وہ دونوں ساحل پر دوڑتے پھر رہے تھے۔“

مجھے اچانک زینت کی بات یاد آگئی۔ اس نے بھی مجھ سے اسی قسم کی باتیں کی تھیں لیکن میں نے اسے جھڑک دیا تھا۔ اب فرحانہ بھی وہی بات کر رہی تھی۔ زینت تو ملازمہ تھی، وہ اپنے فائدے کے لیے مجھ سے جھوٹ بھی بول سکتی

تھی لیکن فرحانہ کو تو مجھ سے یا عرفان سے کوئی لالچ نہیں تھا، وہ میری ہمدرد تھی۔ اس لیے مجھے وہ سب کچھ بتا رہی تھی۔

میں گھر پہنچی تو میرے ذہن میں پہل سی مچی ہوئی تھی۔ دل یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ عرفان مجھ سے بے

وقائی بھی کر سکتے ہیں اور یہ بات تو حلق سے اتر ہی نہیں رہی تھی کہ وہ شائلہ کے بارے میں اس انداز میں سوچ بھی سکتے

ہیں۔ بقول ان کے شائلہ ان کی بہت چہیتی اور لاڈلی بہن تھی۔ انہوں نے اسے گودوں میں کھلایا تھا، بہن سے زیادہ

وہ اسے بیٹی سمجھتے تھے، پھر اس کے ساتھ ایسی گھناؤنی حرکت۔ میں نے نفرت سے سوچا۔ مجھے تو اب کوئی رشتہ

قابل اعتبار نہیں لگتا تھا، اس کے باوجود ایک اُمید تھی کہ ممکن ہے عرفان، شائلہ کو گھمانے ہی لے گئے ہوں اور فرحانہ نے

اسے کوئی اور ہی رنگ دے دیا۔ پھر مجھے زینت کی بات یاد آئی۔ زینت نے بھی تو کوئی ایسی بات دیکھی ہی ہوگی۔ وہ

سلجھی ہوئی ذہین عورت تھی اور بلاشبہ میری ہمدرد تھی۔ وہ بغیر دیکھے اتنی بڑی بات نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ہی اسے جھڑک

کر خاموش کر دیا تھا ورنہ وہ مجھے اپنے خدشات کی وجہ بھی ضرور بتاتی۔

اس وقت تو سب گھر میں تھے۔ میں کل دن میں سب کے جانے کے بعد زینت سے بات کرنا چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عرفان بھی آگئے۔ وہ کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا بریف کیس اور

کوٹ لاؤنج کے ایک صوفے پر پھینکا اور خود دوسرے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ زینت فوراً ہی ان کے لیے پانی

لے آئی۔ ”سارو ڈارنگ!“ انہوں نے کہا۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ، آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔“

”آپ آج مجھے کچھ زیادہ ہی تھکے ہوئے لگ رہے ہیں، آج آرام کریں، ڈنر ہم پھر کسی دن کر لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ارے بھئی، یہ تھکن تو روز ہی ہوتی ہے، تم بس جلدی سے تیار ہو جاؤ، اس وقت تک میں بھی فریش ہو جاتا ہوں۔“

عرفان ہم سب کو شہر کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ ریسٹورنٹ کا وہ حصہ خالی تھا۔

عرفان ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، میں نے ان سے کہا بھی کہ کھانا منگوا لیں، بہت بھوک لگ رہی ہے۔

پھر بولی۔ ”بیگم صاحبہ، میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گی، آپ اس پر یقین نہیں کریں گی۔“

”تم بتاؤ تو سہی۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔
 ”بیگم صاحبہ، کچھ دن پہلے جب آپ اپنی کسی دوست کی بہن کی شادی میں گئی تھیں تو صاحب نہیں گئے تھے۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”اس دن شاملہ بی بی بھی گھر پر تھی۔ میں کچن سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹر میں چلی جاتی ہوں۔ اس دن میں اتفاق سے اوپر چلی آئی۔ صاحب کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی، میں نے حیرت سے سوچا، آپ تو ہیں نہیں، پھر صاحب کس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں، کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا پردہ ایک طرف سے کچھ سرکا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو.....“ زینت اچانک خاموش ہو گئی۔

”تو کیا؟“ میرے اندر غبار سا بھر گیا۔
 ”اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ..... صاحب اور..... شاملہ بی بی..... وہ پھر خاموش ہو گئی۔

میں سب کچھ سمجھ چکی تھی۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں شاملہ کو ابھی چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دوں۔ پھر میں نے..... بمشکل تمام اپنے غصے پر قابو پایا اور سوچا کہ ان دونوں کو رکتے ہاتھوں پکڑوں گی۔

دو دن بعد نجیس مارچ کی چھٹی تھی۔ میں نے عرفان اور شاملہ کے سامنے ناشتے کی میز پر اعلان کر دیا کہ میں بچوں کو لے کر آج ماموں جان کے گھر جاؤں گی۔

احمد ماموں امی کے رشتے کے کزن تھے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار چلی جاتی تھی۔

”بھئی، میں تو کہیں نہیں جاؤں گا۔“ عرفان نے کہا۔
 ”میں تو آج چھٹی کو گھر پر رہ کر ہی انجوائے کروں گا۔“
 ”بھائی، مجھے بھی اپنی ایک دوست کے گھر جانا ہے، اس کے ساتھ مل کر پڑھائی کروں گی، میرے امتحان بھی تو سر پر آ پینچے ہیں۔“ شاملہ نے کہا۔

”اچھا بھئی۔“ میں مسکرا کر بولی۔ ”آپ خوب دل بھر کے سوئیں لیکن ایسا نہ ہو کہ آپ سوتے ہی رہ جائیں اور کھانا بھی نہ کھائیں۔ ویسے میں شام سات آٹھ بجے تک آ جاؤں گی۔“

”ابھی منگواتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”بس کچھ دیر اور صبر کر لو۔“

”ٹھیک بارہ بجے ریسٹورنٹ کا ایک ویٹر ایک ٹرے میں ایک لے کر آ گیا اور ریسٹورنٹ کے بینڈ نے ”پپی برتھ ڈے ٹویو“ کی دھن بجانا شروع کر دی۔

میں حیران تھی کہ کس کی برتھ ڈے ہے؟ اچانک میری نظر کیک پر پڑی۔ اس پر کریم سے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”پپی برتھ ڈے ڈیئر شاملہ۔“

شاملہ یوں حیرانی ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ خود بھی اس سے لاعلم ہو، ممکن ہے، عرفان نے اسے بھی سر پر اتار دیا ہو۔ پھر انہوں نے شاملہ کو ایک بیش قیمت ڈائمنڈ رنگ، مہنگا ترین موبائل فون سیٹ اور قیمتی گھڑی تحفے میں دی تو وہ کھل اٹھی۔

”اگر آپ مجھے بتا دیتے تو میں بھی شاملہ کے لیے کوئی گفٹ لے آتی۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ گھڑی تمہاری طرف سے تو ہے۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”عرفان بھائی، آپ بھی بعض اوقات حیران کر دیتے ہیں۔“ شاملہ نے بہت لگاؤ سے کہا۔
 پہلے تو میں اس کی اداؤں اور نازخوروں کو یہ سوچ کر

نظر انداز کر دیتی تھی کہ وہ عرفان کی بہن تھی۔ لیکن اب مجھے اس کی ہر بات کھل رہی تھی۔ عرفان کا پرشوق نظروں سے اسے دیکھنا اور اس کا شرمانا مجھے ایک آنکھ نہیں بھار ہوا تھا۔

اس رات ہم دو بجے تک گھر پہنچ سکے۔ عرفان وہاں سے آتے ہی سو گئے ورنہ شاید میں ان سے لڑ پڑتی۔
 دوسرے دن اتوار تھا۔ مجھے زینت سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

تیسرے دن جب سب چلے گئے تو میں نے زینت کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے پینشنے کو کہا۔
 وہ میرے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گئی۔

”زینت، تم اس دن کیا کہہ رہی تھیں؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ سہم کر رہ گئی اور بولی۔ ”بیگم صاحبہ، مجھے معاف کر دیں، مجھے ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔“
 ”ڈروست۔“ میں نے کہا۔ ”میں واقعی جانتا چاہتی ہوں کہ تم اس دن مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہی تھیں؟“

زینت چند لمحوں تک تذبذب کی کیفیت میں بیٹھی رہی

میں نے بچوں کو ساتھ لیا اور فوراً ہی گاڑی ڈرائیو کر کے لے گئی۔ بچوں کو علم نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں انہیں فرحانہ کے پاس چھوڑ کر واپس آنا چاہتی تھی۔ فرحانہ کو میں نے پہلے ہی ٹیلی فون کر دیا تھا۔

میں کچھ دیر فرحانہ کے گھر کی اور بچوں سے کہا کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں، تم لوگ فرحانہ آنٹی کے ساتھ رہو۔

میں دوبارہ گھر پہنچی تو اپنی گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دی اور پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

مجھے دیکھ کر زینت چونک اٹھی اور بولی۔ ”آپ بہت اچھے موقع پر آئی ہیں بیگم صاحبہ! شائلہ بی بی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آپ کے کمرے میں گئی ہیں۔“

میں غصے میں یا گل ہو گئی اور تیزی سے اوپر کی طرف لپکی۔ دروازہ بند تھا لیکن اندر سے شائلہ کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔

میں نے غصے میں دروازہ دھکیلا تو وہ ایک دم کھل گیا۔

وہ دونوں ایسی حالت میں تھے کہ میں خود شرمائی۔
”تنت تم“ عرفان نے ہکلا کر کہا۔ شائلہ جلدی سے بیڈ سے اتر کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔

”تم تو اپنی کسی دوست کے گھر پڑھائی کے لیے جانے والی تھیں؟“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ پر میں نے عرفان سے کہا۔ ”یہ تو تمہاری لاڈلی بہن ہے۔ بہنوں کے ساتھ تم.....“

”بکواس بند کرو۔ شائلہ میری کزن ہے۔“ عرفان پھر کر بولا۔

”لیکن تم تو اسے بہن کہتے رہے ہو؟“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”آئندہ نہیں کہوں گا۔“ عرفان ابتدائی صدمے سے سنبھل چکا تھا۔ ”میں شائلہ سے محبت کرتا ہوں۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

عرفان کی ڈھٹائی اور شائلہ کی بے حسی دیکھ کر مجھے زوردار چکر آیا اور میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی۔

مجھے ہوش آیا تو عرفان میرے سرہانے بیٹھے تھے۔ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولے۔ ”سارہ! مجھے معاف کر دو، غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔ میں بھی بہک گیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم

بہت بڑے ظرف کی مالک ہو، مجھے معاف کر دو گی۔“ انہوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ارے، یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ میں نے تڑپ کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”مجھے گناہ گار مت کریں۔“

عرفان نے اسی شام شائلہ کو واپس میر پور خاص بھجوا دیا اور میرے دل کو سکون مل گیا۔ زینت اور فرحانہ کی بروقت مداخلت سے میرا گھر اجڑنے سے بچ گیا لیکن یہ میری بھول تھی۔

اب عرفان ہر تیسرے، چوتھے دن سرکاری دوروں پر جانے لگے۔ وہ بھی دو دن اور بھی تین دن کے بعد واپس آتے تھے۔

ایک دن میری ساس کا فون آیا تو وہ مجھ سے بولیں۔
”دہن، کیا عرفان آ گیا؟“

”اماں، وہ تو پرسوں سے سرکاری دورے پر گئے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”سرکاری دورہ؟“ میری ساس حیرت سے بولیں۔
”لیکن عرفان تو دو دن سے یہاں تھا۔ دوپہر میں گاڑی لے کر یہاں سے نکلا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک کراچی پہنچ چکا ہوگا۔“

”اماں، شاید وہ آتے ہوئے اپنے دفتر کی طرف چلے گئے ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آئیں گے تو میں آپ کی بات کرادوں گی۔“

تھوڑی دیر بعد عرفان آ گئے میرا موڈ آف تھا۔ اگر انہیں میر پور خاص جانا تھا تو مجھے بتاتے، میں بھی وہاں کا چکر لگاتی۔

”کیا بات ہے سارو؟“ عرفان نے پوچھا۔ ”تم کچھ ناراض لگ رہی ہو؟“

”میری ناراضی کو چھوڑیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ پہلے اماں سے بات کریں۔ وہ بتا رہی تھیں کہ آپ دو دن سے میر پور خاص میں تھے۔“

”ہاں، تو، پھر؟“ عرفان ایک دم مشتعل ہو گئے۔
”کیا میں اپنے ماں باپ سے ملنے نہیں جاسکتا؟“

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ میں نے کہا۔
”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی۔“

”تم کیوں میری جاسوسی میں لگی رہتی ہو؟“ عرفان جھنجھلا کر بولے۔ ”اب میں ہر ہفتے میر پور خاص جاؤں گا،

دیکھتا ہوں تم مجھے کیسے روکو گی۔“ سمجھ گئی کہ ان کے دل کا چور بول رہا ہے۔ ”جاہل عورت، سمجھتی ہی نہیں کہ میری کیا ذمے داریاں ہیں۔“

”میں آپ کی ذمے داری کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ میں نے تشریح کر کہا۔

”سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو، اب میں ہر ہفتے میر پور خاص جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

میں دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر تو انہوں نے معمول بتایا کہ وہ ہفتے کی شام کو میر پور خاص جاتے تھے اور پیر کی صبح وہاں سے لوٹ آتے تھے۔

معاملہ ہاتھ سے لگتا جا رہا تھا۔ میں نے فرحانہ سے مشورہ کیا اس نے کہا کہ تم جا کر عرفان کی پھوپھو اور پھوپا کو سب کچھ صاف صاف بتا دو، یا پھر اپنی ساس کو اعتماد میں لے لو۔“

”نہیں فرحانہ۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مجھے دھمکی دے چکے ہیں کہ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوئی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“

فرحانہ نے مجھے تسلی دی کہ تم فکر مت کرو، اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

زینت نے مجھے عجیب مشورہ دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سپر ہائی وے کے نزدیک تھا نہ بولا خان کے علاقے میں ایک بہت کرامت والے بزرگ ہیں۔ وہ ایسا تعویذ دیتے ہیں کہ.....

”جہالت کی باتیں مت کرو زینت۔“ میں نے اسے جھڑک دیا۔ ”یہ سب پیر فقیر صرف لوگوں کو لوٹنے کے لیے بیٹھے ہیں ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، کسی بابا یا عامل کی مرضی سے نہیں۔ یہ سب ڈھکوسلا ہوتا ہے لوگوں کو لوٹنے کا۔“

”لیکن بیگم صاحبہ۔“ زینت نے کہا۔ ”شاہ جی کسی بھی ضرورت مند سے ایک پیسا بھی لینا حرام سمجھتے ہیں۔“

”اجھا؟“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”وہ بغیر پیسوں کے شلٹن خدا کی خدمت کرتے ہیں تو خود کھاتے کہاں سے ہیں؟“

”ان کی تھوڑی بہت زمین ہے، اس کی آمدنی پر گزارہ کرتے ہیں۔“ زینت نے کہا۔ ”آپ ایک دفعہ چل کر تو دیکھیں۔ اگر کام ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کا کیا

ماہنامہ سرگزشت

مدینے کے وہ مسلمان جنہوں نے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مکہ سے آنے والے مسلمان مہاجرین کی مدد کی۔ انصار کہلائے۔ انصار و مہاجرین کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ الانفال اور سورۃ برأت میں آیا ہے اور لوگوں کو ان کے اتباع کی تلقین کی گئی ہے۔ مدنی زندگی میں اگرچہ مسلمانوں کے یہ دو گروہ تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدا ہی سے ان میں بھائی چارہ کرا دیا تھا۔ غزوہ بدر سے پہلے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہؓ کو مشورے کے لیے جمع کیا تو مہاجرین نے جاں نثاری سے تقریریں کیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کی طرف دیکھا کیوں کہ ان سے معاہدہ تھا کہ وہ صرف اس وقت تلواریں اٹھائیں گے جب دشمن مدینے پر چڑھا آئیں گے۔ سعد بن عبادہ سردار خزرج نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ ہم حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم تو آپ کے دانے سے، بانس سے، سامنے سے اور پیچھے سے لڑیں گے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سر تکانکھار فرمایا۔

مرسلہ: فیض محمد سکھر

نقصان ہو گا؟“

وہ کام ہونے کے بعد رقم کا تقاضا کرتے ہوں گے؟“ میں نے کہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاہ جی فی سبیل اللہ کام کرتے ہیں۔

”وہ بعد میں بھی کسی سے کوئی پائی پیسا نہیں لیتے۔ ان کی بس ایک شرط ہے، کام جائز ہونا چاہیے۔ ہمارا کام تو بالکل جائز ہے۔“ زینت نے کہا۔ پھر اس نے مجھے قائل کر ہی لیا کہ میں اس کے ساتھ شاہ جی کے آستانے پر چلوں۔

لباس سفر تھا، میں ڈرائیور کے بغیر اتنا لباس سفر نہیں کر سکتی تھی۔ راستے میں گاڑی خراب ہو جاتی یا کوئی ٹائر پھٹتا ہو جاتا تو میں کیا کرتی؟

میں نے حسب معمول بچوں کو فرحانہ کے پاس چھوڑا اور روانہ ہو گئی۔ میں نے ڈرائیور کو ہزار روپے کا نوٹ دے کر کہا۔ ”اکبر خان! یہ پیسے رکھ لو لیکن صاحب کو معلوم نہیں

جولائی 2016ء

287

ہونا چاہیے کہ ہم کہاں گئے تھے۔“

”بیگم صاحبہ!“ اکبر خان نے کہا۔ ”مارے کو معلوم اے کہ آپ سندھ والے شاہ جی کے پاس جاتا ہے ہم کو شرمندہ مت کرو بیگم صاحبہ، یہ پیسہ رکھ لو۔ ام کسی کو بھی کچھ نہیں بتائے گا۔“

ان دنوں شدید گرمی پڑھ رہی تھی۔ میری گاڑی اگر اڑکنڈیشنڈ نہ ہوتی تو میں جھلس کر رہ جاتی۔ سپر ہائی وے پر تو محض آدھا سفر تھا۔ باقی سفر تو کچے میں تھا۔ شاہ جی نے بھی نہ جانے اس ویرانے میں ٹھکانا کیوں بنایا تھا۔

میں صبح نو بجے گھر سے نکلی تھی اور شاہ جی کے آستانے پر پہنچنے پہنچنے بارہ بج گئے تھے۔ اس سے کہیں کم وقت میں تو میں حیدرآباد پہنچ سکتی تھی۔

وہاں بہت سی عورتیں اور مرد موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن سے شاہ صاحب ملنا نہیں چاہتے تھے۔ زینت نے بتایا کہ ان کے کام ناجائز ہوں گے، یہ اس امید پر یہاں پڑے ہوئے ہیں کہ شاید شاہ صاحب کو ان پر رحم آجائے۔

شاہ صاحب کا ایک ملازم خاص ایک رجسٹر میں ہر سائل کا نام اور اس کا کام لکھ رہا تھا۔ کئی عورتوں کو اس ملازم ہی نے جھڑک دیا تھا۔

شاہ صاحب کا مکان پختہ اینٹوں کا تھا۔ اس کے سامنے بہت بڑا احاطہ تھا جس میں ایک طرف پینڈ پپ لگا ہوا تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے دریاں چھٹی ہوئی تھیں۔ میں ابھی شاہ صاحب کے آستانے کا جائزہ لے رہی تھی کہ شاہ صاحب نے مجھے بلا لیا۔

ان کے خدمت گار نے زینت کو وہیں روک دیا۔

میں شاہ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ خاصے خوب رو اور جوان آدمی تھے۔ عام بیروں اور عالموں کی طرح نہ ان کی داڑھی تھی، نہ گلے میں منکوں کی مالا تھی۔ وہ صاف سترے کاشن کے شلوار قمیص میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے رجسٹر دیکھ کر کہا۔ ”تو تمہیں اپنا گمراہ کرنے کا خدشہ ہے؟“

”جی شاہ صاحب۔“ میں نے کہا پھر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں بولی۔ ”شاہ صاحب! مجھے اس مشکل سے نجات دلا دیں، میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”مشکل سے نجات دلانے والا تو اللہ ہے بی بی۔“

شاہ صاحب نے کہا۔ ”میں تو بس اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کے بندوں کی خدمت کرتا ہوں۔“ پھر وہ موضوع بدل کر بولے۔ ”مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے بی بی، میں تمہیں کچھ تعویذ بھی دوں گا اور کچھ عمل بھی بتاؤں گا لیکن میری ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ تم نے اگر یہ عمل ادھورا چھوڑ دیا تو یہ تم ہی پر الٹ جائے گا۔ اس میں تمہارے حوصلے کی آزمائش ہوگی۔ اگر تم نے عمل پورا کر لیا تو تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔“

انہوں نے مجھے تین تعویذ دیے اور بولے کہ انہیں گھر میں ایسی جگہ دبا دینا جہاں کسی کے قدم نہ پڑیں اور ان پر ہر وقت آگ روشن رہنا چاہیے۔ یہ تعویذ جتنے گرم ہوں گے عمل اتنی ہی جلدی کامیاب ہوگا۔ پھر انہوں نے مجھے ایک چنگی میں تھوڑا سا آٹا دیا اور بولے۔ ”اس آٹے کو دوسرے آٹے میں اچھی طرح ملا دینا اور روزانہ دو پہر کو تین روٹیاں پکا کر اسے کسی کتے کو کھلا دینا۔ یہ روٹیاں تمہیں سات دن تک پکانا ہوں گی۔ ہاں جو آٹا اس کے باوجود بچ جائے اسے گھر کا کوئی آدمی نہ کھائے بلکہ اسے کسی کنویں یا سنڈر میں ڈلوادینا۔ ایک بات اور، ان تعویذوں کو چاندی کے خول میں بند کر کے زمین میں دبانا اور ان پر کونکوں یا لکڑی کی آگ جلا دینا۔ آگ جتنی تیز ہوگی، اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ عمل تمہیں اکتالیس دن تک کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی نماز کی پابندی بھی کر سکو تو بہت اچھا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، یہ عمل ادھورا مت چھوڑنا، اللہ نے چاہا تو تمہارا کام ہو جائے گا اور کام نہ ہو تو سمجھ لینا کہ اس میں اللہ کی مرضی نہیں ہے۔ بس اب جاؤ اور میری ہدایات پر عمل کرنا۔“

☆☆☆

”یہ سارا بندوبست زینت نے کیا۔ اس نے سروٹھ کوارٹر کے نزدیک خاصہ گہرا گڑھا کھود کر چاندی کے خول میں بند تعویذ اس میں دبا دیے اور اس گڑھے میں کونکے ڈال کر مجھ سے آگ لگانے کو کہا۔ میں نے کونکوں پر تھوڑا سا مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔“

شاہ جی کا دیا ہوا آٹا میں نے اچھے خاصے آٹے میں ملا کر الگ رکھ لیا۔ روٹیاں سات دن تک مجھے خود پکانا تھیں۔ میں سات دن تک روزانہ تین روٹیاں پکا کر زینت کو دیتی رہی اور وہ چند قدم آگے بڑھ کر وہ روٹیاں باہر سے پڑوسیوں کے کتے کو ڈال دیتی۔ انہیں وہ فوراً کھا جاتا۔ اس کے بعد بھی اچھا خاصا آٹا بچ گیا تھا۔ میں نے وہ آٹا اکبر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---------------|--------------------|-----------------|------------------|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابراراجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | ممتاز مفتی |
| نگہت عبد اللہ | سباس گل | عنیزہ سید | مستنصر حسین |
| رضیہ بٹ | زُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ ہریم | نایاب جیلانی | ایم اے راحت |

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ،
سرگزشت ڈائجسٹ، نئے آفاق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسوسی دنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

خان کے حوالے کر دیا کہ اسے سمندر میں ڈال آئے۔ اسے بھی میں نے تاکید کر دی کہ یہ آٹا کوئی انسان نہ کھانے پائے۔

اس کے بعد میں پابندی سے سروٹھ کو ارٹھ کی طرف جاتی اور تعویذوں والے گڑھے میں کوئلے ڈال دیتی۔ یہ آٹا لیس دن کا عمل تھا اس لیے میں نے اکبر خان سے کوئلوں کی پوری پوری منگوا لی تھی۔

سات دن گزرنے کے باوجود کچھ نہ ہوا اور عرفان حسب معمول میر پور خاص چلے گئے۔ میں مایوس نہ ہوئی اور گڑھے میں کوئلے جھونکتی رہی اور نمازوں کی پابندی کرتی رہی۔

دوسرے ہفتے جب عرفان پھر سوٹھ کیس لے کر جانے کو تیار ہوئے تو میں... جھنجھلا گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے گڑھے میں بہت سے کوئلے ڈالے اور زینت سے کہا کہ اس آگ کو پکھالے کر دہکاتی رہو۔ میں نے اسے ایک ٹیبل فین دے دیا کہ آگ جو نمی مہم پڑنے لگے تم اس میں نئے کوئلے ڈال دینا اور پکھلا دینا۔

مجھے خود پر حیرت ہوئی تھی میں جو کبھی ان عالموں اور باباؤں کا مذاق اڑایا کرتی تھی، آج خود اس پکھر میں پڑی ہوئی تھی۔

عرفان جانے کے ارادے سے گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھے تو میں نے جھنجھلا کر گڑھے میں پڑے کوئلے جھونک کر پکھلا دیا آگ تیری سے دیکھنے لگی میں زینت کو آگ روشن رکھنے کی تاکید کر کے لان میں آ گئی۔

اچانک دروازے پر گاڑی کا ہارن گونجا۔ دوسرے ہی لمحے گیٹ کھلتے ہی عرفان کی گاڑی اندر داخل ہوئی اور عرفان حواس باختہ سے گاڑی سے اترے اور گرتے پڑتے اندر آ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔

”کیا بات ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ان کے چہرے سے پانی کی طرح پسینا بہ رہا تھا۔

”میرا سر چکرا رہا ہے، ساڑھ، میں کمرے میں جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلے گئے اور بستر پر گرے گئے اور مجھ سے بولے۔ ”مجھے ٹھنڈا پانی لا دو اور اے سی کا تھر مو اسٹیٹ بڑھا دو۔ میرے جسم میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔“

میں نے ان کے لیے ٹھنڈا پانی منگوا یا اور اے سی تیز

کر دیا۔ کمرے میں اتنی خشکی ہو گئی کہ مجھے سردی لگنے لگی لیکن عرفان نے بنیان تک اتار چھینکی تھی اور وہ بار، بار پانی پی رہے تھے۔

میں آگ مسلسل روشن رکھے ہوئے تھی اور اسے اکثر دہکا بھی دیتی تھی۔

ایک ہی ہفتے میں عرفان نڈ حال ہو گئے۔ وہ براہ نام کھاتے تھے، بس زیادہ وقت پانی پیتے رہتے تھے یا نہاتے رہتے تھے، کہتے تھے کہ میرے جسم میں آگ سی بھر گئی ہے۔ انہوں نے آفس سے چھٹی لے لی تھی۔ ہفتہ آیا تو میں نے پوچھا۔ ”میں آپ کا سوٹ کیس تیار کر دوں، آپ کو میر پور خاص نہیں جانا؟“

”کیوں جاؤں میں میر پور خاص؟“ عرفان چیخ کر بولے۔ ”اماں، ابا کو خیال ہوگا تو وہ خود مجھ سے ملنے آئیں گے۔“

دوسرا ہفتہ بھی گزر گیا اور ان کی حالت مزید اتر ہو گئی۔ اب تو ان سے چلا پھرا بھی بہت مشکل سے جاتا تھا۔ وہ ہاتھ روم بھی میرے سہارے سے جاتے تھے۔ دو ہی ہفتے میں وہ مجھے برسوں کے مریض لگنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اور وہ بہت چڑچڑے ہو گئے تھے۔

تیسرا ہفتہ گزرا تو وہ بالکل بستر سے لگ گئے اور بولے۔ ”ساڑھ، تم اماں اور ابا کو بلا لو۔ شاید میں اب نہیں بچ سکوں گا۔“

ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر آپ کو دو امیں تو دے رہا ہے، آپ انشاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے اکتیس دن گزر گئے لیکن یہ اکتیس دن میں نے کانتوں پر لوٹتے ہوئے گزارے۔ عرفان کی حالت مردوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ ان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جانی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی جا کر آگ بجھا دوں اور تعویذ نکال کر بھینک دوں۔ لیکن پھر مجھے شاہ صاحب کی ہدایات یاد آ جاتی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ عمل کو ادھورا کسی بھی حالت میں مت چھوڑنا۔ اس میں تمہاری آزمائش بھی ہے۔

مجھے اُمید نہیں تھی کہ میری آزمائش اتنی سخت ہوگی۔ پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔ عرفان سے اب بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا وہ بہت نحیف آواز میں بولتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”میں اماں کو میر پور خاص سے بلواؤں؟“

”تم نے ابھی تک انہیں اطلاع نہیں دی؟“ وہ مجھے گھور کر بولے۔ ”انہیں بلا لو۔“

”اور شائلہ کو؟“ میں نے ڈرتے، ڈرتے پوچھا۔
”کون شائلہ؟“ وہ چونک کر بولے۔ ”اچھا وہ پھوپھی کی بیٹی، اسے بلانے کی کیا ضرورت ہے؟“

شام تک امی، ابا کراچی پہنچ گئے۔ شائلہ ان کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری ساس عرفان کو دیکھ کر رونے لگیں اور بولیں۔ ”دلہن، عرفان کی طبیعت اتنی خراب تھی اور تم نے ہمیں اطلاع بھی نہیں دی۔“
”اماں انہوں نے مجھے خود سچ کیا تھا کہ اماں فضول میں پریشان ہو جائیں گی۔“

عمل پورا ہونے میں پانچ دن باقی تھے لیکن عرفان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ بار، بار مجھ سے یہ کہہ رہے تھے کہ سائرہ اب میں نہیں بچوں گا لیکن تم فکر مت کرو۔ میں نے اتنی دولت جمع کر لی ہے کہ تمہیں اور بچوں کو میرے بعد کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ پھر وہ خاموش ہو کر غنودگی میں چلے گئے۔ ان کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ گلے سے عجیب خرخراہٹ کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ میری ساس بلک بلک کر رونے لگیں انہوں نے یسین شریف کا ورد شروع کر دیا۔ میرے سر بھی باہر بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ بچے بھی بری طرح رورہے تھے۔ میری آنکھیں بھی بری طرح برس رہی تھیں۔

اچانک عرفان زور، زور سے ہچکیاں لینے لگے۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ پھر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں دیوانہ وار سرونٹ کوارٹر کی طرف دوڑی اور جلتی ہوئی اس آگ میں بالٹی بھر کے پانی ڈال دیا۔

”بیگم صاحبہ، یہ کیا کر دیا آپ نے چارہی دن تو باقی رہ گئے ہیں، عمل ادھورا کیوں چھوڑ رہی ہیں؟“

”مجھ سے ان کی حالات دیکھی نہیں جا رہی۔ چاروں تو بڑی بات ہے، وہ آج کی رات ہی نکال لیں تو غنیمت ہے، میں نے آگ پر مزید پانی ڈالا اور کفگیر لے کے اس میں سے کونکے نکال لیے۔ کونکے نکالنے کے بعد میں نے گڑھا کھود کر تینوں تعویذ بھی نکال لیے اور انہیں بھی پانی کی بالٹی میں ڈال دیا۔ پھر میں روتی ہوئی اندر کی طرف دوڑی۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں خوش ہو گئی۔ عرفان بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر بشارت تھی۔ وہ مجھ سے بولے۔ ”سائرہ، مجھے بہت بھوک لگی ہے، کھانا لاؤ۔“

میری ساس خوش ہو گئیں۔ عرفان نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور گہری نیند سو گئے۔

وہ شام تک سوتے رہے شام کو اٹھے تو ان کی حالت حیرت انگیز طور پر سنبھال گئی تھی۔

وہ مجھ سے بولے۔ ”میرا سوٹ کیس تیار کر دو، مجھے میرا پورا خاص جانا ہے۔“

”اماں اور ابا تو یہیں ہیں، میں نے کہا۔“ آپ میرا پورا خاص جا کر کیا کریں گے؟“

”بحث مت کرو۔“ وہ چیخ کر بولے۔ ”اماں اور ابا بھی میرے ساتھ جائیں گے۔“

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان کے جسم میں کمزوری تھی لیکن چہرے پر بشارت تھی پھر وہ تیار ہو کر میرا پورا خاص چلے گئے۔

دو دن بعد مجھے اماں کا فون موصول ہوا کہ دلہن غضب ہو گیا۔ عرفان، شائلہ کو لے کر لاہور چلا گیا۔ اس نے وہاں اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔

میں ستائے میں رہ گئی۔ میں شاہ صاحب کے پاس دوڑی لیکن انہوں نے ملاقات سے انکار کر دیا اور بولے۔

”اب میرے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔“

میں روتی دھوتی واپس آ گئی۔

عرفان نے اپنا ٹرانسفر بھی لاہور کر لیا اور وہیں سے مجھے طلاق نامہ بھجوادیا۔

مکان سرکاری تھا اس لیے مجھے خالی کرنا پڑا۔ امی کا مکان موجود تھا۔ میں روتی دھوتی اس مکان میں آ گئی۔

میں نے مکان کا ایک حصہ کرائے پر دے دیا ہے اور ایک پرائیوٹ فرم میں ملازمت کرتی ہوں۔ ٹین نے انٹر کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔

..... اور عمران بھی بہت ذہین ہے۔ میں اپنی قسمت پر شاکر ہو گئی ہوں لیکن آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ سب کیا تھا؟ کیا وہ کالا علم تھا یا پھر واقعی کوئی حقیقی علم تھا میں آج بھی ان عالموں اور باباؤں پر یقین نہیں رکھتی ہوں لیکن میں اپنی ذات پر گزرنے والے واقعات سے انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ کیا وہ شاہ صاحب بھی واقعی عامل تھے یا پھر کالے علم کے ماہر تھے؟ اگر زندہ ہوتے تو ضرور معلوم کرتی۔

